عنایت اللہ

خاکی وردی لال لہو

شہرۂ آفاق ناول ''طاہرہ'' کا دوسرا حصہ

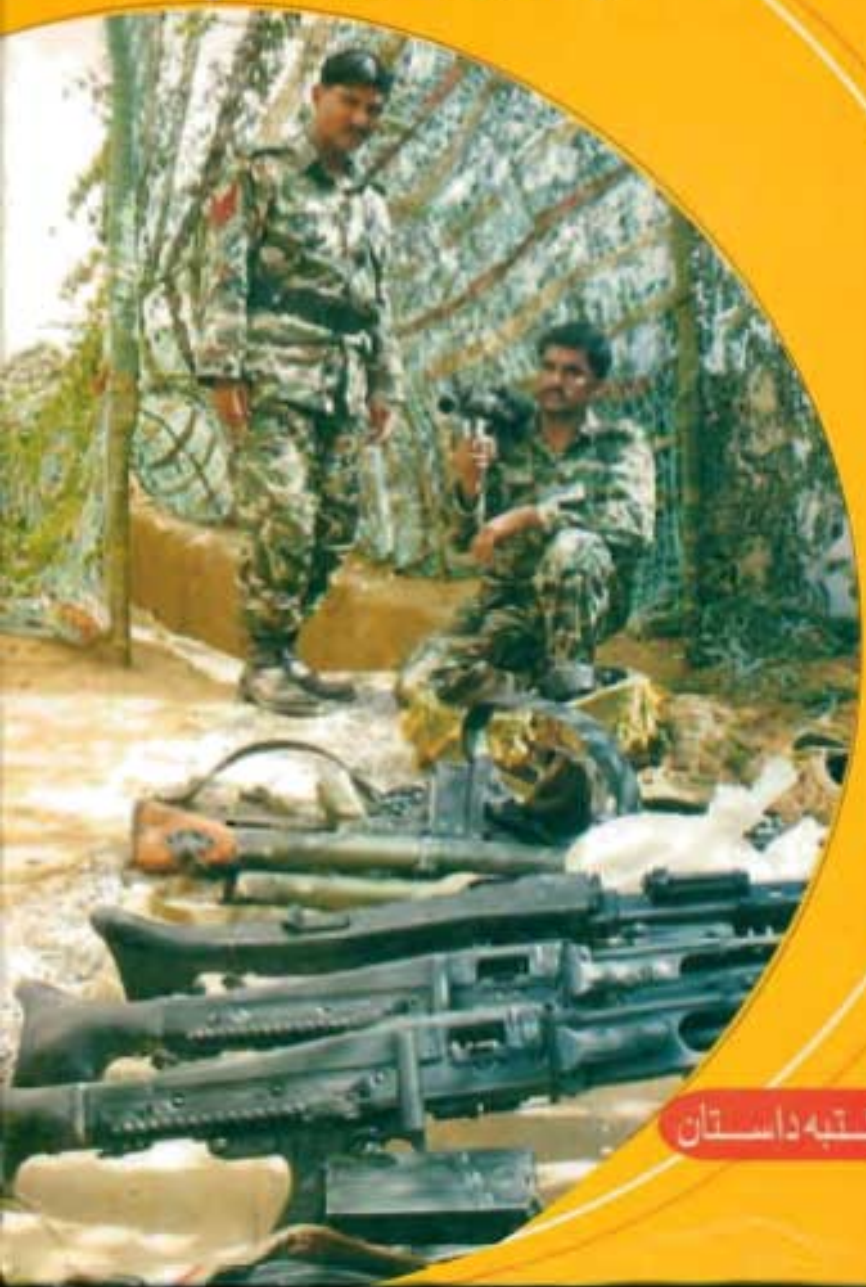

1

مکتبہ داستان

خاکی وَردی لال لہُو

جلد اول

شہرۂ آفاق ناول ''طاہرہ'' کا دوسرا حصہ

عنایت اللہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

واحد تقسیم کار

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔

فون: 7232336، 7352332 فیکس: 7223584

www.ilmoirfan-publishers.com E-mail: ilmoirfan-publishers@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ..... خاکی وردی لال لہو

مصنف ..... عنایت اللہ

ناشر ..... وقاص شاہد

مکتبہ داستان، لاہور

مطبع ..... زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور

اشاعت ثانی ..... جون 2009ء

قیمت ..... -/250 روپے

..... مکمل سیٹ -/500 روپے

☆ ملنے کے پتے ☆

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 7232336, 7352332

مکتبہ داستان

پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور

کتاب گھر

کمیٹی چوک، راولپنڈی

اشرف بک ایجنسی

کمیٹی چوک، راولپنڈی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

وقاص کے نام

لاریب قوم میں سعدبن ابی وقاص موجود ہیں

پیش لفظ

"طاہرہ" کا دوسرا حصہ "خاکی وردی لال لہو" پیش خدمت ہے۔ کہانی آخر سو صفحات پر پھیل گئی ہے اس لیے یہ ہم دو جلدوں میں پیش کر رہے ہیں۔ پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں جب "دل" طاہرہ" لکھ رہا تھا تو مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ یہ اتنا زیادہ مقبول ہوگا کہ قارئین اور نقاد متفقہ طور پر رائے دیں گے کہ یہ ناول پیٹی کے جیئر میں شامل ہونا چاہیئے۔ طاہرہ کو مزید شہرت ٹیلیویژن والوں نے اس طرح دی کہ اسے قسط وار ڈرامہ بنا کر دکھانا شروع کیا لیکن اس کے تحریک پاکستان والے حصے کو نہ حکومت پاکستان برداشت کر سکی نہ بھارت سرکار۔ چنانچہ اس ناول کے ڈرامے سے تحریک پاکستان کا اہم ترحصہ نکال دیا گیا اور کہانی میں باقی جو کچھ رہ گیا تھا اسے سنسر کر کے ٹی۔وی پر پیش کیا گیا۔ ملک کے مختلف اخباروں نے اپنے کالموں میں احتجاج کیا کہ "طاہرہ" کی روح نکال دی گئی ہے۔

اس طرح "طاہرہ" کو مزید شہرت ملی۔ اس کے بعد کئی قارئین نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کہانی کو آگے چلایا جائے جس میں جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء اور جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پوری طرح بیان کیا جائے۔

کام بڑا مشکل اور کٹھن تھا۔ تجویز بہرحال مجھے پسند آئی اور میں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ "طاہرہ" کی کہانی اس مقام پر ختم ہو گئی تھی جہاں طاہرہ کو اپنا باپ جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ مر چکا ہے۔ زندہ مل جاتا ہے۔ ارشد طاہرہ کو مل جاتا ہے جسے وہ چھ برسوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ طاہرہ پہلی بار اپنی ہمدرد دوست کی سہیلی کے بیٹے کو دوستی ہے جس پر اس نے اپنی پہلی اور آخری محبت قربان کر دی تھی۔

اس بچے کی خاطر باپ (ارشد) دوسری شادی نہیں کرتا اور بچے کا شعور بیدار ہوتے ہی اُسے تحریک پاکستان کی کہانیاں سنانی شروع کر دیتا ہے۔ اُسے بتاتا ہے کہ یہ پاکستان کتنا خون دے کر حاصل کیا گیا تھا اور اسے دشمن سے بچائے رکھنا آج کی نسل کا فرض ہے۔ باپ نے بچے کے جذبات میں آگ بھر دی۔

میں نے خود بھی محسوس کیا کہ اس بچے سے کہانی آگے چلائی جا سکتی ہے اور نئی نسل کو بتایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کو کون سے بیرونی اور اندرونی دشمنوں کا سامنا ہے اور نئی نسل کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ یہ بات کہانی کی صورت میں کرنی تھی تاکہ کہانی کی دلچسپیاں اصل بات کو دلوں میں اُتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے افسانہ نہیں۔ میں نے حقیقی زندگی سے کردار نکالے۔ بعض کو میں جانتا تھا۔ کچھ اور مل گئے۔ بعض کو دونوں کے ادوار سے دیکھا اور ان سب کو ایک کہانی میں پرو دیا۔

اس بڑی لمبی کہانی میں آپ کو بھارت کے بڑے خوبصورت جاسوس ملیں گے۔ ان کی خفیہ سرگرمیاں بھی آپ دیکھیں گے۔ کشمیر کا کمانڈو اپریشن "جبرالٹر" بھی اس میں شامل ہے۔ دل دہلا دینے والے کمانڈو ایکشن بھی آپ دیکھیں گے۔ پھر جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کا پس منظر اور جنگی مناظر آپ کے سامنے آئیں گے۔ اس جنگ

iqbalmt@oneurdu.com Scanned

کا میں عینی شاہد اور مبصر ہوں۔ اسی جنگ نے مجھے پاکستان کا واحد جنگی وقائع نگار بنایا تھا میں نے اس ناول (خاکی وردی لال لہو) میں جنگ ستمبر کے ہر پہلو کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

پھر ۱۹۷۱ء کی جنگ آتی ہے اور آدھے پاکستان کو اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہے۔ میں نے اس جنگ کے پس منظر اور پیش منظر کو مکمل کر بیان کیا ہے۔

میں نے ناول کو کہیں بھی خشک نہیں ہونے دیا کئی مناظر ایسے جذباتی ہیں جو آپ کی آنکھیں پُرنم کر دیں گے۔ اس میں آپ کو ایسے کردار بھی ملیں گے جو گفتار ہوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ میں کہانی پر مزید تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہ کہوں گا کہ اس میں آپ کو کہانی کے تمام تر لوازمات ملیں گے اور ایسی حقیقت کو آپ اپنے سامنے بے نقاب دیکھیں گے جو آپ کے خون کو گرما دے گی، آپ کو شرمسار کر دے گی اور آپ کی سوچوں میں انقلاب بپا کر دے گی۔

کہانی اچھی ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

ایک بھی سی ہے جس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ یہ "ناول" حکایت" میں قسط وار چھپتا رہا ہے۔ اس دوران ہم پر سنسر کی پابندی عائد کر دی گئی۔ سنسر کی قینچی بڑی بے رحمی سے چلی اور اس ناول کو بھی نہ بخشا۔ بے شمار فقرے بلکہ پیرے کاٹ دیئے گئے لہٰذا انہیں بحال کرنا ضروری فرماتیے کہ یہ ایک ناول ہے جس میں پاکستان کے دشمنوں کا اور پاکستان کے غداروں کا ذکر ہے مگر اس میں سے بھی سنسر نے کچھ حصے کاٹ دیئے۔

اب میں ان اقساط کو کتاب کی صورت میں یکجا کرنے لگا تو [illegible] سنسر کے پیدا کیے ہوئے خلاء کو پُر کرنے میں بہت دشواری ہوئی۔ بڑے اچھے اور پُراثر فقرے اور پیرے کاٹ دیئے گئے تھے۔

بعض قارئین نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں نے کئی معرکہ آرا ناول لکھے ہیں لیکن کسی کو [illegible] تقریب رونمائی کی خبر اخباروں میں نہیں آئی نہ کبھی کسی اخبار کے ادبی [illegible] میں کسی ناول کا کبھی ذکر آیا۔

اس ضمن میں عرض ہے کہ میں ادبی ایڈیشنوں میں آنے والا ادیب نہیں ہوں مجھے رونمائی کی ضرورت ہے نہ میں نے راشٹرز گلڈ کے انعامی مقابلے میں کبھی اپنا ناول بھیجا ہے کیونکہ میں شہرت کے لیے فکر سلام کرنے والا ادیب نہیں، نہ میں اسلام آباد کی اہل قلم کانفرنس کے مدعوین میں سے ہوں۔

اُندلس کے آخری دور کے ادیبوں اور مدح سرا شاعروں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے سلطنت خداداد اُندلس کا بوریا بستر دائی سے گول کیا تھا میرے سامنے ایک مشن ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک فرض سونپا ہے۔ مجھے اس مشن اور اس فرض کی تکمیل عزیز ہے۔

ناول کے عنوان کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔ ہم نے اس ناول کا عنوان تجویز کرنے کے لیے قارئین کو دعوت دی تھی کیونکہ یہ ناول قارئین کی فرمائش پر ہی لکھا گیا تھا۔ ہمیں بارہ ہزار چار سو ترپن عنوان ملے تھے۔ ان میں سے کوئی عنوان ناول کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ آخری قسط کے ساتھ عنوان لازمی تھا ہم نے عنوان کے لیے ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا جو قارئین کو بہر صورت پیش کرنا چاہتے تھے مگر قارئین کی طرف سے کوئی موزوں عنوان مل نہیں رہا تھا۔ اس مسئلے کو ہم نے یوں حل کیا:

کمیٹی نے ایک عنوان چن کر سربمہر کر لیا جو ناول کے مصنف تک کو نہ بتایا گیا کمیٹی نے قارئین کو موقع دینے کے لیے ہم سے اعلان کرایا کہ ناول کا عنوان آخری قسط میں موجود ہے۔ یہ بڑا ہی واضح اشارہ تھا۔ عنوان موصول ہونے لگے جو ہم دیکھے بغیر کمیٹی کے بکس میں ڈالتے رہے۔

۱۰ نومبر ۱۹۸۴ء شام سات بجے کمیٹی نے "حکایت" کے دفتر میں سربمہر عنوان لفافے سے نکالا۔ یہ تھا "خاکی وردی لال لہو" کل عنوان جو موصول ہوئے۔ ان کی تعداد چھبیس ہزار تین سو پندرہ تھی۔ ہم نے قارئین کو یہ رعایت دی تھی کہ ہر قاری ایک سے زیادہ عنوان بھیج سکتا ہے۔ ایک صاحب نے ایک سو ایک عنوان بھیجے۔ تیس سے چالیس تک تو کئی قارئین نے بھیجے تھے۔

ان میں سے کمیٹی نے ستائیس عنوان انتخاب میں شامل کیے جن میں سے چھبیس بالکل صحیح نکلے اور انہیں انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ہم نے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان کیا تھا۔ اس رقم کو چھبیس خواتین و حضرات میں تقسیم کریں تو بہت تھوڑی رقم ہر ایک کے حصے میں آتی تھی۔ ہم نے انعامی رقم ایک ہزار سے بڑھا کر دو ہزار چھ سو روپے کر دی تاکہ منتخب عنوان بھیجنے والے ہر قاری کو ہم ایک سو روپیہ پیش کر سکیں جو ہم نے پیش کر دیا۔

انعام پانے والوں کے نام

امان اللہ خٹک سردار پٹھان محلہ لقمان ضلع خیرپور

۲۔ چوہدری محمد ادریس ڈسپنسر۔ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال بھکر

۳۔ مطیع الحق۔ کوارٹر نمبر ۱۸۔ جی ۹/۱۱۷۔ پی او ایف واہ کینٹ

۴۔ رقیہ سلطان [illegible] خیبر کالونی پشاور

۵۔ محمد اسلم کمبوہ۔ رسل نمبر ۱۔ ای ۳۹۸۱۶ پی او ایف گدوال ضلع راولپنڈی

۶۔ ڈاکٹر غلام دستگیر۔ مسجد توحید خیٹی پایان تحصیل و شہرہ۔ ضلع پشاور

۷۔ [illegible] اولڈ ٹائر سروس۔ مردان چھاؤنی

۸۔ محمد سرفراز صدیقی ولد نائب صوبیدار دیوان علی۔ سوکھنوڈ تحصیل پسرور۔ ضلع سیالکوٹ

۹۔ اعجاز احمد۔ مکان نمبر ۳۴۳ محلہ کچہری مسجد۔ مانسہرہ

۱۰۔ محمد اجمل۔ پریپ سکول۔ گھوڑا گلی کالج مری

۱۱۔ محمد یونس۔ نائس ٹیچر۔ سوات جانا کھے پراجیکٹ بیگوڑہ۔ سوات

۱۲۔ محمد آصف۔ مکان نمبر ۱ ساہوا ڑی۔ گھنٹہ گھر۔ شالامار لنک روڈ لاہور

۱۳۔ محمد قیام الحق۔ اے۔ ۱۱ فور اپارٹمنٹ بیکڑ آ۔ ۱۱ کراچی

۱۴۔ لطیف چوہدری۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۳۔ مدینہ منورہ۔ سعودی عرب

۱۵۔ عبدالکریم۔ ۱۱۔ جی۔ ۱۲۷ مانڈل ٹاؤن۔ لاہور۔ ۱۴

۱۶۔ سہیل رضوان معرفت عبدالغفور۔ دفتر آئی۔ او۔ ڈویژن پاکستان ریلوے۔ سیالکوٹ

۱۷۔ اورنگ زیب قریشی فورمین۔ شادمان کاٹن ملز۔ ای۔ ۱۰ کوٹری۔ ضلع دادو

۱۸۔ جویریہ سلیم معرفت ایس۔ ایم سلیم۔ طارق آوس سٹریٹ نمبر ۲۔ محلہ اسلام آباد۔ گوجرانوالہ

www.iqbalmt@ohe.com Scanned by iqbalmt@ohe.com

۱۹- TASAWAR IQBAL 133-ABERCROMBY AVENUE HIGH WYCOMBE BUCK'S U.K

۲۰- چوہدری ذوالفقار علی۔ کوٹھ کلاں۔ مورگاہ۔ راولپنڈی

۲۱- محمد جہانگیر خان قادری۔ سعید میڈیکل سٹور۔ بیرون لوہاری گیٹ۔ لاہور

۲۲- شبیر عالم شیخ ایڈووکیٹ۔ ۲۵۔ ڈسٹرکٹ کورٹس۔ فیصل آباد

۲۳- عبدالغفار کمپنی۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۱۱۶۔ ریاض۔ سعودی عرب

۲۴- علی اصغر۔ کول کمیشن ایجنٹ۔ کچھ بولان۔ بلوچستان

۲۵ انجم شیخ۔ مکان نمبر ۵۸۲/۲ شاہ فیصل کالونی۔ کراچی۔ ۲۵

۲۶ سید امجد علی شاہ۔ ۵۰۶ شالامار ٹاؤن۔ سلطان محمود روڈ۔ لاہور ۹

تمام خواتین و حضرات کو ناول کی ایک ایک کاپی اعزازی طور پر پیش کی گئی ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

راولپنڈی سے لاہور جانے والی ریل گاڑی جب اُن پہاڑیوں میں داخل ہوتی جو جہلم اور راولپنڈی کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں تو دن کی روشنی کو اندھیرے نے نگل لیا۔ ریل گاڑی کا شور اور زیادہ بڑھ گیا۔ پہیوں کی ٹھک، ٹھکا ٹھک اور زیادہ بلند ہو گئی۔ اس شور میں عتاب سا تھا جیسے ریل گاڑی اندھیرے کو چیر کر اُجالے میں چلی جانے کی کوشش کر رہی ہو۔

ریل گاڑی اندھیرے سے نکل گئی۔ اس کے ڈبے پھر روشن ہو گئے۔ اب کے انجن کی چھک چھکا چھک لوں سنائی دی جیسے کالا سیاہ انجن اندھیرے پر قہقہے لگا رہا ہو۔

اندھیرے نے اُجالے پر ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ اب کے اُس نے پوری گاڑی کو نگل لیا۔ انجن کی آواز اور زیادہ گرجدار ہو گئی اور اُس کا اکلا ہوا دھواں ڈبے کے اندر آنے لگا۔

"امی جان! دیکھنا، اب پھر روشنی ہو جائے گی.... ابھی آئی.... ابھی آئی.... یہ آ گئی۔"

معصوم سی آواز نے طاہرہ کو چونکا دیا۔ اُسے دھچکا سا لگا لیکن اپنے ساتھ لگے بیٹھے بچے کو ہنستا دیکھ کر اُس کی بھی ہنسی نکل گئی۔ چھ سال کی عمر کا بچہ گھٹنا اور سیٹ پر گھٹنے ٹیک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ہاں طاہرہ!" — طاہرہ نے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے زیرِ لب کہا — "ہر اندھیرے کے بطن سے روشنی جنم لیا کرتی ہے" — وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی — "اندھیرے روشنیوں کو ڈھونڈنے کے لیے لپکتے جھپٹتے ہی رہتے ہیں لیکن روشنی کی نحیف سی کرن گھپ اندھیروں کا جگر چاک کر دیا کرتی ہے۔"

"بچہ ماشاء اللہ ذہین معلوم ہوتا ہے" — ریل گاڑی کے شور میں سے ایک سنجیدہ سی نسوانی آواز طاہرہ کے کان میں پڑی۔ اُس نے اُدھر دیکھا۔ ایک اُدھیڑ عمر معزز سی عورت اُسے کہہ رہی تھی — "تمہارا بھائی ہے یا بیٹا؟"

سناٹا سا ہوا ایک تیر طاہرہ کے سینے سے پار ہو گیا۔ اُس کے ساتھ سفر کرتا ہوا بچہ اُس کا بھائی نہیں تھا۔ وہ اُس کا بیٹا بھی نہیں تھا۔ وہ اُس کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا۔ طاہرہ نے سینے میں بہت تیر کھائے تھے۔ اُس نے ہر تیر اپنے دل و جگر میں جذب کر لیا تھا۔ اس تیر کو بھی اس نے اپنے سینے میں چھپا لیا۔ بازو لمبا کر کے اُس نے بچے کو بازو کے گھیرے میں لیا اور اپنی گود میں گرا کر اُس کی پیشانی چومی۔

"یہ میرا بیٹا ہے" — طاہرہ نے کہا — "طاہر... طاہر پرویز۔"

اس کے بعد طاہرہ نے توجہ نہ دی کہ اُس کی یا اُدھیڑ عمر مسافر کیا کہہ رہی ہے اور کیا پوچھ رہی ہے۔ وہ طاہر پرویز میں کھو گئی تھی۔ بچہ اُس کی گود میں چت لیٹا ہوا تھا اور طاہرہ اس کے نرم اور ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ بچے کے معصوم چہرے میں طاہرہ کو کئی چہرے نظر آنے لگے۔ نایاں چہرے

iqbalmt@oneurdu.com Scanned by

ارشاد اور عفت کے سگے۔ بچے کے خدوخال میں ارشاد اور عفت نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

بچے کے چہرے پر طاہرہ کو اپنی داستان لکھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اُسے اس داستان کے تمام کردار اس معصوم چہرے میں دکھائی دیئے۔ ان سب نے اس کی زندگی کی ریل گاڑی کو تاریکی میں دھکیل دیا تھا۔ ابھی ابھی ریل گاڑی پہاڑی علاقے سے گزرتے ہوئے جن دو تاریک سرنگوں میں داخل ہوئی تھی، وہ زیادہ لمبی نہیں تھیں۔ گاڑی چند سیکنڈ میں دونوں میں سے گزر آئی تھی مگر طاہرہ کی زندگی کی ریل گاڑی جس سرنگ میں داخل کر دی گئی تھی، وہ بڑی ہی لمبی تھی۔ اس میں سے نکلتے اُسے سات سال لگے تھے۔

"کیا تاریک سُرنگ ختم ہو گئی ہے؟" — یہ سوال اُسے پریشان کرنے لگا۔

"امّی جان! دیکھنا، اب پھر روشنی ہو جائے گی" — بچے کے الفاظ اُس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

"میں تھک گئی ہوں" — اُس نے اپنے آپ سے کہا — "اُف میرے خدا! میں تھک گئی ہوں۔"

"بھول جاؤ" — اُسے ایک اور آواز سنائی دی جو اُس کی اپنی ہی تھی — "دن جو گزر گئے ہیں، انہیں ذہن سے اُتار دو۔ ماضی کی زنجیریں توڑ دو۔ اُگل دو اُن یادوں کو۔"

ہو نہیں سکتا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ماضی آسیب کی طرح حال اور مستقبل پر سوار رہتا ہے اور جس کا سارا ماضی آسیب زدہ ہو وہ ایک مسلسل خوف کی زندگی بسر کرتا ہے۔ طاہرہ کے اعصاب پتھر تھے مگر قلعوں کی دیواریں بھی ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔ طاہرہ کے اعصاب میں ابھی کچھ توانائی تھا مگر کوئی ہلکا سا اشارہ یا اپنے ہی ذہن سے اٹھا ہوا ایک جھونکا اُسے دور پیچھے لے جاتا تھا اور اُسے وہ سب کچھ یاد آ جاتا تھا جو وہ بھول جانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اب جب کہ وہ سات سال بعد لاہور جا رہی تھی اور ارشد نے اُسے کہا تھا کہ اُس کی زندگی کی تلخیاں اور تاریکیاں ختم ہو چکی ہیں تو بھی ماضی اُس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔

لاہور کو جاتی ہوئی ریل گاڑی جب سرنگ کی تاریکی میں سے گزری تو طاہرہ کو اٹک سے آگے کی وہ سرنگیں یاد آ گئیں جن میں سے گزر کر وہ اپنے سسرال گئی تھی اور ابھی اُس کی دلہن کی مہندی کا رنگ بھی نہیں گیا تھا کہ وہ بیوہ ہو کر انہی سرنگوں میں سے گزری اور راولپنڈی آ گئی۔ اُسے اپنی تلخ ازدواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ یاد آیا۔ اپنا خاوند نعیم اور اُس کا بھولپن یاد آیا۔ اُسے اپنا سسر یاد آیا جو خونخوار تو نہیں تھا مگر اُس کی ساس عورت کے روپ میں ڈائن تھی۔

"کیا کوئی ماں تسلیم کرے گی کہ وہ اپنے بیٹے کو کھا گئی ہے؟" — طاہرہ کو خیال آیا — "اپنی ہتھو کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی ساس نہیں سوچتی کہ وہ اپنے بیٹے کی ازدواجی مسرتوں میں زہر گھول رہی ہے اور ایک دن یہ میٹھا زہر اُس کے بیٹے کی جان لے لے گا۔"

طاہرہ کی ازدواجی مسرتوں کو اور اُس کے خاوند کو ایسی ہی ایک سانس نے ڈس لیا تھا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب اُس کے خاوند کا، اُس کے سہاگ اور اُس کے ارمانوں کا جنازہ نکلا تھا۔ طاہرہ اس بھیانک یاد سے لرز اٹھی۔ اُس پر خوف طاری ہو گیا۔ اُس نے دیکھا، طاہر پرویز اُس کی گود سے اُٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا بیٹھا تھا۔ طاہرہ نے لپک کر بچے کے گرد بازو لپیٹا اور اُسے پھر گود میں لٹا لیا، اور اب کے اُس نے بچے کو اس طرح گود میں گرا کر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا جیسے اُس کی ساس جیسی کوئی عورت بچے کی مسرتوں میں زہر گھولنے کے لیے دبے پاؤں بڑھی چلی آ رہی ہو۔

"نہیں... نہیں" — طاہرہ اپنے آپ میں کانپنے لگی — "ایسے نہیں ہو گا۔ اس بچے کی مسرتوں پر میں اپنی خوشیاں قربان کر دوں گی۔"

طاہرہ کے اپنے ماتھے پر بے خیالی سی میں یوں ہاتھ پھیرا جیسے ذہن کے کواڑ بند کر دیئے ہوں کہ اب ماضی کی کوئی یاد ذہن میں نہ آئے۔ پاتے سنگر ریل گاڑی اُسے جس ماحول میں سے گزار رہی تھی، وہ اُسے گھسیٹ گھسیٹ کر ماضی کی طرف لے جا رہا تھا اور دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ریل گاڑی کے پہیوں کی ٹھک، ٹھکا ٹھک اور زیادہ بلند ہو جاتی تھی جیسے گزرے ہوئے دن طاہرہ کے ذہن کے بند کواڑوں کو بڑی زور زور سے کھٹکھٹا رہے ہوں۔

ذہن کے کواڑ بڑے کمزور ہوتے ہیں۔ انہیں لاشعور کی دیمک کھاتی رہتی ہے۔ ہوا کے جھٹکے سے جھونکے سے کھل جاتے ہیں۔ کوئی ان پر آہستہ سے ہاتھ رکھے، پیار سے چاہے غصّے سے ذہن کے کواڑ کھل جاتے ہیں اور اس میں یادوں کے جھکڑ داخل ہونے لگتے ہیں۔

طاہرہ نے باہر دیکھا۔ ریل گاڑی پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی اور دوسری طرف اُفق تک اونچی نیچی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ طاہرہ کو یوں لگا جیسے ریل گاڑی اٹک کا پل پار کر کے سرحد کی سرحدوں میں داخل ہو گئی ہو اور وہ نعیم کے ساتھ پشاور اپنے سسرال جا رہی ہو۔ وہ لمحے بہت خوبصورت تھے۔ وہ طاہرہ کے ذہن میں رنگ برنگی چڑیوں کی طرح چہچہانے اور پھدکنے لگے۔ طاہرہ دلہن تھی، آسمانی سنہری ساڑھی میں ملبوس۔ اُسے ماں کا پیار دے کر رخصت کیا تھا اور نعیم اُسے یوں اپنے ساتھ پشاور لے جا رہا تھا جیسے سونے کا سنہرا سپنا اپنی سیمٹ کر لے جا رہا ہو۔

خواب ہوا میں گھولے ہوئے صابن کے بلبلے ہوتے ہیں۔ بچہ نلکی میں سے پھونک مارتا ہے تو بلبلے کئی رنگ دکھا کر اور ذرا سا اُڑ کر پھٹ جاتے ہیں۔ نعیم اور طاہرہ کے خواب بھی یوں کھلے مرجھا جاتے تھے جیسے بلبلے اور صابن کے بلبلوں کی طرح رنگ دکھا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر طاہرہ کی زندگی کی ریل گاڑی ایسی ہی پہاڑیوں میں سے گزر کر واپس وہیں آ گئی تھی جہاں سے وہ طاہرہ کو گود میں اُٹھا کے لے گئی تھی۔

"امّی!" — اُسے طاہر پرویز کی پیاری سی آواز سنائی دی — "امّی جان! لاہور میں ابّو مجھے جس کی قبر پر لے جایا کرتے ہیں وہ کون تھی؟..... وہ میری امّی آپ ہیں نا!..... ہیں امّی جان!"

طاہرہ کے ہونٹوں پر بہت بڑا جھوٹ آ گیا — "ہاں طاہری! میں ہی تمہاری امّی ہوں" — مگر اُس کا دل ڈوب گیا اور اُس پر رقت طاری ہو گئی۔ اُس نے بڑی مشکل سے آنسو روکے۔ اُسے آنسو روکنے میں مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

"بولو نا امّی جان!" — طاہر پرویز نے پھر پوچھا — "میری امّی آپ ہی ہیں نا!"

"ہاں طاہری!" — طاہرہ نے بچے کا منہ چوم کر جھوٹ بول ہی دیا — "میں نہیں تو اور کون ہے تمہاری امّی!"

"پھر وہ کون تھی جس کی قبر پر ابّو مجھے لے جایا کرتے ہیں؟"

"وہ..... وہ....." طاہرہ نے ذرا جھجک کر دوسرا جھوٹ بھی بول دیا — "وہ میری بہن تھی۔ تمہاری

iqbalmt@gmail.com scanned by

ساتھ بہت پیار کیا کرتی تھی۔ تم ابھی بہت چھوٹے تھے تو وہ مر گئی تھی۔"

ریل گاڑی پہاڑی علاقے میں سے نکل گئی تھی اور طاہرہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے ریل گاڑی کبھی دائیں، کبھی بائیں مڑ رہی ہو۔ طاہرہ کا ذہن ڈول رہا تھا۔ ایک اس لیے کہ اُسے عفت یاد آ گئی تھی؛ دوسرے یہ سوال اُسے پریشان کر رہا تھا کہ ارشد نے پیچھے سے کب تک اس حقیقت کو چھپایا جا سکے گا کہ اُس کی ماں عفت تھی اور وہ اپنی زندگی اُسے دے کر مر گئی تھی ـــــ طاہر پرویز کی پیدائش عفت کی موت ثابت ہوئی تھی ـــــ وہ اپنے بچے کو دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔

عفت یاد آئی تو طاہرہ کے وہ آنسو جو باہر نکلے جو اُس نے بڑی مشکل سے روک رکھے تھے، اُس نے بڑی جلدی سے آنسو دوپٹے میں جذب کر لیے اور بچے کی طرف دیکھا۔ اُسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ بچہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے طاہرہ کے آنسو نہ دیکھے لیکن اُن عورتوں نے آنسو دیکھ لیے جو اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔

"کیوں؟" ـــــ ادھیڑ عمر معزز عورت نے طاہرہ سے پوچھا ـــــ "کیا بات ہے؟"

"اپنی بہن یاد آ گئی تھی۔" ـــــ طاہرہ نے اُداس سی مسکراہٹ سے کہا ـــــ "مر گئی ہے۔ میرے بچے کے ساتھ بہت پیار کیا کرتی تھی۔"

طاہرہ پھر خیالوں میں کھو گئی۔ اُس نے عفت کے لیے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ عفت اُس کی سگی بہن تھی جس کی روح میں طاہرہ اُتر گئی تھی اور جو طاہرہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا مگر طاہرہ نے عفت کی شادی اِس آدمی کے ساتھ کرا دی تھی۔ اس شادی کی نشانی طاہر پرویز تھا مگر عفت اپنے بچے کو اپنا بچہ ہی نہیں ایک ایسی کہانی بھی چھوڑ گئی تھی جس میں تخیل اور غلط فہمیاں تھیں اور جو پاکستانی معاشرے کا ایک المیہ تھا، اور یہ المیہ جس نے طاہرہ کی بہت بڑی قربانی سے جنم لیا تھا، طاہرہ کو حال میں لے گیا تھا۔

"بھول جاؤ۔" ـــــ اُسے پھر اپنی آواز سنائی دی۔ "بھول جاؤ اُن دنوں کو جو ماضی کے قبرستان میں دفن ہو گئے ہیں۔ آگے دیکھو۔ مستقبل کو ماضی کے آسیب سے بچاؤ۔"

ناممکن! ـــــ اُس کا باپ جو ماضی کے قبرستان میں دفن ہو چکا تھا اور جس کی اُس نے صورت بھی نہیں دیکھی تھی، اور جس کے متعلق یقین سے کہا جاتا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور جنگ میں مارا گیا تھا، چند دن پہلے طاہرہ کے سامنے آ گیا تھا۔ باپ بیتی ستائیس اٹھائیس سال بعد ملے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں تھے مگر خون نے اپنے خون کو پہچان لیا ـــــ بھولا بسرا ماضی طاہرہ اور اُس کے باپ کے سامنے آ گیا۔

اور طاہرہ نے اپنی ماں کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پیدا ہوئی اور اُس کی عمر ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوئی تھی کہ اُس کے باپ نے اُس کی نانی سے کہا کہ وہ بچی کو اٹھا لے جائے کیونکہ وہ لڑکی کا باپ نہیں کہلانا چاہتا۔ نانی نے اُسے کوئی سخت بات کہہ دی۔ طاہرہ کا باپ اُس کی نانی کو مارنے کے لیے دوڑا تو طاہرہ کی ماں جس کی زچگی کا ابھی نصف گھنٹہ بھی پورا نہیں ہوا تھا، اٹھ کر اپنی ماں اور خاوند کے درمیان آ گئی مگر نقاہت سے گر پڑی۔ خاوند اُس سے ٹھوکر کھا کر اُس کے اوپر اس طرح گرا کہ اُس کے گھٹنے طاہرہ کی ماں کے پیٹ پر آ گئے۔ زچگی کی ماری ہوئی عورت برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ طاہرہ کا باپ گھر سے بھاگ گیا۔

طاہرہ کو نانی اٹھا کر لے آئی اور وہ جوان ہو گئی تو بھی نانی نے اُسے نہ بتایا کہ اُس کی ماں مر گئی تھی۔ وہ خود اُس کی ماں بنی رہی مگر اُس کی ماں ماضی کی تاریکیوں میں چھپی نہ رہ سکی۔ ایک تصویر سب کے پردے چاک کر دیتی لیکن اُس وقت طاہرہ کی نانی ۱۹۴۷ء کی ہجرت میں شہید ہو چکی تھی۔

طاہرہ نے ریل گاڑی میں لاہور کو جاتے ہوئے کئی بار سر کو جھٹکا دیا اور اپنے آپ کو بار بار تلقین کی کہ وہ ماضی کو بھول جائے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا دل ڈول ہوتا جا رہا تھا۔ صرف ایک امید تھی جو ملال کو مسرت میں بدل رہی تھی مگر امید کی یہ کرن مدھم پڑ جاتی تھی۔ اُس کی زندگی کی ریل گاڑی ایک اندھیری سرنگ سے نکلتی تھی تو سامنے ایک اور سرنگ منہ کھولے کھڑی ہوتی تھی۔ اب حالات نے ایسی غیر متوقع کروٹ بدلی تھی کہ اُسے اپنے سامنے اجالا نظر آنے لگا تھا۔

چھ سات دن ہی گزرے تھے کہ اُسے اپنا وہ باپ مل گیا تھا جسے وہ سمجھتی تھی کہ کبھی کا مر چکا ہے۔ یہ ڈرامائی بلکہ معجزانہ ملاقات تھی۔ باپ نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اُس کی ماں کا قاتل ہے۔ پھر ارشد اور اُس کے بیٹے طاہر پرویز سے اس کی ملاقات بھی ڈرامائی اور غیر متوقع تھی۔ ارشد نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنا بچہ طاہرہ کے سوا کسی عورت کو نہیں دے گا۔ بچے کی ماں عفت نے وصیت بھی کی تھی کہ وہ زندہ نہ رہی تو طاہرہ کو دودھ شریک اور بچہ اُسی کو دینا۔ وہی اُس کے بچے کی ماں ہو گی۔

☆

ریل گاڑی سرنگ میں داخل ہو گئی تھی۔ طاہرہ نے تھوڑی سی عمر میں بہت سے رنگ دیکھ لیے تھے۔ اب اُس کی زندگی کی ریل گاڑی سرنگ سے نکل آئی تھی۔ اُس کے سامنے اور دائیں بائیں سبز پوش پہاڑیاں اور وادیاں تھیں۔ خوشگوار ماحول سونر تھا مگر طاہرہ کو زندگی نے جو چوٹیں لگائی تھیں، ان کی ٹیسیں ابھی تھمی نہیں تھیں۔ یہ ٹیسیں اور تلخ ماضی کے تجربات اُسے ڈرا رہے تھے ـــــ انسانوں سے، آنے والے وقت سے اور خود اپنے آپ سے۔ کبھی کبھی دل سے اُمنڈ آتی تھی کہ وہ اگلے سٹیشن پر اُتر جائے اور لاہور سے آنے والی گاڑی سے راولپنڈی واپس راولپنڈی چلی جائے ـــــ مگر وہ ایک قیدی کی طرح جا رہی تھی۔ ارشد اور اُس کے بچے طاہر پرویز کی محبت نے اُسے پابجولاں کر لیا تھا۔ ان زنجیروں کو وہ توڑ نہیں سکتی تھی۔

اس کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، خون کا کوئی رشتہ زندہ نہ تھا۔ اب اُسے باپ مل گیا تھا لیکن باپ کو وہ سہارا یا اپنا پن نہیں سمجھتی تھی۔ یہ تو ایک ذمہ داری تھی جو اُس پر آ پڑی تھی۔ وہ خود اپنی ایک اُستانی تجمل کے گھر رہتی تھی۔ تجمل کا نہ وہ مرد تھا، نہ بچے تھے۔ سب طاہرہ کو اپنے کنبے کا فرد سمجھتے تھے، پھر بھی طاہرہ کے ساتھ ان کا خون کا تو کوئی رشتہ نہ تھا ـــــ اسے اب باپ مل گیا تو یہ مسئلہ سامنے آ گیا کہ باپ بیٹی اکٹھے ہیں تو گزارہ کیسے ہو گا اور اس کے ساتھ عفت کا بچہ بھی آ گیا۔

رشتہ کا تبادلہ لاہور سے راولپنڈی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بچے سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے راولپنڈی جاتے ہی کرائے کا مکان لے لیا اور بچے کو ساتھ لے آیا۔ بچے کو اُس نے اُس سکول میں داخل کرا دیا جہاں طاہرہ استانی تھی۔ یہ تو خدا نے ارشد اور طاہرہ کی ملاقات کا ایک سبب بنانا تھا۔ ارشد کی ماں اس کے ساتھ راولپنڈی جانا چاہتی تھی مگر ارشد اُسے ساتھ نہ لے گیا۔ اپنے گھر میں وہ کچھ کھچا کھچا رہتا تھا۔ کھچاؤ کی وجہ یہ تھی کہ اُسے ماں، باپ، بھابی اور بڑا بھائی دوسری شادی کے لیے کہتے رہتے

iqbalmt@gmail.com scanned by

تھے۔ انہوں نے اس کے لیے ایک سے ایک اچھی لڑکی تلاش کی مگر ارشد اس ایک رٹ اور عزم سے نہ ہٹا کہ وہ طاہرہ کو ڈھونڈے گا اور اُسی کے ساتھ شادی کرے گا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شادی کرنے گا ہی نہیں۔ عفت کو مرے چھ سال گزر گئے تھے۔ ارشد کی زبان پر دو ہی نام ہوتے تھے — طاہر پرویز جسے وہ طاہری کہتا تھا اور طاہرہ — ارشد کی ماں بیٹے کے غم میں بڑی تیزی سے بوڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ طاہرہ جس طرح گھر سے نکل گئی تھی۔ اس سے ان لوگوں کی یہ امید ختم ہو گئی تھی کہ وہ واپس آ جائے گی۔

ارشد کے لیے طاہرہ ایک واہمہ اور الیا تصور بن گئی تھی جسے وہ ٹھوس اور مجسم سمجھنے لگا تھا۔ تنہائی میں اس کے ساتھ وہ باتیں کرتا تھا۔ اس کی ماں اور بھابی نے کئی بار راتوں کو اس کے کمرے کے قریب سے گزرتے اُس کی بلند سرگوشیاں سنی تھیں — "طاہرہ! آجاؤ.... مجھے آواز دو طاہرہ! میں آجاؤں گا؟" — وہ محبت کے اُس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے دیوانگی کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے — جنونی کیفیت جو انسان کا حقیقت سے رشتہ توڑ دیتی ہے۔

ارشد نے اپنے ماں باپ، بھائی، بھابی اور اُن کے بچوں سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ وہ اُن کے درمیان موجود ہوتے ہوئے غیر حاضر ہوتا تھا۔ اُس کا رشتہ قائم تھا تو اپنے بیٹے طاہر سے اور طاہرہ کے تصور کے ساتھ۔ اس کیفیت میں اُس کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا تو اُسے خوشی ہوئی کہ وہ اس جگہ جا رہا ہے جسے لاہور کے لوگ "آشا بھون" کے نام سے جانتے پہچانتے تھے۔ وہ جا رہا ہے۔ طاہرہ کی کوٹھی سے بھاگی تھی۔ طاہرہ نے اسی کوٹھی میں ارشد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ عفت کے ساتھ شادی کرے۔ اسی کوٹھی میں عفت نے اُس کی زندگی ہمیشہ کے لیے برباد کر دی تھی۔ پھر ایک بچہ ارشد کی گود میں ڈال کر اور یہ وصیت کر کے سارا بچہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا، مر گئی تھی۔ اس کوٹھی میں طاہرہ کی آتی جاتی غیر مرئی (نادیدہ) اُس کی رسوائی کا باعث بن گئی تھی۔

یہ کوٹھی ارشد کے لیے آسیب زدہ ہو گئی تھی۔ اس کے برآمدوں اور کمروں میں آسیب عفت کی سسکیاں اور طاہرہ کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی رہتی تھی۔ چاندنی میں اُس نے طاہرہ کو ان جگہوں پر ٹہلتے اور فضا میں تحلیل ہوتے دیکھا تھا۔ اُسے ایسی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو وہ نہیں سننا چاہتا تھا:

"ابو! امی کب آئے گی؟"

"ارشد بیٹا! طاہرہ نہیں آئے گی۔ عفت سچی ہے۔"

"بیٹا! اپنی جوانی پر رحم کرو۔"

لوگ باتیں بنا رہے ہیں ارشد بیٹا! کہتے ہیں جانے اس خاندان میں کیا خرابی ہے کہ ان کے جوان بیٹے کو کوئی رشتہ نہیں دیتا۔"

"لوگ کہتے ہیں امرتسر کے ان مہاجروں کو کون رشتہ دے گا؟"

"ارشد بھائی! مان جاؤ۔"

یہ الفاظ ارشد کے گرد بھیڑوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔ اب تو دیواروں سے بھی یہی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"مجھے بھول جاؤ — ارشد نے کئی بار جھنجھلا کر کہا تھا — "خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو مجھ پر احسان

کرنا کہ میرے بچے کو نہ بتانا کہ اس کی ماں مر گئی ہے میں اسے بتاؤں گا کہ طاہرہ اس کی امی ہے اور طاہرہ آجائے گی۔"

اب ارشد کا تبادلہ لاہور سے راولپنڈی ہو گیا تو اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُسے "آشا بھون" سے رہائی ملی۔ سب نے اُسے کہا کہ وہ بچے کو ساتھ نہ لے جائے مگر وہ نہ مانا۔ وہ تو بچے کو اپنے پاس سُلایا کرتا تھا۔ باپ بیٹا صرف دفتر اور سکول کے وقت جدا ہوتے تھے، اور بچہ ارشد کے جسم کا ایسا حصہ بنا رہتا جو کاٹا نہ جا سکتا تھا۔

ماں نے ارشد سے کہا کہ بچے کی خاطر وہ اس کے ساتھ جائے گی۔ ارشد یہ بھی نہ مانا۔ وہ "آشا بھون" میں رہنے والے کسی بھی فرد کو اپنے ساتھ نہ رکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اس کوٹھی کے آسیب کو اپنے ساتھ لے جانے سے ڈرتا تھا۔ ماں کی بجائے وہ نوردین کو ساتھ لے گیا۔ نوردین صرف نوکر نہیں اس گھر کا فرد بھی تھا۔ وہ امرتسر کے قصبے جلال آباد میں طاہرہ کی نانی خاتون کا مزارعہ تھا۔ اُسے طاہرہ سے بہت پیار تھا۔ ہجرت میں نوردین طاہرہ کے ساتھ آیا تھا۔ لاہور آ کر ارشد کے بانکپن کی یہ ستر بھر کو بھی "آشا بھون" الاٹ کرائی تو ارشد نے طاہرہ اور عفت کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ان دونوں کا ہی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ طاہرہ نوردین کو بھی ساتھ ہی لے آئی تھی اور اُسے "آشا بھون" میں آباد کر لیا تھا۔

"آشا بھون" سے طاہرہ چلی گئی تو نوردین کو یہ کوٹھی کھنڈر کی طرح نظر آنے لگی تھی۔ وہ دن رات طاہرہ کی واپسی کی دعائیں کرتا رہتا تھا۔ اُس نے بارہا چاہا کہ کہیں چلا جائے یا اُسے پتہ چل جائے کہ طاہرہ کہاں ہے تو وہاں چلا جائے مگر آن پڑھ اور تنہا آدمی کہاں جاتا۔ طاہر پرویز پیدا ہوا تو اُسے اس بچے سے اتنا پیار ہو گیا کہ وہ یہیں کا ہو کے رہ گیا۔ بچے کے ساتھ راولپنڈی میں نوردین کو ہی ہونا چاہیے تھا۔ ارشد اس کو لے گیا۔ وہ کھانا پکانا بھی جانتا تھا۔

☆

سات سال بعد جب ارشد اور عفت کا طاہری چھ سال کا ہو چکا تھا، ارشد کو طاہرہ اور طاہری کی آتی جاتی لگی۔ ارشد نے جذبات اور مسرت کے جوش سے طاہرہ کے باپ سے کہا تھا — "یہ اب طاہرہ نہیں، مسز ارشد ہے" — تو طاہرہ ہنس پڑی تھی مگر بچہ کے گھر جا کر طاہرہ پر بچہ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

بچہ اور ارشد کی ملاقات بھی خواب کی ملاقات لگتی تھی۔ بچہ کو معلوم تھا کہ آج طاہرہ دیر سے گھر آئے گی۔ طاہرہ نے اُسے صبح ہی بتا دیا تھا کہ وہ چھٹی کے بعد جوزی بابا کے گھر چلی جائے گی۔ سلیقے سے تراشی ہوئی سپید داڑھی اور سپید سر والا جوزی بابا سکول کے چھوٹے سے چھوٹے بچے سے لے کر ہیڈ مسٹریس تک کا باپ سمجھا جاتا تھا۔ طاہرہ کے ساتھ تو اُسے سب سے زیادہ اُنس تھا اور طاہرہ اُس کی مُربّی ہوتی تھی۔ جوزی بابا سکول کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ طاہرہ کے وہاں اکیلے جانے پر بچہ کو اعتراض نہیں تھا۔

دن کے پچھلے پہر طاہرہ آ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔

"آپا؟" — طاہرہ نے بچہ سے کہا — "آپ نے جاگتے ہوئے کبھی خواب دیکھا ہے؟"

طاہرہ کے مزاج میں شگفتگی تھی۔ بچہ سمجھی کہ طاہرہ اس وقت ہلکے پھلکے موڈ میں ہے۔ بچہ ہنس پڑی اور بولی — "آج معلوم ہوتا ہے جوزی بابا نے کوئی نیا خواب دکھایا ہے؟"

iqbalmt@yahoo.com scanned by

"نہیں آپا!" — طاہرہ نے کہا — "جزی بابا ایک خواب تھا آج وہ اپنی تعبیر خود ہی بن گیا ہے"
— اور طاہرہ کا مسکراتا ہوا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا کہہ رہی ہو طاہرہ؟" — نجمہ نے پوچھا — "کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟"

"خاص نہیں، غیر معمولی" — طاہرہ نے کہا — "غیر متوقع..... جزی بابا جمال بیگ ہے... میرا باپ... کہانی بعد میں سناؤں گی۔ اٹھو اور میرے ساتھ دروازے تک چلو۔ آپ خود ہی کچھ اٹھیں گی کہ آپ بیداری میں خواب دیکھ رہی ہیں۔"

نجمہ اُس کے ساتھ دروازے تک گئی۔ دروازہ کھولا تو حیرت سے اُس کا منہ کھل گیا اور آنکھیں پھٹ گئیں۔ جزی بابا کو تو وہ ہر روز دیکھتی تھی۔ وہ اسی سکول میں اُستانی تھی۔ وہ ارشد اور طاہر پرویز کو دیکھ کر حیران ہوتی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت کہ ارشد آگے کو لپکا اور نجمہ سے بغلگیر ہو گیا۔

نجمہ کے آنسو پھر نکلے۔ ان آنسوؤں کا باعث عفت کی موت بھی تھی لیکن ارشد اور طاہرہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وجہ کچھ اور بھی ہے۔ نجمہ کا ایک ہی بھائی تھا۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور میں انگریزوں کے پروردہ خضر حیات ٹوانہ کی وزارت کے خلاف ایک مظاہرے میں پولیس کی گولی سے شہید ہو گیا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ اُن دنوں کالج میں پڑھتا تھا۔ ارشد بھی اُن دنوں کالج سٹوڈنٹ تھا۔ وہ تحریک پاکستان کے عروج کا دور تھا۔ نجمہ کے شہید بھائی کی شکل وصورت ارشد سے ملتی جلتی تھی۔ نجمہ، ارشد اور طاہرہ سرحد پار جلال آباد میں تحریک پاکستان کا معرکہ دوش بدوش لڑے تھے۔ نجمہ اور ارشد اسی لیے منہ بولے بہن بھائی بن گئے تھے۔ ایک روز نجمہ نے ارشد کو بیاختہ گلے لگا لیا اور کہا تھا — "تم میرے سامنے رہا کرو۔ میں تمھیں جی بھر کے دیکھا کروں۔"

طاہر پرویز کو گلے لگا کر نجمہ کی ہچکی بندھ گئی۔ نجمہ کا خاوند اطہر آ گیا۔ وہ پہلے بار ارشد سے مل رہا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے ارشد کی باتیں سنی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندر بیٹھے ہوئے تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ ارشد، نجمہ اور طاہرہ سے ملاقات کوئی حیران کن واقعہ نہیں تھا۔ بچھڑے ہوئے انسان زندہ رہیں تو زندگی کے کسی موڑ پر مل ہی جاتے ہیں۔ حیران کن ملاقات طاہرہ کے باپ کی تھی۔ اُسے تو سب مرا ہوا سمجھتے تھے۔

"اگر میرے پاس اپنی امّی کی تصویر نہ ہوتی تو مجھے اپنے ابّا جان ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کبھی نہ مل سکتے" — طاہرہ نے کہا۔

"تمھاری امّی نے مجھے یہ تصویر کبھی نہیں دکھائی تھی" — طاہرہ کے باپ جمال بیگ نے کہا۔ اُس کی آواز بوجھی دلی سی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ طاہرہ نے ابھی کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کی ماں اُس کے باپ کے ہاتھوں مری تھی اور اُس وقت اُس کی عمر تقریباً ایک گھنٹہ تھی۔ باپ نے اپنے کوارٹر میں اُسے سارا واقعہ سنا دیا تھا۔

"آپ اتنا عرصہ رہے کہاں؟" — نجمہ نے جمال بیگ سے پوچھا۔

جمال بیگ کا وہی چہرہ جو بڑھاپے کے باوجود کھلا سا رہتا تھا بجھ سا گیا۔ اُس نے نجمہ کی طرف یوں دیکھا جیسے اُس نے اسے ماں بہن کی گالی دے دی ہو۔ نجمہ اور طاہرہ نے جمال بیگ کے

چہرے پر یہ تاثر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کا تاثر آ گیا — یہ چہرہ جمال بیگ کا تھا جزی بابا کا نہیں تھا جو ہر بات کا روشن پہلو دیکھتا اور دکھایا کرتا تھا اور بچوں خصوصاً بچیوں کے لیے سراپا پیار تھا۔

نجمہ نے طاہرہ کی طرف دیکھا، پھر سب کی نظریں جمال بیگ پر جم گئیں۔

"ابا جان مجھے سنا چکے ہیں" — طاہرہ نے اپنے باپ کے چہرے کا تاثر بھانپتے ہوئے کہا — "میری پیدائش سے دو چار دن پہلے میری امّی سے کسی بات پر روٹھ کر گھر سے چلے گئے تھے۔ وہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ انہیں عفتہ آ جاتا تھا۔ ان کی غیر حاضری میں میں پیدا ہوئی اور امّی مر گئی۔ مجھے نانی اماں اپنے گھر لے گئیں۔ ابّا جان واپس آئے تو...؟"

"نہیں" — جمال بیگ نے طاہرہ کی بات کاٹ کر کہا — "میری بیٹی نے مجھے آپ سب کی نظروں سے گرنے سے بچانے کی کوشش میں جھوٹ بولا ہے..... سچ یہ ہے کہ میں اس کی ماں کا قاتل ہوں" — اور اُس نے سب کو سنا دیا کہ طاہرہ کی ماں اس کے ہاتھوں کس طرح مری تھی۔

کمرے میں سناٹا اور زیادہ گہرا ہو گیا۔

"اگر آپ لوگ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں تو میں ہر سزا قبول کروں گا" — جمال بیگ نے کہا — "میں قاتل ہوں کہ آپ مجھے دھتکار دیں اور مجھے اچھوت قرار دے دیں۔ مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے طاہرہ کو بتا دیا کہ میں اس کا باپ ہوں۔"

سب نے خاموش ہو کر سب کو باری باری دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سب کو سکتہ ہو گیا ہو۔

"آپ قاتل نہیں ابّا جان!" — طاہرہ نے سکوت توڑا۔

"میں مجرم ہوں" — جمال بیگ نے کہا — "میں درندہ تھا۔ لوگوں کو اس سے کیا غرض کہ مجھے درندہ کس نے بنایا تھا۔ خدا نے پہلے مجھے ماں کی محبت سے ہمیشہ کے لیے محروم کیا۔ یہ وہ عمر تھی جب بچہ ماں کو ہی خدا اور ماں کو ہی دیوتا سمجھتا ہے۔ باپ نے مجھے سوتیلی ماں کے حوالے کر دیا۔ پھر باپ بھی مر گیا اور سوتیلی ماں نے ایک اور شادی کر لی..... ماں بھی سوتیلی اور باپ بھی سوتیلا..... اور جب ان کے بچے پیدا ہونے شروع ہوئے تو میں ان کا کھلونا بن گیا...؟"

جمال بیگ نے اپنے بچپن اور لڑکپن کی کہانی مکمل سنا دی اور اس دوران اُس کے آنسو بہتے رہے۔

"محبت کے بغیر انسان انسان نہیں رہتا" — اُس نے کہا — "مجھے عورت ذات سے نفرت ہو گئی۔ میں کوئی اچھی بات سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہ خیال میرے ذہن میں زنگ کی طرح بیٹھ گیا تھا کہ عورت ماں ہوتی ہے جو بچے کو اکیلا چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ اور سوتیلی ماں بھی عورت ہوتی ہے جو دوسروں کے بچوں پر ظلم و تشدد کرتی اور ان کے دلوں سے محبت نکال کر نفرت ڈالتی ہے۔"

"یہ نفرت مجھ پر آسیب کی طرح سوار ہو گئی۔ اسی آسیب کا اثر تھا کہ میں نے طاہرہ کی ماں سے کہا کہ لڑکی کو جنم نہ دینا۔ میں گھر میں لڑکی کا وجود برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میں نے طاہرہ کی نانی سے کہا کہ تیری بیٹی نے بیٹی کو جنم دیا تو بچی کو تم اٹھا لے جانا..... پھر جو ہوا وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں....."

"میں نے جب دیکھا کہ طاہرہ کی ماں مر گئی ہے تو معلوم نہیں میرے اندر کیسا دھماکہ ہوا کہ میں بھاگ اٹھا۔ میں پاگل ہو گیا تھا..... شاید میں مر گیا تھا، پھر میں نے دوسرا جنم لیا۔ تب مجھ میں درندگی نہیں تھی۔ نفرت

iqbalmt@onenet.com.pk scanned by

نہیں تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں ہندوستان کے کس کس شہر کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ جہاں کہیں کسی کی بچی کھیلتی نظر آتی میں اُسے اُٹھا کر چومنے لگتا۔ میں نے ہندوؤں کی بستیوں کی، عیسائیوں کی اور بھنگیوں کی بچیوں کو بھی چوما۔ میں ہر بچی میں اپنی بچی کی جھلک دیکھا کرتا تھا۔ میں نے باقی عمر ایک گناہ کا کفارہ ادا کرتے گزاری ہے۔ میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ یہ سزا تھی جو میں نے اپنے آپ کو دی.....

"جب پاکستان بن گیا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا تو میں نے اِدھر کا رُخ کیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے طاہرہ کی نانی کبھی ملے گی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی نانی ماری گئی ہوگی۔ بچی کے متعلق تو مجھے یقین تھا کہ کیمپ میں ہی مر گئی ہوگی۔ نہ جانے میں نے اپنے آپ کو یقین کیوں دلا لیا تھا:

"بہرحال خدا نے آپ کا کفارہ قبول کر لیا ہے" — ارشد نے کہا۔ "آپ کو آپ کی بیٹی مل گئی ہے یا آپ کو بتایا گیا ہے کہ اس نے پاکستان کس طرح بنایا ہے؟"

"خدا نے ایک دکھیاری عورت کی پیشین گوئی پوری کر دی ہے" — جمال بیگ نے کہا۔ "طاہرہ کی نانی نے مجھے کہا تھا — یاد رکھنا جمال! اپنی بچی کے کفن پہنانے کی بجائے مجھے کفن پہنانے کے لیے ملی ہے۔"

باتیں بڑی لمبی تھیں۔ مجرم کو ارشد سے اور ارشد کو مجرم اور طاہرہ سے بہت کچھ کہنا اور سننا تھا۔ طاہرہ کے باپ نے محفل کا رنگ بدل دیا۔

"آپا جی! — طاہرہ نے مجرم سے کہا — اب تو میں ابا جان کے ساتھ رہوں گی نا!..... یہ نہ کہنا کہ ابا جان کو بھی یہیں لے آؤ۔ میں نہیں مانوں گی۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

ارشد نے چونک کر طاہرہ کی طرف دیکھا۔ طاہرہ نے اُسے دیکھا اور اشارہ سمجھ گئی۔

☆

اُسی شام طاہرہ اپنا سامان ساتھ لیے اپنے باپ کو اور اُس کے ساتھیوں کو ساتھ لے کر اُس بستی میں گئی جہاں ارشد اور طاہر پرویز بھی ساتھ تھے۔ ارشد نے سامان باہر رکھوا کر اور کچھ پیدا کر کے طاہرہ سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے۔ رات کو اُسے واپس لے آئے گا۔

"کل آجاؤں گی" — طاہرہ نے کہا — "ابا جان کی ذہنی حالت دیکھ رہے ہو نا! کیا پتہ کب کیا..."

"جانتی ہو میں نے طاہر کی کو کیا بتا رکھا ہے؟" — ارشد نے کہا — "کہ تم اس کی ماں ہو۔ میں نے یہی بتا رکھا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ یہ تم سے الگ نہیں ہو رہا۔ میرے ساتھ آجاؤ۔ یہ سو جائے گا تو میرے ساتھ واپس آجانا..... تمہارے ابا جان سے میں بات کرتا ہوں۔ میں انہیں ساری بات بتا دوں گا۔"

"بچے کو یہیں چھوڑ جاؤ" — طاہرہ نے کہا۔

"طاہرہ!" — ارشد نے جھنجھلا کر کہا — "میں نے چھ سال اور چھ مہینے تمہارا انتظار کیا ہے۔ میرے بچے نے بھی ہمیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

طاہرہ نے چونک کر ارشد کی طرف دیکھا۔ ارشد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طاہرہ کی قسمیں ٹوٹ گئیں۔ اُس نے قسم کھا رکھی تھی کہ اب جذبات کے جھمیلے میں اور شادی کے جال میں نہیں آئے گی۔ ان ساڑھے چھ برسوں میں وہ ارشد کو دل سے اتارنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ ارشد کبھی سامنے آبھی گیا تو وہ اُسے یوں ملے گی جیسے پہلے بھی

کئی ملاقات ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ارشد اُسے تصوروں اور یادوں میں مل جاتا تھا تو وہ تڑپ اٹھتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس خوف کی گرفت میں رہی کہ ارشد سامنے آگیا تو جانے کیا ہو جائے۔

اب اُس نے ارشد کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو وہ یوں دوڑ پیچھے گئی جیسے تیز و تند آندھی گھاس کی خشک پتی کو اپنے ساتھ اڑا لے گئی ہو۔ اُسے جلال آباد والا ارشد یاد آگیا۔ اُسے سر پہ لد والا اپنا پڑوسی نوجوان کمال یاد آگیا جو ارشد جیسا ہی خوبرو تھا اور جو کمبخت پاکستان کے ایک جلوس میں پولیس کی گولی لگنے سے شہید ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے مجرم کا بھائی سلیم آگیا۔ وہ بھی ارشد جیسا خوبرو نوجوان تھا۔ وہ بھی پولیس کی گولی سے شہید ہوا تھا۔ ارشد ہر روز شہید ہونے کے لیے مسلسل سٹوڈنٹس زیادتی کے ساتھ جلوسوں اور مظاہروں کے انتظامات کرتا اور جنگ آزادی میں پیش پیش رہتا تھا۔

طاہرہ کو ایک بات یاد آگئی کہ ارشد ہی اُسے جہاد کے میدان میں لایا تھا۔ طاہرہ مرد بہادر سننے کے لیے تیار رہتی تھی کہ ارشد لاٹھی چارج یا گولی سے شہید ہو گیا ہے۔ اُسے ایک جھٹکے بہت کچھ یاد آگیا۔ ارشد کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے دو آنسوؤں میں طاہرہ کو بڑے بڑے جلوس نظر آئے۔ پورے پورے جلوس کی آنکھوں سے ایسے ہی آنسو بہہ رہے تھے اور ماحول پر آنسو گیس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ارشد کے آنسوؤں میں اُسے پولیس کی لاٹھیاں اور گولیاں برستی نظر آئیں۔ اُسے مسافروں کے قافلے، خون میں نہائے ہوئے۔ لاشیں اٹھائے ہوئے راہ پاکستان پر لاشیں بکھیرتے نظر آئے۔

"طاہرہ —" اُسے شاید اپنی ہی آواز سنائی دی — "ارشد کے آنسوؤں میں صرف تمہاری محبت نہیں یہ ایک عورت کی محبت کے آنسو نہیں۔ یہ اُس پاکستان کی محبت کے آنسو ہیں جو تم نے بنایا تھا جو ارشد نے بنایا تھا جو تمہاری بیٹیوں اور ارشد جیسے بیٹوں نے بنایا تھا۔"

"کیا سوچ رہی ہو طاہرہ؟" — ارشد نے کہا — "تمہارے ابا جان اور طاہر آرہے ہیں۔ جلدی جواب دو۔ میرے ساتھ چلو گی؟ واپس چھوڑ جاؤں گا۔"

"چلوں گی" — طاہرہ نے یوں کہا جیسے آہ بھری ہو۔

جمال بیگ نے طاہرہ کے جانے پر اعتراض نہ کیا بلکہ اُس کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ آگئی۔

"کیا تم مجھے اس قابل سمجھ رہے ہو کہ مجھ سے اجازت لے کے جاؤ؟" — جمال بیگ نے ارشد اور طاہرہ سے کہا — "میں نے اپنے آپ کو اس حق سے محروم کر رکھا ہے۔"

طاہرہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس پر رقت طاری ہو گئی۔ بول ہی نہ سکی۔

"امی جان! چلو نا!" — طاہر پرویز نے طاہرہ کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ اُس نے ارشد کا بازو پکڑ کر کہا — "انکل! آپ نے گھر نہیں چلیں گے؟"

☆

ارشد کے نوکر نوردین نے جب ارشد کے ساتھ طاہرہ کو دیکھا تو اُس کی بھی وہی حالت ہوئی جو مجرم کی ارشد کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا جیسے غش کھا کر گر پڑے گا۔ طاہرہ کی ہنسی اُسے ہوش میں لے آئی۔

"طاہرہ بی بی؟" — نوردین کے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی۔

iqbalmt@onlinepk.com Scanned by iqbalmt@onlinepk.com

"ہاں نور!" — ارشد نے کہا — "یہ طاہرہ بی بی ہے۔ میں نے ڈھونڈ نکالی ہے۔ طاہرہ کو اپنی امّی مل گئی ہے۔"

نوردین نے آگے بڑھ کر طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا — "میں نے تمھارے لیے بی بی اسمارہ دیے کی نیاز اور چالیس نفل مانے ہوئے ہیں۔"

نوردین بھی راہِ پاکستان کا مسافر تھا۔ وہ ارشد، عفّت اور طاہرہ کی نانی خاتون کا ہمسفر تھا۔ وہ بلکھوں کی گرپانوں اور برچھیوں کے سائے میں، راہِ پاکستان کے شہیدوں کے خون پر پھیلتا ان سب کے ساتھ آیا تھا۔ وہ خاتون کا ملازم تھا۔ بلکھوں نے جب خاتون کے گھر پر حملہ کیا، اُس وقت نوردین وہاں موجود تھا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں بی بی؟" — نوردین نے پوچھا۔

"اب بی بی تمھارے پاس ہی رہے گی نور!" — ارشد نے ہنستے ہوئے کہا — "اس سے سُن لینا یہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔"

طاہرہ پراٹھا کھا کر سو گیا تو ارشد اور طاہرہ الگ کمرے میں جا بیٹھے۔ طاہرہ نے [illegible] سے بتایا کہ اُسے خاندہ کیسا اور ساس کیسی ملی تھی اور اس ماں نے کس طرح اپنے [illegible] قربان کر دیا ہے۔ نعیم کو یاد کر کے وہ بہت روتی۔ اس کے چال چلن پر جو داغ لگائے گئے تھے، وہ بھی اُس نے ارشد کو سنائے اور کہا کہ وہ دُکھی انسانوں کے دکھ دور کرنے میں لگی رہتی تھی۔ انسانوں نے اُس کا سینہ دُکھوں سے بھر دیا۔ وہ مفاہمت اور صُلح جوئی کی کوشش کرتی تو اُسے ناشستہ اور بدکار کہا جاتا تھا۔ اُس کے عزم اور ارادے سے چار دیواری کے کونے کونے کریکٹ کی نذر ہو گئے۔

"ارشد!" — طاہرہ نے دکھیاری سی آواز میں کہا — "جو کہو گے ماں لوں گی۔ مجھے یہ نہ کہنا کہ ہم شادی کر لیں۔"

ارشد نے چونک کر اُسے دیکھا۔ طاہرہ نے ایسی بات کہہ دی تھی جو ارشد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اُس کے خواب یوں چکنا چور ہو گئے جیسے ٹیسٹے کا گلاس بے خیالی میں ہاتھ سے چھوٹ کر پکے فرش پر جا پڑے۔

"آؤ، ہم ایک دوسرے کے لیے خوبصورت یادیں بن کر زندہ رہیں۔" — طاہرہ نے کہا۔

"طاہرہ!" — ارشد نے کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا — "مجھ پر ایک کرم کرو۔ میرے بیٹے کو سینے سے لگا لو اور مجھے اپنے ہاتھوں زہر دے دو۔"

"جذبات سے نکلو ارشد!"

"طاہرہ!" — ارشد نے گرج کر کہا — "تم مجھے زہر کا ایک پیالہ پلا چکی ہو۔ خدا نے مجھے نہ جانے کس پَل سے بتایا ہے کہ میں مرا نہیں۔ مجھے عفت کے مرنے کا بہت افسوس ہے لیکن وہ زندہ رہی تو میں پَل پَل مرتا تھا۔ اُس نے جس طرح تمھیں رسوا اور بدنام کیا، کوئی اور ہوتا تو وہ اُسے قتل کر دیتا یا خودکشی کر لیتا۔ مجھے تم نے اس جہنم میں کود جانے کو کہا تھا۔ میں نے تمھاری محبت کی خاطر یہ قربانی دی تھی۔۔۔۔

کیا اس کا انعام یہ جواب ہے جو تم نے مجھے دیا ہے؟"

"میں چھ سال ایک جہنم میں گزار کے آئی ہوں۔" — طاہرہ نے کہا۔

"وہ لوگ جاہل تھے۔" — ارشد نے کہا — "تمھاری ساس پسماندہ تھی۔ وہ گھر تمھارے لیے نہیں تھا۔"

"تمھارا گھرانہ تو جاہل نہیں تھا۔" — طاہرہ نے کہا — "پسماندہ بھی نہیں مگر وہاں مجھ پر جو شرمناک الزامات تھوپے گئے تھے، کیا وہ جاہلوں اور پسماندہ لوگوں والے نہیں تھے؟۔۔۔۔ تم عقل والے سوار شاہ جہاں اور پسماندگی اُن کے ہاں بھی ہوتی ہے جن کے پاس اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور جن کے ہاں روپے پیسے کی افراط ہوتی ہے۔ جھوٹ بولنے والے مصلّے پر بیٹھے ہوتے بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ زاہد اور پارسا بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ جہالت اور پسماندگی کے لیے ان پڑھ ہونا ضروری نہیں۔"

"تم جو چاہو کہہ سکتی ہو طاہرہ!" — ارشد نے کہا — "تم مظلوم ہو۔ تم حق پر ہو۔ میرے اور آپا نجمہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ تم سراپا خلوص، پیار اور ایثار ہو لیکن تم یہ نہیں سمجھ سکیں کہ میرے دل میں تمھاری جو محبت ہے وہ اُس حد تک پہنچ گئی ہے جہاں محبت کرنے والے دیوانے ہو جایا کرتے ہیں اور لوگ انھیں پاگل قرار دے دیا کرتے ہیں۔ میں نے یہ اُمید اب ترک کر دی تھی کہ تم مجھے مل جاؤ گی۔ پھر بھی میں یہی کہتا رہا کہ طاہرہ مل جائے گی اور وہی میرے بچے کی ماں بنے گی۔"

"میں نے طاہری کی ماں بننے سے انکار نہیں کیا۔" — طاہرہ نے کہا — "بچہ میرے حوالے کر دو۔ اس کی تربیت اس سے زیادہ اچھی ہو گی جو تمھارے ذہن میں ہے۔"

"کیا طاہری کے بغیر زندہ رہ سکو گی؟" — ارشد نے کہا — "ہوش میں آؤ طاہرہ! میری محبت کی دلیل کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ میں نے تم سے کوئی گلہ نہیں کیا۔ مجھے نجمہ آپا سے بھی گلہ ہے۔ اگر تم مجھے اطلاع دے سکتی تھیں کہ تم نجمہ آپا کے پاس ہو تو میں سمجھ جاتا کہ میں تمھارے لیے پریشان ہوں گا۔ پھر تم نے شادی کر لی لیکن مجھے اطلاع نہ دی۔ نجمہ آپا کو چاہیے تھا کہ مجھے تمھارے متعلق صحیح اطلاع دیتے رہتے۔ عفّت کی وفات کے بعد آپا مجھے لاہور مل تھیں۔ انھوں نے تمھیں ضرور بتایا ہو گا کہ عفّت مر گئی ہے اور یہ بھی کہ میں کس حال میں ہوں اور طاہرہ، طاہرہ پکارتا پھر رہا ہوں۔"

"مجھے اطلاع مل گئی تھی۔" — طاہرہ نے آہ لینے کے انداز سے سر پیچھے پھینک کر کہا — "یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ تم کس حال میں ہو لیکن میں تمھیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میں کس حال میں ہوں۔"

"میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ تم نے مجھے محبت کا دھوکہ دیا اور راولپنڈی آ کر اپنی پسند کی شادی کر لی۔" — ارشد نے کہا — "بیوہ ہو کر بھی تم نے مجھے اطلاع نہیں دی۔"

"لیکن اب میں اپنی پسند کی شادی نہیں کروں گی۔" — طاہرہ نے کہا — "میں جو زنجیریں توڑ چکی ہوں، مجھے پھر انہی میں نہ جکڑو ارشد!۔۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔۔" — اور طاہرہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اُس نے چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور آگے کو جھک گئی۔

ارشد اپنے آپ کو بھی جانتا تھا اور طاہرہ کو بھی۔ اُسے طاہرہ کے حسین جسم سے اور دلکش جسم سے نہیں، اُس کے کردار سے محبت تھی۔ اُسے اُس کے جذبۂ ایثار سے پیار تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ طاہرہ کے ساتھ اُس کی ماں اور بھائی نے کیا سلوک کیا تھا اور طاہرہ کی مختصر سی ازدواجی زندگی کیسی گزری

iqbalmt@yahoo.com scanned by iqbalkalmati

تھی۔ اب طاہرہ کا جو ردِ عمل تھا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس میں اپنے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کی اہلیت ختم ہو چکی ہے۔ وہ خوفزدہ ہے اور اُس پر مایوسیت کا آسیب طاری ہو چکا ہے — طاہرہ تنہا تھی۔ اس کا خون کا کوئی ایک بھی رشتہ زندہ نہیں تھا۔

ارشد نے لپک کر اُسے کندھوں سے پکڑا اور اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تمھیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا" — ارشد نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا اور اس کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر بازو اُس کے گرد لپیٹ دیئے۔

"میں ہار گئی ہوں ارشد! — طاہرہ نے اپنا گال ارشد کے سینے سے رگڑتے ہوئے کہا — "میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے بچا لو ارشد! .... میرا گلا گھونٹ دو — اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ارشد اُسے اس طرح بہلانے لگا جس طرح ماں اپنے بچے کو گود میں لے کر تھپکا کر اور پچکار کر بہلایا کرتی ہے۔ طاہرہ کی طبیعت سنبھلتے خاصی دیر لگی۔ وہ یوں نڈھال ہو گئی تھی جیسے اُس نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔

"میں تمہیں ہارنے نہیں دوں گا طاہرہ! — ارشد کے لہجے میں اب التجا نہیں حکم تھا — "تمہارے فیصلے مجھے کرنے ہیں اور میں یہ فیصلے اپنے لیے نہیں کروں گا۔ ہم اپنے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ ہم طاہر پرویز کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ ہم اُن بچوں کے لیے پیدا ہوئے ہیں جو پیدا ہوں گے۔ اپنے آپ کو اپنے پنجرے میں قید نہ کرو۔ آنکھیں کھولو۔ اپنے اردگرد دیکھو۔ کیا یہ وہی پاکستان ہے جو ہم نے بنایا تھا؟ کیا ہم یہ پاکستان اپنے بچوں کو دے کر جائیں گے؟"

طاہرہ خلا میں دیکھنے لگی جیسے بیدار ہو رہی ہو۔

"تمھاری عمر چھبیس سال ہو گی" — ارشد نے کہا — "میری عمر تیس سال ہو گی ہے۔ ہم عمر کا نہایت قیمتی دور رو رو کر گزار رہے ہیں۔ ہیں نے عمر کے ساڑھے چھ سال کھٹارے میں پھرتے اور راتوں کو کروٹیں بدلتے تباہ کر دیئے ہیں۔ تم اپنے دکھوں سے روتی رہی ہو۔ ہم نے اپنے اوپر زنگ چڑھا لیا ہے جو قوموں کے وقار کو کھا جاتا ہے۔ یہ زنگ قوموں کو تاریخ کے کوڑے کباڑ میں پھینک دیا کرتا ہے.... تم اپنی زندگی کا مشن بھول گئی ہو"

"ہاں.... ہاں.... تم نے ٹھیک کہا ہے" — اب طاہرہ کسی اور لب لہجے میں بول رہی تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ سر گھمایا اور ارشد کو یوں دیکھنے لگی جیسے آسیب زدگی سے بیدار ہوتی ہو یا ارشد کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولی — "میں بھول گئی ہوں.... میں بھٹکا ہوا بیٹھی ہوں"

"ہمارے وہ لشکر سے دفن نہیں ہو سکتے جن کی گرج جلال آباد سے اماترسر تک سنائی دیتی تھی" — ارشد نے کہا — "یہ پاکستان ان کا نہیں جو پاکستان کو آج اپنی جاگیر سمجھ بیٹھے ہیں۔ پاکستان اُن بچوں کا ہے جنہیں سکھوں اور ہندوؤں نے کرپانوں اور برچھیوں سے قیمہ کر دیا تھا۔ پاکستان قوم کی اُن شہزادیوں کا ہے جو آج بھی ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں ہیں۔ یہ پاکستان اُن کا ہے جن کی لاشیں گھر اور گیدڑ کھا گئے تھے۔ اب پاکستان کو اس کے اپنے گدھ اور گیدڑ کھا رہے ہیں۔ ہمارا دشمن پاکستان

کو ہندوستان میں شامل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو پاکستان کے دفاع کے لیے تیار کرنا ہے"

"کیا تم نے طاہر پرویز کو بتایا ہے کہ ہم نے پاکستان کی کیا قیمت ادا کی تھی؟" — طاہرہ نے پوچھا۔

"ہاں" — ارشد نے کہا — "اس عمر میں وہ جو کچھ سمجھ سکتا ہے وہ میں نے بتا دیا ہے لیکن ابھی اس کا ذہن یہ معمہ حل کرنے میں اُلجھا رہتا ہے کہ اس کی امّی کہاں ہے اور وہ آتی کیوں نہیں۔ وہ تمھیں اپنی ماں سمجھتا ہے۔ اسے ہم نے بتایا ہی یہی ہے۔ اگر تم نے اسے اپنا بیٹا نہ بنایا تو یہ ذہنی مریض ہو جائے گا"

"نہیں.... ایسا نہ کہو" — طاہرہ نے جیسے تڑپ کے کہا ہو — "پاکستان کا کوئی بچہ ذہنی مریض نہیں ہو گا"

☆

اور سات آٹھ روز بعد ریل گاڑی طاہرہ، طاہر پرویز اور ارشد کو لاہور لے جا رہی تھی۔ ارشد مردانہ ڈبے میں تھا۔ طاہرہ اور ارشد نے جمال بیگ کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا مگر وہ نہیں مانا تھا۔ بہت اصرار کیا لیکن اُس نے ہنس کے ٹال دیا تھا۔

"میری دنیا یہی ہے" — اُس نے کہا تھا — "میں بچوں میں خوش رہتا ہوں۔ یہی میری دُنیا ہے۔ میں کسی سے ملنا ملانا نہیں ہوں۔ تم جاؤ" — اور اُس نے طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا — "جلدی آنا"

طاہرہ کو دُور سے شاہی مسجد کے مینار نظر آنے لگے۔ وہ ماضی کی دلدل سے نکل آئی۔ اُس کا انگ انگ بیدار ہو گیا۔ یہ مینار پاکستان کی عظمت کے نشان ہیں۔ اُسے یاد آیا کہ آشا بھون "شاہی قلعے سے تھوڑی ہی دور ہے۔ اُسے اچانک خیال آیا کہ "آشا بھون" کتنا مکروہ نام ہے۔ اُس نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس کا نام کیا ہو — "پاک منزل.... طاہر منزل.... منزلِ مراد.... قصرِ طاہر اچھا رہے گا"

اُس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے طاہر پرویز کو دیکھا اور ایک سوچ اسے پریشان کرنے لگی — "اس بچے سے کب تک چھپایا جا سکے گا کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں؟ .... کیا اسے بتا دیا جائے کہ حقیقت کیا ہے؟ .... نہیں .... اس پر بہت بُرا اثر ہو گا"

iqbalmt@yahoo.com scanned by خوبصورت لوگوں کی خوبصورت اردو

ریل گاڑی جب ریلوے سٹیشن میں داخل ہوتی تو طاہرہ کو آٹھ سال پہلے والا لاہور یاد آ گیا۔ اُسے خون کی بُو محسوس ہونے لگی۔ اُسے زخمیوں کی کربناک سسکیاں، عورتوں کے بَین اور بھوکے پیاسے ہراساں بچوں کی آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ ریل گاڑی کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ برگیوں کی ٹکی ہوئی کھڑکیوں میں طاہرہ کو آٹھ سال پیچھے لے گئیں۔ پاکستان ایسی ہی ہچکیوں، کربناک سسکیوں، عورتوں کے بَینوں اور بھوکے، پیاسے، ہراساں بچوں کی آہ و بکا سے اُبھرا تھا۔ طاہرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے چونک کر کھڑکی سے سر نکالا۔ گاڑی کی رفتار اور کم ہو گئی تھی اور پلیٹ فارم طاہرہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم آٹھ سال پہلے کے مسافروں سے بہت ہی مختلف تھا۔ آٹھ سال پہلے کا ہجوم تھکن، خوف اور زخموں سے چُور تھا۔ وہ چلتی پھرتی لاشوں کا ہجوم تھا۔ یہ ہجوم جسے طاہرہ آج دیکھ رہی تھی، تازہ دم تھا اور گاڑی پر آ بول دینے کو تیار۔ آٹھ سال پہلے کا ہجوم بڑی ہی لمبی مسافت طے کر کے سرحد پر رکا تھا۔ اِسے انسانوں کا قافلہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ انسانوں کے اس انبوہ کا سفر ایک صدی بعد ختم ہوا تھا۔

"لاہور آ گیا!" — طاہرہ کے کانوں میں طاہر پرویز کی آواز پڑی تو وہ جیسے تڑپ اٹھی ہو۔ آٹھ سال پہلے بھی اُس نے یہ آواز سنی تھی — "لاہور آ گیا۔ پاکستان آ گیا" — اُسے دُور سے پاکستان کا پرچم نظر آ گیا تھا۔ خون ٹپکاتے قافلوں کے سینے اس پرچم کو دیکھ کر لمحوں سے پھٹنے لگتے تھے۔

کبھی یوں ہوتا ہے کہ کوئی یاد زمین سے اُبھرتی ہے تو انسان پہروں اسی میں کھویا رہتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ برسوں پرپھیلا ہوا ماضی پلک جھپکتے آنکھوں کے سامنے گزر جاتا ہے جیسے جاگتے صد سالہ ایک آہ میں طے ہو گیا ہو۔ ریل گاڑی کے پلیٹ فارم میں داخل ہونے سے رُکنے تک پورا ایک منٹ نہیں لگا ہو گا لیکن طاہرہ نے ان چند لمحوں میں جیسے اُفق سے اُفق تک کا فاصلہ طے کر لیا ہو۔ وہ اگست ۱۹۴۷ء کے آخری یا ستمبر کے ابتدائی دنوں میں لاہور ریلوے سٹیشن میں پہلی بار آئی تھی۔ اس کے ساتھ ارشد تھا اور عفت بھی تھی۔ اُنھیں پتہ چلا تھا کہ مشرقی پنجاب سے ریل گاڑیوں پر بھی مہاجرین آ رہے ہیں اور ایک ریل گاڑی لاشوں سے بھری ہُوئی آئی ہے۔

طاہرہ بھی مہاجر تھی۔ امرتسر کے قصبے جلال آباد سے پیدل لاہور آئی تھی۔ ان مہاجرین پر جو اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار رہتی تھی۔ اُس کے کانوں میں جب یہ خبر پڑی کہ لاشوں سے بھری ہُوئی ریل گاڑی آئی ہے تو وہ تڑپ اُٹھی تھی۔ اس نے ارشد سے کہا تھا کہ وہ ابھی، اسی وقت سٹیشن پر جانا چاہتی ہے۔ ارشد جانتا تھا کہ اس لڑکی کو روکا نہیں جا سکتا۔ اگر روکا تو یہ اُٹھ دوڑے گی۔

وہ جب ارشد اور عفت کے ساتھ ریلوے سٹیشن میں داخل ہوئی تھی تو عفت رُک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور اُس نے خوفزدگی کے عالم میں طاہرہ کا بازو پکڑ لیا تھا۔

"طاہرہ!" — عفت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا تھا — "واپس چلو۔ دم گھُٹ رہا ہے۔ بدبُو برداشت نہیں ہو گی۔"

"عفت!" — طاہرہ نے دھیمی مگر قہر سے لرزتی آواز میں کہا تھا — "کیا تم بھول گئی ہو کہ تم خود اس بدبُو کا حصہ ہو؟ قوموں کو یہی بدبُو زندہ رکھا کرتی ہے۔ ... تم کب سمجھو گی عفت! شہیدوں کے لہو کی بُو کو تم بدبُو کہہ رہی ہو۔"

عفت کچھ ایسی ہی لڑکی تھی۔ کھسیانی سی ہو کے چپ ہو گئی تھی۔ لاہور ریلوے سٹیشن انسانوں کے سیلاب میں ڈوبا ہُوا تھا۔ مشرقی پنجاب سے آنے والی دو تین ریل گاڑیاں ان انسانوں کو یہاں اُگل گئی تھیں۔ جہاں گاڑیوں کا سفر ختم ہو گیا تھا وہاں سے ان کے مسافروں کا سفر شروع ہُوا تھا مگر مسافروں کو منزل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اُنھوں نے پلیٹ فارموں پر ہی ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ رضاکار انھیں لنگر خانے کیمپ میں چلنے کو کہتے تھے لیکن وہ اُس گاڑی کے انتظار میں ڈیرا ڈھیر ہو گئے تھے جو انھیں عافیت کی منزل تک پہنچا دے گی۔

ہاں میں بچے بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، بُوڑھے اور جوان بھی تھے۔ ان میں زخمی بھی تھے اور مریض بھی۔ بعض کے زخموں سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ اُنھوں نے زخموں پر پگڑیاں اور دوپٹے پھاڑ کر باندھ لیے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں سے پتہ چلتا تھا جیسے انھیں قبروں سے نکالا گیا ہو۔ وہ کفنبرد کنبہ بیٹھے تھے۔ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو، اپنے بھائیوں کو، اپنے بیٹوں اور بعض اپنے خاوند دل کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ کوئی عورت دُور سے کسی بچے کو دیکھ کر دوڑ پڑتی اور بچے کے پاس جا کر رک جاتی تھی پھر اس کے کمر سینے لگتے تھے۔

بعض کنبے کسی کی لاش کے اردگرد بیٹھے رو رہے تھے کسی بھی لاش کو کفن نصیب نہیں ہُوا تھا۔ ان پر نیلی پیلی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ ریلوے سٹیشن پر انجنوں کی وسلیں بھی یوں سنائی دیتی تھیں جیسے عورتیں چیخ چلا رہی ہوں۔ انجنوں کے سیاہ سینوں میں سے بھی بھوک ہی نکلتی تھی۔

ہر ایک پلیٹ فارم کی یہی کیفیت تھی۔ طاہرہ، ارشد اور عفت کے ساتھ اُس پلیٹ فارم پر گئی جہاں وہ لاشوں کی ریل گاڑی کھڑی تھی۔ وہ سٹیشن سے الگ تھلگ پلیٹ فارم تھا۔ اس گاڑی کے ساتھ انجن نہیں تھا۔ ریل کے بھنگی گاڑی کے ڈبوں کو اندر سے دھو رہے تھے۔ اندر پانی پھینکا جا رہا تھا اور ڈبوں کے اندر سے پیلا گھرالال خون بن کر باہر آتا تھا۔ ڈبوں کی اندرونی دیواروں اور چھتوں پر بھی خون جما ہُوا تھا۔ کچھ لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے اس گاڑی کو کھلتا دیکھ رہے تھے۔ وہ دُور اس لیے کھڑے تھے کہ ان پر چھلتے خون کے چھینٹے نہ پڑیں۔

اور طاہرہ بہت قریب چلی گئی جیسے اس کوشش میں ہو کہ اس خون کے چھینٹے بارش کی طرح اس پر پڑیں اور وہ خون کی اس بارش میں نہا لے۔ ارشد اُس کے ساتھ تھا۔ عفت دُور کھڑی رہی۔ پلیٹ فارم پر بڑے کے چار پانچ پائپ تھے جن سے ڈبوں کے اندر پانی ڈالا جا رہا تھا۔ ایک پائپ ڈھیلے سے پڑا تھا اور اس سے پانی سا جا رہا تھا۔ طاہرہ نے دوڑ کر وہ پائپ اٹھا لیا اور ایک ڈبے کی طرف پانی پھینکنے لگی۔ ارشد نے لپک کر اُس سے پائپ چھین لیا اور پھینک دیا۔

"ہوش میں آؤ طاہرہ!" — ارشد نے اُسے کہا — "کیا کر رہی ہو؟"

طاہرہ واقعی ہوش میں نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے دانت یوں بج رہے تھے جیسے یخ ٹھنڈ میں بجا کرتے ہیں۔ اُس پر ہسٹیریا کے دورے کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

"مجھے یہ گاڑی دھو لینے دو، ارشد!" — طاہرہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "پھر ریلوے والوں سے کہوں گی کہ ان ڈبوں کو کہیں الگ کھڑا کر دو۔ ان کے اردگرد پھولوں کا باغ اُگا دو۔ پھر پاکستان کے لوگ یہاں

by iqbalmt@onlinekhoj.com Scanned

آکر ان ڈبوں میں بچوں کی تیاں بکھیر کریں گے۔ یہ گاڑی پاکستان والوں کے لیے زیارت گاہ ہوگی۔ ہم اپنے بچوں کو یہاں لایا کریں گے۔"

"چلو طاہرہ آ" — ارشد نے بازو سے پکڑ کر کہا — "تم اپنے آپ میں نہیں ہو۔ چلو گھر چلیں۔"

"ابھی نہ لے جاؤ مجھے ارشد آ" — طاہرہ نے کہا — "ذرا دیکھ لینے دو.... اس گاڑی میں وہ آتے تھے .... وہ اسی گاڑی میں آتے تھے۔ اُن کی روحیں...."

"کون آتے تھے طاہرہ آ" — ارشد نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

"پاکستان بنانے والے آتے تھے اس گاڑی میں" — طاہرہ نے کہا — "وہ زندہ چلے تھے مگر اُن کی روحیں پاکستان میں پہنچیں۔ ان سے کہو، اس گاڑی کو الگ کھڑا کر دیں۔"

"یہ لڑکی مہاجر معلوم ہوتی ہے" — طاہرہ اور ارشد کو ایک آواز سنائی دی۔ دونوں نے دیکھا ریلوے کا ایک ادھیڑ عمر آدمی ان کے پاس کھڑا تھا۔

"جی ہاں" — ارشد نے جواب دیا — "ہم دونوں مہاجر ہیں۔ یہ ذرا زیادہ جذباتی ہے۔"

"آپ ریلوے میں ہیں" — طاہرہ نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھا — "جب یہ گاڑی آئی تھی تو آپ یہیں تھے، آپ نے اس میں آنے والوں کو دیکھا تھا"

"یہیں تھا" — ریلوے کے اس آدمی نے جواب دیا — "میں نے انہیں دیکھا تھا۔ اس گاڑی میں آتے تھے" — اُس نے بڑی لمبی آہ بھری اور دکھ سے بوجھل آواز میں بولا — "اب تمہاری عمر انہیں دیکھتا رہوں گا.... تم دونوں خوش نصیب ہو کہ یہ گاڑی اُس وقت نہ دیکھی جس وقت آئی تھی۔ ورنہ تم پر ساری عمر اور غصے کا آسیب طاری رہتا۔"

"کیسے تھے" — طاہرہ نے جذباتی لہجے میں پوچھا — "کس حال میں آئے تھے"

ریلوے کے اس آدمی نے اُسے بتایا کہ یہ مسافر گاڑی ہندوستان سے آنے والی پہلی گاڑی تھی جو پاکستان کو آرہی تھی۔ اس لیے پاکستان کو آنے والے مہاجر قتلِ عام سے بچنے کے لیے اس گاڑی میں سوار ہوتے گئے۔ اس کی چھتوں پر بھی تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ پائیدانوں پر بھی پاکستان کے مسافر کھڑے تھے۔ راستے کے قریب ہندوؤں اور سکھوں نے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ چھتوں پر بیٹھے مسافروں نے کود کر بھاگنے کی کوشش کی مگر بھاگ نہ سکے۔ گاڑی میں سے کسی کو باہر نہ نکلنے دیا گیا۔ کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ انجن چلانے والے تین آدمی ادھر کار ڈ زندہ رہے اور انہیں اس لیے زندہ رہنے دیا گیا تھا کہ ریل گاڑی پاکستان تک پہنچا دیں۔

"میں نے بچوں کی لاشیں ہری ہوتی ماؤں کی گودوں میں دیکھی ہیں" — اُس نے کہا — "پائیدانوں پر جو کھڑے تھے وہ کٹ کر وہیں کہیں گر پڑے تھے.... تم پوچھتی ہو وہ کس حال میں تھے؟.... میں نے بچوں کی لاشیں کھڑکیوں سے باہر لٹکتی دیکھی ہیں اور ماؤں کے مُردہ ہاتھوں نے مرنے کے بعد بھی انہیں پکڑ رکھا تھا کہ وہ گاڑی سے گر نہ پڑیں۔ جب گاڑی یہاں آئی تھی تو اس میں سے خون اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح تم اس میں سے پانی باہر آتا دیکھ رہے ہو۔"

بولتے بولتے ریلوے کے اس ادھیڑ عمر آدمی کو ہچکی آئی اور وہ چُپ ہو گیا۔ طاہرہ چپ تھی۔ ارشد بھی چپ تھا۔ ریل کے ڈبے بھی چپ تھے۔ ریلوے کے آدمی نے اپنی پیدا کردہ چپ توڑی۔ اگر اُس نے اپنے آنسو نہ پونچھے۔

"اب یہ ڈبے ڈھل رہے ہیں" — اُس نے کہا — "یہ پشاور سے کراچی تک چلا کریں گے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ یہ گاڑی پاکستان پر قربان ہو جانے والوں کی لاشیں لائی تھی۔ یہ گونگے ڈبے کسی کو کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔"

☆

اب آٹھ برس بعد طاہرہ اسی قسم کی ریل گاڑی پر راولپنڈی سے لاہور آرہی تھی۔ اُس نے چونک کر ڈبے کی دیواروں اور چھت کو دیکھا۔ ڈبہ ڈھلا ڈھلایا تھا۔ اسے ڈبے میں بیٹھی ٹوٹی عورتیں یوں دکھائی دیں جیسے پاکستان کے شہیدوں کی روحیں ہوں۔ اُس کے جی میں آئی کہ ہر عورت کا منہ چوم لے مگر اُسے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ روحیں نہیں، عورتیں ہیں۔ گاڑی دھچکے سے رُکی اور ان عورتوں نے ہڑبونگ بپا کر دی۔

طاہرہ آرام سے اٹھی، ایک طرف سے ایک عورت نے اُسے دھکا دے کر کہا — "اری اُترنا ہے تو اُتر، نہیں تو ایک طرف ہو جا" — طاہرہ اس کے دھکے سے سیٹ پر جا پڑی۔

عورتوں کو اتارنے کے لیے ان کے مرد ڈبے میں گھس آئے۔ رواج کے مطابق انہوں نے سارا سامان زنانہ ڈبے میں رکھوایا تھا۔ یہ سامان اتارتے اور قلیوں سے اترواتے کسی کو ہوش نہیں تھا کہ کوئی بچہ چلا جائے گا۔ ڈبے میں یوں بھگدڑ اور نفسا نفسی بپا ہو گئی تھی جیسے گاڑی پر سکھوں نے حملہ کر دیا ہو۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔

"آپا، آپا جان آ" — طاہر پرویز نے طاہرہ سے کہا — "لاہور آگیا ہے"

"یہ رش نکل جانے دو طاہری بی" — طاہرہ نے کہا — "کوئی دھکا کا کونہ مار کر تجھے زخمی کر دے گا"

اشارہ کیا۔ طاہرہ اور طاہری بڑی مشکل سے ڈبے سے نکلے۔ طاہرہ ارشد کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی مگر اُس کا دل آٹھ سال پیچھے چلا گیا تھا۔ وہ جب ۱۹۴۸ء کے آخری دنوں میں لاہور سے کسی کو بتائے بغیر راولپنڈی گئی تھی تو اُس وقت بھی ان پلیٹ فارموں پر مہاجر ہی موجود تھے مگر اب آٹھ سال بعد یہاں سرگرم زندگی کی گہما گہمی اور دھکم پیل تھی۔ شہیدوں کی ریل گاڑی اُس کے ذہن سے اُتر نہیں رہی تھی۔ طاہرہ اسے ذہن سے اتارنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔ کوئی بھی پاکستانی جو شرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آیا ہے، ہجرت کے سفر کو ذہن سے نہیں اتار سکتا۔

طاہرہ جنگِ پاکستان کی مجاہد تھی۔ وہ پاکستان اپنے ہاتھوں بنانے والی طالبات میں سے تھی۔ اُس نے جنگِ پاکستان کا پورا ذائقہ چکھا تھا۔ پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں کی جنگِ آزادی ۳ جون ۱۹۴۷ء کے روز ختم ہو گئی تھی اور وہ آزادی کی تقریب کے منتظر تھے مگر ہندوستانی علاقوں خصوصاً مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی ایک اور جنگ شروع ہو گئی تھی جو ایک طرف تھی کیونکہ مسلمان نہتے تھے۔ انہیں قتلِ عام سے بچ کر پاکستان پہنچنا تھا۔

طاہرہ کے گھر سکھوں نے حملہ کیا تھا۔ گھر میں چار عورتیں تھیں — طاہرہ، عفت، طاہرہ کی نانی خاتون اور عفت کی ماں — اس کنبے میں کوئی مرد نہ تھا۔ یہ کمی ارشد اور خاتون کے دو مزارعوں نے پوری کی تھی۔ طاہرہ نے اپنے ہاتھوں ایک حملہ آور سکھ کو اپنے نانا کی کرچ (فوجی تلوار) سے ہلاک کیا تھا۔ ارشد اور مزارعوں نے بھی سکھوں کو ہلاک کیا تھا۔ پھر طاہرہ کے مکان کو آگ لگ گئی تھی اور وہ اپنی نانی، عفت اور اُس کی ماں، ارشد اور دو مزارعوں کے ساتھ وہاں سے نکل آئی تھی۔

طاہرہ اس سفر کو کیسے بھول سکتی تھی جس قافلے کے ساتھ وہ آئی تھی، اُس پر راستے میں سکھوں نے

iqbalmt@oneurdu.com scanned by

حملہ کیا تھا۔ قافلہ بکھر گیا تھا۔ کچھ سکھ گھوڑوں پر سوار تھے جو مہاجرین باجرے اور مکئی کے فصل میں چھپنے کو دوڑے تھے۔ انہیں گھوڑ سواروں نے برچھیوں اور کرپانوں سے شہید کیا تھا۔ ارشد، دونوں مزارعوں اور طاہرہ اور عفت نے بھی سکھوں کا مقابلہ کیا تھا۔ قافلہ جب اکٹھا ہوا تو اس کی نفری آدھی سے کم رہ گئی تھی اور کئی جوان لڑکیاں لاپتہ تھیں۔

اس قافلے پر دو اور حملے ہوئے تھے۔ پہلے طاہرہ کی نانی شہید ہوئی۔ دونوں مزارعوں نے کلہاڑیوں سے قبر کھود کر اُسے دفن کر دیا تھا اور طاہرہ نے اپنا سفر یک پاکستان کا سبز دوپٹہ قبر پر ڈال دیا تھا پھر عفت کی ماں شہید ہوئی۔ اسے بھی دفن کر دیا گیا تھا۔ پھر ایک اور حملے میں ایک مزارع شہید ہو گیا تھا۔

آگے دریا آگیا جس میں طغیانی تھی۔ طاہرہ نے ارشد کی پیٹھ پر اور عفت نے مزارع نور دین کی پیٹھ پر دریا پار کیا تھا۔ دریا نے انھیں اپنے ساتھ بہا لے جانے کی بہت کوشش کی تھی۔ سیلابی موجوں نے انھیں اٹھا اٹھا کر پٹخا تھا مگر ارشد اور نور دین دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیے دریا پار کر آئے تھے۔

طاہرہ ان لاشوں کو کیسے بھول سکتی تھی جو پاکستان کے راستے میں پڑی گل سڑ رہی تھیں۔

آج وہ، آٹھ سال بعد، ارشد کے پیچھے پیچھے مسافروں کے ہجوم میں سے گزرتی، دوسرے [illegible] پر کھڑی گاڑیوں کے ڈبوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ اُن ڈبوں کو ڈھونڈ رہی تھی جن میں پاکستان بنانے والوں کی لاشیں آئی تھیں۔ وہ ڈبے انہی جیسے تھے جو اُسے نظر آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان ڈبوں کو حکومتِ پاکستان نے الگ کیوں نہیں کر دیا۔ انھیں ہجرت کی یادگار کے طور پر ہندوؤں کی مسلک گئی کے جبوت کے طور پر الگ کھڑا کر دینا چاہیے تھا تاکہ قوم کے بچے انھیں دیکھتے اور جان سکتے کہ [illegible] پاکستان نے اپنی آزادی کی کیا قیمت ادا کی ہے۔

☆

وہ سوچوں اور یادوں میں گم لاشعوری طور پر چلی جا رہی تھی۔ وہ پُل پر چڑھ گئی تھی اور طاہر پرویز بہت آگے نکل گئے تھے۔ مسافروں کا رش کم ہو گیا تھا۔ یکایک اُس کا اندرونی پُل تھا چس پر وہ جا رہی تھی۔ اُس نے بائیں طرف دیکھا۔ اُسے وہ پلیٹ فارم نظر آ گیا جس پر شہیدوں کی لاشوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ اب وہاں ان گاڑی کے ڈبے کھڑے تھے۔ طاہرہ کے قدم رُک گئے۔ وہ پُل سے نہیں، گزرے ہوئے وقت سے ایک بار پھر گزر رہی تھی۔ اُسے وہ نوجوان لڑکے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ اٹھکیلیاں کرتے آ رہے تھے۔ طاہرہ انھیں ماضی کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ان نوجوانوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر طاہرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

اُسے تحریکِ پاکستان کے ڈھیلے کن ڈور کے طلبا یاد آ گئے۔ وہ ایسے ہی تھے جنہوں نے انگریزی حکومت اور ہندوؤں کے متحدہ محاذ کو توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ طاہرہ کو کل کی بات کی طرح یاد تھا کہ یہ لڑکے لڑکیوں کے جلوسوں کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دیا کرتے تھے۔ ان میں کتنے ہی شہید ہو گئے تھے بعض کی آنکھیں آنسو گیس نے ساری عمر کے لیے خراب کر دی تھیں۔ ان کے زورِ بازو کو انگریز اور ہندو ساری عمر نہیں بھول پائیں گے۔

طاہرہ ٹرک کی کھڑکی ان دونوں لڑکوں کو دیکھ رہی تھی اور ان کی عمر کا اندازہ کر رہی تھی۔ آٹھ سال پہلے ان کی عمریں گیارہ سال ہوں گی۔ بہت چھوٹے تھے۔ اُس وقت تو دس گیارہ سال کی عمر کے بچے بھی چھوٹی

سبز جھنڈیاں اٹھائے گلیوں میں سے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ "لے کے رہیں گے پاکستان... بٹ کے رہے گا ہندوستان"

طاہرہ کو ایک جھرجھری سی آئی۔ دُکھ کی ایک لہر برقی رَو کی طرح اُس کے وجود میں دوڑ گئی۔ اُس نے ہجرت کے سفر میں پاکستان کے راستے پر ایسے بے شمار بچوں کی لاشیں دیکھی تھیں۔ ان کے پیٹ پھٹے ہوتے تھے۔ گردنیں کٹی ہوئی تھیں۔ وہ پاکستان کے نام پر ذبح ہو گئے تھے۔

دونوں لڑکوں کی چال میں کسی سی آ گئی تھی اور ان کے قدم رک رہے تھے۔ طاہرہ نے بے اختیار چاہا کہ انھیں روک کر کہے کہ تمھیں اگر کسی نے بتایا نہ ہو تو میں تمھیں بتاتی ہوں کہ پاکستان کے لیے قوم نے تم جیسے ہزاروں بچے ذبح کروائے ہیں اور ستر ہزار بیٹیاں اغوا ہوئی ہیں.... آؤ، میرے بھائیو، میں تمھیں وہ پلیٹ فارم دکھاؤں جہاں پاکستان بنانے والوں کی لاشوں کی بھری ہوئی گاڑی آ کر رُکی تھی۔

طاہرہ جسیم لڑکی تھی عمر سے کم لگتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایمان کی چمک اور چہرے پر روح کی رونق تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں ادھ کھلی کلی کی طرح تھا۔ دونوں لڑکے اُس کے قریب آتے تو ایک نے اُس وقت کا ایک فلمی گیت گانا شروع کر دیا۔ "کبھی آر کبھی پار لاگا تیر نظر" اور دوسرا لڑکا بیجڑوں کی طرح تالی بجانے لگا۔ گانے والا لڑکا طاہرہ کے ساتھ لگ کر گزرا۔

طاہرہ کی مسکراہٹ جھگ گئی۔ چہرے کی رونق کی جگہ کرب کا تاثر آ گیا جیسے کسی سکھ کی کرپان نے اُس کے سینے میں آ کر اُس کا دل چیر دیا ہو۔ لڑکے آگے نکل گئے۔ طاہرہ ایک زناٹے سے شہیدوں کے آسمان سے شہیدوں کی زمین پر آ پڑی۔ وہ یوں چل پڑی جیسے کوئی بلندی سے گر کر اٹھا اور چلنے کی کوشش کیا کرتا ہے اُس نے دو تین بار گھوم کر دیکھا۔ دونوں نوجوان گھوم گھوم کر دیکھتے اور قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔

طاہرہ جب سیڑھیوں تک پہنچی تو اُسے اپنے قریب ہی ایک لڑکے کی آواز سُنائی دی۔ "سونہیو! بھائی ورگیو" وہ چلتے:

طاہرہ نے گھوم کے دیکھا۔ وہی نوجوان اُس کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ طاہرہ سراپا قہر بن گئی۔ اُس کا دایاں ہاتھ اٹھا، بجلی کی طرح ہوا میں گھوما اور یہ ہاتھ اس قدر زور سے ایک نوجوان کے منہ پر پڑا کہ وہ تیرا کر گرا اور پُل کی چوڑی سیڑھیوں پر قلابازیاں کھاتا ہوا پلیٹ فارم تک پہنچ گیا۔ وہ اُٹھا اور اتنی تیز دوڑا جتنی تیز وہ کبھی نہیں دوڑا ہوگا۔ طاہرہ دوسرے نوجوان کو دیکھنے کے لیے گھومی۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔

"بیٹی!" طاہرہ نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ اُس نے دیکھا۔ ایک بزرگ صورت انسان کہہ رہا تھا۔ "کس کس کو تھپڑ مارو گی۔ یہاں تو پوری نسل نہ جانے کون سی تہذیب میں رنگی گئی ہے۔ یہاں کے زندہ انسانوں کے چہروں پر شہیدوں کی یاد کی جو سرخی تھی، وہ کھیتی جا رہی ہے۔"

"یہ کس قوم کے بیٹے ہیں؟" — طاہرہ نے پوچھا — "یہ کہاں سے آتے ہیں؟"

"یہ ہمارے ہی بیٹے ہیں" — بزرگ نے کہا — "اس سٹیشن کی فضا میں ۱۹۴۷ء کے شہیدوں اور زخمی مہاجروں کے خون کی بُو باس ابھی تک تر و تازہ ہے جسے کوئی ایمان والا ہی سونگھ سکتا ہے۔ یہ چھوکرے سٹیشن کے اندر آ جاتے ہیں اور مسافر گاڑیوں کے زنانہ ڈبوں کے سامنے سنڈلاتے، بکواس کرتے اور شریف زادیوں کو فحش اشارے کرتے رہتے ہیں۔"

iqbalmt@gmail.com scanned by iqbal

"انھیں کسی نے بتایا نہیں کہ....؟"

طاہرہ چپ ہوگئی۔ بزرگ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اُس پلیٹ فارم کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ۱۹۴۷ء میں شہید دل سے بھری ہوئی ریل گاڑی رُکی اور رُکی تھی۔

"بیٹی! تم نے وہ گاڑی نہیں دیکھی تھی" — بزرگ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہہ رہا تھا — "وہ گاڑی دُھلنی نہیں جاتی تھی۔ اُس میں سے لاشیں نکلنی نہیں چاہتی تھیں۔ آج وہ بڈیوں کے ڈھانچے ہوتے۔ ہڈیوں پر اس گاڑی کی تاریخ لکھی ہوتی۔ وہ گاڑی ہماری آتش فشاں تاریخ کی ملکیت تھی۔ ظالموں نے اسے دھوڈالا اور اب وہ تاریخ جانے کہاں کہاں لڑھکتی پھر رہی ہے؟"

"طاہرہ... طاہرہ!"

طاہرہ نے چونک کر نیچے دیکھا۔ ارشد اُسے بلا رہا تھا۔ طاہر پرویز نے ارشد کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ طاہرہ اس قدر تیزی سے سیڑھیاں اُتری اور اُس نے چھ سال کی عمر کے طاہر پرویز کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا جیسے اُسے اس تہذیبی سے بچانے کی کوشش کی ہو جس میں پاکستان کی نئی پود رنگی گئی تھی۔

"وہاں کیوں رُک گئی تھیں؟"

طاہرہ نے اسے تفصیل سے بتایا کہ پُل پر کیا ہوا اور اُس نے کیا کیا اور یہ بزرگ صورت انسان اُسے کیا کہہ رہا تھا۔

جذبات سے مغلوب طاہرہ! — ارشد نے اُسے کہا — "ان جذبات کو اپنے تاریخ نہیں بننے دینا۔"

☆

پاکستان کے نام پر سر مٹنے والوں کا خون ابھی خشک نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی نئی نسل کو سمندر پار سے آئی ہوئی بڑی دلکش غلاظت میں ڈوبنے لگی۔ یہ ایک یلغار تھی جو پاکستان کی ثقافت پر اچانک ٹوٹ پڑی تھی۔ جرائم، خوں ریزی اور جنسی لذت سے بھرپور انگریزی فلموں اور ناولوں کی صورت میں ہوئی تھی۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں کے نوجوان اتنے سستے داموں ملنے لگے کہ طلبا معمولی سے جیب خرچ سے بھی خرید لیتے تھے۔ انھیں ہر چھوٹے بڑے شہر نے کے لیے محلوں میں ایک "آزاد لائبریریاں" کھل گئیں جہاں سے صرف ایک آنہ کرایہ پر بچوں کو وہ ناول ملنے لگے جن میں چرس اور افیون کا نشہ تھا۔

انگریزی فلمیں جن میں بے حیائی اور عریانی پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی، اپنے ساتھ "ٹیلیپرنٹ" بھی لانے لگیں۔ پاکستانی فلم سازوں نے جب دیکھا کہ لوگ جو انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے سمجھتے، انگریزی فلموں کے شیدائی ہو گئے ہیں تو انہوں نے اردو اور پنجابی فلموں میں انگریزی فلموں والی عریانی، فحاشی اور لڑائی مار کٹائی بھرنی، ناچ اور گانے بیکار اور فحش ہو گئے۔

فحاشی باقاعدہ کاروبار بن گئی۔ پبلشروں کے کھوکھے کھمبیوں کی طرح ابھرنے لگے فحش لٹریچر کے پبلشر اور عریاں فلموں کے ڈسٹری بیوٹر دولت کے لالچ میں پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے ایجنٹ بن گئے۔

نوزائیدہ مملکت پاکستان ایک کانٹا بن کر دنیا کے کفر کے سینے میں اُتر گئی تھی۔ ہندو اسے اپنی ماتا کا ٹکڑا، یہودی اور نصرانی اسے اپنا دیرینہ دشمن سمجھتے تھے مگر پاکستان ایک حقیقت بن کر کرۂ ارض پر اُبھرا تھا۔ اسے فوجی حملے سے مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ ان اسلام دشمن قوموں کے دانشوروں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں

کو سامنے رکھ کر پاکستانی قوم کی ذہنی تخریب کاری کا منصوبہ بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کے امین نوجوان ہوتے ہیں کسی بھی قوم کے نوجوان ذہن میں جنسی لذت پرستی ڈال دی جائے وہ قوم زوال کے راستے پر چل پڑتی ہے۔ انسانی فطرت لذت کی طرف جلدی مائل ہو جاتی ہے۔

جب ذہن بدلتے ہیں تو سوچیں بدل جاتی ہیں، اطوار بدل جاتے ہیں، لباس بدل جاتے ہیں تہذیب بدل جاتی ہے۔ پسند اور ناپسند کے پیمانے بدل جاتے ہیں اور جب ذہن کی تبدیلی، لذت پرستی اور فرار پسندی کے زیر اثر ہو تو اخلاقیات اور مذہب کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ کردار کے قلعے مسمار ہو جاتے ہیں۔ نیک و بد کی تمیز مٹ جاتی ہے اور انسان حیوان بن جاتے ہیں۔ قومی روایات سے انحراف شروع ہو جاتا ہے۔

تخریب کا یہ عمل پاکستان میں شروع ہو چکا تھا۔ وہ نونہال اور نوجوان جو قومی روایات کے رکھوالے اور وارث تھے "ٹیڈی بوائے" بن گئے تھے۔ پتلونیں اتنی تنگ پہنتے تھے جیسے کپڑا ٹانگوں پر لپیٹ کر سی دیا گیا ہو۔ لڑکیوں کے بھی لباس اتنے تنگ ہو گئے تھے کہ ملبوس ہوتے ہوئے مستور نہیں تھیں۔ دوپٹہ رسی کی طرح گلے میں پڑا رہتا تھا۔ لڑکے لڑکی میں دوستی لگانے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ لڑکی بھری محفل میں "بوائے فرینڈ" کا ذکر بڑے فخر سے کرتی تھی۔ بات کرنے کے، کھڑے ہونے اور بیٹھنے کے، کھانے پینے اور چلنے پھرنے کے انداز بدل گئے تھے اور اس انداز میں "امریکی کاؤ بوائز" کا رنگ غالب تھا۔

جرائم کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اونچے گھرانوں کے لڑکے جو انگریزی فلمیں دیکھتے اور اردو کے جنوں ناول پڑھتے تھے۔ ان کی نقالی باقاعدہ جرائم (عام طور پر ویران سڑکوں اور سنسان گلیوں میں رہزنی) کی صورت میں کرنے لگے تھے۔ کال میں جو گرفتار ہوتا تھا وہ اپنے بڑے عہدے والے باپ کی بدولت تھانے سے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔ قانون کے پرخچے اُڑنے لگے تھے۔

دشمن کی یلغار کامیاب تھی، اور کامیاب اس لیے تھی کہ جس رخ سے پردشمن نے حملہ کیا تھا وہ مورچہ خالی تھا۔ پاکستان بنانے والا ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کے روز اس دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ پیچھے حکومت کرنے والے رہ گئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بندی کر لی تھی۔ وہ اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر اخباری بیانوں اور دھواں دھار تقریروں کے گولے داغ رہے تھے۔

ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے انھوں نے قانون شکن گروہوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں برسر اقتدار سیاسی پارٹی پولیس کو قانون اور شہریوں کے جان و مال اور عزت کے تحفظ کے لیے نہیں اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ مخالفین کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کر کے انھیں جیلوں میں بند رکھا جاتا تھا۔ جب مخالفین کی حکومت بن جاتی تھی تو وہ سابقہ برسر اقتدار لیڈروں سے انتقام لیتے تھے۔

ان کی سیاست جو سیاست نہیں بلکہ سحر کاری آزمائی تھی، کا کجل ہر ایک کی آنکھ میں بھی پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی جنجر چاقو ریوالور اور سٹین گنیں بھی طلبا کے ہاتھوں میں دے دی گئیں، پھر قوم کے نونہالوں کو سیاسی مقاصد اور مفادات کی خاطر توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ ہوسٹل گوریلا کیمپ بن گئے۔ سٹوڈنٹ لیڈروں کو باقاعدہ وظیفہ ملنے لگا اور سیاسی پارٹیاں غیر ممالک کی آلہ کار بن گئیں — اور ملک دشمن کے ایجنٹوں کی گرفت میں آ گیا۔

☆

iqbalmt@onelibrary.com scanned by
اقبال اردو
خوبصورت لوگوں کی خوبصورت لائبریری

"تم نے آٹھ سال کہاں گزارے ہیں طاہرہ؟" — ارشد نے اُسے تانگے میں گھر کو جاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے آج دیکھا ہے کہ ایک نوجوان نے تمہیں چھیڑا ہے؟ تم اس انقلاب سے بے خبر کس طرح رہی ہو؟ لاتعلق کس طرح رہی ہو؟"

"میں نے تمہیں راولپنڈی میں تفصیل سے بتایا تھا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔" — طاہرہ نے جواب دیا — "مجھے تو اپنی ہوش نہیں رہی تھی کہ میں دیکھتی کہ پاکستان پر کیا بیت رہی ہے.... لیکن ارشد!" — طاہرہ نے کربناک لہجے میں کہا — "ایسا کیوں ہوا ہے۔ یہ وہ ویسے ہی نوجوان ہیں جیسے تم تھے۔ کمال شہید بھی اسی جیسا تھا۔ نجمہ آپا کا بھائی بھی اسی جیسا تھا۔ اب یہ نوجوان کیوں نہیں سمجھتے کہ انہیں دشمن تباہ کر رہا ہے۔"

"اس لیے کہ ہم نے ریل گاڑی کے ڈبوں سے شہیدوں کا خون دھو ڈالا ہے۔" — ارشد نے کہا — "اور گڑھے کھود کر سب کی لاشیں اکٹھی ان گڑھوں میں پھینک دیں اور مٹی ڈال کر گڑھوں کو زمین کے ساتھ ملا دیا تھا.... ہم نے اپنی تاریخ گڑھے میں پھینک دی ہے۔ آٹھ برسوں کی اُڑتی مٹی اور ریت نے گڑھا بھر کر اسے زمین کے ساتھ ہموار کر دیا ہے۔ ہم نے اپنی روایات کو دفن کر دیا ہے طاہرہ!"

دونوں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور طاہرہ پر دوسری اگلی سیٹ پر تھا۔ تانگے والا اپنے گھوڑے کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔

"او تے اُ!" — تانگے والے نے حیرت زدہ لہجے میں کہا — "میں تو تمہیں سردار ہی سمجھا تھا لیکن تم اپنے ہی بچے نکلے.... تم ارشد ہو نا!"

ارشد اور طاہرہ نے اُسے چونک کر دیکھا۔ ارشد نے نعرہ لگانے کے لہجے میں کہا — "او تے کامے!" — ارشد نے ہاتھ بڑھا کر اُس سے ہاتھ ملایا اور کہا — "میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا یار! کب واپس لاہور آ گئے تھے یار....؟"

"ارشد باؤ! — کامے تانگے والے نے کہا — "اللہ نے کرم کیا اور میرا اسلام خیریت سے آ گیا تھا۔ اسی تانگے پر سب کو لایا تھا۔"

"کہیں ٹھکانہ بن گیا تھا؟" — ارشد نے پوچھا۔

"ایک جھگی ڈال لی تھی۔" — کامے نے جواب دیا — "اسی کو پکا کر لیا ہے.... شہر کہ ہے مولا کا! ارشد باؤ! تم سے لوجہ کبھی امرتسر یا جلال آباد یاد آیا تھا کہ اب دونوں شہر بہت یاد آتے ہیں۔"

"بھول جا کامے!" — ارشد نے کہا — "بے شک ہم اپنی جائیدادیں اور اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ آئے ہیں مگر...."

"ارے نہیں ارشد باؤ!" — کامے نے باگیں کھینچ کر گھوڑے کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا — "اللہ پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ وہ پکا مکان یاد آتا ہے نہ وہ مال اسباب یاد آتا ہے جو وہیں رہ گیا ہے۔ وہ فقر سے یاد آتے ہیں، وہ جذبے یاد آتے ہیں، وہ ولولے یاد آتے ہیں اور قوم کے وہ شہید یاد آتے ہیں جنہوں نے جلال آباد سے امرتسر تک کی زمین اور آسمان ہلا ڈالے تھے۔ مجھے وہ جلوس یاد ہے جسے منتشر کرنے کے لیے فوج آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک گورا لفٹین تھا۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔ وہ لاپتہ ہو گیا تھا۔"

"ہاں، ہاں" — ارشد نے کہا — "سنا تھا مگر یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ مل گیا تھا یا نہیں۔"

"نہیں" — کامے نے کہا — "وہ کہاں سے ملتا۔ اُسے چار آدمیوں نے اُس کے اوپر کمبل ڈال کر اغوا کیا تھا۔ ان آدمیوں میں تین ملنگ تھے اور چوتھا میں تھا۔ سیانتظام ایک مسلمان تھانیدار نے کرایا تھا۔ وہ رحیمک کا رہنے والا تھا۔ عبدالجلیل خان۔ وہ اُس روز امرتسر سے پولیس کی گارد لے کر آیا تھا۔ جلال آباد کا اخبر بدمعاش تمہیں یاد ہے نا؟.... اُس کی دوستی اس تھانیدار کے ساتھ تھی۔ تھانیدار نے اسے کہا تھا کہ موقع ملے تو اس انگریز لفٹین کو اٹھا لے جانا اور قبرستان کے حجرے تک پہنچا دینا۔ اخبر بدمعاش میرا لنگوٹیا یار تھا۔ میں ہے۔ اب بھی بدمعاشی کرتا ہے۔ لیڈروں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اُس نے مجھے اور تین ملنگوں سے کہا تھا کہ یہ کام کرنا ہے.... تم اُس روز جلوس کی تیاریوں اور انتظام میں لگے ہوئے تھے اور ہم اس انگریز کے اغوا اور قتل کا انتظام کر رہے تھے۔"

کامے نے لمبی آہ بھری اور بولا — "اخبر بدمعاش تھا۔ شریف میں بھی نہیں تھا اور ملنگ تو تم جانتے ہو کہ ہوتے ہی چرسی اور بھنگی ہیں۔ ان کی بلا سے۔ حکومت انگریزوں کی ہو، ہندوؤں کی ہو یا ہے سکھوں کی۔" تھانیدار عبدالجلیل نے اخبر اور ملنگوں سے کہا تھا کہ اس کام کا پیسہ ایک نہیں ملے گا۔ یہ کام پاکستان اور اسلام کے نام پر کرنا ہے.... اور ارشد باؤ! انہوں نے یہ کام کر دیا۔ انگریز لفٹین کو انہوں نے رات سنگھنے میں قتل کیا اور قبرستان میں لے جا کر گڑھا کھود کر دفن کر دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ تھا.... بس، یہی کچھ یاد آتا ہے کہ اُس وقت بدمعاش بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ اب دیکھو، مومن بدمعاش ہو گئے ہیں.... اُس جلوس نے تھانے پر قبضہ کیا تھا نا! مجھے یاد ہے۔ ایک لڑکی نے بڑی جوشیلی تقریر کی تھی۔"

"اس لڑکی کو جانتا ہیں تم نے کامے؟" — ارشد نے کہا — "یہ تھا رے پیچھے بیٹھی ہے۔"

کامے نے گھوم کر دیکھا اور طاہرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا — "میں نے اسے نہیں پہچانا تھا ارشد باؤ! اس بھاگ بھری کو دیکھا بھی نہ لیکن اس بچی نے جو باتیں کیں اور جو کچھ تم نے اسے کہا، وہ سن کر میں نے تمہاری عزت دیکھا تھا۔ میرے تانگے کی پچھلی سیٹ پر سارا دن لوگ بیٹھتے اور اُترتے رہتے ہیں۔ آدمی کی کس کو پہچانے۔ جو آتا ہے، چند منٹ ساتھ دیتا اور چلا جاتا ہے۔" — اُس نے طاہرہ پر دیز کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھا — "بچہ کچھ تھا رہا ہے؟.... اللہ لمبی عمر دے.... شادی یہاں آ کر کی تھی؟"

"ہاں کامے!" — ارشد نے کہا — "یہاں آ کر کی تھی۔"

"میں اس بچی کو جانتا ہوں۔" — کامے تانگے والے نے کہا — "اس بے چاری نے تو نہ اپنا ماں دیکھا ہے نہ باپ دیکھا ہے۔ یہ لفٹین خیر دین کی دوہتی ہے۔ وہ صوبیدار میجر پشن آیا تھا اور اُسے لفٹینی کا عہدہ ملا تھا۔ اس بچی کی نانی خاتون بڑی بھاگوان عورت ہے۔"

"تھی کامے!" — ارشد نے کہا — "راستے میں شہید ہو گئی تھی۔"

"اللہ شہادت قبول کرے۔" — کامے نے کہا — "میں اس لڑکی کے باپ کو جانتا تھا۔ میں اُسی محلے میں رہتا تھا۔ وہ انسان نہیں تھا۔ ہر روز اس بچی کی ماں کو گالیاں دیتا اور کبھی کبھی پٹائی بھی کر دیا کرتا تھا۔ یہ بچی پیدا ہوئی تو اس کی ماں اس کے باپ کے ہاتھوں ماری گئی اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ کچھ دنوں بعد اُس کی گلی سڑی لاش نہر سے ملی تھی۔ اُس نے خودکشی کر لی تھی۔"

iqbalmt@onedrive.com scanned by

"میری امّی کو تم نے دیکھا تھا کامے بھائی ــــ طاہرہ نے پوچھا۔

"تین چار بار میرے تانگے پر شادی نانی کے ہاں گئی تھی ــــ کامے نے جواب دیا۔ "یہی تانگہ تھا جہاں تم بیٹھی ہو، تمھاری امّی یہیں بیٹھا کرتی تھی۔ تم اُس کی صحیح تصویر ہو۔ اُسے دیکھنا چاہو تو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیا کرو۔"

ارشد اور طاہرہ نے آنکھوں آنکھوں میں طے کر لیا کہ کامے کو یہ نہ بتایا جائے کہ طاہرہ کا باپ زندہ ہے اور وہ انھیں مل گیا ہے۔

کاما جلال آباد کا رہنے والا تھا اور وہ تحریکِ پاکستان کا سرگرم کارکن تھا۔ تحریک کے کاموں کے لیے اُس نے اپنی خدمات پیش کر رکھی تھیں۔ تحریک کے کارکنوں کو تانگے پر اِدھر اُدھر لے جانے کے وہ پیسے نہیں لیا کرتا تھا۔

"تمھارے خاندان کے سارے افراد خیریت سے آ گئے تھے ارشد بابو؟"

"بالکل خیریت سے" ــــ ارشد نے جواب دیا۔

"تمھارے ابّا جان کیا کرتے ہیں؟"

"پچھلے مہینے سروس سے ریٹائر ہو گئے ہیں۔"

"اور تم؟"

"میری بھی سرکاری نوکری ہے۔"

کاما خاموش ہو گیا۔

"ارشد بابو!" ــــ اُس نے کچھ دیر بعد کہا ــــ "تمھارا گھر شاید قریب آ گیا ہے۔ ایک بات کرنی ہے۔"

"تانگہ روکوں لونا؟" ــــ ارشد نے کہا ــــ "ہمیں کوئی جلدی نہیں۔"

کامے نے تانگہ ایک طرف کر کے روک لیا اور بولا ــــ "پاکستان بنانے والے تم لوگوں نے مجھے جو بھی ڈیوٹی دی وہ میں نے پوری کی ہیں۔ ایک انگریز لفٹین کے قتل میں بھی شامل ہوا۔ اگر اس کے اغوا میں ہی پکڑا جاتا تو بھی مجھے عمر قید ملتی۔ میں نے ہر وہ فرض ادا کیا جو مجھے دیا گیا۔ پھر بھی میری بات میں کوئی وزن نہیں کیونکہ میں تانگے والا ہوں اور لوگ مجھے کمال دین کی بجائے کامے کہتے ہیں کیونکہ میں کمال دین کہلانے کے قابل نہیں ہوں۔ ان پڑھ ہوں، چرسی ہوں اور میں بدمعاش بھی ہوں۔ شاید تم بھی میری بات سُن کر نہیں پڑھ کامے کا دماغ چل گیا ہے۔"

"بات کرو کامے!" ــــ ارشد نے کہا ــــ "میں جو مدد کر سکتا ہوں کروں گا۔"

"مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیئے ارشد بابو!" ــــ کامے نے کہا ــــ "اپنے اُس پاکستان کی مدد کرو جو تم نے اپنے ہاتھوں بنایا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہ پاکستان نہیں جو ہم نے بنایا تھا۔ ارشد بابو! ایسی بات تم نہ کہنا۔ یہ وہی پاکستان ہے جس کی خاطر ہم نے لاکھوں جانیں قربان کر دی ہیں۔ اس پاکستان کو دیمک لگ گئی ہے جس راستے پر ہم اپنے عزیزوں کی لاشیں بکھیرتے آتے تھے، اُس راستے اب سمگلنگ ہوتی ہے اور سمگلروں میں یہاں ہندوستان کے جاسوس بھی آتے ہیں۔ ان کی مدد بعض پاکستانی کرتے ہیں۔"

"تم کسی کو جانتے ہو؟"

"میں تانگے والا ہوں" ــــ کامے نے کہا ــــ "اور میں بدمعاش بھی ہوں۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں،

لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک بار ایک آدمی کی نشاندہی کی تھی۔ میرا جو حشر ہوا وہ میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ تم سرکاری رتبے والے آدمی ہو ارشد بابو! بہت کچھ کر سکتے ہو۔ میں تین چار دنوں سے بہت پریشان ہوں۔ سرحد پار سے دو بند و لڑکیاں آئی ہیں۔ ان کے نام اسلامی ہیں۔ انھیں آتے ہوئے دو تین مہینے ہو گئے ہیں۔ ان کا میل جول پاکستان کے افسروں کے ساتھ ہے۔ میں ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ شاید تم کچھ کر سکو لیکن میں تمھیں یہ بتا دوں کہ ان کے خلاف رپورٹ کرو گے تو کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔ ہو سکتا ہے تمھارے خلاف کارروائی ہو جائے..... کچھ اور کرنا پڑے گا..... میں قتل تک کی سوچ چکا ہوں۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو مجھے کسی جگہ ملو۔ میں پوری بات بتاؤں گا۔ ہم سارے ملک کو دشمن کے جاسوسوں سے صاف نہیں کر سکتے، لیکن جسے ہم جانتے ہیں اُسے تو صاف کر دیں۔"

"یہ ہمارا فرض ہے کامے بھائی" ــــ ارشد نے کہا ــــ "چلو، ہمیں گھر پہنچا دو۔ کل اسی وقت یہیں ملنا۔"

"ٹھیک ہے ارشد بابو! ضرور ملوں گا۔"

Scanned by iqbalmt@onenurdu.com

۔۔۔ گھر کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہُوا تو طاہرہ کا دل بیٹھ گیا جیسے کسی مجرم کو عمر بھر کے لیے جیل خانے میں داخل کیا جا رہا ہو۔ کوٹھی کے ماتھے پر ابھی تک "آشا بھون" لکھا ہُوا تھا۔ بڑی خوشنما اور سبک بنی کوٹھی تھی۔ اس کے آگے سرسبز وسیع لان تھا۔ اس کی ہریالی ویسی ہی تھی جیسی وہ سات سال پہلے چھوڑ گئی تھی۔ پیڑ پودے بھی ویسے ہی تھے ان کی ملکیتی اور ان کا حسن کچھ زیادہ ہی نکھر آیا تھا مگر طاہرہ کے پُرشباب چہرے پر وہ نکھار نہ رہا جو کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے تھا۔

گھوڑے کے قدموں کی آواز پر ارشد کی امّی برآمدے میں آئی۔ گھر والوں کو ارشد اور طاہرہ کے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ ارشد نے گھر اطلاع نہیں دی تھی کہ اُسے طاہرہ ملی ہے۔ اُسکی امّی نے تانگے کی اگلی سیٹ پر طاہرہ پر نظر پڑتے ہی دہلیز پھلانگ کر دوڑی ۔۔۔ "میرا طاہری!" ۔۔۔ مگر پچھلی سیٹ سے اُس نے ارشد کے ساتھ طاہرہ کو اترتے دیکھا۔ پرویز کے لیے اُس کے پھیلے ہوتے بازو ہوا میں معلق رہے اور وہ رُک کے بُت بن گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کے منہ سے حیرت زدہ سرگوشی نکلی ۔۔۔ "طاہرہ؟"

ارشد کے قہقہے نے اُس کے بُت میں جان ڈال دی۔

"یہ طاہرہ ہی ہے امّی جان!" ۔۔۔ ارشد نے کہا۔

دوسرے لمحے طاہرہ ارشد کی امّی کے بازوؤں میں تھی۔ اتنے میں ارشد کا باپ، بڑا بھائی یوسف اور بھابی بابر آ گئیں۔ اُن سب نے طاہرہ کو دیکھا۔ کسی کو بھی جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ طاہرہ ہے۔ یہ تو ارشد تھا جس نے آشا بھون میں طاہرہ کے ہم کو زندہ رکھا ہُوا تھا۔ طاہرہ کو دو پوش ہوتے سات سال گزر گئے تھے۔ اُس کی واپسی کی امید کبھی کی دم توڑ چکی تھی۔ اگر ارشد عفت کی موت کے بعد دوسری شادی کر لیتا تو یہ ٹوٹل طاہرہ کا نام بھی بھول چکے ہوتے۔

"میں کہتا نہ تھا کہ طاہرہ مل جائے گی؟" ۔۔۔ ارشد نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "لو آ گئی ہے"

پھر یوں ہُوا جیسے سب طاہرہ پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ ہر کسی نے اُسے گلے سے لگایا۔ وہ طاہرہ کو دیکھ کر شاید اتنی زیادہ خوشی کا اظہار نہ کرتے۔ وہ خوش اس لیے ہُوتے تھے کہ ارشد کا گھر آباد ہونے کا ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔ ارشد نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ طاہرہ سے شادی کرے گا۔ طاہرہ نہ ملی تو وہ اپنے پیچھے کوئی اور عورت کے حوالے نہیں کرے گا۔

طاہرہ کے چہرے پر اداسی کی سی کیفیت تھی، وہ جیسے ان میں سے کسی کو بھی دیکھ کر خوش نہ ہوئی ہو۔ وہ جب سب کے ساتھ کوٹھی کے اندر گئی تو اُس کی نظر اُس کمرے کے اندر چلی گئی جو ارشد اور عفت کا کمرہ تھا۔ وہاں وہ اُن کمرے میں چھوڑ کر بے پناہ غم سے نکل گئی تھی۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے مگر اُسے یہیں واپس آنا پڑا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ رُک گئی اور اُس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ سات برس گزرے، اس کمرے

کو اُس نے اپنے ہاتھوں سجایا تھا۔ شب عروسی والا پلنگ اُسی جگہ پڑا تھا جہاں طاہرہ نے رکھوایا تھا۔ اس پلنگ پر اُس نے پھول بچھائے تھے۔ عفت کو اُس نے اپنے ہاتھوں اس کمرے میں داخل کیا تھا۔

اس کمرے میں اُس نے اپنی محبت ذبح کی تھی۔ اس کمرے میں اُس نے ارشد اور عفت کی ازدواجی زندگی کے ہم اپنے پیار کا صدقہ دے دیا تھا۔ اپنا دل قربان کر دیا تھا مگر انسانوں نے اُس کا صدقہ قبول نہ کیا۔ اُس کی اتنی عظیم قربانی یوں ٹوٹ کے اُس کے وجود کے ساتھ آ لگی جیسے دیرانے میں اپنی ہی صدا دیواروں سے چیختی چٹانوں اور بھوتوں جیسے ٹیلوں سے ٹکرا کر پلٹنے لگتی ہے۔

وہ دروازے میں کھڑی سسکیاں لیتی رہی۔ اُس نے آنسو پونچھے نہیں۔ بہنے جانے دیئے ۔۔۔ سات برس پہلے کے لمحے کمرے میں ٹوٹ آئے تھے اور صدائے بازگشت کی طرح کمرے میں بھٹک رہے تھے۔ طاہرہ کو پہلے ارشد کی امّی نے کندھوں سے تھاما، اور وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ پھر ارشد کی بھابی نے اسے وہاں سے ہٹ آنے کو کہا مگر اُس نے دوپٹہ چہرے پر ڈال لیا اور وہ اور زیادہ رونے لگی۔ ارشد نے رندھی ہُوئی آواز میں اُسے کہا۔ "طاہرہ! چلو، صبر کرو ۔۔۔ وہ وہاں سے نہ ملی جب کے آنسو بہنے لگے۔

"امّی جان!" ۔۔۔ عفت کے بچے طاہر پرویز نے طاہرہ کا ہاتھ پکڑ کر روتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ..... نہ روئیں نا امّی جان!"

طاہرہ جیسے چونک اٹھی ہو۔ اُس نے جھک کر طاہر پرویز کو اٹھا لیا اور دیوانہ وار اُس کا مُنہ چوم کر بولی "نہیں طاہری، روئیں نہیں گی۔ تیرے لیے تو میں یہ آنسو بھی مسکرائیں گی ۔۔۔ اور وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر سب کے ساتھ آگے چل پڑی۔

○

رات بستر پر گئے تھے۔ ارشد کی امّی، اس کا باپ، اس کا بھائی یوسف اور یوسف کی بیوی زینت اور ارشد طاہرہ کے پاس بیٹھے تھے۔

"طاہرہ!" ۔۔۔ ارشد نے کہا۔ "کاش تم نے پیسے نہیں لیے تھے"

"مجبوری دے دینے تھے" ۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔

"ضروری تھی" ۔۔۔ ارشد نے کہا۔ "اُس نے الٹا گھما کر دیکھا کہ میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ جلتے جلتے کہنے لگا ۔۔۔ کل ضرور ملنا ..... ارشد! باؤ اب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان بنانا کوئی معمولی نہیں تھا۔ اسے اُس سے بچانے کے لیے کتنے مخلص نظر آتے ہیں ۔۔۔ اُس نے تانگہ چلا کے رکھ لیا اور مجھے سر کے اشارے سے اپنے قریب بلا کے رازداری سے کہنے لگا ۔۔۔ 'ہر تسر والا چوہدری اکرم یاد ہے؟ صمد اللہ کشش یاد ہے؟' ۔۔۔ مجھے دونوں یاد ہیں" ۔۔۔ ارشد نے اپنے باپ سے مخاطب ہو کے کہا ۔۔۔ "ابّا جان! آپ ان دونوں کو جانتے ہوں گے۔ ہر تسر کے مشہور جاگیردار تھے اور دونوں انگریزوں کے خاص آدمی تھے۔ یونینسٹ پارٹی میں تھے"

"ہاں ہاں" ۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا ۔۔۔ "دونوں کو جانتا ہُوں۔ نظریۂ پاکستان کے بڑے سخت مخالف تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں نے اپنے مزارعوں کو اور ان کی جاگیروں میں جو گاؤں تھے وہاں کے رہنے والوں کو دھمکیاں دے کر کہا تھا کہ وہ پاکستان کا نعرہ نہ لگائیں اور مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیں۔

iqbalmt@oneurdu.com scanned by

انہوں نے کئی ایک مزارعوں کو بے دخل کر بھی دیا تھا.... میں انھیں جانتا ہوں۔ اب ان میں سے ایک پنجاب اسمبلی کا اور دوسرا قومی اسمبلی کا ممبر ہے۔ اب وہ دونوں اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے پاکستان صرف ان دونوں کی قربانیوں کا حاصل ہے۔ پاکستان میں انہوں نے اُدھر سے دُگنی جاگیریں حکومت کی باما مذمتظوری سے ہتھیالی ہیں.... یہ کاما کون ہے جس نے تم سے پیسے نہیں لیے تھے؟"

"کاما تانگے والا ہے" — ارشد نے جواب دیا — "ہم آج اسی کے تانگے پر شیشن سے گھر آتے تھے۔ راستے میں اُس نے ہمیں پہچان لیا۔ وہ تحریکِ پاکستان کا بڑا راہی سرگرم رکن تھا بلکہ زمین دوز ورکر تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جلال آباد میں ہم نے ایک بہت بڑا جلوس نکالا اور تھانے پر قبضہ کیا تھا۔ اُس روز ایک انگریز لیفٹیننٹ لاپتہ ہو گیا تھا۔ اُسے ایک مسلمان پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان نے غائب کر دیا پھر قتل کر دیا کے اُس کی لاش غائب کر دی تھی۔ اس انگریز کے قتل میں کاما بھی شامل تھا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھے تانگے میں پہچان لیا تھا۔ وہ طاہرہ کے والد، والدہ اور نانی کو بھی جانتا تھا...

"کاما نے مجھے راستے میں کہا کہ جو پاکستان ہم نے لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا تھا اسے دیمک لگ گئی ہے۔ سمگلنگ باقاعدہ پیشہ بن گیا ہے اور سمگلروں میں ہندوستان کے جاسوس بھی پاکستان میں آتے اور جاتے ہیں اور بعض پاکستانی ان کی مدد کر رہے ہیں۔ اُس نے بتایا ہے کہ وہ ہندو لڑکیاں بھی پاکستان میں آتی ہیں۔ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہیں اور ان کا میل جول پاکستان کے افسروں کے ساتھ ہے.... کاما بہت پریشان تھا اور کہتا تھا کہ وہ اس پاکستان کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے جو ایک نے اپنے ہاتھوں بنایا تھا۔"

"کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ آٹھ برسوں میں پاکستان کی حالت کیا ہو گئی ہے" — ارشد کے باپ نے کہا — "ایک وزیرِ اعظم قتل ہو چکا ہے اور اس کے بعد کتنے وزیرِ اعظم کرسی سے اُتر چکے ہیں۔ صوبوں میں من مانی ہو رہی ہے۔ وہی سیاسی لیڈر جنہوں نے پاکستان بنایا تھا ان میں سے ہر ایک پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھ بیٹھا ہے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا گروہ بنا لیا ہے۔ یہ گروہ سیاسی لیڈروں کے ہیں۔ یہ جاگیرداروں کے گروہ ہیں۔ مظفر والے چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش جیسے لوگ انہی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کے بہترین حامی پاکستان کے بہی خواہ بنتے پھرتے ہیں مگر وہ صرف ہزاروں کے گاہک ہیں۔ یہی لوگ وزیر بنتے ہیں اور پھر دورہ دورِ وزارت میں سرکاری خزانے سے جتنا بھی اڑا سکتے ہیں اڑا لے جاتے ہیں۔

"بھائی اور ووٹ کمشنر کے لیے یہ وزیرِ اعظم صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور دوسرے وزیر سیکرٹریاں، ڈپٹی سیکرٹریوں اور ان کے عملے کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں افسر شاہی کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت ملک کے بادشاہ وزیر نہیں افسر ہیں۔ وہ وزیروں کے پیٹ دوروں کے الاؤنسوں اور دیگر سرکاری ذرائع سے بھرتے رہتے اور من مانی کرتے ہیں۔ وہ وزیروں سے اپنی مرضی کے بیان دلواتے اور ان کی آنکھوں میں سبز باغوں کی دھول جھونک کر اپنے مفادات کے مطابق صنعتی، تجارتی اور دیگر پالیسیاں بناتے رہتے ہیں۔ یہ افسر شاہی اپنے ملک کی صنعتی ترقی کے راستے میں حائل ہو گئی ہے۔ یہ لوگ درآمدات میں دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ غیر ممالک کی حکومتیں اور کمپنیاں انہیں رشوت دیتی ہیں۔ آٹھ سال گزر گئے ہیں۔ پاکستان کسی بھی چیز میں خود کفیل ہونے کی بجائے ترقی یافتہ ملکوں کا محتاج ہو کے رہ گیا ہے اور یہ محتاجی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رکھا گیا تو چند برسوں بعد پاکستان کسی نہ کسی بڑی طاقت کا غلام ہو کے رہ جائے گا۔

ہم اپنے ملک کے دفاع کے لیے بھی بڑی طاقتوں کے محتاج ہوں گے اور اقوامِ عالم میں پاکستان کی حیثیت ویسی ہی رہ جائے گی جیسی گاؤں میں کمین ذات کی ہوتی ہے۔ ہم اپنے ملی وقار کے تحفظ کی بات بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہمیں مالی امداد، اناج اور چند ایک ہتھیاروں کی بھیک دینے والے ملک کہیں گے کہ تم کون سے وقار کی بات کرتے ہو؟ کہاں ہے تمھارا وقار؟"

ارشد تحریکِ پاکستان کے اُن مجاہدین میں سے تھا جو جانیں ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اُترے تھے۔ اُن کا نعرہ تھا — "پاکستان یا موت!" — یہ مجاہدین پاکستان کے خلاف بے ضرر سا اشارہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے مگر ساڑھے چھ سات برسوں سے ارشد ایسے حالات میں اُلجھ گیا تھا کہ گردوپیش سے کٹ کے رہ گیا تھا۔ وہ طاہرہ کو چاہتا تھا، طاہرہ اُسے چاہتی تھی مگر طاہرہ نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ عفت کے ساتھ شادی کرے۔

اُس نے عفت کے ساتھ ہی شادی کر لی مگر عفت نے اُس کی زندگی جہنم بنا دی، پھر عفت طاہر پرویز کو جنم دے کر مر گئی۔ طاہرہ اس سے پہلے ہی اُسے بتائے بغیر گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ گھر والے اسے کو دوسری شادی کے لیے کہتے تھے تو وہ کہتا تھا کہ وہ اپنا بچہ طاہرہ کے سوا کسی کے حوالے نہیں کرے گا۔ وہ دفتر سے گھر آ کر بچے کے ساتھ کھیلنے لگتا تھا۔ وہ بچے کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ بچہ سو جاتا تو وہ تصوروں میں طاہرہ کی تلاش میں بھٹکنے لگتا تھا۔ اس کی جذباتی دنیا میں ایسا زلزلہ آیا تھا کہ زمین و آسمان تہ و بالا ہو گئے تھے۔

طاہرہ سے اُس وقت ملی جب بچہ چھ سال کا ہو چکا تھا۔ ارشد حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ کاما سے ملنے والے تھے اور پھر اُس کے باپ نے اُسے بتایا کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے تو ارشد کے سینے میں اُلجھا ہوا مجاہد بیدار ہو گیا جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر پاکستان بنایا تھا۔ طاہرہ کو تو وہ دو نوجوان بیدار کر چکے تھے جنہوں نے ریلوے سٹیشن کے پُل پر اس کے ساتھ چھیڑخانی کی تھی۔

○

ابا جان! — ارشد نے کہا — "پاکستان بنانے والے کہاں ہیں؟ کیا وہ ان غداروں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے؟"

ہم نے انگریزوں سے آزادی حاصل کر لی تھی" — طاہرہ نے کہا — "ہم نے ہندوؤں کو شکست دے دی تھی تو کیا ہم چھرّے سے اس گروہ سے پاکستان کو نہیں بچا سکتے؟"

ارشد کا باپ ایسی ہنسی ہنسا جس میں طنز اور دکھ تھا۔

ہم پاکستان کو بچا سکتے ہیں" — ارشد کے باپ نے کہا — "لیکن مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ پاکستان کی محبت کا دعوے کرنے والے جیسے لوگوں کے دلوں میں رہ گئی ہے جو جاگیرداروں اور مفاد پرست لیڈروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پاکستان کی محبت اُن کے دلوں میں رہ گئی ہے جو اپنے مکان اور اپنی زمینیں، اپنے عزیزوں کی لاشیں اور اپنی بیٹیوں کی عصمتیں سرحد پار چھوڑ آئے ہیں۔ پاکستان کی محبت غریبوں اور نادداروں کے دلوں میں رہ گئی ہے.... ہاں، ارشد! بات بہت دُور نکل گئی ہے۔ ہم کہہ رہے تھے کہ کاما تانگے والے نے تمھیں چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش کے متعلق کچھ بتایا تھا۔"

iqbalmt@yahoo.com scanned by iqbalmt@yahoo.com

ان کے متعلق کاسے نے بتایا ہے کہ ہندوستانی سمگلروں کے ساتھ ان کا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے

ارشد نے کہا — اور یہ دونوں پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔"

"کل تمہیں اس سے ملنا ہے ارشد!" — طاہرہ نے کہا۔

ارشد کی ماں اور بھابھی ان کی باتوں سے اُکتائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے جمائیاں لینی شروع کر دی تھیں۔ بھابھی نے اپنے خاوند کو کہنی ماری۔ ارشد کی ماں نے بھی اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ عورتیں کیا چاہتی ہیں۔

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں" — ارشد کے بڑے بھائی یوسف نے کہا — "اور ہمیں پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ملک بنانے کے لیے وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو ہمارے بس میں ہے لیکن ارشد اور طاہرہ بہن! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ تم دونوں پاکستان کے نام پر مرمٹنے کے لیے تیار ہو لیکن تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ پاکستان میں ہر کیا رہا ہے اور مفاد پرست گروہ نے پاکستان کو تباہی کی کس ہی ہمک پہنچا دیا ہے تمہاری لاعلمی کی وجہ صاف ظاہر ہے" — یوسف نے مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھا۔

"سمجھ گئی ہو طاہرہ، یوسف نے کیا کہا ہے؟" — ارشد کی ماں نے کہا۔

"اب تم دونوں حقیقت کی دنیا میں آجاؤ" — ارشد کی بھابی نے کہا۔

○

سب کو توقع تھی کہ طاہرہ خفا ہو جائے گی اور کھے گی کہ ہاں، میں اشارہ سمجھ گئی ہوں لیکن اُس نے سر جھکا لیا اور جب اُس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے بحل اداس ہو گئی۔ کسی نے اسے کچھ کہنے کی جرأت نہ کی۔ طاہرہ کی نگاہیں سب پر گھوم گئیں۔

"میں آپ سب سے ایک بات کہوں گی جو شاید آپ کو اچھی نہ لگے" — طاہرہ نے کہا — "لیکن مجھے یہ بات کہنی ہے۔ اس کے بغیر آپ کے دل صاف نہیں ہو سکتے میں جانتی ہوں کہ میں آج آپ کو اس لیے اچھی لگ رہی ہوں کہ آپ کے بیٹے نے قسم کھالی تھی کہ وہ میرے بغیر کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کرے گا میں آپ کو مل گئی ہوں..... ارشد نے مجھے راولپنڈی بتایا تھا کہ اس کے آپ کو وہ راز ابھی تک نہیں بتایا جس نے مجھے آپ کی نظروں میں گرایا اور مجھ پر آپ نے یہ الزام لگایا تھا کہ میں ارشد اور عفت کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہی ہوں۔ آپ کے دل ابھی تک صاف نہیں ہوئے۔"

"نہ بیٹی!" — ارشد کی ماں نے کہا — "ہمارے دل صاف ہیں، تم ہماری بیٹی ہو۔"

"امی جان!" — طاہرہ نے آہ بھر کر کہا — "میں زندگی کے کچھ سال ایک ساس کے قید خانے میں گزار آئی ہوں۔ وہ اُن ماؤں میں سے ہے جو اپنے بیٹوں کو کھا جایا کرتی ہیں۔ میری ساس میرے سہاگ کو نہیں اپنے بیٹے کو کھا گئی ہے۔ میں نے راولپنڈی ارشد سے کہا تھا کہ ان ٹوٹی ہوئی زنجیروں سے پھر مجھے نہ باندھو لیکن عفت کی وصیت اور طاہری کے پیار نے مجھ سے ہتھیار ڈلوا لیے۔"

"آئی گئی باتوں کو جانے دو طاہرہ!" — ارشد نے کہا — "راز کی وہ بات کہ دو جس نے اس گھر کی خوشیاں تباہ کر دی تھیں۔"

سب نے طاہرہ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ طاہرہ کے چہرے پر ایسا سنجیدہ سا تاثر چھا گیا

تھا جس نے سب پر سناٹا سا طاری کر دیا۔

"میں اس الزام کی ملزم نہیں ہوں جو آپ نے مجھ پر عائد کیا تھا" — طاہرہ نے کہا — "میں ایک اور جرم کی مجرم ہوں۔ وہ میری ایک نیکی تھی جو گناہ بن گئی۔ آپ نے مجھے یہ سزا دی کہ مجھے روحانی اذیت میں ڈالا اور میں نے اپنے آپ کو یہ سزا دی کہ اپنے آپ کو ہلاکو خان کر دیا۔"

"طاہرہ!" — ارشد نے پیار سے رعب سے کہا — "یہ بحث ختم کرو اور وہ بات کہو جو تم نے راولپنڈی میں فیصلہ کیا تھا کہ انھیں بتا دیں گے۔"

"وہ بات یوں ہے ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ عفت میری بہن ہے۔ عفت کا میرے ساتھ خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ میرے خاندان کی لڑکی نہیں تھی اگر آپ ذات اور برادری کے رنگ میں بات کرتے ہیں تو وہ میری ذات کی نہیں تھی اور ہماری برادری کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ہمارے معاشی اور معاشرتی معیار کی بھی لڑکی نہیں تھی عفت اُن بیوہ ماؤں میں سے ایک بیوہ کی بیٹی تھی جو آپ جیسے گھروں میں جھاڑو برتن کرتی اور آپ کا بچا ہوا کھاتی ہیں۔"

سب نے بیٹھے بیٹھے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب کے چہروں پر ایک جیسا تاثر آگیا جیسے وہ اس فیصلے پر متفق ہوں کہ طاہرہ کا جرم ثابت ہے اور اسے سزا ملنی چاہیئے۔

"عفت" طاہرہ نے کہا — "عفت کو میں ایک پھول سمجھتی تھی جو کڑے کرکٹ کے غلیظ ڈھیر میں کھلا تھا۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اس کا جسم کتنا دلکش تھا۔ آپ کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ یہ لڑکی ایک جھگی میں پیدا ہوئی اور کھاتے پیتے گھروں کا جھوٹا کھا کر اور ان کی اُترن پہن کر جوان ہوئی ہے۔"

"تو کیا اس لڑکی کے لیے تمہیں ہمارا ہی گھر ملا تھا؟" — ارشد کی ماں نے دکھیارے سے لہجے میں کہا — "کیا تمہیں اپنی نوکرانی کے لیے ہمارا ہی بیٹا ملا تھا؟"

"وہ میری نوکرانی نہیں تھی" — طاہرہ نے پختہ آواز میں کہا — "میں نے اسے بہن بنا لیا تھا اور جھگی سے نکال کر اسے اپنے گھر میں رکھا تھا..... اور امی جان! اگر عفت نہ ہوتی تو آج آپ کا یہ بیٹا ارشد آپ کے سامنے موجود نہ ہوتا۔ اس کی کہیں قبر بھی نہ ہوتی۔ اس کی ہڈیاں مشرقی پنجاب کی مٹی میں مل کر خاک ہو چکی ہوتیں۔"

ارشد کی ماں کا چہرہ یوں کانپا جیسے سردی کی یخ بستہ لہر اُس سے ٹکرا کر گزر گئی ہو۔ وہ ماں تھی اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"عفت ایک جھگی میں اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ جو بارے میں پیدا ہونے والے ایک بیٹے کو رکھوں کی برچھیوں سے بچا کر اور اسے ایک بیٹا دے کر خدا کے حضور لوٹ جائے" — طاہرہ نے کہا اور اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اور دوپٹے سے آنسو پونچھ کر قدرے سے دبی ہوئی آواز میں بولی — "بعض انسان دکھ سہنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور عفت کی طرح نوجوانی میں ہی سارے دکھ اپنے سینے میں سمیٹ کر قبر میں اُتر جاتے ہیں۔"

○

"ارشد کے ساتھ میں نے دھوکہ نہیں کیا تھا" — طاہرہ نے کہا — "اسے معلوم تھا کہ عفت کون

iqbalmt@onedotcom scanned by iqbalmt

ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ عفت کی ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ ایسی مائیں اپنے بچوں کو بچپن میں ہی گھروں میں یا مانیاتیوں کے ہاں نوکر کرا دیا کرتی ہیں۔ ایسے بچے بچپن میں ہی جوان ہو جایا کرتے ہیں لیکن انسان نہیں رہتے حیوان بن جاتے ہیں اور ان کی ضروریات حیوانوں جیسی ہو جاتی ہیں لیکن عفت کی ماں نے اُسے سکول میں داخل کرا دیا۔ وہ بچی کو تعلیم نہیں دلانا چاہتی تھی بلکہ اُسے دس جماعتیں پاس کرانا چاہتی تھی۔ اُس نے میری نانی سے کہا تھا کہ لڑکی دس جماعتیں پاس کرے گی تو کسی سکول میں استانی لگ جائے گی یا دو چار بچوں کو گھروں میں پڑھا کر دو وقت کی روٹی کمانے لگے گی اور پھر اُسے سیرٹیفکیٹ پاس سمجھ کر کوئی با عزت گھرانہ اس کا رشتہ لے لے گا، مگر ماں آٹھویں جماعت سے آگے اسے نہ پڑھا سکی۔۔۔۔

"عفت کو پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ میری کلاس فیلو تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ماں اسے نویں جماعت میں داخل نہیں کرا رہی تو میں اسے اپنے گھر لے آئی اور اپنی نانی سے کہا کہ اسے بھی میرے ساتھ پڑھایا کریں۔ نانی نے عفت کو میرے کپڑوں میں سے ایک جوڑا دیا اور مجھے کہا کہ کل اسے نویں کلاس میں لے جانا اور فیس بھی دے دینا۔۔۔۔ دوسرے دن عفت کی ماں میرے کپڑے جو عفت کو میری نانی نے دیئے تھے اٹھاتے ہُوئے آئی اور کپڑے واپس کر دیئے۔ کہنے لگی کہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پال رہی ہوں، خیرات قبول نہیں کروں گی۔ جن گھروں میں کام کرتی ہوں، وہاں سے اپنا اور بچی کا پیٹ بھر کر لے لیا کرتی ہوں۔ آپ کو تو میں جانتی پہچانتی ہی نہیں، آپ سے کپڑے کیوں لوں؟۔۔۔۔

"مجھ میں ایثار کا جذبہ نانی نے پیدا کیا تھا۔ اس نے عفت کے ساتھ اس کی ماں کو بھی اپنے گھر رکھ لیا اور اسے اپنے مکانوں کے کرائے وصول کرنے اور زمین اور فصلوں کے متعلق کچھ کام دے دیئے۔ عورت خوددار اور عقلمند تھی۔ اُس نے دیانت داری سے کام کیا۔ عفت کو اچھا کھانے اور اچھا پہننے کو ملنے لگا اور پڑھنے کی خواہش بھی پوری ہو گئی تو اس کا رنگ روپ نکھرنے لگا اور قدرتی طور پر وہ حسین سے حسین تر ہوتا گیا جیسے اس کے سر سے کسی نے وہ لوہا اتار دیا ہو جو وہ اب تک اٹھائے پھرتی تھی لیکن اس میں جھجک اور جھینپ قائم رہی۔ وہ دل کی بات کہنے کے انداز نہ سیکھ سکی۔ میں نے اسے بہن کا اور خوشحال گھرانے کی لڑکی کا درجہ دیئے رکھا۔"

"میں شاید ساری بات سمجھ گیا ہوں۔" — ارشد کے باپ نے کہا — "لیکن طاہرہ بیٹی! میں حیران ہوں کہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں تم میں اتنی عقل تھی؟"

"نہیں ابّا جان!" — طاہرہ نے کہا — "اُس عمر میں میرے پاس صرف جذبات تھے۔ یہ میری نانی کے پیار اور ایثار کی پیداوار تھی۔ ہم غریب نہیں تھے۔ زمینیں تھیں، مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے، مزارعے تھے جو ہمارے گھر کا کام کاج بھی کرتے تھے مگر میری نانی نے کبھی بھی امیری کا اظہار زبانی یا عملاً نہیں کیا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ انسان تو ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن ایک کے پیچھے تعلیم کی آخری ڈگری بھی حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے کے پیچھے سکول میں داخل ہونے کی سوجھ بھی نہیں سکتے۔ کچھ انسان اتنے اتنے بڑے مکانوں میں رہتے ہیں جن میں پورا شہر سما سکتا ہے اور کچھ ایک ہی جھگی میں ٹھونسے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے اس سوال کا جواب کہیں سے بھی نہیں ملتا تھا کہ خدا تو سب کا ایک ہے مگر قسمت سب کی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔۔۔۔

"اُس عمر میں میرے پاس ایسے ہی جذبات تھے عقل بعد میں آئی تھی۔ مجھے کتابوں نے نہیں انسانوں نے عقل دی ہے۔ میرے ساتھ انتہائی بُرا سلوک ہُوا تو میرے اندر زندگی اور انسان دوستی کا جذبہ اور زیادہ پختہ ہو گیا۔۔۔۔ میں عقل کی بات آج کر سکتی ہوں، چودہ پندرہ برس کی عمر میں نہیں کر سکتی تھی۔"

"پھر تم نے عفت اور اس کی ماں کو اپنے گھر رکھ لیا" — ارشد کے بھائی نے کہا — "اور عفت سے بھی تم نے دس جماعتیں پاس کرا لیں؟"

"نہیں" — طاہرہ نے کہا — "پھر میں نے تحریکِ پاکستان کے سلسلے شہید کی لاش دیکھی۔ وہ ارشد کے کالج کا لڑکا تھا جلوس پر گولی چلی تھی۔ شہید کا گھر ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ شہید کی بہنوں اور اُس کی ماں کی آہ و زاری اور بَین سنے تو میری ذات میں شہید کی ماں اور شہید کی بہن بیدار ہو گئی۔ میں نے اپنے چوبارے کی اوپر کی منزل سے آزادی کے شہید کی لاش آتی دیکھی تھی۔ اُس کے ساتھی اُسے چارپائی پر ڈال کر لا رہے تھے۔ لاش پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی اور یہ چادر خون سے لال تھی۔ ایسا ہی خون میری آنکھوں میں اُتر آیا۔ میں نے اپنی نانی سے کہا کہ شہید کے ساتھیوں میں سے کسی کو اُوپر بُلا لاتے۔۔۔۔

"نانی واپس آئیں تو ان کے ساتھ ارشد تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے بتاتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور لڑکیاں اپنے بھائیوں کا کس طرح ساتھ دے سکتی ہیں۔ ارشد نے جب بتانا شروع کیا تو میرے سامنے کسی اور دنیا کے دروازے کھُلتے چلے گئے۔۔۔۔ اس کے بعد جو ہُوا، جو ارشد نے کیا، جو ارشد کے ساتھیوں نے کیا اور جو ساری قوم نے کیا وہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو عفت کی بات سنا رہی ہوں۔ یہ غریب بچی محاذ پر ہمارے ساتھ رہی، خطروں میں بھی ہمارے ساتھ رہی اور ہجرت میں بھی ہمارے ساتھ رہی۔"

"آپ کی عفت نصیب ہیں کہ اچھے وقت ریل گاڑی پر نکل آتے تھے۔ آپ نے کرم کیا کہ ارشد کو ہمارے پاس چھوڑ آتے تھے۔ ہم جس حال میں وہاں سے نکلے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ ہم پیدل آتے ہوئے قافلے پر کسی نے چار بار حملہ کیا۔ ہمارا ایک مزارعہ شہید ہو گیا۔ میری نانی شہید ہو گئیں۔ عفت کی ماں شہید ہو گئی۔۔۔۔ امّی جان! اب میں آپ کو جو بات سنانے لگی ہوں وہ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سننا۔"

"سُن رہی ہُوں بیٹی!" — ارشد کی ماں نے کہا — "ہم نے تو وہ وقت کبھی یاد نہیں کیا تھا تم ہمیں پھر گزرے ہوئے وقت میں لے گئی ہو۔"

"میں، ارشد، مزارعہ اور عفت قافلے سے الگ ہو گئے تھے" — طاہرہ نے کہا — "قافلے پر سکھ بار بار حملے کرتے تھے۔ ہم نے الگ تھلگ سفر بہتر سمجھا مگر تین سکھوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ دو کے پاس کرپانیں اور ایک کے پاس لمبی کلہاڑی تھی۔ وہ دو مسلمان مردوں سے دو نوجوان لڑکیاں چھین لے جانے آتے تھے۔ ہم نے مقابلہ کیا۔ کلہاڑی والا سکھ میری طرف آیا۔ میں اس سے بچنے کے لیے اُلٹے قدم تیزی سے پیچھے ہٹی تو گر پڑی۔ میرے ہاتھ میں میرے نانا کی برچھا تھی۔ مزارعہ نور دین میرے اور سکھ کے درمیان آ گیا۔ میں نے ارشد کو دیکھا، یہ کرپان دانے سکھ سے لڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے دوسرے سکھ نے اس پر کرپان کا وار کرنے کے لیے کرپان گھمائی۔ ارشد کی گردن اور سکھ کی کرپان میں صرف دو انچوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں گری ہوئی تھی، نور دین مجھے بچانے کے لیے لڑ رہا تھا۔ ارشد کا کرپان سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میں نے برچھا پھینک کر دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے، جو کچھ ہونے

iqbalmt@onedrive.com scanned by

حالا تھا وہ میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں اُس سکھ تک پہنچ بھی نہیں سکتی تھی ....

"امّی جان! میں نے ارشد کی لاش دیکھنے کے لیے آنکھوں سے ہاتھ ہٹاتے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ارشد کے پیچھے والے سکھ کے ہاتھ سے کرپان گر پڑی تھی۔ عفت کی برچھی اس کے پہلو میں اُتر گئی تھی۔ یہ معجزہ تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ عفت کہاں تھی اور جہاں کہیں بھی تھی، کس طرح پہنچ سکتی تھی۔ اُس نے اپنی طاقت سے برچھی سکھ کے پہلو میں اتاری تھی کہ اُس سے برچھی کی انی سکھ کے پہلو سے باہر نہیں نکل رہی تھی اور سکھ تڑپ رہا تھا۔ ارشد کو معلوم نہ تھا کہ موت اس سے بال برابر دور رہ گئی تھی اور عفت نے اسے بچا لیا ہے۔ عفت نے اسے لاہور آکر بھی نہ بتایا کہ یہ اُس کی پھرتی اور جرأت کی وجہ سے زندہ ہے۔ اسے میں نے بتایا تھا۔"

ارشد کی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ اُس کی آنکھوں کی بے چینی بتا رہی تھی جیسے سکھوں نے اس کے بیٹے کو گھیرے میں لے لیا ہو۔ اُس نے نظریں ارشد پر گاڑ دیں۔

"یہ کارنامہ اُس لڑکی کا تھا جس کا دھیان پیٹ سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ بھوکی ننگی لڑکی کے لیے جس کی قسمت میں گھر گھر کی نوکری، بھوکا کھانا اور دو سرمل کے پرانے کپڑے لکھے ہوئے تھے، پاکستان کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ مال جٹی کو ہجرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہندوؤں اور سکھوں کے حوالے کر دیتیں تو ان کے لیے کوئی فرق نہ پڑتا، لیکن انہوں نے وہی راہ اختیار کی جو ہم نے دی ہے۔ عفت نے ثابت کر دیا تھا کہ سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

ارشد کی ماں نے دوپٹہ ہاتھوں پر پھیلا کر کہا — "اللہ اُسے اپنی حفظ و امان میں رکھے جس نے میرا بچہ مجھے زندہ دیا ہے۔ اللہ اُس کی قبر ٹھنڈی کرے۔"

"میں آپ کو یہ بتاتے ہوئے جھینپوں گی نہیں کہ میں اور ارشد ایک دوسرے کو اس طرح چاہتے تھے کہ ایک لمحے کی جدائی ناقابلِ برداشت تھی — طاہرہ نے کہا — "میں شادی کرنی تھی اگر آپ جائز دے دیتے۔ عفت کو ہماری محبت کا علم نہیں تھا۔ میں اور ارشد جتنے دن رفیوجی کیمپ میں رہے، رات کو ہم کیمپ سے نکل جاتے اور ریلوے لائن کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ عفت کو ہم سوتا چھوڑ جاتے تھے مگر اُسے پتہ چل گیا۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ تب اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے دل میں ارشد کی محبت کو پال رہی ہے ....

"مجھے اُس کے الفاظ ساری عمر نہیں بھولیں گے۔ اس نے کہا تھا — "تم نے مجھے کال کوٹھڑی سے نکال کر محل میں بسایا تھا۔ تم نے مجھے غربت کی گرد سے اٹھا کر فواری پلنگ پر سُلایا تھا۔ تم نے میری نامراد اور اداس زندگی کو مسرت اور کامرانی دی تھی مگر تم جان نہ سکیں کہ تم نے یہاں آکر میری تمناؤں کو اور میری امنگوں کو کس بیدردی سے کچل ڈالا ہے۔ تم نے اچھا کیا ہے کہ مجھے بتا دیا ہے کہ غریب لڑکی کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے، اُسے کسی امیرزادے سے محبت کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا!...."

"اور اُس نے یہ بھی کہا تھا — "میں کمتر ہوں طاہرہ! میں حقیر ہوں لیکن اور ارشد کو اکٹھے باہر جاتے اور ایک دوسرے کو مسکراتے دیکھتی ہوں تو اپنے وجود کو مکمل میں ڈھل کا پیوند سمجھنے لگتی ہوں" — اور اُس نے کہا تھا — "ارشد کو جب اپنے والدین مل جائیں گے تو تم دونوں چلے جانا۔ مجھے اسی کیمپ میں پڑی رہنے دینا۔ میں مجروی اور پستی میں پل کر جوان ہوئی ہوں۔ مجھ سے توقع نہ رکھو کہ میں بلند خیال ہو گئی ہوں۔ میں

عورت ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اندر رقابت اور حسد پیدا ہو جائے۔ میں ہر پستی تک آسانی سے اُتر سکتی ہوں۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ میں غلاظت میں رہ سکتی ہوں۔ میں ہر قسم کی غلاظت سے سمجھوتہ کر سکتی ہوں۔ مجھے ارشد سے بھی محبت ہے اور میرے دل میں تمہاری محبت بھی ہے۔ میں اپنا آپ تم دونوں پر قربان کر دوں گی لیکن جیتے جی ارشد کو کسی دوسری عورت کے ساتھ نہیں دیکھ سکوں گی!...."

"ایک آواز میرے اندر سے اٹھی کہ قربانی روپے پیسے کی نہیں ہوتی، کسی کی خاطر اپنی اسٹیٹس ترک کر دینے کو قربانی کہتے ہیں۔ طاہرہ! تم نے اس لڑکی کو نا دیکھ سے نکالا تھا، اب اسے تنہا نہ چھوڑ دینا، ورنہ وہ ایسی تاریکی میں جا پہنچے گی جہاں انسان حیوان اور درندے بن جایا کرتے ہیں.... اب آپ مجھے پاگل کہہ لیں، دیوانہ سمجھ لیں، میں نے ارشد سے کہا کہ میں اس لڑکی کو بہت بڑا انعام دینا چاہتی ہوں اور یہ انعام تم ہو۔ ارشد نہیں مان رہا تھا۔ میرا اپنا دل نہیں مان رہا تھا لیکن میں نے ارشد کو بھی قائل کر لیا اور اپنے آپ کو بھی، اور آپ کو عفت کو اپنی بہن بتا کر اسے ارشد کے ساتھ بیاہ دیا...."

"میری بھول تھی۔ بڑی خطرناک لغزش تھی۔ مجھے بہت جلدی پتہ چل گیا کہ یہ بے جوڑ شادی ہوتی ہے۔ پہلے میں یہ سمجھتی رہی کہ ارشد نے عفت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ میں ارشد کو الگ بٹھا کر اور اسے اپنے کمرے میں بلا کر اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر کہتی رہی کہ عفت کو قبول کر لو۔ ارشد نے مجھے بتایا کہ یہ کوشش کر چکا ہے مگر عفت احساس کمتری اور پسماندگی سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔ میں ارشد سے بار بار کہتی رہی کہ میری محبت پر قربان ہو جاؤ۔ عفت کو اپنی سطح پر لے آؤ۔ ارشد نے کوشش جاری رکھی، آخر یہ تنگ آ گیا اور پوری طرح مایوس ہو گیا۔ اس کا ردِعمل عفت کو لے بیٹھا۔ وہ میری دشمن ہو گئی۔"

طاہرہ نے ارشد کی بھابی سے مخاطب ہو کر کہا — "بھابی! مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ نے میرے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ کھڑے ہو کر میری اور ارشد کی باتیں سنی تھیں مگر آپ نے پوری باتیں نہ سنیں۔ دو چار جملے سن کر ان کی تفسیر کچھ اور بنا لی اور سب کو یہ تاثر دیا کہ ارشد کے ساتھ میری ملاقاتیں نازیبا ہیں اور میں اسے خراب کر رہی ہوں۔"

بھابی جھینپ گئی اور اُس کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"میں آپ میں سے کسی کو بھی شرمسار نہیں کرنا چاہتی" — طاہرہ نے کہا — "میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتی۔ میں آپ کو اتنی لمبی بات اس لیے نہیں سنا رہی کہ آپ مجھے بےگناہ قرار دے دیں، بلکہ میں تو اپنی ایک بھیانک لغزش کی روئیداد سنا رہی ہوں۔ میں نے اپنے گناہ کا کفارہ یوں ادا کیا کہ اپنے آپ کچھ علاوہ بن کر دیا۔ مجھے اس کا دکھ نہیں کہ میں بدنام ہو کے نکلی اور بلاوجہ بدنام ہوئی، دکھ یہ تھا کہ میری ایک نیکی اور قربانی رائیگاں گئی تھی اور دکھ یہ بھی تھا کہ میں نے ارشد کو ایسی ذہنی اور روحانی اذیت میں ڈالا جس سے نجات کا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا....

"میں واپس آنے کے لیے نہیں گئی تھی۔ ارشد سات سال بعد میرے سامنے آ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا مگر اس نے جب یہ کہا کہ عفت نے وصیت کی تھی کہ میرا بچہ طاہرہ کے سوا کسی کو نہ دینا اور یہ کہ بچہ عفت کی بجائے مجھے اپنی ماں سمجھتا ہے تو میری نسیں ٹوٹ گئیں۔ میں نے یہی سوچا کہ ارشد کی زندگی میری ایک غلطی سے اجیرن ہوئی تھی تو میں اس کے ساتھ آ گئی

iqbalmt@onenurdigital.com scanned by

"ہم سمجھ گئے ہیں" — ارشد کے باپ نے کہا — "تم نا تجربہ کار تھیں، تم نے اگر علم نفسیات پڑھا ہوتا تو ایسی غلطی نہ کرتیں۔ عفت جیسے انسان احساس کمتری سے نکل کر سید ھے برتری کے احساس کی گرفت میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھڑ کیلے کپڑے پہنتے ہیں، ہیروئن کی طرح ایکٹنگ کرتے ہیں، دوسروں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ ان میں خود نمائش اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی ذات سے باہر نہیں آ سکتے۔"

"اگر آپ ماہر نفسیات بننے کی کوشش نہ کریں تو کیا بہتر نہیں ہوگا؟" — ارشد کی ماں نے اُس کے باپ سے کہا۔ "عفت جیسی بھی تھی، ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی ہے۔ اب آگے کی بات کرو۔ اگر یہ غلطی تھی، نیکی تھی، جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"بہتر آپ کو معلوم ہوگا کہ میرے پاس کتنی زیادہ رقم تھی" — طاہرہ نے کہا — "وہ سب ابا جان اور ارشد کے ہاتھوں مہاجرین پر خرچ کر دی تھی اور اپنے تمام زیورات عفت کو دے دیتے تھے۔ میں صرف یہاں سے غائب نہیں ہوئی تھی، میں نے تو اپنی ذات کو بھی ختم کر دینے کے لیے شادی کر لی۔"

"شادی کر لی؟" — ارشد کی ماں اور بھابی نے بیک زبان کہا اور دونوں کے چہرے یک لخت سرخ ہو گئے۔ دونوں نے ارشد کی طرف دیکھا۔ وہ تو خوش تھیں کہ طاہرہ آ گئی ہے اور اب ارشد کا گھر آباد ہو جائے گا۔ اب طاہرہ نے کہا کہ اُس نے شادی کر لی تو اُن کے چہروں پر ایسے تاثرات آ گئے جیسے انہیں طاہرہ کے ساتھ ذرہ بھر دلچسپی نہ ہو۔

"رات بہت گزر گئی ہے" — ارشد کی ماں نے کہا — "اٹھو اور وضو کرو۔"

باتوں باتوں میں اتنا وقت گزر گیا ہے" — ارشد کی بھابی نے ارشد سے کہا۔

"تمہارے میاں کیا کام کرتے ہیں؟" — ارشد کے باپ نے کہا۔

"فوت ہو چکے ہیں" — طاہرہ نے کہا۔

"بچے؟"

"کوئی نہیں" — طاہرہ نے جواب دیا — "میرے خاوند کی اپنی ماں نے انہیں دل کا مریض بنا دیا تھا۔ میں اب آزاد ہوں۔"

ارشد کی ماں اور بھابی کے لٹکے ہوئے چہروں پر پھر رونق آ گئی۔ ان کی اُلجھن ختم ہو گئی اور طاہرہ انہیں پھر پیاری لگنے لگی۔

"اب تم آزاد نہیں ہو طاہرہ!" — ارشد کی ماں نے کہا۔

"اپنے آپ کو تنہا اور لاوارث لڑکی نہ سمجھنا طاہرہ، بیٹی!" — ارشد کے باپ نے کہا — "یہ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔"

"فیصلہ ہو چکا ہے ابا جان!" — ارشد نے کہا — "اگر آپ اجازت دیں تو میں اور طاہرہ دن مقرر کر لیں۔"

"کرو نا!" — ارشد کی ماں نے کہا۔

"لیکن شادی بالکل خاموشی سے ہوگی ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "شادی راولپنڈی میں نجمہ آپا کے گھر میں ہوگی۔ میرے ابا جان وہیں ہیں۔"

"ابا جان؟" — ارشد کے باپ نے حیران ہو کے پوچھا — "کونسے نئے ابا جان بنا تے ہیں؟"

"میرے اپنے ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "جنہیں میں سمجھتی تھی کہ مر چکے ہیں۔"

طاہرہ نے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُسے اُس کے ابا جان کس طرح ملے ہیں، لیکن یہ نہ بتایا کہ اُس کے ابا جان اُس کی امی جان کو جان سے مار کر بھاگ گئے تھے۔ سب نے خوشی کا اظہار کیا اور محفل برخاست ہونے لگی۔

"بہت ضروری بات رہ گئی ہے" — ارشد کے باپ نے طاہرہ سے کہا — "عفت اور ارشد کا بچہ طاہر پرویز تمہیں اپنی ماں سمجھتا ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ بچہ اس راز سے واقف نہ ہو۔ بچہ تمہاری پوچھتا تھا تو ہم ہر بار نیا جھوٹ بول کر اسے بہلا لیتے تھے۔ ارشد اور اس کی امی نے بچے پر پیار کا نشہ طاری کیے رکھا ہے۔ اب اس راز کی رکھوالی تمہیں کرنی ہے۔ گھر میں ارشد کے اس بڑے بھائی یوسف کے وہ بچے طاہر پرویز کی پیدائش کے وقت بہت چھوٹے تھے۔ وہ عفت کو بھول چکے ہیں۔ ہم اب راولپنڈی چلی جاؤ گی تو بچہ تمہارے ساتھ جائے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ آج کتنا خوش تھا۔ وہ تمہارے گھر رہے میں سویا ہے۔"

"میں آئی ہی اس بچے کے لیے ہوں" — طاہرہ نے کہا — "میں اسے اس راز کے آسیب سے بچائے رکھوں گی۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ لڑکے بڑے ہو کر ماں باپ کا سہارا بنتے ہیں لیکن میں طاہر پرویز کو ہی اور مظلوم انسانیت کا سہارا بنا دوں گی۔ میں اسے اُس پاکستان کا رکھوالا بناؤں گی جو ہم نے بنایا تھا۔ اس بچے کو اور میرے بطن سے پیدا ہونے والے ہر بچے کو پاکستان کے راستے میں شہید ہونے والوں کے خون کے قطرے قطرے کا انتقام لینا ہے۔"

"طاہرہ!" — ارشد کے باپ نے کہا — "تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی ہو۔ تم یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم اس بچے کو اور اپنے بچوں کو ڈاکٹر بناؤ گی، بیرسٹر بناؤ گی، انجینئر بناؤ گی، تم حقیقت سے دور بھاگ رہی ہو۔"

"ابا جان!" — طاہرہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا — "آپ کیا بول رہے ہیں؟ کیا اپنے بچوں کو پاکستان کا رکھوالا بنانے والے حقیقت سے دور بھاگ رہے ہیں؟"

"نہیں بیٹی!" — ارشد کے باپ نے کہا — "میں بچوں کے روشن مستقبل کی بات کر رہا ہوں۔"

"اور میں پاکستان کے روشن مستقبل کی بات کر رہی ہوں..... اگر پاکستان کا ہی مستقبل تاریک ہو گیا تو پاکستان کے بچوں کا مستقبل کیا رہ جائے گا؟" — طاہرہ نے کہا — "انگریزوں کی غلامی میں ہمارا مستقبل کیا تھا؟..... غلاموں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا ابا جان!"

ارشد کا باپ ہنس کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا — "تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

○

دوسرے دن اُس وقت جب اُس نے کامے تانگے والے کو بتایا تھا، ارشد سڑک کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ وہ ہر تانگے کو غور سے دیکھتا تھا۔ پیچھے سے ایک تانگہ آیا جو اُس کے قریب سے گزرنے لگا تو تانگے والے نے اُسے دیکھا۔ تانگہ رک گیا۔ وہ کامے کا تانگہ تھا۔

"ارشد باؤ!" — کامے نے کہا — "میں تمہاری کوٹھی کی طرف سے آ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ کوٹھی کے باہر شاید دل جاؤ... آؤ، بیٹھو۔"

iqbalmt@onedrive.com Scanned by

ارشد تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ چلا تو کامے کی زبان بھی چل پڑی۔

"ارشد باؤ جا..... میں تانگے والا ہوں؟" — کامے نے کہا — "تانگے والے چرسی ہوتے ہیں نا! بھنگی، افیمی، بدمعاش، سوہرا بیوں کی ایک ٹرالی، پر یاد کرو ارشد باؤ! پاکستان بنانے والوں میں تانگے والے چرسی، بھنگی اور بدمعاش سب سے اگلے مورچے میں تھے۔ تم جیسے بچوں سے پولیس اور فوج کا مقابلہ جان کی بازی لگا کر کیا ہے مگر انگریز لفٹین کو تین مشکوں اور ایک تانگے والے نے اغوا اور قتل کیا تھا اور چرس کا دم لگا کر قتل کیا تھا اور جب ہم نے اس کی لاش گڑھے میں پھینک کر گڑھا بھر دیا تھا تو اللہ گواہ ہے کہ ہم نے نعرہ لگایا تھا — "پاکستان زندہ باد"

کامے نے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "تم بہت پڑھے لکھے ہو ارشد باؤ! مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے پاکستان اُسی رات لے لیا تھا جس رات ہم نے اس انگریز لفٹین کو قتل کیا تھا۔ بول سمجھ لو کہ ہم نے ایک انگریز لفٹین کی نہیں، انگریزی راج کی لاش گڑھے میں دبا دی تھی.... اب کہو کہ یہ غلط ہے تو میں تم کو بتاتا ہوں کہ یہ غلط نہیں ہے۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب ہمیں کہا جاتا تھا کہ کسی انگریز کی طرف انگلی نہ اٹھنا، یہ جرم ہے۔ یہ ایک عقیدہ بن گیا تھا کہ انگریز کی طرف انگلی اٹھانا گناہ کبیرہ ہے لیکن ہم نے اور تم نے انگریز کو بتایا کہ اب اُس نے کسی مسلمان کی طرف انگلی اٹھائی تو اُس انگریز کا پورا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ انگریز ہر گناہ بخش سکتا تھا مگر یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ اُس کا ہندوستانی غلام اُس کے سامنے آنکھ اُٹھائے لیکن ہم نے اور تم جیسے شیر جوانوں نے اُس کے خلاف ہتھیار اٹھائے...

"ارشد باؤ! جلال آباد جیسے چھوٹے سے قصبے میں ایک انگریز لفٹین کا اس طرح قتل ہو جانا کہ مدتوں کا کوئی سراغ ہی نہ ملے، انگریزی راج کے لیے معمولی سی بات نہیں تھی۔ بندر کی دادا دیکھ کی کہ اب مسلمان کو لاٹھیوں، گولیوں اور آنسو گیس سے دبائے رکھنا ممکن نہیں..... مجھے سی۔ آئی۔ ڈی سے پتہ چلا تھا کہ جلال آباد میں ہم نے اُس روز جو مظاہرہ کیا تھا اس کی خفیہ رپورٹ گورنر کو بھیجی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ سارے ہندوستان میں صرف جلال آباد ہی نہیں جہاں مسلمانوں نے یہ مظاہرہ کیا ہے۔ اگر سارے ہندوستان کا نہیں تو اکیلے صوبہ پنجاب کا ہی حساب کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کو دبانے کے لیے سارے ہندوستان کی فوج استعمال کرنی پڑے گی جو کسی صورت ممکن نہیں اور یہ دانشمندی بھی نہیں۔"

ارشد نے ہنس کر پوچھا — "تمہیں یہ رپورٹ کس نے دکھائی تھی کامے؟"

"انسپکٹر عبدالجلیل خان نے!" — کامے نے کہا — "یہ نام تمہیں یاد آیا؟ اسی نے انگریز لفٹین کو اغوا اور قتل کرایا تھا۔ وہ امرتسر پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہوتا تھا۔ یہ باتیں اُس نے مجھے پاکستان میں آکر بتائی تھیں۔"

"وہ پاکستان میں ہے؟" — ارشد نے اشتیاق سے پوچھا — "کامے! میں تو اُسے ملوں گا۔ اب تو وہ ڈی۔ ایس۔ پی ہو گا!"

کامے طنزیہ ہنسی ہنس کر بولا — "اب تو وہ انسپکٹر بھی نہیں رہا۔ تم کہتے ہو وہ ڈی ایس۔ پی ہو گا۔ چار سال گزرے، اُسے معطل کیا گیا، پھر اُسے وقت سے پہلے جبری پنشن پر گھر بھیج دیا گیا۔"

"کیوں؟ جرم کیا تھا؟"

"یہی کہ اُس نے پاکستان کے لیے قربانیاں دی تھیں" — کامے نے آہ بھر کر کہا — "اور

پاکستان میں آکر وہ اُس پاکستان کی باتیں کرتا تھا جس کا مطلب تھا لا الٰہ الا اللہ۔ اُس نے طالب علموں کے ایک جلوس پر آنسو گیس پھینکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ پاکستان کے بچے ہیں اور میں انگریز نہیں ہوں۔ پھر اُس نے ان دو جاگیرداروں سے ٹکر لے لی تھی جن کا میں نے تمہارے ساتھ ذکر کیا تھا۔"

"چوہدری اکرم اور مہر اللہ بخش؟"

"ہاں" — کامے نے کہا — "اُنہوں نے اسے سروس سے نکلوایا ہے مگر وہ چین سے بیٹھ نہیں گیا۔ اُس نے اپنا ایمان بنا رکھا ہے کہ پاکستان کی جڑیں کاٹنے والوں کی گردنیں کاٹ دو..... میں نے وہ ہینڈ لڑکیوں کا ذکر کیا تھا نا؟ ان کے متعلق ساری بات تمہیں وہی بتائے گا۔"

"اگر کبھی ملاقات ہو گئی تو؟"

"میں تمہیں اُسی کے پاس لے جا رہا ہوں ارشد باؤ!" — کامے نے کہا — "معلوم نہیں مجھے تم پر کیا اعتبار آ گیا ہے۔ اگر ان آٹھ برسوں میں تم پاکستان کے شہیدوں کو بھول نہیں گئے تو تم محسوس کرو گے کہ پاکستان کو اب پھر تمہاری ضرورت ہے۔ شاید تمہارے خون کی بھی ضرورت آ پڑے۔ ساری بات تمہیں عبدالجلیل خان بتائے گا۔"

"میں ہر طرح تیار ہوں کامے!"

"اور کاما تانگے والا تو ہر وقت تیار رہتا ہے ارشد باؤ!"

iqbalmt@yahoo.com scanned by

کامے نے تانگہ سڑک پر روکا اور گھوڑے کی لگام کھبے کے ساتھ باندھ دی۔ اس نے ارشد کو ساتھ لیا اور ایک گلی میں چلا گیا۔ کشادہ اور پکی گلیوں کا یہ علاقہ آٹھ سال پہلے ہندو، ڈل اور سکھوں کا علاقہ ہوا کرتا تھا۔ اب یہاں مشرقی پنجاب کے مہاجرین آباد تھے۔

ایک دروازے پر دستک دے کر کامے نے دستک دی۔ ایک قد آور آدمی باہر آیا۔ غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی لیکن لگتا جوان تھا۔ اس کے چہرے پر پختگی اور شگفتگی تھی اور آنکھوں میں ایسی چمک جو دل میں اُتری محسوس ہوتی تھی۔ یہ روح کا پرتو تھا جو اس شخص کے چہرے کا نور بن گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ وہ مطمئن اور مسرور انسان لگتا تھا۔ اس کا چہرہ اور تبسم بتا رہا تھا کہ اس شخص کو کوئی غم نہیں، کوئی رنج نہیں۔

کامے نے ارشد سے کہا تھا کہ وہ اُسے انسپکٹر عبدالجلیل خان کے پاس لے جا رہا ہے۔ یہ شخص عبدالجلیل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسے تو سردوں سے قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی۔ وہ مطمئن اور مسرور نہیں ہو سکتا تھا۔

"لو خان صاحب! یہ ہے ارشد باؤ"۔۔۔ کامے نے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تانگے والوں کے لہجے میں کہا۔ "اصیل نسل۔ اصل شیر کا بچہ۔ ٹھوک بجا کر دیکھ لو۔ کھوٹا نکلے تو آپ کی جوتی میری سائیڈ"۔۔۔ اس نے ارشد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اور ارشد باؤ! یہ ہیں انسپکٹر عبدالجلیل خان۔ ان کے متعلق تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں اور خان صاحب! ارشد کے متعلق آپ کو بہت کچھ بتا چکا ہوں۔"

عبدالجلیل خان کا تبسم بڑی جاندار مسکراہٹ بن گیا۔ اس نے ارشد کو گلے لگا لیا، پھر اسے کامے کو اندر لے گیا۔

"ارشد بھائی!"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا۔ "تھانیداروں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا۔ تم بھی شاید مجھے شک کی نگاہ سے دیکھو لیکن مجھے امید ہے کہ تمہارے تمام شکوک رفع ہو جائیں گے۔"

"کامے نے مجھے آپ کا جو کارنامہ سنایا ہے، وہ اگر سچ ہے تو مجھے آپ پر اعتماد ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا۔ "لیکن خان صاحب! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان انسانوں کی فطرت ہی بدل گئی ہے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔"

"ہم ان لوگوں کی فطرت کو اصل روپ میں لے آئیں گے"۔۔۔ عبدالجلیل خان نے کہا۔ "تمہیں اسی مقصد کے لیے بلایا ہے۔"

عبدالجلیل نے ارشد سے اُس کے خاندان کے متعلق، جلال آباد میں اُس کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق، وہاں کی جائیداد، یہاں اُس کے بدلے جو کچھ الاٹ کرایا، موجودہ پوزیشن اور پاکستان کے متعلق اُس کے نظریات کے بارے میں یوں پوچھنا شروع کر دیا جیسے وہ کسی مشتبہ کو شاملِ تفتیش کر کے پوچھ گچھ کر رہا ہو۔

وہ ارشد کو بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم مجھ سے اکتا چکے ہو گے!"۔۔۔ عبدالجلیل خان نے کہا۔ "ایک آخری سوال ہے۔۔۔ کیا تم پاکستان کے موجودہ حالات سے مطمئن ہو؟"

"نہیں"۔۔۔ ارشد نے جواب دیا۔

"تم کیا محسوس کر رہے ہو"۔۔۔ عبدالجلیل نے پوچھا۔ "ذرا ٹھہرو۔۔۔ میں جو محسوس کر رہا ہوں وہ تمہیں بتاتا ہوں۔ تم اس کے مطابق سوچ کر جواب دینا۔۔۔ پاکستان کی عمر صرف آٹھ برس ہوتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں آٹھ برس آٹھ لمحوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اتنے کم عرصے میں وہ پاکستان ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے جس کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے پوری ایک صدی جان اور مال کے نذرانے دیتے تھے۔"

"خان صاحب!"۔۔۔ ارشد نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں ہم نے اپنے آپ کو انگریز سے آزاد کرایا اور یہ خطہ حاصل کیا تھا۔ ہماری جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اب ہمیں پاکستان کو آزاد کرانا ہے۔"

"کس سے؟"

"مذہب اور سیاست کے ان لیڈروں سے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک نظریۂ پاکستان کے مخالف تھے۔ ان میں سے بعض انگریز کے پروردہ تھے اور بعض ہندو کے دوست اور ہمی خواہ۔ اب وہ پاکستان کی باگ دوڑ پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم انگریز سے آزاد نہیں ہوئے۔ ہم انگریز اور ہندو کے جانشین اور حاشیہ بردار وں کے غلام ہو گئے ہیں۔"

"ہیں پاکستان کے ان آقاؤں کے خلاف کام کرنا ہے"۔۔۔ عبدالجلیل خان نے کہا۔ "اور یہ کام زمین کے نیچے ہو گا۔۔۔ میں کہہ رہا تھا کہ اتنے قلیل عرصے میں پاکستان کا یہ حال ہو گیا ہے تو تھوڑا سا عرصہ اور گزرنا تو۔۔۔ تو۔۔۔ ارشد بھائی! میں تو اس انجام کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہوں۔۔۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں تم پر کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں کہ تم ہمارا ساتھ دو گے اور دھوکہ نہیں دو گے؟ تم سرکاری ملازم ہو۔"

"خان صاحب!"۔۔۔ ارشد نے کہا۔ "یہی سوال میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ پر کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں؟ آپ پولیس انسپکٹر تھے۔ آپ کوڈی۔ ایس۔ پی بننا تھا مگر ایک وزیر آپ سے ناراض ہو گیا اور آپ کو کسی جرم کے بغیر جبری پنشن پر گھر بھیج دیا گیا۔ میں آپ پر شک کر سکتا ہوں کہ آپ حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں کی مخبری کر رہے ہیں جو موجودہ حکومت کے خلاف ہیں۔"

"ایسا شک نہ کرو ارشد باؤ!"۔۔۔ کامے نے کہا۔ "خان صاحب کو تم نہیں جانتے۔"

"مجھے خوشی ہوئی ہے ارشد!"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا۔ "اس ملک میں کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھو۔ دل کی بات کسی کو نہ بتاؤ۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس سے تمہیں یقین دلاؤں کہ میں سرکار کا مخبر نہیں۔ اگر مخبری ہی کرنی ہوتی تو میں وزیروں کی حکم عدولی کیوں کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ حکم عدولی کی سزا ملے گی ہے لیکن میں غلط حکم نہیں مان سکتا تھا۔۔۔ مجھے تمہارے متعلق کسی نے نہیں بتایا تھا کہ تم پاکستان کے موجودہ حالات سے نالاں ہو۔ مجھے کامے نے صرف یہ بتایا تھا کہ تم تحریکِ پاکستان کے مجاہد نہیں جانباز ہو اور تم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صفِ اوّل کے کارکن تھے۔"

iqbalmt@onet.pl scanned by

"اگر آپ مجرمی ہی کر رہے ہیں تو آپ نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر غلطی نہیں کی"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔ "پاکستان کے جو معدودے چند حکمران آتے ہیں، میں ان کا جانی دشمن ہوں۔ انہوں نے پاکستان کو مثالی مملکت بنانے کی بجائے سارا زور ہر سرکاری ذرائع قوم کے خزانے کا پیسہ اور پولیس کا محکمہ اپنے مخالفین کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا اور ملک کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا۔ میرے وہ تمام ساتھی جو آٹھ سال پہلے نوجوان تھے، سٹوڈنٹ تھے، پاکستان کو اقتدار کا اکھاڑہ بنانے والوں کے دشمن ہیں۔ وہ دانستہ پیس رہے ہیں۔ کر کچھ نہیں سکتے"۔

ارشد کی آواز میں وہی جلال آباد والا جلال اور تحریک پاکستان والا جوش آ جا رہا تھا۔ عبدالجلیل خان اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے مسحور ہو گیا ہو۔

"خان صاحب!"۔۔۔ ارشد کہہ رہا تھا۔۔۔ "آج کا پاکستان جو انگریزوں کے پیچھے چھوڑے ہوئے جاگیرداروں اور وڈیروں کی ذاتی جاگیر بن گیا ہے، ۴۷-۱۹۴۶ء کے نوجوانوں، طلبا اور طالبات کو کسی طرح مطمئن کر سکتا ہے۔ آپ بھولے تو نہیں ہوں گے کہ اس وقت کے طالب علموں نے کالجوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دن رات تحریک میں مصروف رہتے تھے۔ ان میں سے کتنی ایک گرفتار ہوئے۔ پولیس کے تشدد اور اذیت رسانی نے انھیں جسمانی اور بعض کو دماغی لحاظ سے معذور کر دیا تھا۔ کچھ ایسے لاپتہ ہوئے جن کا سراغ تک نہ ملا۔ کئی ایک پولیس کی لاٹھیوں اور گولیوں سے شہید ہو گئے تھے۔۔۔۔

"باقی پاکستان کو ہجرت کر آئے۔ انہوں نے تعلیم ادھوری تحریک پاکستان پر قربان کر دی تھیں۔ خود میں بی۔ اے نہ کر سکا۔ وہ میرا آخری سال تھا، میرے تمام ہم جماعت میرے ساتھی تھے۔ کسی نے بھی بی۔ اے نہ کی کہ بی۔ اے کا آخری سال ہے۔ ہم میں اس احساس نے قہر بھر دیا تھا کہ پاکستان کا آخری معرکہ ہے۔ ہم ہار گئے تو ہمیشہ کے لیے ہار جائیں گے اور ہر بھنگی کا وارث ہندو ہو جائے گا۔۔۔ خان صاحب! ہمارے ساتھ المیہ۔ اسے کے دونوں سالوں کے طلبا بھی تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں خان صاحب! پاکستان میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ انہیں اچھی ملازمتیں نہ مل سکیں کیونکہ ان کے پاس ڈگریاں نہیں تھیں۔ ان کی کسی نے نہ سنی کہ انہوں نے اپنی ڈگریاں پاکستان پر قربان کر دی تھیں۔ کسی نے بہال لاہور میں اپنے والد کو قتل دیکھے ہیں۔ وہ آڑھتیوں کے منشی ہیں۔ وہ سرحد پار بی۔ اے کے آخری سال میں تھے مگر تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔۔۔

"اور خان صاحب! میں اپنے محکمے میں آپ کو ایک افسر دیکھ سکتا ہوں۔ وہ جلال آباد میں میرے کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ بی۔ اے نہیں کر سکا تھا۔ وہ سٹوڈنٹ فیڈریشن میں بھی نہیں تھا۔ تحریک کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک ٹینینٹ زمیندار کا بیٹا ہے۔ بہال آتے ہی وہ گزیٹڈ آفیسر ہو گیا اور اُس نے اپنے نام کے ساتھ ایم۔ اے لکھنا شروع کر دیا"۔

"تم ایک زمیندار کے بیٹے کو جانتے ہو ارشد!"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں ایسے کئی بیٹے دکھا سکتا ہوں جنہوں نے بڑی مشکل سے دس جماعتیں پاس کی تھیں لیکن ان کے پاس بی۔ اے کی ڈگریاں ہیں اور سرکاری محکموں میں اچھے عہدوں پر ملازم ہیں۔ انہوں نے ڈگریاں خریدی تھیں۔ انہیں کوئی قانون پکڑ نہیں سکتا۔ قانون اُن کا ہے جن کے یہ بیٹے ہیں"۔

"میں کہہ رہا تھا کہ آپ اگر مخبری کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے صحیح آدمی کو پکڑا ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔ "میں ان لیڈروں کا جانی دشمن ہوں۔ مجھے وہ پاکستان چاہیے جو میرے دوستوں نے بنایا تھا"۔

"ارشد باؤ"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "خان صاحب رہتک کے رہنے والے ہیں۔ یہ تو اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ امرتسر میں تھے۔ وہیں سے لاہور آ گئے۔ ان کے والد صاحب، والدہ، دو بھائی، ایک بہن ایک چچا اور بہن کے بچے رہتک میں تھے۔ سب شہید ہو گئے تھے"۔

ارشد نے عبدالجلیل کی طرف دیکھا۔ عبدالجلیل کے چہرے پر دبی دبی گھنگھناہٹ اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو پہلے تھی۔ اُسے اپنے پورے کے پورے خاندان کے ختم ہو جانے کا جیسے کوئی غم نہیں تھا۔

"مجھ پر اعتبار کرو ارشد!"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا۔

درد مشترک تھا۔ جذبہ ایک تھا۔ دلوں کے زخم ایک جیسے تھے خون ایک تھا۔ وہ بیٹیاں سب کی تھیں جو سرحد پار اغوا اور بے آبرو ہوئی تھیں۔ وہ بچے سب کے تھے جو کرپانوں اور برچھیوں سے کٹ گئے تھے۔ وہ لاشیں ایک ہی قوم کی تھیں جو مشرقی پنجاب کے کھیتوں میں بکھری تھیں۔ عبدالجلیل خان اور ارشد اسی قوم کے فرد تھے۔ دل نے دل کو پہچان لیا۔

○

ایک عورت چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی۔

"السلام علیکم"۔۔۔ اُس نے کہا اور ٹرے تپائی پر رکھ کر اُس نے نظریں ارشد کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ارشد کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو؟"۔۔۔ عبدالجلیل نے اس سے پوچھا اور ارشد سے کہا۔۔۔ "ارشد بھائی! یہ میری بیوی ہے"۔

"بھائی جان!"۔۔۔ عورت نے کہا۔۔۔ "میں نام بھول گئی تھی۔ ارشد صاحب کو میں یاد نہیں رہی۔ میری اس وقت نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ مجھے امرتسر لے آئے تھے"۔

"یہ تحریک میں اسی طرح سرگرم رہی ہے جس طرح ارشد تم سرگرم تھے"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا۔۔۔ "اور جس روز تم نے جلال آباد میں آخری جلوس نکالا اور تھانے پر قبضہ کیا تھا، اس روز یہ جلال آباد میں تھی اور عورتوں کے جلوس میں شامل تھی۔ یہ جلوس میں تھی اور خاوند جلوس کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنے کے لیے ڈیوٹی پر تھا"۔

"میں نے آپ کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ والی حویلی میں دیکھا تھا"۔ عبدالجلیل کی بیوی نے کہا۔۔۔ "آپ تین چار لڑکیوں کو ساتھ لاتے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جلال آباد کے اس مظاہرے میں جان ڈالنے کے لیے وہاں کی مسلم لیگ نے امرتسر مسلم لیگ سے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ عورتیں جلال آباد بھیجی جائیں۔ ہم پینتالیس لڑکیاں امرتسر سے جلال آباد گئی تھیں۔ مجھے وہ لڑکی یاد ہے جس نے تھانے کے سامنے نیشنل گارڈ کے گھوڑے پر کھڑے ہو کر بڑی جوشیلی تقریر کی تھی"۔

"طاہرہ"۔۔۔ ارشد نے کہا۔۔۔ "اُس کا نام طاہرہ ہے"۔

کچھ پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ انہیں بہت یاد کیا گیا جو اُن کی صفوں کے مجاہدین تھے۔ جس کا بھی نام آتا اُس کی باتیں یاد کی جاتیں اور ہر ایک کی باتوں کے بعد یہ الفاظ ضرور کہے جاتے۔۔۔ "معلوم نہیں زندہ آیا کہ نہیں"۔۔۔ معلوم نہیں کہاں ہو گا۔۔۔ وہ موت کے ساتھ میں سُوتے منزل چلے تھے اور منزل تک کوئی کوئی پہنچا

iqbalmt@onedrive.com scanned by iqbalmt@onedrive.com

تھا۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا!

ارشد نے عبدالجلیل سے پوچھا ۔"کیا آپ نے مجھے باتوں کے لیے بلایا تھا یا کچھ کرنا ہے؟"

"کچھ کرنا ہے"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا ۔"لیکن کامے نے بتایا ہے کہ تم شادی شدہ ہو اور تمھارے بچے بھی ہیں؟"

"میرا ایک ہی بچہ ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔"لیکن شادی دو چار سال بعد ہو گی؟"

سب نے اُسے حیران ہو کے دیکھا۔ ارشد مسکرانے لگا۔ ذرا سا خاموش رہ کر اُس نے اپنی شادی کی کہانی سنادی اور انہیں بتایا کہ اب وہ اُس طاہرہ کے ساتھ شادی کر رہا ہے جس نے تھانے کے سامنے جوشیلی اور جذباتی تقریر کر کے ہجوم کو مشتعل کر دیا تھا۔

"ہمیں اس لڑکی کی گرفتاری کا حکم ملا تھا"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا ۔"تم لوگوں نے بڑی عقل مندی کی تھی کہ اسے فوراً نائب کر دیا تھا۔ جلال آباد کے تھانیدار کو حکم ملا تھا کہ اس لڑکی کو گرفتار کر کے بغیر مقدمے کے جیل بھجوا دیا جائے۔ اسے گرفتار کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ وہاں کا تھانیدار میرے ساتھ میری گہری دوستی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھ پر احسان کرے اور اس لڑکی کو گرفتار نہ کرے۔ اُس نے دوستی کا حق ادا کیا۔ اس طرح طاہرہ گرفتاری سے بچ گئی؟"

"طاہرہ میری روحانی قوت ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔"وہ نہیں ملتی تو میں جیسے ادھورا تھا۔ اپنی شادی سے میرا جو بچہ ہے اسے میں اور طاہرہ پاکستان کے لیے جوان کریں گے۔ ہم اُسے اُس کی تعلیم کو نہیں اُس کے فرض کو دول گا۔۔۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور یہ بھی کہ ہم کون ہیں اور کون کون ہیں؟"

عبدالجلیل خان نے آہ لی۔ ارشد کو سر سے پاؤں تک پھر پاؤں سے سر تک دیکھا اور بولا ۔"تمہارے ساتھ کون کون ہے اور ہماری تعداد کیا ہے؟ یہ سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ ہمیں حکومت کا تختہ نہیں الٹنا۔ اگر ایک بار تختہ الٹنے کا رواج شروع ہو گیا تو اس ملک میں تختے ہی الٹتے رہیں گے۔ پھر جس کسی کے ہاتھ لاٹھی آجائے گی بھینس اُسی کی ہو گی۔ فوج کی مدد کے بغیر تختہ نہیں اُلٹا جا سکتا۔ میں تجربہ کار اور جہاندیدہ نہیں ہوں ارشد! میں یہ جانتا ہوں کہ ایک بار فوج سیاست میں آگئی تو فوج پھر بیرکوں میں کبھی نہیں جاتی۔ یاد رکھو ارشد! کسی بھی ملک کی سلامتی ایک مضبوط، پُرعزم اور قوی جذبے سے سرشار فوج کے بغیر ممکن نہیں لیکن پاکستان کو تو بہت سی زیادہ مضبوط اور ایماندار فوج کی ضرورت ہے کیونکہ پاکستان کا سامنا ایک ایسے دشمن کیساتھ ہے جو اس کے وجود کا ہی منکر ہے اور جو پاکستان کو اپنے ملک کا حصہ سمجھتا ہے۔ وہ برصغیر سے اسلام کا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے....

"۱۹۴۷ء میں اُس نے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ وہ ابھی تک مسلم کُشی کی مہم جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہاں مسجدیں ویران ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ پاکستان کی فوج جتنی طاقتور ہو گی، ہندوؤں پر اُس کی اتنی ہی دہشت طاری رہے گی اور ہندوستان کے مسلمان اور وہاں کی مسجدیں محفوظ رہیں گی۔ اگر ہم نے فوج کو سیاست میں گھسیٹ لیا اور اگر سیاسی لیڈروں نے اسے اقتدار کے حصول کا آلۂ کار بنا دیا تو فوج ملک کے دفاع کے قابل نہیں رہے گی۔ دشمن ہمارے خلاف تیاری کرتا رہے گا اور اُس کے لیے ہماری سرحدیں کھلا دروازہ بنی رہیں گی؟"

"پھر ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔"میں اپنے دشمن کو اچھی طرح پہچاننا چاہتا ہوں؟"

"فوج کا مقابلہ فوج کیا کرتی ہے"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا ۔"ہمارا مقابلہ اسی دشمن کی ایک اور فوج سے ہو گا۔ یہ ہے اس کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کی فوج۔ دشمن کی اس فوج میں وہ پاکستانی بھی شامل ہیں جو اسے پاکستان میں پناہ اور مدد دیتے ہیں۔ ان میں وہ سیاسی اور مذہبی لیڈر شامل ہیں جو نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے۔ وہ اب پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے دشمن کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کہا کرتے تھے کہ پاکستان ایک مذاق ہے۔ اگر مسلمانوں نے پاکستان حاصل کر بھی لیا تو یہ چند دنوں کا کھیل ثابت ہو گا۔ وہ پاکستان کی جڑیں کاٹ کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اُنہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔"

"کیا آپ ہندوستان کے کسی جاسوس اور تخریب کار کو جانتے ہیں؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا۔

"میں تمہیں یہی بتانے لگا تھا"۔۔۔ عبدالجلیل نے جواب دیا ۔"دو ہندو لڑکیاں ہیں۔ بہت خوبصورت۔ بہت شوخ۔ پتھر کو پگھلا سکتی ہیں۔ تم جیسے جوانوں کو انگلیوں پر نچا سکتی ہیں؟"

"مجھے یہ بتائیں کہ اس وقت کون اُن کی انگلیوں پر ناچ رہا ہے؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا۔

"امرتسر کے دو جاگیردار"۔۔۔ عبدالجلیل نے جواب دیا ۔"ایک کا نام مہراللہ بخش ہے، اور۔۔۔"

"اور دوسرے کا نام چوہدری اکرم ہے"۔۔۔ ارشد نے اُس کی بات پوری کر دی۔

"تم اُسے جانتے ہو؟"

"کامے نے یہ دو نام بتائے تھے"۔۔۔ ارشد نے کہا ۔"میرے ابا جان انہیں جانتے ہیں۔ ان میں ایک پنجاب اسمبلی کا ممبر ہے اور۔۔۔"

"اور دوسرا صوبائی اسمبلی کا"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا ۔"اسمبلیوں کے ممبروں کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی کہ ملک کے اندازِ اور اہم معاملات میں دخل اندازی کر سکیں یا سرکاری پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکیں لیکن یہ دونوں آدمی [illegible] کھیلنا جانتے ہیں اور اثر و رسوخ والے ہیں۔ یہ دونوں ہندو لڑکیاں اسلامی ناموں سے سمال ٹاؤن کی بستیوں میں رہتی ہیں۔ ان کے خاوند بھی ہیں:"

"وہ ہندو ہوں گے"۔

"نہیں"۔۔۔ عبدالجلیل نے جواب دیا ۔"وہ مسلمان ہیں۔ دونوں ان جاگیرداروں کے آدمی ہیں۔ ان کا تعلق سمگلروں کے ساتھ ہے۔ سمگلروں کے ذریعے یہاں سے رازاور اہم خبریں ہندوستان کو جاتی ہیں۔ یہ دونوں کوٹھیاں ہندوستان کے اڈے ہیں۔ وہاں پاکستان کے بڑے بڑے افسر جاتے ہیں۔ وہاں ہندوستان کا پیسہ تقسیم ہوتا ہے؟"

"وہ کون سے راز ہیں جو اسمبلیوں کے ان دو ممبروں کے پاس ہوں گے؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا۔

"میں انگریزوں کی پولیس میں رہا ہوں"۔۔۔ عبدالجلیل نے جواب دیا ۔"ہمارا واسطہ جرمنی اور جاپان کے جاسوسوں اور تخریب کاروں سے پڑتا رہا ہے۔ جاسوسی میں ان دونوں ملکوں کا مقابلہ کوئی ملک نہیں کر سکتا۔ میں نے جاسوسوں کی سراغرسانی کی ٹریننگ لی تھی۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جاسوس فوجی راز کہیں اور سے لیتے ہیں اور چھپنے اور اپنے ملک کو جانے کی مدد کہیں اور سے لیتے ہیں۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ اسمبلیوں کے ممبروں کے پاس فوجی راز نہیں ہوتے ہمارے یہ دو ممبر چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش جاسوسوں کو صرف چھپاتے ہوں گے؟"

www.iqbalmt@gmail.com scanned by
خوبصورت لوگوں کی محفل

"کیا ہماری انٹیلی جنس اتنی کمزور ہے کہ اس کی موجودگی میں ہندوستان کے جاسوس اور تخریب کار یہاں اڈے بناتے پھرتے ہیں؟"

"انٹیلی جنس کمزور نہیں ارشد بھائی!" — عبدالجلیل نے کہا — "لیکن انٹیلی جنس کا محکمہ پکڑ سکتا ہے، کسی کو سزا نہیں دے سکتا۔ سزا کے لیے کیس عدالت میں بھیجنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ مجرموں کو سزا دلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں۔"

"اگر ہم ان دو لڑکیوں اور ان کے براستے نام خاوندوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں؟" — ارشد نے کہا — "یا ان کے خلاف رپورٹ کر دیں تو کیا ہوگا؟"

"ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی" — عبدالجلیل نے کہا — "تمہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے خلاف کسی فرضی جرم میں کارروائی ہو جائے۔ تمہیں تخریب کار اور کمیونسٹ کہا جائے گا۔ ایسا ہو چکا ہے اور ایسے ہی ہوگا۔"

ارشد کچھ دیر عبدالجلیل کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ عبدالجلیل ہنس پڑا۔

"ہم نے انگریزوں کے خلاف کھلی جنگ لڑی تھی" — ارشد نے کہا — "میں نہیں جانتا خفیہ طور پر کسی کے خلاف کس طرح لڑا جاتا ہے۔"

"جاسوس بن کر" — عبدالجلیل نے کہا — "ان کی کارروائیاں زمین دوز ہوتی ہیں، اس لیے ان کے خلاف جنگ بھی زمین دوز لڑی جاتی ہے۔ قوم کے پیچھے چھپے کو یہ ٹریننگ ملنی چاہیے کہ دشمن کے جاسوسوں کو پہچان سکے اور ان کے خلاف کارروائی کر سکے۔ تخریب کاری صرف یہ نہیں ہوتی کہ کہیں بم اڑا دیا یا کسی سرکاری عمارت میں دھماکہ کر دیا، گولہ بارود کے کسی سٹور کو اڑا دیا۔ تخریب کاری نظریاتی بھی ہوتی ہے جو حال آٹھ برسوں میں مشرقی پاکستان میں شروع ہو چکی ہے۔ اگر ہماری طرف سے جوابی انسدادی کارروائی نہ ہوئی تو یہ ناممکن نہیں کہ مشرقی پاکستان ہم سے کٹ جائے۔"

"نہیں خان صاحب!" — ارشد نے تڑپ کر کہا — "ایسا نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کا کوئی حصہ بھی الگ نہیں ہو سکتا۔"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے ارشد بھائی!" — عبدالجلیل نے کہا — "ہم خوش فہمیوں میں جینے والے لوگ ہیں۔ عرگوش کو ہم اپنی تیز رفتاری کی خوش فہمی تھی لیکن دو کچھوے نے جیت لی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ خرگوش ہمیں کچھوے سے شکست دلائے گی۔ ایک پہلو پر غور کرو ارشد! ہمارے حکمران اور وزیر سیاسی ہوتے ہیں اور ان کی سیاست اقتدار کے گرد گھومتی ہے۔ انہیں جب یقین ہو جاتا ہے کہ دشمن کے جاسوس سے اُن کی کرسیٔ اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ دشمن سے نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔"

"بات پوری کرو خان صاحب!" — کامے نے کہا — "اگر ہمارے کسی بھی لیڈر کو اپنے ملک اور اپنے مذہب کا دشمن یقین دلا دے کہ وہ اُسے اقتدار میں لے آئے گا، اس کے عوض وہ اس کے جاسوسوں کو پاکستان میں کھلی چھٹی دے دے تو وہ لیڈر دشمن سے دوستی کرے گا۔"

"ان حالات میں ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟" — ارشد نے کہا — "میرے دماغ میں تو یہی آتا ہے کہ جس کے متعلق ہمیں یقین ہو جائے کہ یہ دشمن کا جاسوس ہے اسے ایسے طریقے سے قتل کر دیں کہ قاتل

کا سراغ نہ ملے۔"

"ہو سکتا ہے ہمیں قتل ہونا پڑے۔" — عبدالجلیل نے کہا — "ہم نے خون دے کر یہ ملک بنایا تھا، خون دے کر ہی اسے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم سب یہ سوچنے بیٹھ جائیں کہ خون کون دے تو وہ دن جلدی آ جائے گا جب دشمن ہمیں آ کر دبوچ لے گا۔"

"ارشد باؤ!" — کامے نے کہا — "تم فکر نہ کرو خون دینے کے لیے ہم موجود ہیں۔ جس طرح مجھ جیسی مخلوق ۴۷-۱۹۴۶ء میں تمہارے ساتھ رہی ہے اسی طرح اب بھی ساتھ ہوگی۔ ہماری بیٹیاں اغوا ہوئی ہیں ارشد باؤ! ہم اس دشمن کو کس طرح دوست بنا سکتے ہیں۔ تم اپنی قوم کو جانتے ہو۔ یہ قوم ہے جو ہندو کی دوستی کو قبول نہیں کر رہی، ورنہ ہمارے وزیرِ اعظم کبھی کے پاکستان کا سودا کر چکے ہوتے۔"

"کیا ہمارے ساتھ اتنے آدمی ہیں جو سارے پاکستان میں پھیل کر ہندوستان کے ایجنٹوں کا قلع قمع کر سکیں؟" — ارشد نے کہا — "ہم زیادہ سے زیادہ ان دو لڑکیوں کو ختم کر سکتے ہیں۔"

"ذرا اور گہرائی میں جاؤ ارشد!" — عبدالجلیل نے کہا — "ہم نے پاکستان ایک دن میں حاصل نہیں کر لیا تھا۔ قرار دادِ پاکستان ۱۹۴۰ء میں پاس ہوئی تھی لیکن اس قرار داد کی جڑیں، دور پچھلی صدی میں گئی ہوئی تھیں۔ اس کی بنیادی پتھر تحریکِ مجاہدین کے جانبازوں نے رکھا تھا۔ فتح یا کامیابی ایک رات میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ جہد جاری رہے تو جبھی برسوں گزر جاتے ہیں۔ کام جو تم شروع کرو گے وہ تمہارے بچے مکمل کریں گے۔ مخالف قوت زیادہ ہوئی تو ہو سکتا ہے تمہارے بچوں کے بچے وہ کام مکمل کر سکیں۔"

"اتنی دیر تک دشمن ہماری جڑیں کاٹ چکا ہوگا۔" — ارشد نے کہا۔

"نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں یہ بھی سمجھا دیتا ہوں۔" — عبدالجلیل نے کہا — "اگر ہم نے دشمن کے دو چار ایجنٹوں کو لاپتہ کر دیا تو دشمن بھی چوکنا ہو جائے گا اور دشمن کے پاکستانی دوست بھی ذرا پھونک کر قدم اٹھائیں گے۔ ہم اپنا تحفظ بھی رکھیں گے۔ اپنے ساتھیوں میں اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ دشمن کے آدمیوں اور ان کے حمایی دوستوں کی گشتگی کی وارداتیں بڑھتی جائیں گی۔ اس سے دشمن بھی اور ہماری حکومت بھی سمجھ جائے گی کہ ملک میں ایک زمین دوز جنگ چل رہی ہے۔ ہمیں اپنی حکومت کے خلاف کچھ نہیں کرنا۔ ہمیں اپنے آپ کو خانہ جنگی کے راستے پر نہیں ڈالنا۔ ہمیں سیاسی نوعیت کے جلسے، مظاہرے اور ہنگامے نہیں کرنے۔"

"میں تمہیں اپنی مثال دیتا ہوں۔ وہ سکولوں اور کالجوں کے طلبا کا جلوس تھا جس پر مجھے لاٹھی چارج کا حکم ملا تھا۔ میں نے اپنی آدھی لمبی نوکری قربان کر دی۔ آدھی نہیں قربان کر دی لیکن یہ حکم نہ مانا۔ مجھے معلوم تھا کہ دو سیاسی پارٹیوں کے مل کر ہمارے بچوں کو آلۂ کار بنایا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں افواہیں پھیلائی گئی تھیں کہ برسرِ اقتدار پارٹی کے ایک وزیر کے حکم سے پانچ طلبا کو پولیس سے پٹوایا گیا ہے۔ یہ محض افواہ تھی۔ بے بنیاد خبر تھی۔ یہ حزبِ مخالف کی اڑائی ہوئی تھی اور مقصد یہ تھا کہ طلبا کو حکومت کے خلاف بھڑکا کر ان کے جلوس نکلوائے جائیں۔۔۔۔

"طلبا کا جلوس نکلا جو پُرامن تھا۔ لوگوں نے تقریریں کیں اور جلوس منتشر ہو گیا۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن جلوس پر تشدد کرنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے جلوس میں سرکاری غنڈے شامل کر دیئے گئے۔ میں ان میں سے کئی ایک کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا تھا۔۔۔۔ ارشد بھائی! تم شاید یقین نہ کرو، جلوس میں ہمارے

iqbalmt@onedrive.com scanned by

بڑے دشمن ہندوستان کے ایجنٹ بھی شامل ہو گئے تھے۔ میں ان میں سے دو کو پہچانتا تھا۔ دشمن ایسے ہنگاموں میں جلتی پر تیل ڈالا کرتا ہے تاکہ پاکستان میں بدامنی پھیلے۔ چنانچہ برسرِ اقتدار پارٹی کے غنڈوں نے طلبا کے پُرامن جلوس کو ٹول بجرل کا ہجوم بنا دیا کہ وکالتوں میں توڑ پھوڑ اور لوٹ مار شروع کر دی۔ دشمن کے ایجنٹوں نے پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ طلبا۔ کچلے ذہنوں کے لڑکے تھے۔ ان میں سے کچھ پتھراؤ میں شامل ہو گئے۔۔۔

"مجسٹریٹ نے لاؤڈ سپیکر پر جلوس کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سرکاری غنڈے اور کچھ اور آدمی جن میں دشمن کے تخریب کار شامل تھے جلوس کو منتشر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ مجھے جلوس پر لاٹھی چارج کا حکم ملا۔ میں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ لاٹھی چارج کی کوئی ضرورت نہیں۔ جلوس میں غنڈے شامل ہو گئے ہیں میں انہیں جانتا ہوں میں انہیں گرفتار کر لوں گا۔ اسی سے جلوس پُرامن ہو جائے گا۔۔۔۔

"مجسٹریٹ ایک انسپکٹر کے مشورے کو اپنی توہین سمجھا۔ اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ میں لاٹھی چارج کروں۔ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کو بلایا۔ اُس نے بھی مجسٹریٹ کا حکم دہرایا۔ میں نے اُسے بھی وہی مشورہ دیا جو مجسٹریٹ کو دیا تھا۔ اُس نے بھی مجسٹریٹ کی طرح مجھے ڈانٹا۔ مجھے جلال آباد کا وہ جلوس یاد آ گیا جو تم لوگوں نے نکالا تھا۔ میں انگریز کا نوکر تھا لیکن میں نے انگریز لیفٹیننٹ سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس جلوس پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس پھینکنے کی حماقت نہ کرنا۔ اُس نے مجھے گالی دی تھی۔ اُس کے انجام سے تم واقف ہو۔۔۔

"اب یہاں میں دیکھ رہا تھا کہ طلبا کا کوئی جرم نہیں۔ میں نے لاٹھی چارج نہ کیا تو ڈی۔ ایس۔ پی نے خود ہی لاٹھی چارج کا حکم دے دیا اور مجھے معطل کر دیا۔ رپورٹ وزیرِ داخلہ تک پہنچی۔ اُس نے مجھے بلایا اور لیکچر دینے لگا۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ جناب! میں حیران ہوں کہ آپ وزیر ہیں اور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوں اور آپ مجھے اپنے محل بلا کر لیکچر دے رہے ہیں۔ میں اتنا اہم آدمی نہیں ہوں۔۔۔ اس نے مجھے بے معنی سا جواب دیا۔ میں نے اُسے کھری کھری سنا دیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے ارشد بھائی! ہر سال حکمرانی پولیس کے سہارے کی جاتی ہے۔ ملک میں ڈاکے پڑتے رہیں۔ قتل ہوتے رہیں۔ بلوے اٹھتے رہیں، پولیس سے جواب طلبی نہیں ہوتی۔ پولیس کا فرض یہ ہے کہ حکمران کی کرسی اُس کے نیچے سے نہ نکلے اور پولیس حکمران پارٹی کے مخالفین کو سر نہ اٹھانے دے۔۔۔۔ میں نے وزیرِ داخلہ سے کہا کہ یہ ملک اس لیے ویران ہوتا جا رہا ہے کہ غلط حکم مان لیتا ہے میرے سامنے کوئی وزیر اور وزیرِ اعظم نہیں، میری دو بچیاں پاکستان اور پاکستان کے بچوں کے ساتھ ہیں۔۔۔۔ میں اس وزیر کو قاتل نہ کہہ سکا۔ مجھے قبل از وقت جبری پنشن پر گھر بھیج دیا گیا۔۔۔

"میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں ایسی تحریک چلانی ہے جو طلبا کو سیاسی لیڈروں سے محفوظ رکھے اور وہ آلۂ کار نہ بن سکیں۔ یاد رکھو ارشد! سیاسی پارٹی اور تحریک میں سیاہ اور سفید جتنا فرق ہے۔ کامیاب ہمیشہ تحریکیں ہوتی ہیں۔ پاکستان تحریکِ پاکستان کا حاصل ہے۔ آزادی ملتے ہی تحریک ختم ہو گئی اور سیاسی پارٹیاں میدان میں آ گئیں اور ملک اقتدار پرستی کا اکھاڑہ بن گیا۔ تم نے اس کے حالات آٹھ برسوں میں ہی دیکھ لیے ہیں۔ اب ایک اور تحریک کی ضرورت ہے جو پاکستان کو وہ پاکستان بنا دے جس کے لیے ہم نے اپنے پیچھے ذبح کرائے تھے اور جس کا مطلب تھا لا الٰہ الا اللہ۔ وہ پاکستان ہندو کے آسیب سے پاک ہو گا لیکن اسے پاک کرنا پڑے گا۔"

"میں ابھی تک یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے میرا انتخاب کیوں کیا ہے؟" ارشد نے پوچھا۔ "صرف کاسے کے بھر دینے سے آپ کو یقین نہیں کر لینا چاہیے تھا کہ میں اتنی خطرناک تحریک میں آپ کا ساتھ

دوں گا۔"

"صرف اس لیے کہ یہ پاکستان تم نے بنایا ہے۔" عبدالجلیل نے کہا۔ "جو خون تم نے دیکھا ہے جو راہِ حق پر قوم نے بہایا ہے۔۔۔۔ اب تم کہو گے کہ وہ تو لاکھوں اور کروڑوں نے دیکھا ہے۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ وہ سب قابلِ اعتماد ہیں۔ انھیں ایک اشارے کا انتظار ہے۔ شرط یہ ہے کہ اشارہ صحیح سمت کو ہو۔ اور اشارہ مردِ مومن کی فطرت کے مطابق ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ۱۹۴۶ء میں تمہیں سب سے پہلی عورت کو تحریک میں شامل کرنے کے لیے گھر سے باہر لانے میں کتنی دشواری پیش آئی تھی؟ کیا تم بھول گئے ہو کہ پاکستان کا نام سن کر پرانی وضع کے لوگوں نے تمہارا کس طرح مذاق اڑایا تھا؟ انگریزوں کے گماشتے زمیندار نمبردار، ذیلدار، سفید پوش، انعام خور، تھانیداروں کے خوشامدی اور خبر اور مسجد دشمن کے اجارہ دار پاکستان کا نام سنتے ہی کیا تمہارے ساتھ ہو گئے تھے؟۔۔۔

"پھر تم نے انہیں اپنے ساتھ دیکھا۔ بڑے جاگیردار اور مذہب کے بڑے بڑے ٹھیکیدار کسی اور وجہ سے تمہارے خلاف تھے، باقی سب تمہارے محاذ میں آ گئے تھے۔ جس کے پاس جو کچھ تھا اُس نے تحریکِ پاکستان کو دے دیا تھا۔۔۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ انہیں صحیح سمت کا اشارہ ملا تھا۔ وہ مان گئے تھے کہ وہ بھٹکے ہوئے مسافر ہیں تم نے انھیں منزل کا راستہ دکھا دیا تھا۔ اب وہ منزل پر آ گئے ہیں لیکن منزل بھٹک گئی ہے۔ منزل کو ایسے راہبر ملے ہیں جو خضرِ راہ کے بھیس میں رہزن ہیں۔ ہمیں اپنی منزل کو ان سے واپس لینا ہے۔ تم جس کسی سے یہ بات کہو گے وہ تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔۔۔ میں نے تمہارا انتخاب [illegible] نہیں کی۔" عبدالجلیل نے ارشد کی طرف جھک کر دھیمی اور پُرعزم آواز میں کہا۔ "میں نے غلطی نہیں کی ارشد! اگر تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو یہ تمہاری بڑی ہی خطرناک غلطی ہو گی۔ میں خاتب کر دیا جاؤں گا۔"

ارشد نے چونک کر عبدالجلیل کی طرف دیکھا۔ عبدالجلیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ارشد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"اگر تم میرا ساتھ نہ دینا چاہو تو بتا دو اور چلے جاؤ۔" عبدالجلیل نے کہا۔ "پھر ہم ایک دوسرے کی کسی صورت بھی نہیں دیکھیں گے۔ اگر تم نے میرے ساتھ شامل ہو کر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو تمہارا اکلوتا بچہ جو چھ سال اپنی ماں کو ڈھونڈتا رہا ہے، ساری عمر اپنے باپ کو ڈھونڈتا رہے گا۔"

ارشد کا سر جھک گیا۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

"ارشد بھائی!۔۔۔ کچھ دیر بعد عبدالجلیل نے سکوت توڑا۔ "میں نے تمہیں لوٹنے کے لیے دھمکی نہیں دی۔" عبدالجلیل کی آواز کانپ گئی۔ اُس نے ارشد کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس کی انگلیوں نے اُسکے کندھے کو شکنجے کی طرح جکڑ لیا۔ عبدالجلیل کی آواز جواب تک دھیمی دھیمی اور ٹھہری ٹھہری تھی، قہر سے لرزنے لگی۔

"پاکستان لُٹ رہا ہے؟۔۔۔" اُس نے اور زیادہ اونچی آواز سے کہا۔ "اسلام لُٹ رہا ہے۔ اسلام کے قلعے کی دیواروں میں مجھے دراڑیں نظر آ رہی ہیں۔ ایک نئی ہندو قوم کا پاکستان لُٹ رہا ہے۔ ہمارا عزم یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہندوستان کو پاکستان میں شامل کریں گے، تب ہم اس پاکستان کو دشمن سے بچا کر اسے اسلام کا قلعہ بنا سکیں گے۔"

"میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا۔" ارشد نے جذبات سے دبی دبی آواز میں کہا۔ "میں

iqbalmt@gmail.com scanned by

اپنے مذہب اور اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتا۔"

"غداری..... غداری!" — عبدالجلیل نے جذباتیت سے لرزتے لہجے میں کہا — "ہم غداروں کی ڈسی ہوئی قوم ہیں۔ ہماری تاریخ میں جتنی شجاعت ہے، اتنی ہی اس میں غداری ہے۔ ٹیپو کو غداروں نے مروایا، سید احمد شہید کو غداروں نے مروایا، ۱۸۵۷ء میں مجاہدینِ آزادی نے دِلّی پر اسلام کا جو پرچم لہرایا تھا وہ غداروں نے اُتروایا اور دِلّی کے دروازے انگریزوں کے لیے کھول دیے۔ پھر ہندوستان جو اسلامی ملک تھا، اسلام کے شیدائیوں کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں جہنم بن گیا۔ مسلمان پر یہ زمین تنگ ہو گئی پھر بھی تمام کھڑ غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے نعرے بھٹکی ہوئی، دبی دبی سی، گریاں و نالاں گونج بن کے رہ گئے۔"

عبدالجلیل کے ہونٹ کانپنے لگے مگر آواز خاموش ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ اُس کی بیوی برتن اٹھانے کے لیے کمرے میں آئی تو اسے یوں لگا جیسے وہ خلا میں آ گئی ہو۔ کمرے میں اتنی گہری خاموشی تھی جس میں بے وزنی کا احساس ہوتا تھا۔ پیالیوں میں چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ کاسے نائنگے والے نے بھی جائے نہیں پی تھی۔ عبدالجلیل کی بیوی نے سب سے پہلے خاوند کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ چلتی اُس تک گئی اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ نے پھر اپنے خون کو جوش دے لیا ہے؟" — اُس کی بیوی نے ایسے لہجے میں کہا جس میں مال اور بیٹی کے پیار کی جھلک نمایاں تھی۔ اُس نے سنجیدہ سی ہنسی ہنس کر ارشد سے کہا — "بیٹے کیا کرتے ہیں کہ جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے آپ پر جذبات نہیں عقل کو غالب رکھا کرو۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے بھابی جان!" — ارشد نے کہا — "بڑی جذباتی بات ہے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنا محال ہو جاتا ہے۔"

"اپنے آپ کو قابو میں رکھنا پڑے گا ارشد!" — عبدالجلیل کی بیوی نے کہا — "ہم نے جذبات کو قابو میں رکھا تھا اور انہیں ایک قوت بنا کر پاکستان حاصل کر لیا تھا۔ اب بھی اسی قوت کو بروئے کار لا کر ہم پاکستان کو بچا بھی لیں گے۔"

ارشد کو یوں لگا جیسے طاہرہ بول رہی ہو۔ اُس نے چونک کر اس جوان عورت کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ طاہرہ ہی لگتی تھی۔ چہرے پر وہی حسین وقار اور پُرنور سنجیدگی تھی۔

"میں جذباتی نہیں ہوا سلمیٰ!" — عبدالجلیل نے کہا — "ارشد نے پوچھا تھا کہ میں نے اس کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ میرا ذہن بڑی دور پیچھے چلا گیا۔ میں اسے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے سامنے نہ اپنی ذات ہے نہ اس کی ذات ہے، نہ کاسے کی نہ تمھاری، میرے سامنے ایک اللہ کی ذات ہے اور پاکستان ہے جو مملکتِ خداداد ہے مگر یہ انسانی خداؤں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ ہم نے جس دشمن کو شکست دے کر بھگا فتح کیا تھا، وہ ہماری بنیادوں میں اُترتا جا رہا ہے۔"

"ارشد کو اتنی لمبی چوڑی باتیں بتانے کی کیا ضرورت ہے؟" — سلمیٰ نے کہا — "یہ سارا پس منظر جانتا ہے۔ اب آگے کی بات کریں۔"

"وہ کل شام ہو گی۔" — عبدالجلیل نے کہا — "کل شام آ سکتے ہو؟"

"میں لے آؤں گا۔" — کاسے نے کہا۔

"نہیں کاسے!" — ارشد نے کہا — "میں آ جاؤں گا۔"

"کل شام سات بجے۔" — عبدالجلیل نے کہا — "کچھ اور دوستوں سے بھی مُلاقات ہو گی۔"

○

ارشد جب کاسے کے تانگے پر گھر واپس جا رہا تھا تو کاسے نے اُسے بتایا کہ عبدالجلیل کسی بھی وقت گرفتار ہو سکتا ہے کیونکہ امرتسر والے دونوں جاگیردار، مہراللہ بخش اور چوہدری اکبر اس کے سخت خلاف ہیں۔ وہ دونوں سمگلنگ کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے صوبائی وزیروں کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ کاسے نے اس شک کا اظہار بھی کیا کہ دونوں جاگیرداروں کو شاید معلوم ہے کہ عبدالجلیل ان کے خلاف زمین دوز سرگرمیوں میں مصروف ہے۔

"عبدالجلیل کو معلوم ہے؟" — ارشد نے پوچھا۔

"ہاں!" — کاسے نے جواب دیا — "معلوم ہے لیکن اسے پروا ہی نہیں۔ کہتا ہے کہ اس کے خلاف مخبری ہوتی تو وہ معلوم کرے گا کہ مخبر کون ہے۔ اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"میں ایک پہلو پر غور کر رہا ہوں کاسے!" — ارشد نے کہا — "عبدالجلیل کس کے بھروسے اتنی بڑی مہم چلانا چاہتا ہے؟"

"اپنے اخلاق اور کردار کے بھروسے پُتر!" — کاسے نے جواب دیا — "یہ شخص ضلع امرتسر کے تین تھانوں کا ایس۔ ایچ۔ او رہا ہے۔ ان تھانوں کے تمام جرائم پیشہ لوگ اس کے مرید تھے۔ اس کے ایسے کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی چوری ڈاکے کی واردات ہو جائے تو علاقے کے تمام عادی مجرموں کو تھانے بلا کر مارنا پیٹنا شروع کر دے۔ انہی لوگوں کی مدد سے اور اپنی عقل سے چور کو پکڑ لیتا تھا۔ یہاں لاہور میں کسی نامی گرامی جیب کترے کو دیکھ لو تو تمہیں ریتک والے خاں صاحب یاد آ رہے ہیں تو وہ دوڑتا پیچھے گا.... میں تمہیں کچھ بتاؤں ارشد باؤ! مجھے پاکستان کے ساتھ شاید اتنی محبت نہیں ہے جتنی اس شخص کے ساتھ ہے۔ اگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص کو کوئی ذاتی لالچ نہیں تو ہم اس کے کیوں نہ مرید بن جائیں؟"

کاسا ارشد کو اس کی کوٹھی کے سامنے اتار کر چلا گیا۔ طاہرہ ارشد کے انتظار میں بے چین تھی۔

"دوستوں سے مِلنے چلے گئے تھے؟" — طاہرہ نے پوچھا — "کچھ تھکے تھکے سے لگتے ہو؟"

"آج ایک ایسے دوست سے مِل کر آیا ہوں جس نے ساری تھکن دور کر دی ہے۔" — ارشد نے کہا — "تمہیں یاد ہو گا طاہرہ! جلال آباد میں ہم نے جو آخری جلوس نکالا تھا جس میں تم نے تھانے کے سامنے تقریر کی تھی، اس میں ایک انگریز لیفٹیننٹ لاپتہ ہو گیا تھا؟"

"ہاں، سنا تھا۔" — طاہرہ نے کہا — "لیکن اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ افواہ ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انگریز لیفٹیننٹ لاپتہ ہو جاتے؟"

"وہ افواہ نہیں تھی۔" — ارشد نے کہا — "میں اُس پولیس انسپکٹر سے مِل کر آ رہا ہوں جس نے اس انگریز لیفٹیننٹ کو اغوا اور پھر قتل کرایا تھا۔"

ارشد اُسے تفصیل سے بتانے لگا کہ عبدالجلیل خان نے اُس کے ساتھ کیا باتیں کی ہیں اور وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ ارشد بولتا جا رہا تھا اور طاہرہ کے چہرے پر آٹھ نو برس پہلے والا تاثر آتا جا رہا تھا۔ آٹھ نو برس پہلے جب انگریز اور ہندو نے تہیہ کر رکھا تھا کہ پاکستان نہیں بننے دیں گے — طاہرہ کے

iqbalmt@onedu.com Scanned by

چہرے کا یہ تاثر جذبۂ حُریت کی سرخی بن گیا۔ اس دوران طاہر پرویز ان کے پاس آگیا اور وہ بھی ان کی باتیں بڑے غور سے سننے لگا۔

"ابّا جان! آپ کون سے دشمن کی بات کر رہے ہیں؟" — طاہر پرویز نے پوچھا — "ہمارا دشمن کون ہے؟"

"ہم پاکستان کے دشمن کی بات کر رہے ہیں بیٹا!" — طاہرہ نے اُسے بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا — "ہم تمہیں بتائیں گے کہ وہ دشمن کون ہے۔ تم اس دشمن کو مارو گے۔ اُسے اپنے ہاتھوں تباہ کرو گے۔"

پھر ارشد اور طاہرہ باتیں کرتے رہے اور چھ سالہ طاہر پرویز اُن کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دونوں کبھی کبھی بچے کو ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے جیسے یہی ہے وہ بچہ جو اس کام کی تکمیل کرے گا جو وہ شروع کریں گے۔ دونوں اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے کہ بچے کو پاکستان کے وقار اور آن کا محافظ بنانا ہے اور اس کے خون میں اس کے آباؤ اجداد کی روایات کو شامل کرنا ہے، اور اسے اس کے مذہب اور ملک کا دشمن دکھانا ہے۔

اُسی شام لاہور کی ایک کوٹھی کے سامنے اُس وقت کے جدید ماڈلوں کی چار پانچ کاریں کھڑی تھیں۔ اُن دنوں سڑکوں پر کاروں کی یہ بھرمار نہیں تھی جو آج دیکھنے میں آرہی ہے۔ موٹر سائیکل اور سکوٹر بھی بہت کم تھے کیونکہ ابھی پاکستانیوں کو کسی کے باہر کے ملکوں کا راستہ نہیں دیکھا تھا۔ ابھی لوگ پاسپورٹ اور ویزا جیسے الفاظ سے واقف نہیں ہوتے تھے۔ روپے پیسے کا لالچ تو سبھی کے دل میں تھا لیکن کسی کو ابھی یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ روپے پیسے کی کمائی سمندر پار ہیں۔ ابھی تک لوگ عرب کے صحراؤں کو مقدس اور احترام سے کرتے تھے کہ اس ریگزار نے رسولِ خدا کو جنم دیا تھا اور غار حرا ابھی اسی ریگزار میں ہے جس کی تاریکی سے اسلام کی کرنیں پھوٹیں اور اللہ کی زمین اس کے نور سے جگمگا اٹھی تھی۔

وہ وقت ابھی دُور تھا جب پاکستانیوں پر انکشاف ہوا تھا کہ اس مقدس صحرا کے نیچے تیل کا سمندر ہے جو انہیں پکار رہا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب صحراتے عرب سے لوگوں کو اتنا پیسہ نہ رہا کہ وہ وہاں سے اسلام آبا تھا بلکہ اس لیے کہ وہاں سے پیسہ آتا ہے۔ اس پیسے سے جاہل، اَن پڑھ اور پسماندہ ذہنوں کے لوگ بھی کوٹھیاں اور محلات جیسی حویلیاں تعمیر کرا سکتے ہیں اور کاریں خرید سکتے ہیں۔ ابھی لوگ "ڈبی کے پیسے" سے واقف نہیں ہوتے تھے۔ ان کے قریب سے کار گزرتی تھی تو وہ رک کر دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ کسی وزیر کی ہوگی، کوئی بڑا افسر ہوگا، شاید کوئی سمگلر ہو۔

لاہور کی اُس کوٹھی میں اُس وقت کے جدید ماڈلوں کی چار پانچ کاریں کھڑی دیکھ کر راہ جاتے لوگ رک کر دیکھتے اور آگے نکل جاتے تھے۔ وہ سوچتے تھے یہ کوئی شاہی خاندان ہے۔ اس کوٹھی میں ایک حوال سال بڑی خوبصورت بیوی اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ گرمیوں میں وہ سری یا سوات چلے جاتے تھے۔ سردیوں میں اس کوٹھی میں رونق آجاتی تھی۔ ایسی کاریں اس کوٹھی میں آتی ہی رہتی تھیں۔ اُس شام وہاں کاریں کھڑی دیکھ کر کوئی حیران نہ ہوا۔

اس کوٹھی میں رہنے والی کا نام عقیلہ تھا۔ اس کے ہاں اس جیسی ایک بڑی ہی دلکش اور جوان عورت مدعو تھی جس کا نام نسیمہ تھا۔ اس کوٹھی کے قریب سے گزرنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ عقیلہ عقیلہ نہیں اور نسیمہ نسیمہ نہیں۔ لوگوں کو معلوم ہی کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ دونوں ہندو ہیں۔ کوٹھی کے قریب سے گزرنے والے پاکستانیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کوٹھی میں آج شام جو لوگ مدعو ہیں، ان میں ایک ان کا وزیر داخلہ چوہدری نذر حسین ہے اور دوسرا وزارتِ داخلہ کا سیکرٹری، مہراللہ بخش اور چوہدری اکرم بھی مدعو تھے۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ مدعو تھی۔

تلاشِ معاش میں مارے مارے پھرتے رہنے والے اور مشقت کے مارے ہوئے پاکستانیوں کو علم نہ تھا کہ اس کوٹھی میں ان کی قسمت پر مہر ثبت ہو رہی ہے اور انہوں نے آٹھ سال پہلے غلامی کی جو زنجیر [illegible] وہ انہیں پھر پہنانے کے منصوبے بن رہے ہیں۔

کوٹھی کی فضا شراب کی بُو سے مخمور ہوتی جا رہی تھی۔ ہندوستان سے آتی ہوئی ذائقہ سی شراب کے رسیا عقیلہ اور نسیمہ کے حسن و جوانی نے دو دست اور دشمن کو ایک کر دیا تھا۔ سرحدیں مٹ گئی تھیں۔ محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور قائدِ اعظم کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ پاکستانی گہری نیند سو گئے اور پاکستان کی ایک کوٹھی میں دشمن بیدار ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"چوہدری اکرم!" — شراب سے مخمور قہقہوں میں مہراللہ بخش کی سرگوشی سنائی دی — "او تے، اس عبدالجلیل خان کا خیال رکھنا۔ بڑا زہری آدمی ہے۔ سنا ہے کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔"

"اُڑا دوں گا مہر جی!" — چوہدری اکرم نے بدمست آواز میں کہا — "اُس کی بیوی اور بچوں کو اُٹھوا دوں گا۔ میں نے اُس کے پیچھے مخبر لگا رکھے ہیں۔"

اگلی شام ارشد پھر عبدالجلیل خان کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کافی تانگے والے کے علاوہ چار آدمی اور تھے۔ تین ارشد کی عمر کے تھے اور ایک کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ عبدالجلیل نے ارشد کو اس کا نام عبدالقدیر بتایا۔

"یہ ہوشیار پور میں اے۔ ایس۔ آئی پولیس ہوا کرتے تھے" — عبدالجلیل نے عبدالقدیر کے متعلق ارشد کو بتایا — "وہاں ان کے خاندان کا بہت نقصان ہوا تھا۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور بیوی بچوں

iqbalmt@yahoo.com scanned by iqbalmt

کو ساتھ لے آتے تھے۔ ان کے باقی سب رشتہ دار شہید ہو گئے تھے۔ پاکستان میں دو سال بعد جب انہیں ترقی ملنے والی تھی، اپنے ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ ان کی چپقلش چل پڑی۔ اُس نے انہیں رشوت خوری کے جھوٹے الزام میں گرفتار کروا کے سروس سے نکلوا دیا۔ انہوں نے بیروزگاری کا ایک سال ناخوشی میں گزارا ہے۔ پاکستان کے نام پر یہ جان چھڑکتے ہیں۔ پہاڑوں سے ٹکرا جانے والے مڑیں یہ عقیلہ اور نسیمہ کو جانتے ہیں؟"

"میں انہیں جانتا ہی نہیں بلکہ ان کی زمین دوز سرگرمیوں سے بھی واقف ہوں" — عبدالقدیر نے کہا۔ "میں اُن پاکستانیوں کو بھی جانتا ہوں جن کے ساتھ ان دونوں ہندو لڑکیوں کا دوستانہ ہے۔ ان پر جس شخص نے پردہ ڈالا ہوا ہے، میں انہیں بھی جانتا ہوں۔"

"ان کے ساتھ میری ملاقات آٹھ دس روز پہلے ہوئی ہے" — عبدالجلیل نے عبدالقدیر کے متعلق بتایا — "ہم آزادی سے پہلے فیروزپور میں اکٹھے رہے تھے۔ پاکستان میں آکر پہلی ملاقات آٹھ دس روز پہلے، آزادی کے آٹھ سال بعد ہوئی ہے۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ آزادی سے پہلے کی باتیں ہونے لگیں تو مہاجرین کے قافلوں کی طرح باتیں لہولہان ہو کر پاکستان میں آگئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے حب الوطنی کی اور ایک غلط حکم نہ ماننے کی یہ سزا ملی ہے کہ مجھے قبل از وقت جبری پنشن پر بھیج دیا گیا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے پنشن تو مل گئی ہے، انہیں وہ بھی نہیں ملی۔ اُدھر ہندوؤں اور انگریزوں نے لوٹ لیا، اِدھر انہوں نے ذاتی رنجش کی بنا پر ذریعۂ معاش سے محروم کر دیا اور ان کے بچوں کا مستقبل تاریک کر دیا تھا۔"

"پھر آپ اپنے پاؤں پر کس طرح کھڑے ہوئے عبدالقدیر صاحب" — ارشد نے پوچھا۔

"مختلف بھگوان پر توکل کیا" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "پھر ایک دکان کھول لی۔"

"اب تو اللہ کا فضل ہے" — عبدالجلیل نے کہا — "ان کا جنرل سٹور ہے۔ دو سیلز مین ہیں۔ اچھا مکان ہے۔ اللہ تو انصاف کرتا ہے نا! بے انصاف اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔ بھلا کوئی انسان کسی انسان کی روزی چھین سکتا ہے؟..... ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ان کے ساتھ پاکستان کی باتیں ہوئیں تو میں نے ان کے ساتھ وہی باتیں کیں جو کل تمہارے ساتھ کی تھیں اور ان کے ساتھ ان دو ہندو لڑکیوں کا بھی تذکرہ کیا جو عقیلہ اور نسیمہ کے نام سے یہاں ایک کوٹھی میں رہتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں دونوں کو جانتے ہیں۔ ان کے پاکستانی دوستوں اور مددگاروں کو بھی جانتے ہیں۔ میں نے چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش کے نام لیے تو کہنے لگے کہ یہ انہیں بھی جانتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ دونوں شخص ان لڑکیوں کی مدد سے سمگلنگ کرتے ہیں اور لڑکیاں جاسوسی کرتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہاں ہندوستان کی دولت پانی کی طرح تقسیم ہوتی ہے۔"

"اور یہ سمگلنگ اور پاکستان کے خلاف جاسوسی اُن راستوں پر ہو رہی ہے جن راستوں پر اُدھر کے مسلمان اپنا خون بہاتے اور اپنے بچوں اور اپنے عزیزوں کی لاشیں پھینکتے آئے تھے" — عبدالقدیر نے جذباتی لہجے میں کہا — "ان راستوں پر شہیدوں کا خون ابھی خشک نہیں ہوا..... مجھے جب پتہ چلا تھا کہ سمگلنگ اور جاسوسی شروع ہو گئی ہے تو میں سر سے پاؤں تک کانپنے لگ گیا تھا۔ میں نے پولیس کے کئی افسروں کے ساتھ بات کی۔ کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ اپنے ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ اسی بات پر میری تُرش کلامی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ پاکستان تمہارے باپ کی جاگیر نہیں، تم اس ملک کے گورنر جنرل ہو اپنے

عہدے اور اپنی حیثیت کے مطابق بات کیا کرو۔ اس ڈی ایس۔ پی کے ساتھ دشمنی ایسی بڑھی کہ مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اُس روز خان صاحب سے ملاقات ہو گئی تو میں نے ان کے سینے میں بھی وہی درد دیکھا جو میرے سینے میں ہے اور جو تم جیسے جوانوں کے سینوں میں ہے۔"

"میں نے انہیں کہا کہ پاکستان کسی گورنر جنرل اور کسی وزیراعظم کی جاگیر نہیں" — عبدالجلیل خان نے کہا — "یہ ایک قوم کا وطن ہے جو قوم نے جان اور مال کی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔ یہ اللہ کی سرزمین ہے جسے راہِ حق کے شہیدوں نے سیراب کیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ میرے ہاتھ میں ایسے آدمی ہیں جو نہ مرنے سے ڈرتے ہیں نہ کسی کو جان سے مار دینے سے گھبراتے ہیں۔"

"میں نے ان کی یہ بات سُنی اور یہ جذبہ دیکھا تو انہیں کہا کہ میں ایسے ہی جانبازوں کی تلاش میں ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "مجھے خان صاحب کے ساتھ پورا پورا اتفاق ہے کہ جس ملک کے لیڈر اور حکمران دشمن کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں اور اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا کر لیں کہ یہ دشمن نہیں دوست ہے تو یہ قومیں قوم پر حادثہ ہوتا ہے کہ اپنے ملک کو دشمن سے بچانے لیڈروں کی نظرِ اقتدار کی کرسی پر ہوتی ہے۔ قوم اپنی زمین کی حفاظت کرتی ہے۔ عوام دشمن کی فوج کے خلاف نہیں لڑ سکتے لیکن وہ دشمن کے جاسوسوں اور ایجنٹوں کو پکڑ کر ختم کر سکتے ہیں..... میں نے خان صاحب سے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ سمجھیں اور مجھے آزمائیں۔"

"اچھا ان کی بات ہے کہ جس دشمن پر میری نظر تھی، اسے عبدالقدیر بھی جانتے ہیں" — عبدالجلیل نے کہا — "میں ان کے ساتھ ساری بات کر چکا ہوں۔ آج ہم ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

اُس روز اُن آدمیوں کا بھی تعارف ہوا۔ ان میں ایک کالج سٹوڈنٹ نجم اکسن تھا۔ بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ دوسرے نے ایک سال گزرا بی۔ اے کیا تھا۔ اس کا نام ناصر تھا اور تیسرا حفیظ، کسی وکیل کا بیٹا تھا اور وکالت پڑھ رہا تھا۔ کاما تانگے والا ان سب کو جانتا تھا۔ عبدالقدیر کے ساتھ اُس کا پہلا تعارف تھا۔

"قدیر بھائی!" — عبدالجلیل نے عبدالقدیر سے کامے کا تعارف کراتے ہوئے کہا — "یہ کاما ہے۔ تانگہ چلاتا ہے لیکن گھوڑے کی نسبت انسانوں کو بہتر طریقے سے لگام ڈال سکتا ہے۔ اس نے جلال آباد میں جو کارنامے کر دکھائے تھے، وہ تمہیں سناؤں گا۔"

عبدالقدیر نے کامے کو بڑے غور سے دیکھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کامے جیسے لوگ بڑے کام کے ہوتے ہیں خان صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "کامے دوست! چھری چاقو چلانا جانتے ہو؟"

کاما یوں ہنسا جیسے کسی بچے کی معصومانہ سی بات پر کوئی بڑی عمر کا آدمی ہنس دیتا ہے۔

"وقت آئے گا تو تمہیں پتہ چلے گا قدیر بھائی!" — عبدالجلیل خان نے کہا۔

"کیا آپ لوگوں نے کوئی باقاعدہ سکیم بنالی ہے یا ابھی خفیہ پارٹی بن رہی ہے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا۔

"ابھی پارٹی بن رہی ہے" — عبدالجلیل نے جواب دیا۔

iqbalmt@onemorepage.com scanned by

"ہماری سکیم کا بنیادی اصول ہوگا قتل!" — کالج سٹوڈنٹ تجمل الحسن نے کہا۔

"لیکن قتل صرف دشمن کے آدمیوں کا" — عبدالجلیل نے کہا — "ہم اپنے لیڈروں کو قتل کر کے سیاسی قاتل نہیں کہلانا چاہتے لیکن ہم اپنے لیڈروں اور وزیروں سے یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ جس کام کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے یہ ان کا کام ہے۔ لیڈر کی نظر سیاسی مفاد پر ہوتی ہے۔ ہماری نظر سرحدوں پر ہے۔"

"خان صاحب آ" — عبدالقدیر نے ارشد کی طرف اشارہ کر کے کہا — "آپ نے ان کا تعارف نہیں کرایا؟"

"اوہ! معاف رکھنا ارشد!" — عبدالجلیل نے کہا — "میں اپنے سب سے زیادہ دلیر اور آزمائے ہوئے مجاہد کا تعارف کرانا بھول گیا ہوں.... قدیر بھائی! اس جوان کا نام ارشد ہے صوبائی حکومت کا ملازم ہے بڑے اچھے عہدے پر ہے۔ راوی روڈ پر آتشا بھون نام کی بہت بڑی کوٹھی میں رہتا ہے" — اور عبدالجلیل خان نے تفصیل سے بتایا کہ ارشد نے تحریک پاکستان میں کیا کام کیا تھا۔

عبدالقدیر نے گرم جوشی سے ارشد سے ہاتھ ملایا۔

"خان صاحب!" — ارشد نے کہا — "ہم ایک بنیادی غلطی کر رہے ہیں جو کسی بھی وقت ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ہاں، ہاں بتاؤ ارشد!" — عبدالجلیل نے کہا — "تمہاری بات سننے سے پہلے میں سب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں جذبات سے نکل کر سوچنا اور مشورے دینا ہے۔ کوئی بھی تجویز ہو اس کے پیچھے جذبات نہیں عقل ہونی چاہیئے۔"

"میں اسی غلطی کی نشاندہی کرنے لگا تھا" — ارشد نے کہا — "مجھے یہی شک ہو رہا ہے کہ یہاں جذبات کے تحت باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ ایک دوسرے کے متعلق ہمیں کامل یقین نہیں کہ ہم سب دیانتدار ہیں اور ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دیں گے۔ ہم میں سے کوئی پیٹھ نہیں پھیر جائے گا یا ہم میں سے کوئی مخبر نہیں بن جائے گا.... کیا آپ نے اس کا کوئی علاج سوچا ہے؟"

"حلف" — عبدالقدیر نے کہا — "قرآن پر ہاتھ رکھ کر سب سے حلف لیا جائے۔"

"حلف تو وزیروں سے بھی لیا جاتا ہے" — ارشد نے کہا — "حلف تو گورنر جنرل بھی اٹھاتا ہے۔"

"اس کے سوا اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟" — عبدالجلیل نے کہا۔

"میں جاہل اور ان پڑھ ہوں" — کامے نے کہا — "میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان پولیس افسروں کی طرح دنیا دیکھی ہے اور انسانوں کو پڑھا ہے۔ لوگ خدا میں بیٹھ کر اسی طرح جھوٹ بولتے ہیں جس طرح میں تانگے میں یا تیکتے والے اڈے پر بیٹھ کر جھوٹ بولا کرتا ہوں۔ جھوٹ بولنے کے لیے ذہانت لینا پڑتا ہے نہ لاء آنسس۔ انسان بڑی ناپاک چیز ہے خان صاحب! میں اس کا علاج پیش کرتا ہوں۔ ہمارے ساتھ جو بھی شامل ہوگا اُسے خبردار کر دیا جائے کہ اُس نے دھوکہ دیا، پیٹھ پھیر گیا یا مخبری کی تو اُسے قتل کر دیا جائے گا اور لاش غائب کر دی جائے گی۔"

"لیکن پارٹی کی تو نشاندہی ہو جائے گی" — وکیل کے بیٹے حفیظ نے کہا۔

"پارٹی کی نشاندہی ہو گی" — ناصر نے کہا — "تمام ممبروں کی نشاندہی نہیں ہو سکے گی۔ جو سرِ محفل ہیں

گے وہ پارٹی کو دھوکہ دینے والے کو ختم کر دیں گے۔"

"اگر میں باہر ہوا تو غداروں کو قتل کرنے کے لیے بڑے استاد مل جائیں گے" — کامے نے کہا۔

یہ تعارفی محفل تھی جو مشوروں اور تجویزوں میں اور کچھ جذباتی باتوں کے بعد برخاست ہو گئی اور اگلی میٹنگ کا دن اور وقت طے ہو گیا۔

عبدالقدیر کی شخصیت میں جاذبیت تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ اسے ایس۔ آئی رہ چکا ہے۔ چہرے کے خدوخال میں کشش تھی۔ قدوقامت نگاہوں کو اچھا لگتا تھا۔ رنگ روپ بڑا پیارا تھا اور اُس کے بات کرنے کا انداز پُراثر تھا۔ بات کرتے وقت اُس کی آنکھیں ساری محفل پر گھومتی تھیں۔ وہ محفل کو سحر کر سکتا تھا مگر اگلی رات وہ جس محفل میں بیٹھا ہوا تھا وہاں مخمور تھا۔

وہ اُس نسیمہ کی کوٹھی تھی جس کا نام نسیمہ نہیں تھا۔ وہ ہندو لڑکی تھی اور اس کا ایک خاوند بھی تھا جو اصل میں اُس کا خاوند نہیں تھا۔ ان کے آگے شراب کی بوتل اور گلاس رکھے تھے۔ نسیمہ کا اصلی خاوند بھی کچھ دیر پہلے وہیں تھا لیکن وہ کسی سے ملنے کے بہانے باہر نکل گیا تھا۔ اُسے کسی سے نہیں ملنا تھا۔ اُسے عبدالقدیر نے اشارہ کیا تھا کہ وہ باہر چلا جائے۔ خاوند کو معلوم تھا کہ عبدالقدیر نسیمہ سے اپنی ضرورت وصول کرنے کے لیے اُسے باہر بھیج رہا ہے۔ وہ باہر چلا گیا تھا۔ اب نسیمہ عبدالقدیر کی تھی۔

یہ ہندو لڑکی اپنے دشمن ملک کو کھوکھلا کرنے کی قیمت ادا کر چکی تو اُس نے عبدالقدیر سے پوچھا کہ کوئی خاص خبر ہے یا وہ تفریحاً آ گیا ہے۔

"آج خاص خبر یہ ہے کہ سن لو کانپ جاؤ گی" — عبدالقدیر نے کہا — "ہماری سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور عقیلہ نے معمول جھونک رکھی ہے مگر ہماری قوم کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔"

"کیا ہوا؟" — نسیمہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"تمہاری محفل کی نشستیں بن رہی ہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "اور عقیلہ کے قتل کی بھی۔"

"یہ کام کون کر رہا ہے؟"

"ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر!" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش اُسے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اُس کا منہ اور اُس کی آنکھیں کس طرح بند کی جا سکتی ہیں؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"عورت کے معاملے میں وہ پتھر ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "روپے پیسے کا اُسے لالچ نہیں۔"

"تم ایک بار اُسے یہاں لے آؤ" — لڑکی نے کہا — "میں اس پتھر کو موم کر لوں گی۔"

"یہ پتھر تمہاری کھوپڑی توڑ دے گا۔"

"تم کس مرض کی دوا ہو؟" — نسیمہ نے پوچھا — "کیا یہ تمہارا کام نہیں کہ کسی کو رکاوٹ نہ بننے دو؟ وہ سرکاری افسر نہیں، وزیر نہیں، کچھ بھی نہیں معمولی سا ایک آدمی ہے۔ کیا اُسے ٹھکانے نہیں لگایا جا سکتا؟"

"وہ اکیلا نہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "پورا گروہ ہے.... پہلے یہ بتاؤ کہ کل رات عقیلہ کے ہاں وزیر داخلہ اور سیکرٹری داخلہ مدعو تھے۔ تم بھی گئی تھیں۔ کوئی بات بنی؟"

iqbalmt@onedrive.com scanned by

"تمہارے وزیر صاحب تو آج بھی آتے تھے" — لڑکی نے کہا۔

"زُلف کے اسیر ہو گئے؟"

"غلام کہو" — نسیمہ نے کہا۔ "کیا اِن سے بات کرنے کی ضرورت ہے؟"

"ابھی نہیں" — عبدالقدیر نے کہا۔ "تمہارے پاس تو ویسے ہی چلا آیا ہوں۔ میں بات تو چوہدری اکرم اور عبداللہ بخش سے کروں گا۔ لیکن ابھی کوئی کارروائی نہیں کریں گے کیونکہ ابھی گروہ بن رہا ہے۔ یہ مغز پھروں کا گروہ ہے جو اس وہم میں مبتلا ہیں کہ وہ نہ ہوتے تو پاکستان بھی نہیں رہے گا۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ کبھی اکیلی باہر نہ نکلنا۔ تم کبھی کبھی شلنے کے لیے نکل جاتی ہو۔"

"کیا وہ اتنے خطرناک لوگ ہیں؟"

"جہاں ایک پرانا تھانیدار اور ایک تانگے والا اکٹھے ہو جائیں وہاں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہو گا" — عبدالقدیر نے کہا۔ "جس شخص نے انگریزوں کی حکومت میں ایک انگریز لیفٹیننٹ کو ایک تانگے والے اور دو ملنگوں سے قتل کرا دیا اور سراغ تک نہیں چھوڑا تھا، اُس کے لیے دو اسی لڑکیوں کو جو اس ملک کی شہری بھی نہیں، غائب کرا دینا کوئی مشکل کام نہیں۔"

نسیمہ کے اتنے دلکش چہرے پر خوف و ہراس چھا گیا۔ عبدالقدیر نے اُسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا اور بازو لمبا کر کے اُسے اپنی طرف کیا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ڈرو نہیں رادھا!"

"پاگل؟" — لڑکی نے اُس سے ایک جھٹکے سے الگ ہو کر کہا۔ "تم کہو کہ تم کسی اجنبی کے سامنے بھی مجھے رادھا کہہ کر گزر گئے اور ہنسا تو گئے۔"

"ہاں تو نسیمہ!" — عبدالقدیر نے کہا۔ "میں تمہیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟.... تم اپنے ملک کے لیے اپنی عصمت قربان کر سکتی ہو، اپنی جان نہیں۔ مجھے ڈر ہے تم خود ہی کہیں پھنس جاؤ گی۔ میں نے عقیلہ میں بھی یہی کمزوری دیکھی ہے۔ دل مضبوط رکھو۔"

"قدیر!" — لڑکی نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ "میں گریجوئیٹ ہوں۔ اپنی ایشیائی جنس سے ٹریننگ لے کر آئی ہوں۔ ہمیں انسانی فطرت کی کمزوریاں اور دکھتی رگیں بتائی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ بالخصوص رگیں زیادہ دکھتی ہیں لیکن صرف اُن کی جو سیاست کا کھیل کھیلتے ہیں۔ حکومت انہی کی ہوتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ بادشاہ ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے لوگوں سے بچنا.... تم یہاں کے کسی بھی لیڈر کا نام لو، کسی جاگیردار اور کروڑپتی کارخانے دار کا نام لو، میں نہیں ڈروں گی۔ تم نے ایک تانگے والے کا نام لیا ہے تو میرا دل کانپ گیا۔ تم خود پولیس میں رہ چکے ہو۔ شاید انٹیلی جنس کے لوگوں کو جانتے ہو گے۔ بہت ہی ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری ہندوستانی انٹیلی جنس کو انگریزوں کے تربیت دی ہے۔ وہ پاکستان کے عوام کی نفسیات اور جذبات سے پوری طرح واقف ہیں۔ ہمیں یہ بتا کر خبردار کیا گیا تھا کہ پاکستان کے بڑے سے بڑے افسر سے بھی نہ ڈرنا لیکن پاکستان کے ہر اُس عام آدمی سے جس نے پھٹے پرانے کپڑے ہی کیوں نہ پہن رکھے ہوں، بچ کے رہنا۔"

"جانتی ہو کیوں؟" — عبدالقدیر نے کہا۔ "اس لیے کہ پاکستان ان پھٹے پرانے کپڑوں والوں نے ہی بنایا تھا اور پاکستان انہی کا ہے۔ اگر تمہاری کوٹھی کے سامنے سے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر

چلنے والے نیم فاقہ کش انسانوں کو پتہ چل جائے کہ اس کوٹھی میں ایک ہندو لڑکی رہتی ہے جو مسلمانوں جیسے نام کے بہروپ میں پاکستان کی جڑیں کاٹ رہی ہے تو یہ لوگ اس کوٹھی کو آگ لگا دیں اور تمہیں زندہ جلا دیں خود بھی دیکھو اور غور کرو۔ تم نے یہاں کے کیسے کیسے آدمی پھانس رکھے ہیں مگر ایک ریٹائرڈ تھانیدار، ایک تانگے والے اور تین چار گمنام سے آدمیوں کو تمہارے متعلق پتہ چلا تو وہ تمہارے اور عقیلہ کے قتل کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ عام اور خاص آدمی میں یہ فرق ہوتا ہے۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ ہو گا کیا؟"

"تم اور عقیلہ خوش قسمت ہو کہ مجھے اس گروہ کا پتہ چل گیا ہے" — عبدالقدیر نے کہا۔ "یہ تھانیدار میرا دوست نکلا اور اس نے مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لیا ہے۔ یہ گروہ ابھی بن رہا ہے۔ میں اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لوں گا مگر ان لوگوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر رہے۔ وہ اپنے لیڈروں کو قتل نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم دشمن کے تخریب کار ایجنٹوں سے بھرک کر اپنے آدمیوں کو قتل کر دیں تو دشمن کو اس سے خوشی ہو گی..... تم بھی اتنا نہ ڈرو۔ ضرورت پڑی تو میں ان لوگوں کو کسی اور جال میں لے آؤں گا۔"

"اور تمہیں مُنہ مانگا انعام ملے گا" — نسیمہ نے کہا۔ "اور مل رہا ہے۔ تم اس جائیداد اور مال اسباب سے کہیں زیادہ میری حکومت سے لے چکے ہو جو تم ۱۹۴۷ء میں ہوشیار پور چھوڑ آئے تھے۔"

"مجھے تم تمہاری محبت چاہیئے" — عبدالقدیر نے لڑکی کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر ہندوستان سے آئی ہوئی دلآئی شراب کے نشے سے جھومتے ہوئے کہا۔ "جس روز مجھے پتہ چلا کہ تمہاری محبت کاروباری ہے تو سمجھو تمہاری زندگی کا یا شاید میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

"ہاں ہماری ہُوں قدیرا" — بھارتی انٹیلی جنس کی تربیت یافتہ لڑکی نے گال اُس کے گال سے رگڑتے ہوئے کہا۔ "میں واپس جاؤں گی تو تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"آج ایک اور تھانیدار ہمارے گروہ میں شامل ہو گیا ہے" — ارشد طاہرہ سے کہہ رہا تھا۔ "ہوشیار پور اُسے اتنا ہی ہوش تھا کہ اُسے اپنے گھر جانا ہے اور رات بہت گزر گئی ہے۔ اُس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ اُس کے سر پر فلیٹ ہیٹ تھا۔ کوٹھی سے نکل کر اُس نے کوٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ چہرہ کچھ ان سے ڈھانپ لیا۔ فلیٹ ہیٹ آگے سے نیچے کر لیا۔ پیشانی بھی ڈھانپ لی گئی۔ دُور ایک تانگہ کھڑا تھا۔ ابھی لاہور میں رکشے اور ٹیکسیاں نہیں چلی تھیں۔ اُس نے کوٹھی سے بہت آگے جا کر تانگے والے کو آواز دی۔ وہاں روشنی بہت تھوڑی تھی۔

تانگہ سرپٹ دوڑتا آیا۔ عبدالقدیر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگے والے کو بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ اُس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی کہ تانگے والے سے پیسے پوچھتا اور کم کراتا۔ تانگہ چل پڑا۔

"صاحب آپ ہیں کہیں رہتے ہیں؟" — کمبل میں لپٹے ہوئے تانگے والے نے پوچھا۔

"نہیں" — عبدالقدیر نے جواب دیا۔ "کسی سے ملنے آیا تھا۔"

"صاحب!" — تانگے والے نے پوچھا — "آپ ان کوٹھیوں سے واقف ہیں؟"

iqbalmt@onenurdigital.com scanned with CamScanner

"کیوں؟" — عبدالقدیر نے پوچھا — "کسی کا اتا پتہ پوچھنا ہے؟"

"صاحب بہادر!" — تانگے والے نے کمبل کی بکل میں سے کہا۔ "سوچتا ہوں اس ملک کا کیا بنے گا ..... سُنا ہے یہاں ایک کوٹھڑی میں ایک ہندو لڑکی رہتی ہے جس نے اپنا کوئی اسلامی نام رکھا ہوا ہے اور ہمارے بڑے بڑے لیڈر اور افسر یہاں آتے ہیں۔"

"آنے ہوں گے بھائی!" — عبدالقدیر نے جمائی لیتے ہوئے کہا — "کوئی اونچی طوائف ہو گی۔ تانگے والے کا مما جر ہے۔ عبدالقدیر۔ بڑا خوب صورت آدمی ہے۔ اندر سے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ اُس کی اور عبدالجلیل خان کی کہیں اتفاقیہ مُلاقات ہو گئی تھی۔ پتہ چلا کہ وُہ بھی اُن دو ہندو لڑکیوں کو اور اُن کی تخریب کاری کو اچھی طرح جانتا ہے۔ بڑا ہوشیلا اور صحیح جذبے کا آدمی ہے۔"

اُس وقت ہوشیلا اور صحیح جذبے کا آدمی ہندو لڑکی کے بیڈ رُوم میں تھا۔

ارشد اور طاہرہ رات بہت دیر تک پاکستان اور پاکستان دُشمنوں کی باتیں کرتے رہے۔ ان باتوں میں تلخی تھی۔ کئی ایک سوال تھے جن کے جواب نہیں مِل رہے تھے۔ طاہرہ کو کوئی وجہ سُوجھ نہیں رہی تھی کہ لوگ اپنے مُلک اور اپنی قوم سے غدّاری کس طرح گوارا کر لیتے ہیں۔

"آخر کیوں؟" — طاہرہ نے جھنجھلا کر کہا — "اِس مُلک کی بنیادوں میں ہم سب کا خون شامل ہے، پھر چند ایک انسان اپنے خُون کی لاج کیوں نہیں رکھتے؟ وُہ دُشمن سے اِس کی قیمت کیوں وصول کرتے ہیں؟"

اُس وقت عبدالقدیر جس کے خاندان کے بہت سے انسانوں کا خُون راولپنڈی میں بہہ گیا تھا، ہندو لڑکی کی کوٹھی سے جھُومتا ہوا نکل رہا تھا۔ شراب نے اُسے اِس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنے آپ سے پُوچھ سکتا اور اپنے آپ کو بتا سکتا کہ وُہ اپنے خاندان کے خُون کی قیمت اپنے دُشمن سے کیوں وصول کر رہا ہے۔

تو ایسے اوقات سے واقف ہوتے ہیں۔"

"نہیں، آپ کو معلوم نہیں" — تانگے والے نے کہا — "میں جاہل اور اَن پڑھ آدمی ہوں۔ ہماری عادت ہوتی ہے کہ اپنی سواری کے ساتھ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ آپ جیسی کوئی سواری مِل جائے تو اُس سے بھی کی دو باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ مَیں نے سُنا ہے کہ یہاں جو ہندو لڑکی رہتی ہے وُہ ہندوستان کی جاسُوس ہے۔"

"اگر جاسُوس ہے تو تم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہو؟" — عبدالقدیر نے کہا — "تُم اپنے کام سے مطلب رکھو۔"

"بگاڑنے کو تو مَیں بہت کچھ بگاڑ سکتا ہوں صاحب!" — تانگے والے نے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" — عبدالقدیر نے کسی شک کی بنا پر پُوچھا۔

"کاما جناب!" — تانگے والے نے کمبل کی بکل اچھی طرح مارتے ہوئے کہا — "میرا نام کاما ہے۔"

تانگہ اندھیری سڑک سے گزر رہا تھا۔ عبدالقدیر نے فلیٹ ہیٹ اونچے اور کوٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ جہاں اُسے جانا تھا، وہاں پہنچنے سے پہلے اُس نے پیدل ہی سیٹ پر پھینکے اور تانگہ ابھی رُک رہا تھا کہ وُہ اُتر کر چلا گیا۔ کاما اُسے پہچان نہ سکا۔

طاہرہ کا باپ جمال بیگ جوجوزی بابا کے نام سے مشہور تھا، ایک روز سکول سے غیر حاضر ہوا۔ وہ بیمار ہو تو بھی غیر حاضر نہ ہوا کرتا تھا، ورنہ آندھی، طوفان اور زلزلے اُسے سکول جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ اُس کی رُوح سکول میں تھی۔ اُس کے دِل میں سکول کے بچّوں کا جو پیار موجزن تھا، اُسے بیماری سے بھی اُٹھا لیا کرتا تھا۔ وُہ جب غیر حاضر ہوتا تھا تو اُس کی کلاس کے بچے اُداس ہو جایا کرتے تھے۔

اُس کی پہلے دن کی غیر حاضری سکول کے سٹاف نے محسُوس نہ کی۔ وہ دوسرے دِن بھی نہ آیا اور اُس کی کوئی اطلاع بھی نہ آئی تو سب ایک دُوسرے سے پُوچھنے لگے کہ جوزی بابا کو کیا ہو گیا ہے۔ سکول کے زنانہ حصّے میں صرف نجمہ ایک اُستانی تھی جو جوزی بابا کی غیر حاضری کو محسُوس کر رہی تھی اور اُسے کچھ شک ہو رہا تھا۔ وہ ہر روز جوزی بابا سے ملتی تھی۔ اَب اُس کی عقیدت بڑھ گئی تھی کیونکہ وہ جوزی بابا نہیں جمال بیگ تھا اور وہ طاہرہ کا باپ نکلا۔

طاہرہ کو ارشد کے ساتھ لاہور گئے تیسرا روز تھا دن تھا۔ اُس کے جانے کے اگلے روز جمال بیگ سکول آیا تھا، پھر نہیں آیا اور اگلے دن بھی نہیں آیا۔ نجمہ کو کچھ شک سا ہوا۔ نجمہ ذہین اُستانی تھی اور اَب اُسے جوزی بابا کے ماضی کا پتہ چل چکا تھا۔ وہ جس طرح کلاس کے بچّوں خصُوصاً بچیوں سے پیار کرتا تھا، اِسے والہانہ پن بھی کہا جا سکتا ہے اور دِلدادگی بھی۔ بہرحال اُس کا یہ تدریسی اور اندازِ تدریل ذہن کے انسان کا نہیں تھا۔ نجمہ کو شک یہ ہُوا تھا کہ جوزی بابا نے اپنے آپ کو اپنی بیوی کا قاتل سمجھا تھا اور اُس نے اپنی اس نوزائیدہ بچی کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا جو بڑی ہو کر طاہرہ بنی اور جس کے جاننے والے تحریکِ پاکستان کے ذکر کو طاہرہ کے بغیر نامکمل سمجھتے تھے۔

اور جوزی بابا کو وہ بچی مِل گئی تھی جس کی پیدائش طاہرہ کی ماں کا جُرم بن گئی تھی اور جوزی بابا جو اُس وقت جمال بیگ تھا، درندہ بن گیا تھا اور اُس نے بچی کی ماں ساجدہ اور اُس کی نانی خاتُون سے کہہ دیا تھا کہ اُس نے پہلے ہی اُنہیں خبردار کر دیا تھا کہ اُس کی بیوی نے بچی کو جنم دیا تو بچی کو میرے گھر سے لے جانا۔ ساجدہ کے اِس جُرم نے جمال بیگ کو اُس کا قاتل بنا دیا تھا۔

نجمہ کو یہ شک تھا کہ اب طاہرہ پچیس چھبّیس سال کی ہو کے اُسے مِل گئی ہے، شاید یہ دھچکہ جمال بیگ کے لیے اچھا ثابت نہیں ہُوا۔ چھُٹی ہُوئی تو نجمہ جمال بیگ کے گھر چلی گئی جو سکول کا ہی کوارٹر تھا۔ باہر کا دروازہ کھُلا تھا۔ نجمہ اندر چلی گئی۔ دیکھا کہ جوزی بابا چارپائی پر لیٹا ہُوا ہے اور اُس کی نظریں چھت پر جمی ہُوئی ہیں۔ یہ زیرِ کھانا پڑا ہے اور سالن جم چکا ہے۔

"بابا جان!" — نجمہ نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پُوچھا — "خیریت تو ہے؟ آج دُوسرا دن ہے آپ سکول نہیں آئے۔"

وُہ کچھ دیر چُپ رہا۔ نجمہ کی طرف دیکھا تک نہیں۔ نجمہ اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر کہا — "بابا جان!"

جمال بیگ نے نجمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے دُوسرا

iqbalmt@gmail.com scanned by

ہاتھ بھی بخر کے ہاتھ میں دے دیا۔ بخر جوان ہلا خوب صورت عورت تھی۔ جمال بیگ پچاس برس سے ایک دو سال اُوپر عمر کا تندرست آدمی تھا۔ اُس کے زیادہ تر بال سفید ہو گئے تھے لیکن چہرے پر بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن بخر نے بالکل محسوس نہ کیا کہ وہ ایک مرد کے پاس تنہا بیٹھی ہے۔ اُس نے اپنا ہاتھ جمال بیگ کے ہاتھوں سے نہ چھڑایا۔

"طاہرہ یاد آ رہی ہے؟" — بخر نے پوچھا — "وہ آ جائے گی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ وہ ارشد کے ساتھ کیوں گئی ہے۔ چار پانچ دنوں تک آ جائے گی۔"

"آ جائے گی" — جمال بیگ نے یوں کہا جیسے سسکی لی ہو۔ کہنے لگا — "کیا کرے گی یہاں آ کر؟ اگر آپ کی ماں قتل ہو جائے تو کیا آپ اپنی ماں کے قاتل کو اپنا باپ کہیں گی؟"

"ہرگز نہیں میں آئی ہا باجان!" — بخر نے کہا — "طاہرہ آپ کو قاتل نہیں اپنا باپ کہتی ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ وہ کتنی خوش ہے۔"

"خوش ہے؟" — جمال بیگ بخر کا ہاتھ چھوڑ کر اُٹھ بیٹھا اور بولا — "تم کہتی ہو وہ خوش ہے؟ اسی لیے ایک غیر مرد کے ساتھ چلی گئی ہے؟ ارشد اُس کا خاوند تو نہیں۔"

"وہ آپ کی اجازت سے گئی ہے بابا جان!"

"اُس نے مجھ سے اجازت نہیں لی تھی" — جمال بیگ نے کہا — "اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جا رہی ہے۔"

"خدا کے لیے طاہرہ کو ایسا نہ سمجھیں بابا جان!" — بخر نے جھنجھلا کر کہا — "آپ نہیں جانتے میں جانتی ہوں۔ ارشد جانتا ہے۔ اُس کا گھر وازرستم کے پانی جیسا پاک اور شفاف ہے۔ دکھ جو اُس نے جھیلا ہے آپ نے ابھی نہیں سُنے" — بخر جذباتی ہوتی چلی گئی۔ اُس نے قدرے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "طاہر آپ کی نہیں، میری نہیں، وہ پاکستان کی بیٹی ہے۔ اُس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اُس کا کوئی گھر نہیں۔"

"میرا گھر ساتھ کا ہے نا؟" — جمال بیگ نے کہا — "تم لوگ ہندوستان سے ہندوؤں اور سکھوں سے بھاگ کر آئے تھے اور میں اپنے آپ سے بھاگا ہوا ہوں۔ اپنے آپ سے پناہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"آپ کو اپنی بیٹی مل گئی ہے" — بخر نے کہا — "آپ کو پناہ بھی مل جائے گی ..... چلئے، اُٹھیے، کھانا کھا لیں۔ میں گرم کر دیتی ہوں۔"

جمال بیگ اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بخر سالن گرم کرنے کے لیے اُٹھانے لگی تو جمال بیگ نے اُسے روک دیا۔ کہنے لگا کہ وہ خود گرم کر کے کھا لے گا مگر بخر نہ رکی۔ وہ چولہا جلا کر سالن گرم کرنے لگی۔ جمال بیگ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ بخر نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر التجا کی — "بابا جان! کھا لیں، کھا لیں۔"

جمال بیگ نے بے ساختہ اور بے اختیار بخر کو اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا اور ہچکیاں لے لے کے رونے لگا۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے بخر!" — اُس نے بے بسی کے عالم میں کہا — "میں کہاں تھا؟ کہاں چلا آیا ہوں؟"

اُس نے ایک جھٹکے سے بخر کو الگ کر کے کہا — "نہیں ..... نہیں ..... طاہرہ مجھے مجرم سمجھتی ہے۔ اسی

لیے وہ ارشد کے ساتھ چلی گئی ہے ..... بخر! اُسے خط لکھو، دو کہ یہاں نہ آئے" — وہ پھر چپ ہو گیا۔ اُس نے سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور بڑی سخت آواز میں بولا — "اُسے لکھو، دو تمہارا باپ پاگل ہو گیا ہے۔ تمہاری ماں کا قاتل پاگل ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ یہاں نہ آئے۔ یہاں نہ آئے۔"

بخر اُسے آنکھیں حیرت سے پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ اُسے طاہرہ کا خیال آیا۔ طاہرہ کا باپ دانوکس جیل میں تھا۔ کیا خدا طاہرہ کو ایک اور آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے؟

☆

اُدھر بخر طاہرہ کے لیے پریشان اِدھر طاہرہ پاکستان کے لیے پریشان۔

طاہرہ بخر کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ ان کی ذات برادری بھی ایک نہیں تھی۔ ہندوستان سے ہجرت تک ان کا تعلق استاد اور شاگرد کا تھا۔ بخر سرحد پار جلال آباد میں استانی تھی اور طاہرہ اس کی شاگرد۔ لیکن ان کا خون ایک تھا، جذبہ ایک تھا اور وہ ایک محاذ پر لڑی تھیں۔ یہ جنگِ آزادی کا محاذ تھا۔ وہ خون میں ڈوبی ہوئی اُس بڑی لمبی راہ کی مسافر تھیں جو ہندوؤں اور سکھوں کے جتھوں سے پاکستان کی جنت کو آتا تھا۔

طاہرہ اکیلی رہ گئی تھی مگر اُس نے آنسو نہیں بہائے تھے۔ اُس کے پاس پلے جو کچھ تھا، وہ اُس نے مہاجروں کے تین خاندانوں کو آباد کرنے پر خرچ کر دیا تھا۔ اُس نے اپنی محبت بھی قربان کر دی تھی۔ بخر کو یہ اچھی لگتی تھی کہ وہ دوسروں کو آباد کرنے کے لیے خود برباد ہو جائے۔ نئے والی لڑکی تھی وہ بخر کو یہ بھی نہیں لگتی تھی بلکہ بخر اُسے اپنی بیٹی بھی سمجھتی تھی اور اپنی بہن بھی۔ یہ روحانی رشتہ تھا جو ٹوٹنا چاہے تو بھی نہیں ٹوٹتا۔

ارشد سے طاہرہ کو پتا چلا تھا کہ دشمن سمگلروں اور بڑی بڑی حسین اور چالاک لڑکیوں کے ذریعے پاکستان کی جڑوں میں اُتر آیا ہے۔ ارشد نے طاہرہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے جو دشمن کے ایجنٹوں کے خلاف زمین دوز کارروائیاں کرے گا۔ ارشد نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ ایک اور ریٹائرڈ تھانیدار عبداللہ یہ بھی ان کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔

طاہرہ یہ سن کر خوش نہ ہوئی کہ ارشد اور کچھ دوسرے لوگ دشمن کے خلاف زمین دوز جنگ شروع کر رہے ہیں۔ اُسے یہ سوال پریشان کرنے لگے تھے کہ اپنے ملک میں کیا دشمن کے خلاف چوروں کی طرح لڑنا ہے؟ کیا پاکستان کی اپنی فوج اور پولیس کو معلوم نہیں کہ جو دشمن پاکستان کو ابتدا ہی میں ختم کرنے اور ہندوستان میں شامل کر لینے میں ناکام ہو گیا تھا، وہ اب چند ایک ضمیر فروش پاکستانیوں کے کندھوں پر بندوقیں رکھ کر پاکستان کے اندر آ گیا ہے؟

طاہرہ کا ذہن آٹھ سال پیچھے چلا گیا۔ صرف اپنا قصبہ جلال آباد ہی نہیں، اُسے ۱۹۴۶ء — ۴۷ء کے وقت کا سارا ہندوستان یاد آنے لگا۔ اُس وقت وہ ہر روز اخبار پڑھا کرتی تھی۔ مسلم لیگ کے دفتر میں اور نیشنل گارڈ کی حویلی میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے جہادِ آزادی، جوش و خروش اور جذبہ ایثار کی باتیں ہوتی تھیں۔ طاہرہ اُن علاقوں کی بھی خبریں سنا کرتی تھی جہاں مسلمانوں کی آبادی مشکل پانچ اور دس فیصد تھی۔ وہاں کے ہندو اپنی اکثریت کے زور پر مسلمانوں کا خون بہاتے رہتے تھے کہ وہ پاکستان کی باتیں کرتے ہیں اور کانگرس میں شامل نہیں ہوتے۔ وہ مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ جس پاکستان کے لیے یہ

iqbalmt@oneurdu.com scanned by
ون اردو
خوبصورت لوگوں کی خوبصورت اردو

وہ ہندوؤں کی دوغلی کا نشانہ بننے سے بچ رہتے ہیں، وہ اگر معرضِ وجود میں آ بھی گیا تو ان کے علاقوں سے سیکڑوں میل دُور وجود میں آئے گا اور انہیں انہی ہندوؤں کے جرم و کرم پر رہنا پڑے گا جو آج انہیں کانگرس میں شامل ہونے پر مجبور کر رہے ہیں، مگر مسلمان نظریۂ پاکستان پر قربان ہوتے جا رہے تھے۔

طاہرہ کو آٹھ سال پہلے کا وہ وقت یاد آ رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ ۱۹۴۷ء میں گڑھ مکتیشر میں ہندو مسلمانوں پر منظم طریقے سے ٹوٹ پڑے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے وہاں مسلمانوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت بھری ہوئی تھی، اس کا اظہار ان ہندوؤں نے یوں بھی کیا تھا کہ اُن مسلمان عورتوں کو گھروں سے گھسیٹ کر باہر لے گئے تھے جن کے بیٹوں میں بچے تھے۔ ان کے پیٹ چاک کر کے بچے نکالے اور انہیں ہندوؤں نے دیواروں کے ساتھ پٹخا تھا۔

پھر اُسے صوبہ بہار میں مسلمانوں کا قتلِ عام یاد آیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو، ان کی خواتین اور ان کے بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ وہاں کانگرسی مسلمان بھی تھے۔ انہوں نے ہندوؤں سے کہا کہ ہم کانگرسی ہیں، ہمارا پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں نے یہ کہہ کر ان سب کو قتل کر دیا تھا کہ ہمیں مسلمان کا خون چاہیے۔ خون برساتی فضا میں ہندوؤں کے نعرے سنائی دیتے تھے — "بھارت ماتا کی جے..... ملک میں مسلمان نہیں رہے گا۔"

ان یادوں سے خون ٹپک رہا تھا اور طاہرہ کا خون کھول رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ آٹھ نو سال پہلے کی باتیں ہیں، ابھی ایک ہی روز پہلے کے اخبار میں اُس نے خبر پڑھی تھی کہ ہندوستان کی تین جگہوں پر ہندوؤں نے نہ جانے کیا بہانہ ڈھونڈ نکالا اور بہت سے مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔

طاہرہ کو اس سوال کا جواب کہ ہندو مسلمانوں کے دشمن کیوں ہیں، عرصہ گزرا ہندوؤں نے خود ہی دے دیا تھا مگر اس سوال کا جواب اُسے نہیں مل رہا تھا کہ پاکستانی مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں میں کیوں کھیل رہے ہیں۔

☆

طاہرہ کو برآمدے میں چھوٹے چھوٹے قدموں کے دوڑنے کی آہٹ سنائی دی۔ سر جھکے ہوئے تھے۔ جب سر بلند ہوتے ہوئے اُس کے کمرے میں آ گئی۔ طاہر پرویز تھا۔ دوڑتا آیا اور طاہرہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"امّی جان!" — اُس نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا — "کتا بلی کا ہندو ہوتا ہے؟"

طاہرہ کی ہنسی نکل گئی۔

"طاہر بیٹی ہوتی تھی نا امّی جان!" — طاہر پرویز نے کہا — "ایک کتا گھیٹ کے اندر آ گیا۔ انہوں نے بلی کو دیکھا تو اسے پکڑنے کے لیے دوڑا آیا۔ بلی درخت پر چڑھ گئی۔ کتا درخت کے نیچے کھڑا اُوپر دیکھتا اور غرّاتا رہا۔ میں نے اُسے پتھر مارا تو وہ بھاگ گیا..... کتا بلی کا ہندو ہوتا ہے نا؟"

"ہاں طاہری!" — طاہرہ نے اُسے سینے سے لگا کر کہا — "کتا ہندو ہوتا ہے لیکن مسلمان بلی نہیں طاہری! اسلمان شیر ہوتا ہے۔"

"وہ شیر جو چڑیا گھر میں دیکھا تھا؟" — بچے نے خوشی سے کہا۔

"نہ طاہری!" — طاہرہ نے کہا — "پنجرے والا شیر نہیں۔ اس شیر نے پنجرہ توڑ لیا ہے۔ اب آزاد ہے۔"

ارشد نے طاہر پرویز کو اُس روز سے پاکستان کی حمیت اور حریت کے سبق دینے شروع کر دیے تھے جس روز بچہ توتلی زبان میں بولنے لگا تھا۔ اب تو اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ پاکستان کیوں اور کیسے بنا تھا اور پاکستان کا دشمن کون ہے۔ وہ ہندو اور دشمن کو ایک چیز سمجھتا تھا، اسی لیے وہ کتے کو بلی کا ہندو کہتا تھا۔

طاہر پرویز پھر باہر کو دوڑ پڑا۔ طاہرہ نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ بچہ لان میں ایک درخت کے نیچے کھڑا بلی کو دیکھ رہا تھا جو کتے کے ڈر سے ابھی درخت سے اُتری نہیں تھی۔ طاہرہ کی نظریں بچے پر جم گئیں۔ بچہ بڑا ہونے لگا اور وہ اُن دو نوجوانوں جتنا بڑا ہو گیا جنہوں نے طاہرہ کو ریلوے سٹیشن کے پُل پر اکیلے دیکھ کر بے ہودہ بکواس کی تھی۔ ان میں سے ایک کے مُنہ پر طاہرہ نے اتنی زور سے تھپڑ مارا تھا کہ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا پلیٹ فارم پر جا پڑا تھا۔

"نہیں بیٹی" — طاہرہ تڑپ اٹھی — "طاہری ایسا نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کا کوئی بچہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی باتیں اُن بچوں کو نہیں بھول سکتیں جو سرحد پار کٹ گئے تھے۔ انہوں نے جو بچتے یہاں آ کر جنے ہیں انہیں ضرور بتاتی ہوں گی کہ انہیں اپنے بھائیوں کا اور اپنی بہنوں کے خون کا حساب چکانا ہے۔"

پاکستان کی باتیں بھی یہی کچھ سوچ رہی تھیں۔ وہ اپنے شہید بچوں کو نہیں بھولی تھیں۔ ان کا بھی خون طاہرہ کی طرح کھولتا رہتا تھا مگر پاکستان اُن کے ہاتھ آ گیا تھا جو شریکِ سفر نہ تھے۔ انہوں نے سیاسی پارٹیاں بنائی تھیں اور حکومت اور حکومت کے حق پر انہوں نے اپنی اپنی مہریں لگا لی تھیں۔ قوم کے جذبات اور ارادے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں اور تحریکوں کی صورت میں کسی نہ کسی گوشے سے اُمڈتے رہتے اور دب جاتے یا دبا دیے جاتے تھے۔

ملک میں ایجنسی جنس کا محکمہ بھی تھا جو حکمرانوں کو بتاتا رہتا تھا کہ قوم کی جذباتی کیفیت کیا ہے اور قوم کیا سوچ رہی ہے۔ حکمرانوں کے پاس اس کا بڑا اچھا علاج تھا — مہنگائی اور جرائم — قوم کو موٹر سیکل کا ریلوے بنا دو۔ دن دہاڑے ڈاکہ زنی کی وارداتیں کراؤ۔ ہوش نہ آنے دو۔ قوم کے ہوش اور جذبات فاقوں سے مار دو۔

اور طاہرہ سوچوں میں ڈوبی جا رہی تھی۔

"کن سوچوں میں کھوئی ہوئی ہو طاہرہ؟"

طاہرہ نے چونک کے دیکھا۔ ارشد کی بھابی اُس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

"امّی بگڑ رہی ہیں کہ اپنے لیے کپڑے اور زیورات خود ہی پسند کر لو" — بھابی نے کہا — "اور طاہرہ! اب اور زیادہ انتظار نہ کراؤ۔ شادی جلدی ہو جانی چاہیے۔"

"جلدی ہو جائے گی آپا!" — طاہرہ نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا — "لیکن ہو گی راولپنڈی..... میں نے آپ سے کہا تھا کہ شادی بالکل سادگی سے ہو گی۔ آپ کپڑوں اور زیورات کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ عفت مرحومہ کے زیورات جو ہیں۔"

"نہ طاہرہ!" — بھابی نے کہا — "امّی کے سامنے ان زیورات کا نام نہ لینا۔ اپنی مری ہوئی بہو کی

iqbalmt@onenurdu.com scanned by iqbal

کوئی چیز تمہیں نہیں پہننے دیں گی تمہارے لیے سستے زیورات نہیں گے۔ پسند تمہاری ہوگی۔"

گھر میں ارشد اور طاہرہ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارے گھر میں خوشیاں تھیں مگر ارشد دشمن کے ایجنٹوں کے خلاف لڑنے کے لیے ایک زمین دوز گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور طاہرہ کے ذہن اور احساب پر پاکستان کی سلامتی اور پاکستان کے دشمن سوار ہو گئے تھے۔

☆

عبدالقدیر صوبائی اسمبلی کے ممبر چوہدری اکرم کی کوٹھی میں بیٹھا اُسے سنا رہا تھا کہ عبدالجلیل خان ایک خفیہ گروہ بنا رہا ہے اور اس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔

"اتفاق سے اُس سے ملاقات ہو گئی اور وہ مجھے اپنے گھر لے گیا" — عبدالقدیر نے عبدالجلیل کا تمام ترخفیہ پروگرام سنا کر کہا — "میں چونکہ اُس کی فطرت سے واقف ہوں اس لیے میں نے اپنے آپ کو پاکستان کی آن پر مرمٹنے والا جانباز ثابت کر دیا اور اُس نے مجھے اپنے گروہ کے عزائم بتا دیئے ہیں نسیم کو بتا آیا ہوں کہ وہ ایمبلی باہر نہ نکلا کرے عقیلہ کے پاس نہیں جا سکتا۔"

"تم نے کمال کر دکھایا ہے قدیر" — چوہدری اکرم نے کہا — "لو، اس خوشی میں دو گھونٹ پی لو۔ پھر شہراللہ بخش کے گھر چلتے ہیں۔ ان سے بات کرتے ہیں کہ اس عبدالجلیل کا کیا کریں گے۔"

عبدالقدیر نے وہ کی سجائے چار گھونٹ وہسکی پی چوہدری اکرم کے ساتھ کار میں بیٹھا اور دونوں مرکزی اسمبلی کے ممبر اللہ بخش کے گھر جا پہنچے۔ عبدالقدیر کو ساری رپورٹ ایک بار پھر دینی پڑی۔

"ارے کہاں کا سچا پاکستانی ہے" — شہراللہ بخش نے کہا — "اسے تو ڈی۔ ایس۔ پی بنوا دیتے تو ہماری جوتیوں میں بیٹھا رہتا۔ ہم نے اسے سردس سے نکلوایا ہے۔ وہ ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"میں پولیس میں رہا ہوں شہر صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "جو سیری نظر کر سکتا ہے وہ آپ نہیں دیکھ سکتے۔ اگر آپ اور عبدالجلیل کسی جلسے میں تقریر کریں تو لوگ عبدالجلیل کے ساتھ ہوں گے۔ میں آپ کو صحیح رپورٹ دیتا ہوں۔ لوگ بھوک برداشت کر لیں گے، ہندو کی دوستی کو قبول نہیں کریں گے۔ عبدالجلیل کو آپ معمولی آدمی نہ سمجھیں۔"

"بھائی میرے!" — شہراللہ بخش نے کہا — "سیدھے طریقے سے نہ مانا تو ایسا انتظام کر دوں گا کہ اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی..... اس کے ساتھ اور کون ہے؟"

"میں نے تو ابھی تین چار مخبر پھرتے دیکھے ہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "ایک جوان کچھ حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا امرتسر میں کمشنر کے دفتر میں ایک سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتا تھا، چوہدری اشفاق احمد۔"

"ہاں ہاں" — چوہدری اکرم نے کہا — "جلال آباد والا۔ پچھلے سال بڑے اچھے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے۔"

"میں اس کے بیٹے ارشد کی بات کر رہا ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "سنا ہے جلال آباد میں اس نے مسلم لیگ کا بہت کام کیا ہے۔ بڑا جوشیلا اور عقل مند جوان ہے۔"

"سنبھال لیں گے" — شہراللہ بخش نے کہا — "تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ معمولی آدمی ہمارا مقابلہ کر سکیں گے؟ ان لوگوں کی اس قسم کی تقریروں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے کہ پاکستان کے جو مخالف تھے وہ پاکستان میں آکر وزیر اور لیڈر بن گئے ہیں۔ لیڈری تو ہماری ہی رہے گی، پاکستان رہے نہ رہے۔"

"مہر صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "ان باتوں کو چھوڑیئے۔ میں آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں کہ کیا ہے اس قوم کو کوئی جگا نہ سکے، والا مل گیا تو آپ نہیں رہیں گے، پاکستان رہے گا۔ اصل طاقت تو یہ لوگ ہیں جنہیں آپ اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ محمد علی جناح صرف ایک آدمی تھا۔ پاکستان کروڑوں آدمیوں نے مل کے بنایا ہے۔ ان کروڑوں آدمیوں نے پاکستان کی جو قیمت دی ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ یہ لوگ اتنی جلدی بھول نہیں سکتے۔"

"بھول جائیں گے" — شہراللہ بخش نے کہا — "تم جانتے ہو حکومت ہماری ہے۔ وزیر ہماری پارٹی کے ہیں۔ تم چھوٹے تھانیدار رہے ہو۔ جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔ چونکہ تم اپنے آدمی ہو، اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ہم اُس ٹھکانے پر لا رہے ہیں جس پر ہندوستان کی ریاستوں میں ہمارا جول نے اپنی رعایا کو رکھا ہوا ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو عبدالقدیر، کہ لوگوں کے مسئلوں کا ہم کوئی علاج نہیں کر سکتے؟" — چوہدری اکرم نے کہا — "کیا ہماری حکومت منڈی پر کنٹرول نہیں کر سکتی؟ کیا ہم شہر سے بارش کے پانی کے نکاس کا انتظام نہیں کر سکتے؟ کیا ہم رشوت بند نہیں کر سکتے؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم پولیس کو لگام نہیں ڈال سکتے؟..... ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم جھگیوں میں رہنے والوں کو بڑے اچھے فلیٹوں میں رکھ سکتے ہیں۔ ہم چوراہوں اور عنڈہ گردی کرنے والوں کو ایک دن میں سیدھے راستے پر لا سکتے ہیں۔ خلفائے راشدین کا طرز حکومت یہاں نہیں چلایا جا سکتا ہے مگر حکومت نہیں چلاتے گی۔ ہمارا دشمن ہندوستان نہیں، اپنی سیاسی پارٹیاں ہماری دشمن ہیں۔ اگر لوگ خوشحال اور خوشحال ہو گئے تو ہماری تقریریں کون سنے گا؟"

"تم سمجھے تو نہیں ہو عبدالقدیر!" — شہراللہ بخش نے کہا — "کیا وہ باتیں ہماری زبان سے کہلانا چاہتے ہو جو تم کہہ رہے ہو؟ اگر تم پولیس میں رہتے تو اب زیادہ سے زیادہ سب انسپکٹر ہوتے۔ اب حساب کرو تم کیا کما رہے ہو تمہارے آگے جی کی آمدنی نہیں جو تم کما رہے ہو۔ دلاتی دہلی الگ اور نسیم جیسی لڑکی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کیا پاکستان تمہیں اتنی عیش کرا سکتا ہے؟ اب تم نے بہت بڑا کانٹا سر کر لیا ہے کہ ایک خطرناک گروہ کا سراغ لگایا ہے۔ اس کا تمہیں انعام ملے گا۔ ان لوگوں پر نظر رکھو۔ اگر کسی چھوٹے آدمی کو قتل کرنا ضروری ہو تو خود کر دو یا کرا دو اور ہمیں بتا دینا۔ کوئی بڑا آدمی سامنے آتے تو ہمیں بتانا۔ ہم اُسے سیکورٹی ایکٹ میں گرفتار کرا کے جیل میں بٹھا دیں گے کیونکہ وہ شر پسند ہے، تخریب کار ہے، انڈیا کا جاسوس ہے۔ تم جانتے ہو کہ سیکورٹی ایکٹ میں پکڑے ہوئے آدمی کا کیس عدالت میں جایا ہی نہیں کرتا۔"

"مجھے عبدالجلیل کے گروہ کے باقی آدمیوں کا سراغ لگا لینے دیں" — عبدالقدیر نے کہا اور پوچھا — "مہر صاحب! آپ کا وزیر بننے کا چانس نہیں ہے؟"

"بالکل ہے" — شہراللہ بخش نے کہا — "اسی لیے تو سارا جھنجھٹ کر رہا ہوں" — اُس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا — "چلو ایک محبِ وطن گرفتار کرا دو تو وزارت اپنی ہے۔"

"وہ تو کرا دیتے" — عبدالقدیر نے کہا — "میری ایک ضرورت پوری کر دیں..... مجھے صرف ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ وہ محلے میں ہے۔ ہر وقت لوگوں کی نظر میں رہتا ہوں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ میرا کاروبار یا ملازمت کیا ہے۔ یہ خطرہ ہے نسیم اور عقیلہ کے علاقے میں ایک کنال زمین دلا دیں اور کوٹھی بنانے کے لیے قرضہ دلا دیں۔ کوٹھیوں کی آبادی میں پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں ہوتی۔ ہر کوئی اپنے آپ کو امریکن

iqbalmt@outlook.com Scanned with CamScanner

سمجھتا ہے۔ وہاں بُری سے بُری اور بہت ہی خطرناک حرکتیں بھی چھپائی جا سکتی ہیں۔"

"تم جگر دیکھو" — مہراللہ بخش نے کہا — "کوٹھی بن جاتے گی۔"

☆

عبدالقدیر عبدالجلیل کے ہاں گیا اور اُسے بتایا کہ وہ اب پاکستان میں ہندوستانی تخریب کاروں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس کا خون کھول رہا ہے۔ اب اس کے سامنے جو آئے گا اُسے وہ قتل کر دے گا۔ عبدالجلیل نے اُسے کہا کہ وہ اتنا جذباتی ہو کر نہ سوچے زمین دوز کارروائیوں کی پلاننگ ٹھنڈے تحمل سے اور جذبات پر قابو پا کر کی جاتی ہے۔

"خان صاحب!" — عبدالقدیر نے بے تاب ہو کر کہا — "معلوم ہوتا ہے آپ ذہنی عیاشی کر رہے ہیں۔ آپ کچھ آدمی اکٹھے کر کے ان کے کمانڈر بننا چاہتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ آپ کے پاس کوئی ٹھوس پلان نہیں۔"

عبدالقدیر نے ایسے جذباتی لہجے میں اپنے شکوک کا اور بے تابی کا اظہار کیا کہ عبدالجلیل خان جیسا چالاک، ہوشیار اور تجربہ کار آدمی بھڑک اُٹھا اور اُس نے اپنا سارا پلان عبدالقدیر کو بتا دیا۔ اُس نے جن لوگوں کے نام بھی بتا دیئے جو اُس کے گروہ میں شامل ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔

"خان صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "آپ شاید خواب دیکھ رہے ہیں۔ آپ کا یہ پلان ایک افسانہ ہے۔ آپ سے مجھے اس معاملے میں اتفاق ہے کہ آپ پاکستان کو تقریروں، اخباری بیانوں اور جلوسوں کے ذریعے نہیں بچا سکتے۔ آپ کو دہشت گردی کرنی پڑے گی یعنی [illegible] موومنٹ ہوگی۔ اس کے بغیر آپ ان لوگوں کے چنگل سے پاکستان کو چھڑا نہیں سکتے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک نظریۂ پاکستان کے ٹھٹھے اڑاتے اور ہندو کے دوست تھے لیکن یہاں آ کر وہی پاکستان کے حاکم اور آقا بن گئے ہیں۔ آپ کا طریقہ یہ کہ ایک دو یا تین سرکاری افراد کو یرغمالی بنا کر آپ اپنے مطالبات اور ملیچھ نظریات منوائیں گے مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جن بالو لوگوں کو اور کالوں کے لڑکوں کو آپ نے اپنے ساتھ ملایا ہے، کیا یہ اغوا اور قتل جیسی وارداتیں کر سکیں گے؟... نہیں کر سکیں گے خان صاحب!"

"بدنصیب قدیر ہے!" — عبدالجلیل خان نے کہا — "کہاں پولیس کی نوکری کرتے رہے ہو اس وقت لاہور کے زیادہ نہیں تو ڈیڑھ سو غنڈے، بدمعاش اور جرائم پیشہ میرے ایک اشارے پر جانیں قربان کرنے کو آ جائیں گے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"وہی جو سیاسی پارٹیوں کا کام کرتے ہیں" — عبدالجلیل نے کہا — "یہ اُن کا فطری معاش ہے۔ اُن کا ایمان میرے ہاتھ میں ہے..... اور یہ غریب اور فاقہ کش لوگ جو گلیوں، محلوں اور احاطوں میں رہتے ہیں، ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ پاکستان انہی لوگوں کی قربانیوں کا حاصل ہے۔ میں نے جن ڈیڑھ سو غنڈوں کا ذکر کیا ہے انہیں سیاسی لیڈروں نے غنڈے بنایا ہے۔ تم میرے پاس ایک ایسا جرائم پیشہ آدمی لے آؤ جس کے متعلق تمہارا خیال ہو کہ یہ پتھر ہے اور اسے احساس ہی نہیں کہ پاکستان کی اہمیت کیا ہے اور وطن کیا ہوتا ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں اس آدمی میں سے ایک ایسا انسان نکال کے

دکھاؤں گا جس کے سامنے تم مذاق میں کہو گے "پاکستان مردہ باد" تو دوسرے منٹ یہاں تمہارا مُردہ پڑا ہوا ہوگا...

"اور کالج کے جن لڑکوں کے متعلق تم نے کہا ہے کہ وہ اغوا اور قتل جیسی وارداتیں نہیں کر سکیں گے، وہ ایسے کام کر دکھائیں گے کہ اپنے دشمن کو حیران کر دیں گے۔ یہی تو پاکستان کی قوت ہے ان لڑکوں اور لڑکیوں کو تم نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے نہیں دیکھا تھا؟"

عبدالقدیر کی مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی جسے عبدالجلیل مسرت کی مسکراہٹ سمجھ رہا تھا مگر وہ جان نہ سکا کہ یہ مسکراہٹ ہے تو مسرت کی لیکن اس کے پیچھے نیت کچھ اور ہے۔

"تم کالے کو صرف تانگہ بان سمجھتے ہو گے" — عبدالجلیل نے کہا — "وقت آیا تو دیکھنا یہ شخص میرا دایاں بازو ہے۔ اس کے سامنے کبھی کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھنا۔"

"اور ارشد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"رائے تو اچھی ہے" — عبدالجلیل نے کہا — "لیکن اسے میں ابھی پوری طرح اعتماد میں نہیں لے رہا۔ وہ ہے تو پکا پاکستانی۔ پاکستان اس سے جو قربانی مانگے گا وہ دے گا لیکن اس کا باپ ریٹائرڈ آفیسر ہے اور اس کا بڑا بھائی سیکرٹریٹ میں بڑی اچھی پوزیشن پر لگا ہوا ہے۔ خود ارشد سرکاری ملازم ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کا باپ اپنی پنشن کے تحفظ کے لیے اور اس کا بڑا بھائی اپنی نوکری کی خاطر اسے میرے گروہ میں نہیں ٹھہرنے دیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت ارشد کو ہی اپنی ملازمت اور ترقی کا خیال آ جائے۔ اسے میں ابھی آزمانا نہیں چاہتا۔ اسی لیے اسے یہ پلان نہیں بتایا جو تمہیں بتا دیا ہے۔ تم پر تو میں شک نہیں کر سکتا قدیر! تم ہندوستان سے زخم کھا کر آئے ہو۔ تم پاکستان کی قیمت دینے والوں میں سے ہو۔"

"مجھے پاکستان اور قیمت مانگے گا تو ادا کروں گا" — عبدالقدیر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "مجھے اپنا ساتھی سمجھیں خان صاحب!"

☆

عبدالقدیر حریت پسندوں کے گروہ کا بھیدی بن گیا۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسے اس گروہ کے متعلق ابھی کچھ اور بھی معلوم کرنا تھا۔

اُدھر کالے نے ان دونوں ہندو لڑکیوں جولیسہ اور عقیلہ کے فرضی ناموں سے جانی پہچانی جاتی تھیں، کی کوٹھیوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ عبدالجلیل نے اُسے کچھ ہدایات دے رکھی تھیں۔ ان کے مطابق وہ جاسوسی کر رہا تھا۔ عبدالجلیل نے اُسے عبدالقدیر کے متعلق یقین دلا دیا تھا کہ وہ گروہ کا قابلِ اعتماد اور بڑے کام کا آدمی ہے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کالے کا تانگہ شام کو جوتا تھا۔ اس کا تانگہ خوشنما اور گھوڑا بڑی اچھی نسل کا تھا۔ اس دور میں مال روڈ پر بھی تانگے چلا کرتے تھے۔ روپے پیسے والی سواریاں مل جاتی تھیں سیر سپاٹا اور عیش و عشرت کرنے والے شام کو نکلا کرتے تھے اور خوشنما تانگے شام کو ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ لاہور کے ان تانگوں میں کالے کا تانگہ بھی تھا۔

iqbalmt@gmail.com scanned by

اُس رات گیارہ بجے وہ کوٹھیوں کی اُس آبادی میں چلا گیا جہاں دیہات کے جاگیرداروں اور اسیر کبیر زمینداروں نے بھی محلوں جیسی کوٹھیاں بنالی تھیں۔ یہاں وہ عیاشی کرنے اور وزیروں کی دعوتیں کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ابھی بہت سا علاقہ خالی تھا۔ پلاٹ بک رہے تھے اور کوٹھیاں بن رہی تھیں۔

کامانجب نسیمہ کی کوٹھی کے قریب پہنچا تو اُس نے باہر ایک تانگہ کھڑا دیکھا۔ بڑا خوبصورت تانگہ تھا۔ کامے کو اس کوٹھی سے ذرا دور تانگہ روکنا اور کچھ دیر دیکھتے رہنا تھا کہ کوٹھی میں کون آتا جاتا ہے۔ اُس نے جب وہاں تانگہ کھڑا دیکھا تو تانگے والے کو پہچان لیا اور کوٹھی کو قریب سے دیکھنے کے لیے تانگہ اُس تانگے کے ساتھ جا روکا اور تانگے والے سے گپ شپ لگانے لگا۔ اُس تانگے والے نے اُسے بتایا کہ وہ ایک آدمی کو لایا ہے اور اُس نے تانگہ روک کے رکھنے کو کہا ہے۔

کاما جاسوسی کے لیے وہاں رکا تھا۔ اس نے سگریٹ نکالا۔ اس میں سے تھوڑا سا تمباکو اپنی ہتھیلی پر انڈیل کر جیب سے چرس کی گولی نکالی۔ اسے تمباکو میں ملا کر تمباکو سگریٹ میں ڈال کر سلگایا اور ایک کش لگا کر تانگے والے کو سگریٹ دے دیا۔ چرسیوں کی ملاقات ہوتی ہے تو محبت اور پیار کا اظہار ایک دوسرے کو چرس کا کش لگا کر کرتے ہیں۔

"جہانے یار!" — کامے نے اُس سے پوچھا — "اس کوٹھی میں کون رہتا ہے؟"

"معاملہ گڑبڑ ہے" — جہانے نے جواب دیا — "بڑی خوبصورت عورت رہتی ہے یہاں۔ بیرِ خیال ہے چلتی ہے۔"

"اونچا مال ہوگا؟"

"اونچا ہی لگتا ہے" — جہانے نے کہا — "یہ سواری جو اندر گئی ہے، اوپر والا آدمی ہے۔ پچھلے تین مہینوں میں اسے کوئی آٹھ بار لا چکا ہوں۔ رہتا تو سنت نگر کے ایک محلے میں ہے لیکن یاری کوٹھیوں میں لگا رکھی ہے۔ کبھی اس نے کرایہ نہیں چکایا۔ تم جانتے ہو میں سنت نگر کے علاقے میں ہوتا ہوں۔ صرف دو تانگے امیر سواری کے قابل ہیں۔ ایک میرا ہے۔ اس لیے میں وہاں ہوں تو میری ہی تانگے پر آتا ہے۔"

کامے نے گپ شپ کے انداز میں جہانے سے کچھ اور باتیں معلوم کر لیں۔ اتنے میں وہ آدمی کوٹھی سے نکلا۔ بڑے گیٹ پر دو بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ آدمی ان بتیوں کی روشنی میں آیا تو کامے نے دیکھ لیا۔ وہ آگے ہو گیا۔

"آپ ہیں؟" — کامے نے اُس سے رازداری سے پوچھا۔

"اوہ، تم.... فسانہ کامے! کیا حال ہے؟"

وہ عبدالقدیر تھا۔ اُس نے پتلون اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اوپر اوورکوٹ تھا۔ فیلٹ ہیٹ ابھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ کامے کو اس طرح اچانک اُس کے سامنے چلا گیا تھا کہ اُسے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اوورکوٹ سے بڑے بڑے کالر اوپر کرنے اور ہیٹ سر پر رکھ کر آنکھوں پر کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

"میں نے آپ کو آسانی پہچان لیا ہے" — کامے نے کہا — "خان صاحب کہتے تھے کہ بھائی عبدالقدیر اتنے ہوشیار ہیں کہ ان لڑکیوں کی کوٹھیوں تک رسائی حاصل کر لیں گے۔ آپ نے بھیس خوب بدلا ہے۔"

"اچھا تم چلو کامے!" — عبدالقدیر نے کہا — "میرا تانگہ کھڑا ہے۔"

"آپ اسے پیسے دے دیں" — کامے نے کہا — "آپ کو گھر تک میں لے چلوں گا۔ اپنا تانگہ موجود ہے تو پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد کاما جیت گیا۔ عبدالقدیر نے جہانے کو پیسے دیئے اور کامے کے تانگے کی پچھلی سیٹ پر سوار ہو گیا۔ عبدالقدیر نے فیلٹ ہیٹ سر پر رکھ کر آگے سے نیچے کر لیا اور اوورکوٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ کامے نے اُسے دیکھا تو اُسے تسکا سا جوا تین راتیں پہلے اُس نے ایسی ہی ایک سواری جو اسی کوٹھی سے نکلی تھی، اپنے تانگے میں بٹھائی تھی اور اُسے سنت نگر اتارا تھا — کیا وہ عبدالقدیر ہی تھا؟

"کیا آپ پہلے بھی اس کوٹھی میں آئے ہیں کبھی؟" — کامے نے پوچھا۔

"نہ کامے!" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "میرا یہاں کیا کام تھا پہلے۔ آج پہلی بار آیا ہوں۔"

کامے کو یقین ہو چکا تھا کہ عبدالقدیر کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ اُس کے اپنے پھیپھڑوں اور نتھنوں میں چرس بھری ہوئی تھی لیکن اُس نے عبدالقدیر کی سانسوں میں شراب کی بو سونگھ لی تھی۔ اُسے دوسرے تانگے والے نے بتایا تھا کہ اس سواری کو گذشتہ تین مہینوں میں کوئی آٹھ مرتبہ یہاں لا چکا ہے۔ اگر آٹھ مرتبہ وہ لا چکا ہے تو کئی مرتبہ وہ کسی دوسرے تانگے میں آیا ہوگا۔ تین رات پہلے تو کامے اُسے یہاں سے لے گیا تھا اور وہ سنت نگر اترا تھا۔

"آپ نے شراب بھی شاید پہلی بار پی ہے" — کامے نے کہا۔

عبدالقدیر نے شراب کے نشے میں جھومتا ہوا قہقہہ لگایا اور کہا — "جسے اپنے جال میں پھانسنا ہوتا ہے، اُس کی ہر بات بھی ماننی پڑتی ہے۔"

سفر لمبا تھا۔ کاما عبدالقدیر سے باتیں پوچھنے کے لیے گھوڑے کو تیز نہیں چلنے دے رہا تھا۔

"دو تین راتیں پہلے بھی آپ یہاں آئے تھے" — کامے نے کہا — "میں آپ کو یہاں سے سنت نگر لے گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی آپ یہاں آتے رہے ہیں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو کامے!" — عبدالقدیر نے ایسے غصے سے کہا جس میں دوستانہ بے تکلفی تھی — "کیا تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو؟"

عبدالقدیر شراب کے نشے میں تھا اور کامے نے چرس پی رکھی تھی۔ رات کی ٹھنڈی ہوا لگی تو دونوں کا نشہ تیز ہو گیا۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ مجھے اپنا دوست نہیں سمجھ رہے" — کامے نے کہا — "میں اگر اپنی جان قربان کر دوں تو بھی آپ کہیں گے کہ جھوٹا تانگے والا تھا، مر گیا تو کیا قیامت آ گئی۔ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔ خان صاحب کو آپ سب کچھ بتا دیں گے۔"

عبدالقدیر نے پھر بھی اُسے کہا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا اور وہ پہلی بار اس کوٹھی میں آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے نشے میں کہہ دیا کہ وہ اگر جھوٹ بول رہا ہے تو عبدالجلیل سے بھی وہ جھوٹ ہی بولے گا۔ وہ اُس کا گواہ نہیں لگا ہوا۔

"تم شاید اُسے ابھی تک تھانیدار سمجھ رہے ہو" — عبدالقدیر نے کہا — "میں اُسے کیا سمجھتا ہوں!"

یہاں سے بات کا رنگ ہی بدل گیا۔ کامے کو ایک شک ہو چکا تھا جو پکا ہوتا چلا گیا۔ اُس نے جاسوسی والی چال چلی اور ہنس پڑا۔ کہنے لگا — "جناب! آپ سو دفعہ آئیں، ایک بار بھی نہ آئیں۔ مجھے کیا سچی بات ہے، ہم چور اُچکے لوگ بدمعاش ہیں۔ وہاں بھی یہی کچھ کرتے رہے۔ یہاں بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ خان صاحب وہاں بھی مدد کرتے رہے یہاں بھی مدد کرتے رہے اور میں اُن کے لیے مخبری کرتا رہا۔ بڑے نامی گرامی چور پکڑواتے ہیں۔ اگر آپ کہیں مخبری کرانا

iqbalmt@onemarcom scanned by

چاہتے ہیں یا کوئی اور کام کرانا چاہتے ہیں جو کوئی شریف آدمی نہیں کر سکتا تو کامے حاضر ہے۔ اس کوٹھی کا کوئی کام ہو تو بتائیں۔"

"تانگہ روکو کامے!" — عبدالقدیر نے کہا۔

کامے نے تانگہ روک لیا۔ ساتھ میاں میر نہر تھی۔ اُس دور میں یہ علاقہ رات کے وقت سنسان ہو جاتا تھا۔ اس کے اردگرد آبادی نہیں تھی۔

"عبدالجلیل خان کا ساتھ چھوڑ دو" — عبدالقدیر نے کہا — "اور میرے ساتھ ماہوار مقرر کر لو"

"کام کیا ہے؟"

"لعنت بھیجو کام پر" — عبدالقدیر نے کہا — "فائدے میں رہو گے۔ زندگی کو کسی جرم کیے بغیر اندھ ہو جاؤ گے۔ عیش کرنی ہے تو میرے ساتھ رہو۔"

"سمگلنگ کے لیے؟" — کامے نے طنزیہ پوچھا — "پاکستان کی جاسوسی کے لیے؟ پاکستان کی جڑیں کاٹنے کے لیے؟"

"اپنی حیثیت پہچان کامے!" — عبدالقدیر نے کہا — "تو چور رہا ہے میں تھانیدار رہا ہوں۔"

"مجھ جیسے چور اور تم جیسے تھانیدار میں کوئی فرق نہیں میرے دوست!" — کامے نے اُسے 'آپ' کی بجائے 'تم' کہہ کر اپنی سطح پر گھسیٹ لیا — "تم ہمیں دھوکہ دے رہے ہو۔"

"ہاں! میں تمہیں دھوکہ دے رہا ہوں" — عبدالقدیر نے اور کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ نالی کامے کی طرف کر کے بولا — "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنے خان صاحب کو میری رپورٹ دینے کے قابل رہو گے؟ صبح تک یہ نہر تمہاری لاش اگلے دریا تک پہنچا دے گی اور تمہارا تانگہ اسی گھوڑی کے ساتھ اسی سڑک پر چلتا رہے گا۔ کوئی یہ بھی نہیں دیکھے گا کہ کوئی تانگے والا مرا ہے یا کوئی گم مر گیا ہے۔"

کامے پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اُسے اب یقین ہو گیا کہ عبدالقدیر ہندوستانی جاسوسوں کا ساتھی ہے لیکن اُس کے پاس ریوالور تھا جس کی نالی اُس کے پیٹ سے ایک ہی ہاتھ دور تھی۔ عبدالقدیر نشانے میں تھا۔ اُس کا نشانہ اُس کے قابو میں نہیں تھا۔ ٹریگر دبانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔

"ایک غریب کو قتل کر کے آپ کو کیا ملے گا!" — کامے نے ڈری ہوئی آواز میں کہا — "مجھے حکم دیں۔ دل و جان سے غلامی کروں گا۔"

"تم جیسے پاکستانیوں کو میں ایک ایک کر کے ختم کر دوں گا" — عبدالقدیر نے کہا۔

وہاں اندھیرا تھا۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ لمحے تیزی سے گزر رہے تھے۔ کامے ساکن کھڑا تھا۔ عبدالقدیر شاید اُسے ٹھنڈا سمجھ بیٹھا تھا۔ اچانک اُس کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی پر کامے کا ہاتھ یوں پڑا جیسے کسی نے تھوڑا مارا ہو۔ ریوالور گر پڑا۔ عبدالقدیر ریوالور اُٹھانے کو جھکا تو کامے نے بڑی تیزی سے اپنے نیفے سے وہ خنجر نکالا جو وہ بوقت نیفے میں اڑس کے رکھتا تھا۔ دوسرے لمحے خنجر جھکے ہوئے عبدالقدیر کے دل میں اُتر گیا۔ کامے خنجر چلانا جانتا تھا۔ اُس نے نیچے سے وار کیا تھا۔

عبدالقدیر سیدھا نہ ہو سکا۔ کامے نے اُسے گرنے نہ دیا۔ اُس کے پیچھے ہو کر اُس کی کمر میں بازو ڈالے اور اُسے دھکیلتا ہوا نہر کے کنارے تک لے گیا۔ نہر تین چار قدم دُور تھی۔ اُس نے دھکا دیا اور عبدالقدیر نہر میں جا پڑا۔ کامے نے ایک آدھ منٹ اُسے دیکھا۔ وہ ہاتھ پاؤں نہیں مار رہا تھا — خنجر اپنا کام کر چکا تھا۔

کامے نے ریوالور اٹھایا اور تانگہ بڑی سڑک کی طرف لے گیا۔ اُس نے سگریٹ میں چرس بھری اور لمبے لمبے کش لگاتا لاہور میں کہیں غائب ہو گیا۔

صبح کامے تانگے والے نے جب عبدالجلیل خان کو اُس کے گھر جا کر بتایا کہ اُس نے عبدالقدیر کو قتل کر دیا ہے، عبدالجلیل کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور کچھ دیر کامے کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے یوں بت بنا رہا جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو، یا جیسے اُسے دھوکہ ہو رہا ہو کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

"ہاں خان صاحب! میں نے عبدالقدیر کو رات قتل کر دیا ہے" — کامے نے عبدالجلیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا بلند آواز سے کہا اور جیب سے عبدالقدیر کا ریوالور نکال کر عبدالجلیل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا — "یہ اُس کا ریوالور ہے جس کی نالی اُس نے رات میرے سینے کی طرف کر کے کہا تھا کہ تم جیسے پاکستانیوں کو میں ایک ایک کر کے ختم کر دوں گا.... میں نے اُسے گولی چلانے کی مہلت نہ دی۔"

"کیوں؟" — عبدالجلیل نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا — "ایسی کیا دشمنی پیدا ہو گئی تھی اُس کے ساتھ؟ اُس کا مطلب کچھ اور ہو گا؟"

"وہ ہندوستان کا آدمی تھا" — کامے نے کہا — "وہ ہندوستان کے جاسوسوں کا ساتھی تھا۔"

عبدالجلیل گرج کر بولا — "کیا بکتے ہو کامے؟ کون سے عبدالقدیر کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ کو یقین نہیں آئے گا خان صاحب!" — کامے نے کہا — "اطمینان سے میری بات سنیں۔ میں آپ کے دوست عبدالقدیر کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے اُسی عبدالقدیر کو قتل کیا ہے جو ہمارا ساتھی بنا تھا۔ وہ آپ کو دھوکہ دے رہا تھا۔"

کامے نے عبدالجلیل کو پوری تفصیل سے سنایا کہ رات کیا ہوا تھا اور اُس نے عبدالقدیر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا تھا۔

عبدالجلیل خان ساری داستان سُن کر بہت دیر خاموش رہا اور اُس کی نظریں کسی ایک جگہ جمی رہیں۔ پھر اُس نے آہ بھری اور زیرِ لب بولا — "کوئی کس پر اعتبار کرے" — اُس نے کامے کی طرف دیکھ کر کہا — "تم نے یقین کر لیا تھا کہ وہ ہمیں دھوکہ دے رہا ہے؟ کہیں گرمیوں میں ہی کام کے ایک آدمی کو تو نہیں مار ڈالا؟"

"شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی خان صاحب!" — کامے نے کہا۔

"تمہیں کیسے یقین آ گیا تھا کہ وہ مر گیا ہے؟" — عبدالجلیل نے کہا — "ہو سکتا ہے وہ صرف زخمی ہوا ہو اور تمہارے آنے کے بعد نہر سے نکل آیا ہو۔"

"میں تھوڑی دیر وہاں رُکا تھا" — کامے نے کہا — "نہر کا پانی گہرا نہیں۔ وہ مرا نہ ہوتا تو کھڑا ہو جاتا۔ وہ پانی سے نہیں اُبھرا۔ مجھے یقین ہے کہ خنجر اُس کے دل میں لگا تھا۔"

عبدالجلیل خان بڑا عرصہ تھانیدار رہ چکا تھا۔ وہ مشرقی پنجاب کے اُن علاقوں میں تھانوں کا انچارج رہا تھا جہاں ہر روز قتل کی ایک واردات ہوتی تھی۔ اُسے قاتلوں کا سراغ لگانے کی مہارت حاصل تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ قتل بعض کس طرح کیے جاتے ہیں۔ اُس نے کامے سے قتل کی اِس واردات کے متعلق اِس طرح باتیں پوچھیں جیسے تفتیش کر رہا ہو، پھر اُس نے کامے کو اچھی طرح بتایا کہ اُسے کیا کرنا ہے اور قتل بعض کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ عبدالجلیل خان نے عبدالقدیر کا ریوالور اپنے پاس رکھ لیا۔

iqbalmt@yahoo.com Scanned by iqbalmt@yahoo.com

"دیکھ لیا تم نے کامے؟" — عبدالجلیل نے کہا — "پاکستان میں ایسے پاکستانی بھی موجود ہیں مجھ جیسا تجربہ کار تھانیدار بھی اس کے دھوکے میں آ گیا تھا۔"

"وہ بھی تھانیدار رہ چکا تھا خان صاحب!" — کامے نے کہا — "میں حیران ہوں کہ لوگ اپنے ملک اپنے مذہب اور اپنی قوم کو بھی دھوکہ دینے پر آ جاتے ہیں۔"

"پیسے میں بڑی طاقت ہے کامے!" — عبدالجلیل نے کہا — "اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں۔ تمہیں عالم فاضل بھی ہندوؤں کی دوستی کا دم بھرتے دکھائی دیں گے۔ اپنے حکمران طبقے میں اور سیاسی لیڈروں میں تمہیں ایسے ملیں گے جو اپنے وطن کے دشمن کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ یہی ان غداروں اور ایمان فروشوں کو چن چن کر ختم کرنا ہے.... اور شنو کامے! کسی اور سے عبدالقدیر کے قتل کا ذکر نہ کرنا ہمارے جو ساتھی بن گئے ہیں، ان میں سے کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔"

"لاش برآمد ہو جاتے گی؟" — کامے نے پوچھا۔

"ہو سکے تو" — عبدالجلیل نے کہا — "اور اس واردات کو بھول جاؤ۔ عبدالقدیر اتنی بڑی شخصیت نہیں تھی کہ پولیس اس کے قاتل کا سراغ لگاتی پھرے گی۔"

☆

ارشد کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ وہ عبدالجلیل خان سے ملنے گیا۔

"میں لاہور واپس آنے کی کوشش کروں گا" — ارشد نے کہا — "میں آپ سے اتنی دور رہ کر کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"تم بہت کچھ کر سکتے ہو ارشد!" — عبدالجلیل نے کہا — "پہلا کام یہ کرنا ہے کہ کسی کو شائبے سے بھی نہیں بتانا کہ ہم نے کوئی خفیہ تحریک چلائی ہے ورنہ اڑنے سے پہلے ہی تمہارے پر کٹ جائیں گے۔ تمہارا کام یہ ہوگا کہ اپنے دوستوں کو پاکستان کی سلامتی اور بقا کے لیے تیار کرو۔ ہر ایک کے ساتھ ایسی باتیں کرتے رہو کہ وہ خود کہیں کہ ایک تحریک شروع کرنی چاہیئے.... تم عقلمند آدمی ہو ارشد! خود سوچ سکتے ہو کہ تمہارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ رازداری لازمی ہے۔"

اگلی صبح ارشد اور طاہرہ راولپنڈی پہنچ گئے۔ طاہر پرویز بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن سے نجمہ کے گھر چلے گئے۔ طاہرہ کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی مگر تھوڑی دیر بعد نجمہ نے اس کے چہرے سے مسرت کا تاثر دھو ڈالا۔ طاہرہ نے نجمہ سے اپنے ابا جان کے متعلق پوچھا تھا کہ کیسے ہیں۔

"طاہرہ!" — نجمہ نے آہ بھر کر کہا — "معلوم ہوتا ہے تمہیں ایک اور غم سہنا پڑے گی.... ارشد! تم بھی میری بات غور سے سننا۔ طاہرہ! تمہارے ابا جان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ جوزی بابا رہے تو اچھے رہے۔ انہیں تم مل گئیں تو وہ جمال بیگ بن سکتے۔ اب اُن کی ذات میں وہ جمال بیگ بیدار ہو گیا ہے جس کے ہاتھوں تمہاری ماں اس لیے مرگئی تھی کہ اُس نے تمہیں جنم دیا تھا مگر اب جو جمال بیگ بیدار ہوا ہے وہ ہاتف اور کچھ اور دے میں جل بھن رہا ہے۔"

"وہ روتے ہوں گے؟" — ارشد نے پوچھا — "افسوس کرتے ہوں گے؟"

"نہیں!" — نجمہ نے کہا — "وہ بظاہر غصّے کا اظہار کرتے ہیں کہ طاہرہ تمہارے ساتھ ان سے پوچھے بغیر لاہور چلی گئی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ طاہرہ مجھے مجرم سمجھتی ہے اس لیے ارشد کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ تین دن سکول نہیں گئے۔ میں انہیں دیکھنے چلی گئی۔ اُنہوں نے ایسی باتیں کیں کہ میں پریشان ہو گئی۔ انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ طاہرہ کو لکھ دو کہ تمہاری ماں کا قاتل پاگل ہو گیا ہے۔ سیال نہ آیا۔ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔"

طاہرہ کچھ کہے کہ رہ گئی۔

"نجمہ آپا!" — طاہرہ نے اداس سے لہجے میں پوچھا — "آپ پھر بھی انہیں دیکھنے گئی تھیں؟ وہ سکول جاتے ہیں یا نہیں؟"

"میں کل بھی گئی تھی" — نجمہ نے جواب دیا — "اب سکول جاتے ہیں۔ میں نے ان کا وہم دور کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ پہلے سے بہتر نظر آتے ہیں۔ ان میں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے کہ اب سکول کے بچوں کے ساتھ وہ بے تابانہ پیار نہیں کرتے جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ اب تم دونوں ان کے پاس جاؤ اور ان پر باتوں سے بھی اور عملی طور پر بھی ثابت کر دو کہ تم دونوں کی زندگی میں اُن کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ان کے بغیر تمہاری زندگی خالی خالی سی رہ جائے گی.... طاہرہ! تم میں پتھروں کو موم کرنے کی اہلیت ہے۔ تمہارے ابا جان اگر اسی کیفیت میں رہے تو وہ فی الواقع پاگل ہو جائیں گے۔ اب تم دونوں سوچ لو کہ ان سے کیا کیسی باتیں کرنی ہیں.... تم ارشد! ان سے مل کر اپنے گھر چلے جانا۔ طاہرہ اور طاہر پرویز کو اس کے ابا جان کے پاس رہنے دینا۔"

ارشد اور طاہرہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ اُن کے اچھے بھلے کھلے ہوئے چہروں پر سنجیدگی اور اداسی طاری ہو گئی تھی۔ طاہرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"سنبھال لیں گے طاہرہ!" — ارشد نے کہا — "گھبراؤ نہیں۔"

"مجھے اس شخص سے نفرت ہونی چاہیئے تھی" — طاہرہ نے کہا — "لیکن وہ میرا باپ ہے۔ میری ماں کو تو اس نے مار ڈالا تھا لیکن میری رگوں میں اسی باپ کا خون ہے۔ میں اس خون کا احترام کرتی ہوں۔ ابا جان دکھی ہیں ارشد! انہوں نے میری خاطر بہت لمبی سزا بھگتی ہے۔ میں انہیں پاگل نہیں ہونے دوں گی۔ انسانوں کو پاگل انسان ہی کیا کرتے ہیں۔"

نجمہ، اُس کا خاوند، اظہر اور ارشد طاہرہ کے منہ کی طرف دیکھتے رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ اس کا باپ پاگل ہو نہ ہو، یہ خود پاگل ہو جائے گی — دوسروں کے دکھ اپنے سینے میں ڈال لینے والے لوگ نارمل نہیں ٹھہرا کرتے۔

☆

ارشد نے جمال بیگ کے کوارٹر کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ جمال بیگ نے کھولا۔

"تم؟" — جمال بیگ نے بے تاثر سے لہجے میں کہا — "تم لوگ آ گئے؟"

ارشد اُس سے ہاتھ ملانے کی بجائے جھک گیا اور اس کے پاؤں چھو لیے پھر اس سے مصافحہ کیا، پھر طاہرہ نے اُس کے پاؤں چھوئے، اُس کے ہاتھ چومے اور پھر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ جمال بیگ نے لپک کر طاہر پرویز کو اٹھا لیا اور سب اندر چلے گئے۔

iqbalmt@oreurdu.com Scanned by

"کیا تم لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہو کہ میرے پاؤں چھوؤ؟" — جمال بیگ نے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں کچھ اور ہی طرح کی اُداسی تھی۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے ابّا جان؟" — طاہرہ نے کہا — "کیا اپنی کھوئی ہوئی بیٹی کو پا کر آپ خوش نہیں ہیں؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ میں خوش یا کیا ہوں"۔ جمال بیگ نے ایسے انداز سے کہا جیسے وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے مگر اُسے پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ کہنے لگا — "تمہارے آنے سے پہلے میری ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ تم دونوں کو دیکھ کر کچھ اور ہو گئی ہے"۔

"اپنے آپ کو سنبھالیں ابّا جان!" — ارشد نے کہا — "ہم آپ کو اپنے ساتھ رکھیں گے۔ آپ کی خدمت کریں گے"۔

جمال بیگ دکھیاری سی ہلکی سی ہنس پڑا اور اس نے سر جھکا لیا۔

ارشد ہوٹل سے کھانا لے آیا۔ کھانے کے بعد ارشد اپنے بیٹے طاہر پرویز سے یہ کہہ کر جانے کے لیے اٹھا کہ "تم طاہری، اپنی امّی اور اپنے نانا جی کے پاس رہو گے۔ میں کل آؤں گا"۔ طاہر پرویز کچھ حیران ہو کے طاہرہ کی طرف دیکھا۔ طاہرہ نے اُسے سینے سے لگا لیا کچھ دیر بعد سکھ سو گیا۔

"میں آپا نجمہ سے مل کے آ رہی ہوں" — طاہرہ نے کہا — "اُس نے آپ سے ملنے کی مجھے بڑی تشویش ناک بات بتائی ہے۔ میں اُس سے یہی پوچھنے گئی تھی کہ آپ کیسے ہیں"۔

"طاہرہ بیٹی!" — جمال بیگ نے آہ بھر کر کہا — "میں خوش تھا کہ جمال بیگ مر گیا ہے اور میری ذات نے جوزی بابا کو جنم دیا ہے مگر تم نے آ کر جوزی بابا کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے میری ماں کے خون کا انتقام لے لیا ہے۔ میں پھر جمال بیگ بن گیا۔ اپنی بیٹی کا بھگوڑا اور اپنی بیوی کا مفرور قاتل... اور پھر کبھی سوچتا ہوں کہ جوزی بابا مرا نہیں۔ جمال بیگ پھر سے جی اٹھا ہے اور وہ دونوں میری ذات میں ایک دوسرے کو لہولہان کر رہے ہیں"۔

"ابّا جان!" — طاہرہ نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا — "اپنے آپ میں آئیں۔ آپ نے میری ماں کو قتل نہیں کیا تھا۔ وہ زچگی کی حالت میں گر پڑی تھی اور آپ اُس سے ٹھوکر کھا کر اُس کے پیٹ پر گر پڑے تھے۔ مجھے نانی اماں نے یہ سارا واقعہ سنایا تھا۔ آپ نے میری ماں کو قتل نہیں کرنا چاہا تھا۔ خدا کے لیے اپنے آپ کو یوں سزا نہ دیں"۔

طاہرہ نفسیات کی ڈاکٹر نہیں تھی، نہ جمال بیگ اپنا نفسیاتی تجزیہ کر سکتا تھا۔ وہ ایک نفسیاتی رد عمل کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس نے سکول کے بچوں اور بچیوں کے پیار میں ڈوب کر اپنے گناہ کا کفارہ ادا کیا تھا۔ اُس نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کے لیے اپنا نام بدل ڈالا تھا۔ وہ جمال بیگ سے جوزی بابا بن گیا تھا۔ وہ تو پاگل بھی ہو گیا تھا اور آزادی سے پہلے ہندوستان کی گلیوں میں جانے کتنے مہینے یا کتنے سال بھٹکتا پھرتا رہا تھا۔ اُسے اتنا ہی یاد تھا کہ اُس نے کسی کی ننھی سی ایک بچی کا منہ چڑھایا تھا تو وہ اپنے آپ میں آ گیا تھا۔ پھر اُن اجنبی گلیوں میں جس بچی کو دیکھتا، اُسے اٹھا کر چومتا اور مسکراتا تھا۔ کتنی بار ایسے ہوا کہ کسی نے اُسے کسی بچی کو اُٹھاتے دیکھ لیا تو اُس سے بچی چھین لی اور اُسے گالیاں دے کر بھگا دیا۔

اُسے پاگل پن سے بیدار تو برصغیر کی آزادی نے کیا تھا جب مسلمانوں نے ملک کے ٹوٹکڑے

کر کے پاکستان بنا لیا تھا۔ اُس وقت جمال بیگ ہندوستان میں ہی تھا اور پاگل پن سے اتنا سا نکل آیا تھا کہ لوگ اسے نیم پاگل اور بعض اسے خبطی کہتے تھے۔ اُس وقت وہ مشرقی پنجاب میں تھا۔ اُس نے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام دیکھا۔ گلیوں اور بازاروں میں مسلمان بچوں، عورتوں، بڈھوں اور جوانوں کی کٹی پھٹی، کچلی مسلی ہوئی لاشیں دیکھیں تو وہ پوری طرح بیدار ہو گیا اور پاگل پن کی دلدل سے نکل آیا۔ وہ کچھ دن ان لاشوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ اُس کا طلبہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کے قاتل اُسے پاگل سمجھتے رہے جس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ اس طرح وہ قتل ہونے سے بچ گیا اور وہ لہولہان قافلوں سے الگ تھلگ، آہستہ آہستہ چلتا جانے کتنے دنوں بعد پاکستان میں آ گیا۔

پاکستان نے اُسے نئی زندگی دی۔ اسے نیا ذہن دیا، نئی سوچیں دیں۔ وہ اب پاگل نہیں، پیار کا ہی پیاسا اور پیار کا ہی سرچشمہ تھا — پھر جمال بیگ ایک خوش لباس اور معزز انسان کے روپ میں، جوزی بابا کے نام سے سامنے آیا اور وہ اس سکول میں جہاں نجمہ اور طاہرہ پڑھاتی تھیں، ایک ایسے استاد کی شکل میں مشہور ہوا جو پیار اور محبت کی علامت تھا۔

اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی بیٹی جس کے پیدا ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کے اوپر گرا دیا تھا، زندہ ہو گی اور زندگی کے کسی موڑ پر اور کسی دوراہے پر اُسے مل جائے گی۔ وہ اُسے مل گئی تو انسانی نفسیات کا چکر اُلٹا چل پڑا۔ جوزی بابا کے ذہنِ لاشعور سے جمال بیگ قہقہے لگاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا ماضی اُس کے ذہنِ لاشعور میں قید تھا۔ یہ قید خانہ ٹوٹ گیا۔ ہوٹل میں بند کیا ہوا جن نکل آیا۔

انسان بیک وقت دیوانہ بھی ہوتا ہے فرزانہ بھی۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ دیوانگی غالب آ جاتے یا فرزانگی۔ کوئی انسان پر، ذہنِ لاشعور کس حد تک غالب آتا ہے اور ذہنِ لاشعور میں ماضی کا بھرا ہوا زہر کس مقدار میں شعور میں سرایت کرتا ہے۔ جمال بیگ نے بچوں کے پیار میں اپنے گھناؤنے ماضی سے اور اپنے ایک جرم سے فرار حاصل کیا تھا مگر اس کے جرم کی یادگار جس کا نام طاہرہ تھا اُس کے سامنے آ گئی اور طاہرہ نے اُسے اپنی امّی کی تصویر بھی دکھا دی تو وہ ذہنِ لاشعور کے تہ در میں جا گرا جس میں بڑی تلخ اور زہریلی یادیں ایندھن کی طرح جل رہی تھیں۔ جمال بیگ کو اب جلنا تھا، اُسے پاگل ہی ہونا تھا۔

"میری سزا ختم نہیں ہوئی طاہرہ بیٹی!" — اُس نے کہا — "میں مفرور تھا، مزے میں تھا۔ تم نے مجھے گرفتار کر لیا ہے تم کہتی ہو میں گزرے ہوئے وقت کو بھول جاؤں۔ کیسے بھلا جاؤں؟ .... گھٹا ہوں نے نظریں پھیر دیں گے تو وہ گھوم کر تمہارے سامنے آ جائیں گے ضمیر بڑی ظالم چیز ہوتی ہے طاہرہ بیٹی!..... مجھے گھٹا ہوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ میں ابھی اس قابل نہیں ہوں کہ تم میرے پاؤں چھوؤ اور میری خدمت کرو۔ میرے اندر سے ایک زہر اُٹھ رہا ہے"۔

"آپ کفارہ ادا کر سکتے ہیں" — طاہرہ نے کہا — "میں آپ کو ایک طریقہ بتاتی ہوں میری خوشیوں کی خاطر اور اس بچے کے مستقبل کی خاطر یہ زہر پی جائیں جو آپ کے اندر اٹھ رہا ہے۔ آپ کو یاد ہے نا کہ آپ نے مجھے جب پہچان لیا تھا اور ارشد بھی آ گیا تھا تو ارشد کے اشارے پر آپ نے مجھے ارشد کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اب ہماری شادی ہونی ہے۔ جلدی ہو رہی ہے

iqbalmt@onelumen.com Scanned by

اگر آپ کہیں کہ یہ شادی نہ ہو تو میں شادی نہیں کروں گی۔ آپ کے حکم پر قربان ہو جاؤں گی۔ اگر آپ میری شادی پر مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو جوزی بابا بن جائیے۔ آسیب نہ بنئے۔ مزا اپنے لیے نہ میرے اور ارشد کے لیے۔"

جمال بیگ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اُس نے نظریں طاہرہ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ طاہرہ اُس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی مگر جمال بیگ اپنی ہیلی کے چہرے میں کھو گیا تھا، پھر اس کی نظریں اپنی ہیٹی کے سراپا کا طواف کرنے لگیں، اور پھر اس کی ہیٹی جھیل میں درختوں کے عکس کی طرح جھلمل جھلمل کرنے لگی جیسے کسی نے جھیل میں کنکری پھینک دی ہو۔ طاہرہ کا چہرہ اُس کے آنسوؤں میں لہرا لہرا کر دھندلا گیا۔

"تمھاری خوشیوں کی خاطر میں زہر کا پیالہ پی لوں گا"— جمال بیگ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اپنے آپ سے بات کی ہو— "مجھے صرف یقین دلا دینا کہ تمھاری ماں کی رُوح نے مجھے معاف کر دیا ہے"— اُس نے لمبی آہ بھری اور بولا— "لیکن طاہرہ بیٹی! آندھیوں میں دیپ جلانے کی کوشش کی جاتی ہے، دیپ جلا نہیں کرتے... تمھیں ارشد کو روشنی کی ضرورت ہوئی تو میں اپنا گھر جلا کر بھی دنیا کو روشن کر دوں گا۔"

طاہرہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس نے بے اختیار اور بے قابو ہو کر اپنے باپ کی گود میں پھینک دیا۔ ہچکیاں لے لے کے رونے لگی جیسے فرحتی ہو، تھک کر نڈھال ہو گئی ہو اور اب پناہیں ڈھونڈ رہی ہو۔ جمال بیگ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

جمال بیگ کے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ طاہرہ کی شکل و صورت اور قد و قامت بالکل اپنی ہیلی سے ملتا جلتا تھا۔ طاہرہ نے اسے ایک دوسرے کو پہچاننے سے پہلے اپنی ماں کی جوانی کی تصویر دکھا کر کہا تھا کہ یہ میری تصویر ہے تو جمال بیگ مان گیا تھا لیکن اُس کی دانش و بینائی آشفتہ سر بحال آیا کہ وہ دنیا و دل تک ہل گیا تھا۔ اب وہ طاہرہ کو دیکھتا تھا تو ساجدہ کو اپنے سامنے کھڑا پاتا اور فراق کی راہیں ڈھونڈنے لگتا تھا۔

طاہرہ کی ہچکیوں اور آنسوؤں نے جمال بیگ کو سنبھال لیا اور وہ اپنے آپ میں آ گیا تھا کہ طاہرہ سمجھ سکی، جمال بیگ کو یوں سنبھل جانا اور جذبات کے تلاطم میں ٹھہراؤ پیدا ہو جانا عارضی کیفیت ہے اور ایسا سکوت بڑے خوفناک طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ طوفان کب اٹھے گا اور کیسی تباہی اپنے ساتھ لائے گا— طاہرہ نے اپنے آنسوؤں اور وارفتگی سے ایک طوفان اپنے باپ کے سینے میں روک دیا تھا۔

تیسرے دن لاہور کے اخباروں میں خبر چھپی کہ لاہور سے کچھ میل دُور نہر سے ایک لاش پکڑی گئی ہے جس کے سینے میں خنجر کا گہرا زخم ہے۔ مقتول کی جیب سے ریوالور کی چند گولیاں برآمد ہوئی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے پاس ریوالور تھا۔ مقتول کی جیب سے چاندی کی نقرئی رقم بھی برآمد ہوئی ہے۔ سونے کی انگوٹھی لاش کی انگلی میں تھی اور قیمتی گھڑی بھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول کو لوٹنے کے ارادے سے قتل نہیں کیا گیا۔ قتل کا باعث عداوت ہو سکتا ہے۔

خبر میں یہ بھی تھا کہ نہر سے جس علاقے سے لاش برآمد ہوئی ہے اُس علاقے کے تھانیدار نے مقتول کو پہچان لیا ہے۔ کسی وقت مقتول اس کے ساتھ پولیس میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر رہا تھا۔ مقتول کچھ عرصہ پہلے پولیس سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اُس کا نام عبدالقدیر تھا۔

لاش لاہور کے ایک ہسپتال میں لائی گئی۔ اخباروں میں پڑھ کر عبدالقدیر کے گھر والے ہسپتال پہنچ گئے اور انھوں نے لاش پہچان لی۔ لاش خراب ہو گئی تھی لیکن موسم سرد تھا اور برف ٹھنڈا اس لیے لاش ابھی پہچانے جانے کے قابل تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا باعث خنجر کا زخم بتایا گیا تھا۔ خنجر نے دل کو کاٹ دیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہو گیا کہ کیس کون سے تھانے میں رجسٹر ہو۔ اُس علاقے کے تھانے میں جس میں عبدالقدیر کا گھر تھا، یا اُس تھانے میں جہاں لاش برآمد ہوئی ہے یا اُس تھانے میں جس کے علاقے میں مقتول قتل ہوا ہے؟ اس تیسرے تھانے کا تو کسی کو علم نہ تھا۔ یہ سوال اس لیے اُٹھا تھا کہ کوئی تھانیدار کیس لینے پر آمادہ نہیں تھا جس کی تفتیش مشکل تھی۔ قتل کی اس قسم کی وارداتوں میں قاتل کا سراغ لگانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔

لاش لواحقین کے حوالے کر دی گئی تھی۔ وہ تھانے رپورٹ درج کرانے گئے تو تھانیدار نے انھیں کہا کہ ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ رپورٹ کہاں درج ہو گی۔ جوں ہی فیصلہ ہوا متعلقہ تھانہ اپنے آپ انھیں اطلاع دے کر کارروائی شروع کر دے گا۔

پاکستان سیاست دانوں کی حکمرانی کے اُس دور میں داخل ہو چکا تھا جس میں پولیس اور جسٹس غنڈوں اور بدمعاشوں کی چاندی ہو گئی تھی۔ پولیس کو برسرِ اقتدار پارٹی کے وزیروں، وزیرِ اعلیٰ اور صدرِ مملکت کی حفاظت کے لیے اور پارٹی کے مخالفین کی سرکوبی کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ غنڈے اور جرائم پیشہ افراد سرکاری پارٹی کے پاس بھی تھے اور حزبِ مخالف کے پاس بھی۔ ایک دوسرے کے جلسے جلوس اور جلسوں سے اکھاڑے جاتے تھے۔ پاکستان پولیس سٹیٹ بن چکا تھا۔ کوئی قتل ہو جاتے، لڑائی جھگڑے میں زخمی ہو جاتے، کسی کا گھر لُٹ جاتے، کسی کی ہتو بیٹی اغوا ہو جاتے، کچھ ہی ہو جاتے، متعلقہ تھانیدار رپورٹ درج کرنے سے گریز کرتا تھا۔ پولیس کے خلاف رپورٹ سننے والا کوئی نہ تھا کہ نگران پولیس کو راضی کرنے کا حوصلہ کون لے سکتے تھے۔ اس کے نتیجے میں پولیس من مانی کر رہی تھی۔

عبدالقدیر جیسے گمنام سے لوگ قتل ہوتے ہی رہتے تھے۔ اس کے لواحقین خالی ہاتھ رپورٹ درج کرانے چلے گئے تھے۔ مایوس لوٹ آتے۔

☆

تیسرے روز عبدالقدیر کی بیوہ گھر میں بیٹھی بین کر رہی تھی۔ محلے کی عورتیں بھی اس کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ باہر عبدالقدیر کے چھوٹے بھائی کے پاس محلے کے تین چار آدمی نیلے فلک میں بڑھتے ہوئے جرائم کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بار بار افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ عبدالقدیر جیسا نیک اور بھلا مانس آدمی بھی رہزنوں کا شکار ہو گیا ہے۔

ایک آدمی آیا جسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اُس نے بتایا کہ

iqbalmt@gmail.com scanned by

یہ ایک درخواست ہے جس پر مقتول کی بیوہ کے دستخط یا نشان انگوٹھا کی ضرورت ہے۔ عبدالقدیر کے بھائی نے درخواست پڑھی۔ یہ عبدالقدیر کی بیوہ کی درخواست تھی جو آئی۔ جی پولیس کے نام لکھی گئی تھی۔

"یہ کس نے لکھی ہے؟" — عبدالقدیر کے بھائی نے اس شخص سے پوچھا۔ "آپ کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے ایسی کوئی درخواست نہیں لکھوائی۔"

"آپ اسے پڑھ لیں" — اس شخص نے کہا۔ "اس سے آپ کو کوئی غرض نہیں کہ میں کون ہوں اور درخواست کس نے لکھی ہے۔ ہمیں قاتل کو پکڑنا ہے۔"

مقتول کے بھائی نے درخواست پڑھی۔ اردو میں کسی نے مقتول کی بیوہ کی طرف سے آئی جی کو لکھا تھا کہ اس کے خاوند کے قتل کا کیس سی۔آئی۔ اے کو دیا جائے۔ مقتول کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس نے پاکستان سے پہلے پولیس کی سروس میں ہوتے ہوئے تحریک پاکستان کے لیڈروں کی بہت مدد کی تھی۔ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے ایک بہت بڑے قافلے کو وہ اپنی حفاظت میں خیریت سے پاکستان لایا تھا۔ پاکستان میں اس نے موجودہ حکومت کی درپردہ بہت مدد کی تھی۔ مرکزی اسمبلی کے ممبر بہرام بخش صاحب اور صوبائی اسمبلی کے ممبر چوہدری اکرم صاحب مقتول کی خدمات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ پنجاب کے ہوم منسٹر اور ہوم سیکرٹری سے پوچھا جا سکتا ہے۔ مقتول نے موجودہ برسراقتدار پارٹی کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو موجودہ حکومت کی مخالف سیاسی پارٹیوں نے قتل کرایا ہے۔ مقتول ایک سچا پاکستانی اور ہندوستان کا بہت بڑا دشمن تھا لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں کہ مقتول کا قتل صرف میرا مسئلہ نہیں بلکہ یہ پاکستان کا اور موجودہ حکومت کا مسئلہ ہے۔ اس کے قتل کی تفتیش سی۔آئی۔اے کے سپرد کی جائے۔ اگر تفتیش متعلقہ تھانے میں کی گئی تو خطرہ ہے کہ موجودہ حکومت کے مخالفین پولیس پر اثر انداز ہو کر اصل قاتل کو سامنے نہیں آنے دیں گے۔"

عبدالقدیر کے بھائی نے درخواست لانے والے کو بتایا کہ ان کے تھانے کے انچارج نے قتل کی رپورٹ لی ہی نہیں۔ کتنا تھانہ بھی فیصلہ نہیں کرا سکا کہ کون سا تھانہ تفتیش اپنے ہاتھ میں لے گا۔

"ہمیں معلوم ہے" — اس شخص نے کہا۔ "اسی لیے یہ درخواست دی جا رہی ہے۔" درخواست پر بیوہ کا انگوٹھا لگوا دیا گیا۔

☆

"عبدالقدیر نے مجھے بتایا تھا کہ میرے اور عقیلہ کے قتل کا خطرہ ہے۔" — اس ہندو لڑکی نے کہا جس کا نام رادھا تھا لیکن پاکستان میں نام نسیرہ تھا۔ "معلوم ہوتا ہے یہ سیاسی خفیہ پارٹی کا کام ہے۔" عبدالقدیر نے مجھے ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر کا نام بتایا تھا۔"

"عبدالجلیل خان" — چوہدری اکرم نے کہا۔ "عبدالقدیر نے ہمیں اس خفیہ پارٹی کی ساری رپورٹ دے کر قتل کرایا ہے۔"

"مجھے سلمیٰ آنے یقین ہے کہ عبدالقدیر کو عبدالجلیل نے قتل کرایا ہے۔" — مہراللہ بخش نے کہا۔ "لیکن وہ عبدالجلیل کی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔" — چوہدری اکرم نے کہا۔ "اس نے دان اپنا اعتماد پیدا کر لیا تھا۔"

"تم عبدالجلیل کو نہیں جانتے چوہدری؟" — مہراللہ بخش نے کہا۔ "اس کا ہر کام شیطانی ہوتا ہے۔ تم امرتسر سے اُسے جانتے ہو۔ یہاں مجھے مخبروں نے بتایا ہے کہ وہ پولیس سے ریٹائر ہو چکا ہے لیکن غنڈے ابھی تک اس کے مرید ہیں۔ ناگوں والے بھی اس کے یار ہیں۔ اسے اندر کرانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے عبدالقدیر کی بیوہ سے درخواست لکھوا کر آئی۔جی کو دے دی ہے اور ہوم منسٹری کے سیکرٹری نے کہا ہے کہ کیس سی۔آئی۔اے کے پاس چلا جائے گا۔"

یہ سب نسیرہ کی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ عقیلہ بھی وہیں آ گئی تھی۔ ان کے جیلی خاوند بھی موجود تھے۔ دو نوجوان لڑکیاں ڈری سہمی تھیں۔ عبدالجلیل نے ٹھیک کہا تھا کہ دشمن کے دو تین ایجنٹ قتل ہو گئے تو باقی سب چوکنے ہو جائیں گے۔ نسیرہ اور عقیلہ تو لڑکیاں تھیں۔ انہیں ہوم منسٹری تک کا تحفظ حاصل تھا پھر بھی ان پر عبدالقدیر کے قتل نے خوف طاری کر دیا تھا۔

"آپ ہندوستانی سفارت خانے کو اطلاع دے دیں کہ کسی خفیہ ہاتھ نے ہمارے ایک پاکستانی ایجنٹ کو قتل کر دیا ہے۔ لہٰذا ہماری حفاظت کا مزید انتظام کیا جائے۔" — عقیلہ نے کہا۔

"مت ڈرو لڑکی!" — مہراللہ بخش نے کہا۔ "ہم مر تو نہیں گئے۔ میں چند دنوں بعد کراچی جا رہا ہوں۔ تمہارے سفیر کو بتا دوں گا۔ اس وقت تک اُسے یہ بھی بتا سکوں گا کہ ہم نے اس خفیہ ہاتھ کو پکڑ لیا ہے، ورنہ وہ کہے گا کہ ہم لوگ اس کی بھیجی ہوئی وہسکی پینے کے سوا کوئی کام نہیں کر رہے۔"

"نہیں صاحب!" — چوہدری اکرم نے کہا۔ "یہ بھی سوچ لیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ عبدالقدیر کو عبدالجلیل نے قتل کرایا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ عبدالقدیر کیسا آدمی تھا۔ وہ رئیس کیسا تھا۔ جوا کھیلتا تھا۔ ہیرا سٹہ کی ٹاپ کی طوائفوں کے ساتھ اس کا یارانہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ کسی جواری نے یا کسی طوائف نے جس کے اس نے پیسے دبا لیے ہوں گے، اُسے قتل کر کے لاش نہر میں پھینک دی ہو گی۔ عبدالجلیل کی جاسوسی اتنی تیز نہیں ہو سکتی کہ اُسے اتنی جلدی پتہ چل گیا ہو گا کہ عبدالقدیر اُسے دھوکہ دے رہا ہے۔"

"تم عبدالجلیل کے چاچے گھسیٹے ہو یا مامے؟" — مہراللہ بخش نے کہا۔ "میں کیس سی۔آئی۔اے کو کیوں دلا رہا ہوں؟ تم سمجھے نہیں؟..... عبدالجلیل کو پھانسنے کے لیے۔ خدا نے ایک موقع پیدا کر دیا ہے۔ اُسے گرفتار کرا دیں گے۔ کیس ۳۰۲ ہے اس لیے ضمانت نہیں ہونے دیں گے۔ اِدھر سے بچ گیا تو ہوم منسٹری اپنی ہے۔ اُسے سیکورٹی ایکٹ میں اندر کرا دیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو قتل کرا دیں گے۔ یہ تو یقین ہو چکا ہے نا، کہ اُسے ان دونوں لڑکیوں کا سراغ مل گیا ہے۔ ہماری تو اُس کے ساتھ پہلے سے ہی دشمنی ہے۔ حکومت ہماری ہو تو ایسا دشمن اہر کس طرح گھومتا پھرتا رہے؟"

ہندوستان سے آئی ہوئی وہسکی کا دور چلتا رہا اور اس دوران ہوم منسٹری کا سیکرٹری بھی آ گیا۔ اس نے خبر سنائی کہ عبدالقدیر کے قتل کا کیس سی۔آئی۔اے کے سپرد ہو گیا ہے۔ یہ کام اُس کے ہاتھ میں تھا جو اُس نے کر دیا اور داد طلب نگاہوں سے نسیرہ کو پھر عقیلہ کو دیکھا۔ دونوں خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے اُسے کھل کر داد دی اور پھر اُس کے بھی ہوش و حواس وہسکی میں اُڑنے لگے۔

☆

iqbalmt@gmail.com scanned by

تفتیش ایک ڈی۔ ایس۔ پی اور ایک انسپکٹر کر رہے تھے۔ اُن کے ایس۔ پی نے انہیں بتایا تھا کہ مقتول موجودہ حکومت کا نہایت اہم آدمی تھا۔ اس تفتیش میں مہراللہ بخش اور ہوم منسٹری کے سیکرٹری کی کوششیں شامل تھیں۔ انہوں نے وزیراعلیٰ کو بھی بتایا تھا کہ عبدالقدیر کو پارٹی کے دشمنوں نے قتل کرایا ہے اور عبدالقدیر پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اس طرح سی۔ آئی۔ اے پر سرکاری دباؤ آتا پڑا اور تاثر ایسا ملا کہ عبدالقدیر کا قاتل نہ ملا تو وہ گورنر اور وزیراعلیٰ کو بھی قتل کر دے گا۔

ڈی۔ ایس۔ پی اور انسپکٹر کی تفتیشی ٹیم مقتول کے گھر والوں سے معلوم کر چکی تھی کہ وہ گھر سے کس وقت نکلا اور کیا بتا گیا تھا۔ اُن سے یہ بھی پوچھا جا چکا تھا کہ انہیں کس پر شک ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں بتا سکے تھے۔ مخبروں کا ایک گروہ تھا جو مقتول کے محلے اور آبادی میں بسی سُراغ اور کسی ایسے اشارے کی مُشک لیتا پھر رہا تھا جو قاتل کی نشاندہی کر دے یا یہی پتہ چل جاتے کہ قتل کا باعث کیا تھا۔

مہراللہ بخش اور چوہدری اکرم خصوصاً بھی اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اور دوڑ دھوپ بھی کر رہے تھے۔ وہ اپنی زبان سے تفتیشی ٹیم سے نہیں کہنا چاہتے تھے کہ انہیں ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان پر شک ہے۔ یہ شک انہوں نے ایک مخبر کے ذریعے ڈی ایس۔ پی تک پہنچایا۔ اس سے مہراللہ بخش نے وزیراعلیٰ کے کان اِس انداز سے بھرے کہ وہ بھی عبدالجلیل کو مجرم سمجھنے لگا — اور شک کا یہ طوفان عبدالجلیل خان کے دروازے تک پہنچ گیا۔

دستک کی آواز پر عبدالجلیل نے ہی دروازہ کھولا۔ ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔

"ملک رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی صاحب نے آپ کو بلایا ہے" — کانسٹیبل نے کہا۔

"مجھے؟" — عبدالجلیل نے پُوچھا — "مجھ سے اُن کا کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو انہوں نے نہیں بتایا۔"

"میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں" — عبدالجلیل نے کہا — "کسی وقت ہم سب حال میں اکٹھے رہے ہیں۔ وہ اچھے آدمی ہیں۔"

عبدالجلیل نے جو کپڑے پہن رکھے تھے انہی میں چلا گیا۔ اپنی بیوی سے وہ کہہ گیا کہ جلدی آ جائے گا مگر سی۔ آئی۔ اے کو اُسے واپس بھیجنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

☆

ڈی۔ ایس۔ پی اُسے بڑے تپاک سے ملا جیسے مدتوں بعد بچھڑے ہوئے دو دوست ملے ہوں۔ وہ آزادی سے پہلے اکٹھے رہے تھے۔ ہم عمر اور ہم جولی تھے۔

"خان! تمہاری مدد کی ضرورت آ پڑی ہے" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔

"حکم کرو ملک! حاضر ہوں۔"

"یاد ہے تمہیں، عبدالقدیر نام کا ایک اے۔ ایس۔ آئی ہُوا کرتا تھا" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "وہ قتل ہو گیا ہے۔"

"کب؟" عبدالجلیل نے حیران ہو کے پُوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں؟"

"ملک! عبدالجلیل نے کہا — "مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا.... تم تفتیش کر رہے ہو؟.... تم سی۔ آئی۔ اے میں ہوتا!.... بتاؤ، میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"وہ تمہیں کب ملا تھا؟"

"مجھے؟" — عبدالجلیل سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بھی پولیس آفیسر رہ چکا تھا۔ سمجھ گیا کہ دال میں کالا ہے۔ بولا — "کوئی ایک مہینہ گزرا، بازار میں ملا تھا۔ کچھ دیر گپ شپ ہوئی۔ پھر اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"وہ تمہارے گھر نہیں گیا تھا؟"

"نہیں!" — عبدالجلیل نے جواب دیا — "اُس کے بعد میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔"

"خان!" — ڈی۔ ایس۔ پی نے دوستانہ لہجے میں کہا — "ہم پرانے دوست ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ تم میری یہ مدد کر سکتے ہو کہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو، اور میں تمہاری یہ مدد کروں گا کہ جس بات پر پردہ ڈالنا مناسب سمجھا، پردہ ہی ڈالے رکھوں گا.... مقتول تمہارے گھر گیا تھا، بلکہ جاتا رہتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔"

عبدالجلیل خان کا دماغ بیک وقت دو سوچوں میں مصروف ہو گیا۔ ایک یہ کہ ڈی ایس۔ پی کو کیا جواب دے اور دوسری سوچ یہ کہ کامیاب مگنے والا اتنا سچ ہو سکتا ہے کہ اُس نے پولیس کو بتایا ہو گا کہ عبدالجلیل حکومت کے خلاف ایک زمین دوز جماعت تیار کر رہا ہے اور عبدالقدیر بھی اس کے گھر آتا ہے؟.... نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر اُسے دھوکہ دینا ہوتا تو عبدالقدیر کو قتل کر کے اُسے کیوں آ کے بتاتا؟ اُس کا یہ ارادہ اُسے کیوں دے دیتا؟

"خان!" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "تم جو اتنا سوچ سوچ کر جواب دیتے ہو تا، اس سے اپنے خدوخال نمایاں کر رہے ہو۔"

"اوہ! میں اب سمجھا" — عبدالجلیل نے کہا — "میں تمہارا مشتبہ ہوں۔ تم نے مجھے مشتبہ بنا لیا ہے۔"

"میں اٹھا بھی سکتا ہوں" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "تفتیش میرے ہاتھ میں ہے۔ تم مجھے صاف بتا دو کہ تمہارا اس واردات میں کتنا کچھ عمل دخل ہے۔ تمہیں اس میں سے نکال دوں گا اور...."

"اور کسی اور کو پکڑ کر کیس ثابت کر دوں گا" — عبدالجلیل نے اُس کا فقرہ پُورا کرتے ہوئے کہا — "یہی کہنا چاہتے ہو نا!.... ملک! تم شاید بھول گئے ہو کہ میں بھی تھانیدار رہ چکا ہوں اور تم جانتے ہو کہ میں کس قسم کا تھانیدار ثابت ہوا کرتا تھا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں قتل یا اعانتِ جرم کا مجرم ہوں تو کیا میں تمہیں بتا دوں گا کہ ہاں میں مجرم ہوں، مجھے گرفتار کر لو؟"

"تمہیں بتانا پڑے گا خان!" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "نہیں بتاؤ گے تو تم جانتے ہی ہو کہ کیا ہو گا۔"

عبدالجلیل کے ذہن میں کامیابی تھا۔ وہ جواب بھی سوچ رہا تھا اور یہ بھی کہ ہو سکتا ہے کامے نے عبدالقدیر کے پاس کچھ رقم دیکھ لی ہو اور رقم اُڑانے کے لیے اُسے قتل کر دیا ہو اور مجھے آ کر یہ کہانی سنا دی ہو کہ عبدالقدیر نے دھوکہ دے دیا تھا۔

"تم ڈی۔ ایس۔ پی ہو کر زیادہ عقل مند تو نہیں ہو گئے ملک" — عبدالجلیل خان نے کہا۔

iqbalmir@gmail.com scanned by

"میرے دل سے دوستی کا پیار نہ نکالو خان!" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا "تم دیکھ لینا ایک دوست دوستی کا حق کس طرح ادا کرتا ہے۔"

کامیاب آنکھ والا ضرور ہے، اتنا کمین نہیں ہو سکتا۔ عبدالجلیل کو اس سوچ نے سکون سا دیا کہ اس دھوکہ دینے والا آدمی نہیں۔

"اگر تم مجھے مجرم سمجھتے ہو تو تفتیش کرو" — عبدالجلیل نے کہا — "مجھ پر وقت ضائع نہ کرو۔ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو کر لو۔ تمہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ میں تمہیں پوچھوں گا کہ میرے خلاف کس نے شک پیدا کیا ہے۔ تم یہ معلوم کرو کہ عبدالقدیر کی میرے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ خود سوچو کہ اس سے میری دشمنی ہو کیا سکتی ہے؟"

"مہراللہ بخش، چوہدری اکرم اور ہوم سیکرٹری کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے راز داری سے پوچھا — "کیا تم نے واقعی کوئی ایسا گروہ بنا رکھا ہے جو موجودہ حکومت کا تختہ الٹے گا؟"

"اب آئے ہو تم پٹڑی پر" — عبدالجلیل خان نے کہا — "کیا تم بھول گئے ہو کہ اس سے میری کیا دشمنی ہے؟"

"ہاں، مجھے یاد ہے" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "تم نے طلاق کے جرم پر الٰہی چارج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

☆

دن گزر گیا۔ عبدالجلیل کو کھانے کے لیے کچھ نہ دیا گیا۔ چائے کی صرف دو پیالیاں اُسے پلائی گئیں، وہ پانی پیتا تھا۔ رات کے دس بج گئے۔ ڈی۔ ایس۔ پی ابھی تک اُس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ عبدالجلیل عقل مند اور تجربہ کار انسان تھا۔ اُسے معلوم تھا قاتل کون ہے لیکن اسے وہ یہ نہیں کہتا تھا۔ عبدالقدیر کو قتل ہی ہونا چاہیے تھا۔ عبدالجلیل کے ضمیر پر کسی جرم اور کسی گناہ کا بوجھ نہ تھا۔ اس لیے اُس کی جسمانی اور روحانی قوتیں بیدار تھیں۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ مر جائے گا، قتل کا الزام اپنے قبول کرے گا، اپنی زبان سے یہ نہیں کہے گا کہ قاتل کون ہے۔

رات دس بجے کے بعد ڈی۔ ایس۔ پی کمرے سے نکل گیا اور اُس کی تفتیشی ٹیم کا انسپکٹر دوست محمد آ گیا۔ عبدالجلیل کو پولیس کا طریقۂ تفتیش معلوم تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی تھک گیا تھا اور وہ آرام کرنے چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ عبدالجلیل کو رات بھر جگائے رکھنے کے لیے یہ انسپکٹر آ گیا تھا۔

"آؤ دوست!" — عبدالجلیل نے مسکرا کر کہا — "اب تم زور لگا لو۔"

انسپکٹر دوست محمد نے دروازہ بند کر دیا اور ہاتھ جوڑ کر عبدالجلیل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"آپ میرے استاد ہیں" — اُس نے عبدالجلیل سے کہا — "مجھے وہ وقت بھولا نہیں جب میں آپ کے پاس ایک بچے کی طرح آیا تھا۔ میں کوئی گستاخی نہیں کروں گا۔ اپنی نوکری کا مار آپ کے سامنے آ گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ آپ کو آپ کے دشمنوں نے پھانسا ہے۔ مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ یہ کوئی چکر ہے۔ ایک ریٹائرڈ اے۔ ایس۔ آئی قتل ہو گیا۔ تھانے والے اس کیس کو لے ہی نہیں رہے تھے لیکن دو تین دنوں

میں کیس سی۔ آئی۔ اے کے پاس آ گیا۔ مقتول کہاں کا وزیرِ اعظم اور کس ملک کا صدر تھا کہ اُس کے قتل کی تفتیش ایک ڈی۔ ایس۔ پی اور ایک انسپکٹر کر رہا ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے پیر استاد کو میرے سامنے مُشتبہ بٹھایا جائے گا۔"

"تم اپنی ڈیوٹی کا خیال رکھو دوست محمد!" عبدالجلیل نے کہا — "میں تم سے بالکل یہ توقع نہیں رکھوں گا کہ میرے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کرو۔ تمہیں جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کرو۔"

ڈی۔ ایس۔ پی ابھی گیا نہیں تھا۔ وہ دفتر میں بیٹھا کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہا تھا:

"میں اسے بڑی اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ چکا ہوں سر! یہ بالکل صاف ہے..... جی سر! آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ بڑا کایاں تھا نیذارہ چکا ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں الیکشن میں اُس نے درپردہ مسلمانوں کی بہت مدد کی تھی۔ اُس نے اپنی نوکری بھی خطرے میں ڈال دی تھی لیکن اس کیس میں یہ صاف ہے۔ میں نے صبح نو بجے تفتیش شروع کی تھی اور دس بجے رات اُسے چھوڑا ہے۔ اب اسے انسپکٹر دوست محمد کے حوالے کر دیا ہے..... جی سر! بجا فرمایا آپ نے۔ جی جی سر، میں سمجھ گیا۔ یہ تو میں کہہ ہی گیا تھا کہ اسے پھنسایا جا رہا ہے..... جی سر! میں اوپر والوں کے دباؤ کو سمجھتا ہوں۔ جی سر! ہوم سیکرٹری کو معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا دشمنی ہے۔ جی سر! اگر حکم یہی ہے تو میں کیس اسی کے خلاف ثابت کر دوں گا۔ ہمیں تو نوکری کرنی ہے۔ ہماری ترقیاں انہی کے ہاتھ میں ہیں..... بہت اچھا سر! اسے نہیں نکلنے دوں گا۔ کل اس کے گھر کی تلاشی لے لیں گے۔ ایک دو گرفتاریاں ساتھ لے جائیں گے۔ دو تین رات کو لے جائیں گے اور یہ سارا اسلحہ اس کی خانہ تلاشی کی برآمدگی دکھا دیں گے۔ خدا حافظ سر!"

ڈی۔ ایس۔ پی نے ریسیور رکھا اُدھر ایس۔ پی نے ریسیور رکھا۔ دونوں کے چہروں پر تاسف، ندامت یا پشیمانی کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں تھا۔

☆

عبدالجلیل نے انسپکٹر دوست محمد کو آواز دی کہ آ کر بتایا کہ ڈی۔ ایس۔ پی صاحب گھر چلے گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ عبدالجلیل کو ساری رات سونے نہ دینا۔

"دوڑ کر جاؤ اور سامنے والے ہوٹل سے کہہ کر نالے آؤ" — دوست محمد نے کانسٹیبل سے کہا۔

وہ چلا گیا تو دوست محمد نے عبدالجلیل سے کہا — "میں اسی انتظار میں تھا کہ ڈپٹی یہاں سے لاپتہ ہو جائے تو آپ سے بات کروں۔ آپ کے گھر والے آپ کے لیے پریشان ہیں۔ آپ کا نوکر شام سے باہر گیٹ پر بیٹھا ہے۔ آپ کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ رات دس بجے کے بعد آنے لیکن اندر نہ آئے۔ میں اُسے بلا لیتا ہوں۔ آپ اُسے تسلی دلاسہ دے دیں۔ میں آپ کے لیے بیوی کو کہہ سکتا ہوں" — اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

عبدالجلیل حیران تھا کہ اُس کا نوکر کون ہے۔ تھوڑی دیر بعد لوکر آ گیا۔ وہ کامیا تھا۔ اُسے دیکھ کر عبدالجلیل کو کئی خیال آئے۔ کامے کا آنا بھی پولیس کی چال ہو سکتی تھی۔ دوست محمد کامے کو عبدالجلیل کے پاس بٹھا کر باہر چلا گیا۔

"میں پوری جاسوسی کر رہا ہوں" — کامے نے کہا — "مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کیس سی۔ آئی۔ اے میں آ گیا ہے۔ آپ کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ ایک کانسٹیبل آپ کو ساتھ لایا ہے۔ میں نے آپ کی بیگم سے

iqbalmt@onelap.com scanned by iqbalmt

کہہ کر عبدالقدیر کا ریوالور آپ کے ٹرنک سے نکال لیا اور راوی میں پھینک آیا ہوں۔ آپ نے انہیں کیا بتایا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں"۔۔۔ عبدالجلیل نے کہا اور اسے جلدی جلدی بتا دیا کہ ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ اُس کی کیا باتیں ہوئی ہیں۔ اس نے کہا۔ "میں سارا ایکٹر کھچ گیا ہوں۔ یہ لوگ مجھے چھوڑیں گے نہیں۔"

"میں بھی بہت کچھ سمجھتا ہوں خان صاحب!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "میں اس کیس کا رُخ کسی اور طرف کر دوں گا۔ ہم نے میٹنگ کر لی ہے۔"

"کیا کرو گے؟"

"ہم ان دونوں ہندو لڑکیوں کو اغوا کر کے غائب کر دیں گے"۔۔۔ کامے نے کہا۔ "ہم نے سکیم بنالی ہے۔ کچھ آدمی ساتھ لے لیے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تین یا چار دنوں بعد آپ خبر سُنیں گے کہ ٹرین اور حقیقی نام کی دو لڑکیاں لاپتہ ہو گئی ہیں۔"

انسپکٹر دوست محمد اندر آگیا اور بولا۔ "خان صاحب! اب اسے جانے دیں۔ کوئی اور بات ہو تو کل کر لیجیے گا۔"

کامے کمرے سے نکل گیا۔

عبدالجلیل خان اُس کمرے میں بیٹھا رہا جس میں ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی نے اُسے لا بٹھایا تھا اور جس میں ڈی۔ ایس۔ پی کے جانے کے بعد انسپکٹر دوست محمد نے اُسے کھانا کھلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسپکٹر دوست محمد نے اُسے کھانا کھلا کر اور اُس کے ساتھ دوستانہ شفقت سے باتیں کر کے اُس پر کرم کیا تھا اور اُس نے خطرہ مول لیا تھا۔ وہ خود پولیس کا ریٹائرڈ انسپکٹر تھا۔ وہ اس کمرے میں پہلی بار آیا تھا لیکن اس قسم کے کمروں سے وہ ناواقف نہیں تھا سرحد پار، انگریزوں کے دور میں اس قسم کے کمروں میں اس نے ایسے ملزموں اور مشتبہوں سے مسلسل کئی کئی دن اور راتیں پوچھ گچھ کی تھی جو تجربوں سے بھی سخت جان تھے۔ مانتے نہیں تھے۔ بڑی بڑی سخت چٹانوں سے بھی نہیں ٹوٹتے تھے، مگر توڑ ہی لیے جاتے تھے۔ بیگناہ بھی بلبلا کے کچھ اُگل اٹھتے تھے۔۔۔ "جو کہلوانا چاہتے ہو لکھ لو۔ میں دستخط کر دوں گا۔"

کمرے میں عبدالجلیل مشتبہ کی حیثیت سے تنہا بیٹھا تھا۔ اُسے ڈرا نہیں سکتا تھا۔ ڈرنے کی بجائے وہ سوچ رہا تھا بلکہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خون کا ابال اسے اچھی طرح سوچنے نہیں دے رہا تھا۔ اُس کے وجود میں غصّے کی لہر اٹھتی تھی تو وہ ربڑ کی گیند کی طرح اچھل کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ وہ دروازہ بند تھا۔ کھڑکی ایک تھی جس میں سلاخیں لگی ہُوئی تھیں۔ دروازہ سلاخوں کے بغیر تھا۔ اس میں شیشے لگے ہُوئے تھے۔ عبدالجلیل جوں ہی اٹھتا تھا، باہر پہرے پر کھڑا کانسٹیبل شیشوں میں سے اُسے جھانکتا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اس قسم کے کمرے موجود ہیں اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب ان کمروں کو انٹیروگیشن روم کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں یہ کمرے دُکھتی رگ اور جاسوسی کے ملزموں کی تفتیش کے لیے استعمال ہوتے تھے مگر پاکستان چونکہ آزاد ملک تھا اس لیے یہ کمرے آزادی سے استعمال ہونے لگے تھے۔ اب یہاں کسی سیاسی پارٹی، مدیر، پبلشر یا اخبار کے ملزموں اور مشتبہوں اور ملک دشمن جاسوسوں اور ان کے ایجنٹوں کو لانے کی بجائے پاکستان کی آئے دن بدلتی حکومتوں کے مخالفین کو لایا جاتا اور اُن کی بریفنگ کی جاتی تھی۔

پاکستان کے ہر بڑے پرچم نے اپنی عمر کے آٹھویں نویں سال ہی یہ منظر دیکھا کہ انٹیروگیشن روم میں لائے ہُوئے اور اذیت سے بلکتے تڑپتے ملزم اور مشتبہ تو رہے ہُوئے کل کے یا آنے والے کل کے حکمران ہوتے تھے، اور پھر ان کے حکم سے ان کمروں کی رونق قائم رکھنے کے لیے ان کے مخالفین کو لایا جاتا اور انہیں تخریب کار اور ون پرسنٹ کہا جاتا تھا۔ قوم بے خبر رہتی تھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی کہ برسرِ اقتدار پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے والی پارٹی کے کھٹنے ہی افراد ان ذبح خانوں میں بند کر رکھے ہیں جنہیں انٹیروگیشن روم کہا جاتا ہے۔۔۔ اور اس سارے عمل کو سیاست کا نام دیا جاتا ہے۔

○

ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان جانتا تھا سب کچھ جانتا تھا۔ ملزموں سے پوچھ گچھ کرنے والا افسر ملزم بنا

scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بیٹھا تھا۔ اُس کی نگاہیں دیواروں اور چھت پر گھومنے پھرنے لگیں اور اُسے طرح طرح کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسی چیخیں جو پولیس کے سوا کوئی اور شہری برداشت نہ کر سکے۔ انسان کو یہاں لاکر اسے انسان سمجھنا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ان غیر انسانی اذیتوں سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا —— موت۔ پولیس کی مرضی کے مطابق اقبالِ جرم —— ان کمروں میں بعض افراد مر بھی جاتے تھے۔ کسی کے متعلق کہہ دیا جاتا تھا کہ اس نے خودکشی کر لی ہے اور کسی کی لاش باہر پھینک کر اخباروں کو خبر دی جاتی تھی کہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے —— اور پھر ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پولیس لاش غائب کرنے کی خاموش رسم تھی۔ مرنے والے کے لواحقین واویلا مچاتے تو پولیس کی طرف سے لاعلمی کا اظہار ہوتا تھا کہ اس نام کے کسی آدمی کو کبھی گرفتار کیا ہی نہیں گیا۔

عبدالجلیل کو اپنا انجام نظر آنے لگا تھا۔ اُسے ڈی۔ ایس۔ پی نے بُلا دیا تھا تو تمہیں بتانا پڑے گا نہیں بتاؤ گے تو جانتے ہو کیا ہوگا۔

"نہیں بتاؤں گا" —— عبدالجلیل نے اپنے آپ سے کہا —— "کا مجرم نہیں بچاؤں گا۔ میں اُن کی خاطر جان دے دوں گا، نہیں بتاؤں گا۔"

کمرے کا دروازہ کھلا۔ انسپکٹر دوست محمد اندر آیا۔ اُس کا چہرہ اُداس تھا۔ عبدالجلیل کی پرچھائی پر جھکا تھا۔ انسپکٹر دوست محمد اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا۔

عبدالجلیل نے اسے دیکھا۔ ایک بگولہ سا اُس کے ذہن سے اُٹھا اور اُس کے ذہن میں ہی غوطہ لگا کر غائب ہو گیا۔ "کیا دوست محمد مجھے پیار اور محبت کا دھوکہ دے کر مجھ سے سچ اگلوانا چاہتا ہے؟"

یہ بھی پولیس کا طریقۂ تفتیش تھا کہ ایک دو آدمی طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے اور ان کے جانے کے بعد ایک تھانیدار سراپا پیار اور ہمدردی بن کر آجاتا تھا۔ وہ ایسی باتیں کرتا تھا جیسے ملزم کی چوٹوں کا درد اُس کے جگر میں چلا گیا ہو۔ وہ ملزم پر تشدد کرنے والوں کو گالیاں دیتا اور خود کو غمخوار بتاتا تھا۔ ملزم تو تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہوتا تھا، اس پیار کے جال میں آتے دیر نہ لگتی۔ وہ زیادہ وقت نہیں لگاتا تھا۔

انسپکٹر دوست محمد نے سر اٹھایا اور بولا —— "خان صاحب! میرے لیے حکم ہے کہ آپ کو کسی طرح سولے تو دوں..... ڈپٹی کو شاید معلوم ہے کہ میری آپ کے ساتھ دوستی ہے۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ محبت اور دوستی کا پنجہ چلانا۔"

"چلا لو یار!" —— عبدالجلیل نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا —— "جو پنجہ چل سکتا ہے چلا لو۔"

دوست محمد نے داڑھی میں ہاتھ پھیرا اور بولا —— "نہیں چلاؤں گا۔ کوئی پنجہ نہیں چلاؤں گا" —— اُس نے آہ بھری اور کہنے لگا —— "سب سمجھتا ہوں خان صاحب! سب سمجھتا ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ چوتھی چار کانسٹیبل یہاں ڈیوٹی پر ہیں۔ میرے لیے اپنے آدمی ہیں۔"

"کانسٹیبل کسی کے بھی آدمی نہیں ہوا کرتے دوست محمد!" —— عبدالجلیل نے کہا —— "کسی پر بھروسہ نہ کرنا۔ اپنے سگے کو تم جانتے ہو۔ سچ پوچھو تو مجھے تم پر بھی بھروسہ نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں خان صاحب!" —— انسپکٹر دوست محمد نے کہا —— "ابھی کل ہم آزاد ہوئے ہیں اور آج بھائی نے بھائی کو کھانا شروع کر دیا ہے۔ ہم دین و ایمان سے بھی آزاد ہو گئے ہیں۔"

"مجھے ساری رات کس طرح جگائے رکھو گے؟" —— عبدالجلیل نے مذاق کے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس واردات کی کوئی بات نہیں کروں گا۔ بس میں آپ کو بچانا چاہتا ہوں" —— دوست محمد نے جواب دیا —— "میں آپ کے پاس بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ڈر ہے کہ ملک صاحب نہ آجائیں..... باتیں کریں گے۔ گپ شپ لگائیں گے۔"

اور وہ گپ شپ لگاتے رہے۔ پرانی باتیں، پاکستان کی باتیں، اُس دور کی باتیں جب وہ انگریزوں کے وقت کھیں اکٹھے رہتے تھے، پاکستان کے لیے خون دینے والوں کی باتیں، پاکستان کی رگوں سے خون چوسنے والوں کی باتیں، پاکستان کے اُن مخالفین کی باتیں جو پاکستان کے تخت و تاج پر قابض تھے، اور وہ دونوں ان باتوں میں ایسے مگن ہوئے کہ رات کے دو بج گئے۔

"سو جائیں خان صاحب!" —— انسپکٹر دوست محمد نے کہا —— "میں نیچے پر سو جاتا ہوں۔"

دوست محمد اس انداز سے کمرے سے نکل گیا جیسے گپ شپ لگانے ہی آیا تھا۔

o

دوسرے دن ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی اپنے ایس۔ پی کے گھر بیٹھا تھا۔ ایس۔ پی نے اُسے صبح سویرے ہی بلا لیا تھا۔ اُس نے رجب علی کو اُن بالائی افسروں کے نام بتائے جنہوں نے اُسے گذشتہ رات فون پر کہا تھا کہ عبدالجلیل کو چھوڑ نہ دینا۔

"ملک صاحب!" —— ایس۔ پی نے کہا —— "معلوم ہوتا ہے جیسے سیکریٹریٹ کی ساری توجہ اس مسئلہ پر مرکوز ہو گئی ہے کہ عبدالجلیل کو کس طرح پھانسی چڑھایا جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا، کہ میں کس کس کی بات کر رہا ہوں، ورنہ عبدالقدیر جیسے گنے چنے آدمی تو یہاں قتل ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے سمجھ نہیں آئی کہ عبدالجلیل کے ساتھ ان لوگوں کی دشمنی کیا ہے" —— رجب علی نے کہا —— "سنگین کیس تو نہیں؟"

"کیس نے دوگی!" —— ایس۔ پی نے کہا —— "ہمیں نوکری کرنی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں کتنے قاتل چھوٹ گئے ہیں اور کتنے قتل کرائے جا چکے ہیں۔ آپ دشمنی کی وجہ پوچھتے ہیں۔ حکومت اوپر سے اور کھینے لوگوں کے ہاتھ آگئی ہے۔ ان سے آپ اس سے زیادہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ بیسیوں دہائیوں کی طرح نہ اذاسی بات پر دشمنی پیدا کریں اور طاقت کا استعمال اپنے دشمنوں کے خلاف کریں۔ پاکستان کی اور ہماری قسمت اب انہی کے ہاتھ میں ہے۔"

"مجھے تو افسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے ہاتھوں مختار ظلم کروا رہے ہیں" —— رجب علی نے کہا۔

"میں نے بھی شروع شروع میں افسوس کیا تھا" —— ایس پی نے کہا —— "لیکن نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھنے یا تبادلے سے محروم ہو جانے کا افسوس قابلِ برداشت نہیں تھا۔ عبدالجلیل کا حشر دیکھ لو۔ آج ایس۔ پی نہیں تو ڈی۔ ایس۔ پی ضرور ہوتا مگر اسے جبری ریٹائرمنٹ پر بھیج دیا گیا اور آج قتل کا ملزم ہے۔ میں جانتا ہوں اس سے ملزم کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے..... ملک صاحب!" —— ایس۔ پی نے آہ بھر کر کہا —— "میں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح عہد کیا تھا کہ پاکستان میں حلال کی کھاؤں گا اور یہاں کسی جرم کو زندہ نہیں رہنے دوں گا مگر پاکستان کی حکومت ہی مجرموں کے ہاتھ آگئی اور انہوں نے ہمیں بھی مجرم بنا ڈالا۔ ہم کیا ہیں ملک صاحب؟..... مجرموں کے محافظ..... ہمیں حکم ماننا ہے۔ ہمارا اولیں فرض یہ ہے کہ کرسی پر جو بیٹھ جائے اُس کی حفاظت کریں۔"

iqbalmt@onepoint.com scanned by

"یہاں جو بھی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اُس کی یہی ایک خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا جنازہ اسی کرسی پر اُٹھے"
— ملک رجب علی نے کہا۔

"جاؤ بھائی میرے! — ایس۔ پی۔ نے کہا۔ "تصدیق کرو کہ عبداللہ پر کا قاتل عبدالجلیل ہے۔"

"مگر صاحب! — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ اسے جانتے ہیں وہ لفنگا، غنڈہ اور تجربہ کار پولیس انسپکٹر رہ چکا ہے۔"

"وہ آپ کے قبضے میں ہے" — ایس۔ پی نے کہا — "اس کی جعلی مار دو۔ اس کے ہوش گم کر دو۔ زبان سے نہیں ہاتھوں سے کام لو۔ سیکریٹریٹ کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا۔ ملک صاحب! اس کے گھر کی تلاشی لو۔ اسلحہ برآمد کرو۔ آلۂ قتل برآمد کرو۔"

ملک رجب علی جب وہاں سے اُٹھا تو اُس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اُس کا ذہن صاف تھا۔ اُسے ایس۔ پی بنانا تھا۔ اس کے لیے اسے کچھ کر کے دکھانا تھا۔

○

وہ جب سی۔ آئی۔ اے کے تفتیشی کمرے میں داخل ہوا، اُس وقت عبدالجلیل بیچ پر گرفتار کیے جانے والا تھانیدار دوست محمد دفتر میں بیٹھا تھا۔ اُس نے رجب علی کو بتایا تھا کہ اُس نے ساری رات سونے نہیں دیا لیکن وہ ملزم سے کچھ بھی اگلوا نہیں سکا۔ رجب علی نے کہا تھا کہ وہ اگلوا لے گا۔ اس کا باپ بھی اُگلے گا۔

ملک رجب علی کے ہاتھ میں افسروں والی دو فٹ لمبی چھڑی تھی۔ اُس سے بڑی بڑے زور سے سوئے ہوئے عبدالجلیل کے پہلو میں چھوتی۔ عبدالجلیل اُٹھ بیٹھا۔

"کیا ارادے ہیں دوست؟" — اُس نے عبدالجلیل سے پوچھا — "مجھ کو ناکارہ کر دو، میرے ہاتھ سے ہڈیاں نہ تڑواؤ۔"

عبدالجلیل ہنس پڑا۔ رجب علی نے اس کے منہ پر بڑی زور سے چھڑی ماری۔ عبدالجلیل اوندھا ہو گیا۔ اس نے سیدھا گھونسہ رجب علی کے منہ پر مارا۔ رجب علی تین چار قدم پیچھے ہٹ کے بل گرا۔ اور اُٹھ کے کھڑا کانسٹیبل وزیر کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ رجب علی اندر آ رہا تھا۔ عبدالجلیل نے اچھل کر اس کے پہلو میں لات ماری۔ ڈی۔ ایس۔ پی دیوار سے جا لگا۔ کانسٹیبل کے پاس رائفل تھی۔ وہ رائفل دونوں ہاتھوں میں لے کر عبدالجلیل کو بٹ مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ عبدالجلیل نے بٹ کو اُس کی رائفل پکڑ لی اور اس کے پیٹ میں ٹھڈا مارا۔ کانسٹیبل دوہرا ہو گیا اور اُس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔

عبدالجلیل نے رائفل نہ اٹھائی۔ رجب علی اب آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ عبدالجلیل کھڑا رہا۔

"اب پوچھو میرا ارادہ کیا ہے" — عبدالجلیل نے اُسے کہا — "مجھے معلوم ہے میرا انجام کیا ہوگا۔ اب میری ہڈیاں توڑنے کا بندوبست کرو۔ میں تیار ہوں۔"

اور اُس کی ہڈیاں توڑنے کا بندوبست کر دیا گیا۔

وہ ایک اور کمرہ تھا۔ وہاں سے کسی کی آواز باہر نہیں آتی تھی۔

پورا ایک دن اور ایک پوری رات گزر جانے کے بعد جب ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی اس کمرے

میں داخل ہوا تو عبدالجلیل فرش پر پڑا تھا۔ رجب علی نے عبدالجلیل کے پہلو میں ٹھوکر ماری تو عبدالجلیل نے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں آدھ کھلی تھیں اور چہرے کا رنگ لاش جیسا تھا۔

"مجھے پہچانتے ہو جلیل؟" — رجب علی نے کہا۔

جلیل نیم غشی کی حالت میں تھا۔

رجب علی نے ایک کانسٹیبل سے پانی مانگا۔ گلاس ہاتھ میں لے کر اس نے کھڑے کھڑے پانی کی دھار عبدالجلیل کے ہونٹوں اور چہرے پر انڈیلی۔ عبدالجلیل کے ہونٹ ہلنے لگے۔ وہ نیم غشی میں پانی پینے کی کوشش کر رہا تھا، پھر اُس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ رجب علی اور دو کانسٹیبل جو ہڈیاں توڑنے کے ایسے ماہر تھے کہ جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہوتا تھا، کھڑے دیکھتے رہے۔ عبدالجلیل بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر اذیت اور درد کا تاثر تھا۔

"عبداللہ پر کس نے قتل کیا ہے عبدالجلیل؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

عبدالجلیل نے اوپر دیکھا۔ اس کی آنکھیں پوری نہیں کھل رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہلے جیسے کچھ کہہ رہا ہو۔ ملک رجب علی اس کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا اور کان اس کے منہ کے قریب کیے۔

"عبدالجلیل کو کس نے قتل کیا ہے جلیل؟" — رجب علی نے کہا — "بول سکتے ہو؟"

"بول سکتا ہوں" — عبدالجلیل نے بڑی دھیمی سی سرگوشی کی — "تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے اور میری جان تک سلامت رہے گا۔"

"کیوں اپنی زندگی تباہ کرتے ہو خان" — ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی نے دوستانہ لہجے میں کہا — "میں تمہیں اپنی طرح عبدالجلیل خان سی کہوں گا۔ مان جاؤ۔ بول دو۔"

"میں ایمان ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدے کے عوض پاکستان کے دشمنوں کے قدموں میں پھینک دوں مرو" — عبدالجلیل نے کہا — "میں ایمان پر اپنی جان دے دوں گا۔ تم مرد نہیں ہو ملک! اپنے کو مجھے للکار کر انتقام لینے دو۔"

"آج شام تک سوچنے کی مہلت دیتا ہوں" — ملک رجب علی نے کہا — "نہیں مانو گے تو رات کو تمہارے گھر کی تلاشی لی جائے گی۔"

"ابھی لے لو تلاشی" — عبدالجلیل نے کہا — "شام کو بھی میرا یہی جواب ہوگا جو تم اب سن رہے ہو۔"

"اسے یہیں پڑا رہنے دو" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کانسٹیبلوں سے کہا — "اس کے پاس پانی رکھ دو اور تم دونوں باہر سے تالا لگا کر چلے جاؤ۔"

دونوں کانسٹیبل ڈی۔ ایس۔ پی کے پیچھے پیچھے نکل گئے اور دروازہ بند کر کے تالا لگا گئے۔

○

عبدالجلیل خان کو جیسے پتہ ہی نہ چلا ہو کہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دینے والے جا چکے ہیں۔ اسے ایک دن اور ایک رات ہراذیتیں دی گئی تھیں۔ ان سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ یہ تو پولیس کا معمول تھا۔ البتہ عبدالجلیل نے ان اذیتوں کا ذائقہ پہلی بار چکھا تھا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں وہ پل پل مرا اور ہر پل کے زندہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ کالی گھٹا آجاتی اور گزر جاتی تھی کبھی اسے یوں دھماکے سنائی دیتے جیسے اس کے جسم کے اندر بجلیاں کڑکی اور چمکی ہوں۔

iqbalmt@gmail.com scanned by

اپنے ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ باہر جا کر ایک کانسٹیبل نے کہا تھا — "جناب! یہ تو بڑا ہی سخت جان ہے۔ اسے ہم نے برف کے بلاک پر پیٹ کے بل لٹایا اور میں آدھے گھنٹے سے زیادہ اس کی پیٹھ پر بیٹھا رہا۔ دو منٹ بعد ظلم چیخنے چلانے لگتے ہیں لیکن جناب! اس کی آواز نہیں نکلی۔ تڑپا نہیں۔ بولا نہیں۔"

"میرا تو خیال تھا کہ مر گیا ہے" — دوسرے کانسٹیبل نے کہا — "میں نے اس کے منہ کی طرف جھک کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ جناب! وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ اللہ کے کسی ایسے کلام کا ورد کر رہا تھا جس میں کوئی طاقت ہے جناب! آدھے گھنٹے تک کوئی انسان برف کے بلاک پر نگالیٹ کر زندہ رہ سکتا ہے؟"

"پھر جناب!" — پہلے کانسٹیبل نے کہا — "ہم نے اس پر وہ حربہ بھی آزمایا جس سے پتھر بھی نرم ہو کر پگھل جاتے ہیں۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ درد کی شدت اس سے برداشت نہیں ہو رہی لیکن جناب! اس کے ہونٹ ہم نے پھر ہلتے دیکھے۔"

"یہ وہی ورد کر رہا تھا" — دوسرے کانسٹیبل نے کہا۔

دونوں کانسٹیبل بولتے جا رہے تھے اور ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی آہستہ آہستہ ان سے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کانسٹیبلوں کی باتیں اسے تکلیف دے رہی ہیں۔

"ہم نے کئی بار پوچھا، اقبال جرم کرو گے؟" — ایک کانسٹیبل نے کہا — "اس نے کوئی جواب نہ دیا۔"

"جناب!" — دوسرے کانسٹیبل نے کہا — "اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔ پہنچے والا لگتا ہے جناب!"

رجب علی نے چونک کر کہا — "بکواس بند کرو..... دفع ہو جاؤ اور اگلے گھنٹے کا انتظار کرو۔"

انسپکٹر دوست محمد اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کی گرج سن کر باہر آ گیا لیکن اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور جھک گیا جیسے گرنے والا ہو۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" — ملک رجب علی نے اس سے پوچھا۔

"صبح سے چکر آ رہے ہیں" — دوست محمد نے جواب دیا — "میں آپ کے ہی انتظار میں تھا۔ کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ دل پر بہت گھبراہٹ ہے" — اور وہ بیٹھ گیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ تانگے لے آئے اور دوست محمد کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ دوست محمد نے کسی دوسرے کانسٹیبل کو ساتھ لے لیا۔ وہ جب تانگے میں بیٹھا تو چھ جتھ ہو چکے تھے جس کانسٹیبل کو اس نے ساتھ لیا تھا اسے اس نے کہا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں۔ وہ بالکل تندرست ہے۔

"تم جانتے ہو عبدالجلیل خان میرا دوست ہی نہیں استاد بھی ہے" — دوست محمد نے کانسٹیبل سے کہا — "جب تک اسے یہاں رکھا جائے گا میں یہاں سے غائب رہوں گا۔ اسے دشمنی سے پہچانا جاتا ہے۔ تم واپس آ کر ملک رجب علی سے کہنا کہ انسپکٹر صاحب راستے میں بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں ڈاکٹر سے گھر والوں کا کہہ کر پندرہ بیس دن تک ڈیوٹی کے قابل نہیں رہا۔"

ملک رجب علی اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ مر چکا ہے۔ اس نے تین ساڑھے تین برسوں میں سینکڑوں مجرموں اور شقیوں کو خبر انسانی ایذا رسانی کی چکی میں ڈالا تھا۔ ان میں بیگناہ بھی تھے۔ وہ جانتا تھا یہ بیگناہ ہیں لیکن اسے ڈی۔ ایس۔ پی کا عہدہ حاصل کرنا تھا جو اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب اسے ایس۔ پی بننا تھا۔ اس کے اپنے اندر نرخوم کا کوئی جذبہ رہنے دیا تھا نہ کسی انسان کا۔ انسانی لاش اس کی نگاہ میں مری ہوئی چیونٹی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ تھانیداری کے زمانے میں جب کسی مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا کرتا تھا تو پوسٹ مارٹم کے بعد لاش اس کے لواحقین کے حوالے کرنے کی بھی رشوت لیا کرتا تھا۔ وہی نہیں، تھانوں کے بیشتر ایس۔ ایچ او مقتول کی لاش پر گدھوں کی طرح جھپٹ جاتے اور منہ مانگا نذرانہ وصول کر کے لاش وارثوں کے حوالے کیا کرتے تھے۔

اسے پرانے افسروں نے یہی سبق دیا تھا کہ درندہ بننا پڑتا ہے۔ ظالم ہونا پڑتا ہے۔ دل میں انسانوں کا درد رکھو گے تو پیٹ جاؤ گے۔ مگر اب وہ عبدالجلیل کو نیم غشی کی حالت میں دیکھ کر آیا تو وہ اپنے اندر ایک چبھن سی، خلش سی اور جھنجھلاہٹ سی محسوس کر رہا تھا جیسے اسے کوئی جھٹلائے دے رہا ہو۔

"تم اپنا ایمان ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدے کے عوض پاکستان کے دشمنوں کے قدموں میں پھینک چکے ہو۔"

"تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے۔"

"تم درندے نہیں ہو ملک!"

اس کے اندر گرد بے شمار ہچکیاں پھنکارنے لگیں۔۔

"وہ اللہ کے کسی ایسے کلام کا ورد کر رہا تھا جس میں کوئی طاقت ہے جناب!"

"آدھے گھنٹے تک کوئی انسان برف کے بلاک پر لیٹ کر زندہ رہ سکتا ہے؟"

"اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔"

اس کے اندر کے بے شمار بادل جیسے پھنپھناتے غول میں سے کوئی کوئی ہچکی اسے ڈنک بھی مارنے لگی تھی۔ ایک بار اس نے اپنے خیالوں کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ سوچنے لگا کہ آج رات عبدالجلیل کے گھر کی تلاشی لے گا اور کچھ اسلحہ برآمد کرنے کا انتظام کرے گا۔

"کیا برآمد ہونا چاہیے؟" — اس نے سوچا۔

"ریوالور تو ضرور ہونا چاہیے" — اس نے اپنے آپ کو جواب دیا — "لیکن اس کے پاس لائسنس کا ریوالور تو ہو گا ہی۔ ایک ریوالور بغیر لائسنس برآمد کرنا ہے۔"

"میرا ایمان آخری سانس تک سلامت رہے گا" — ایک ہچکی نے اسے ڈنک مار کر تڑپایا۔

اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے ان آوازوں سے توجہ ہٹالی۔

"اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ تخریب کار ہے، وہ گرنیڈ برآمد کرنے لازمی ہیں۔"

"اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔"

رجب علی اس آواز پر چونک اٹھا۔

"تین چار خنجر ضرور برآمد کروں گا۔"

"تم ڈی۔ ایس۔ پی ہو کر زیادہ عقلمند تو نہیں ہو گئے ملک!" — اسے عبدالجلیل کی دو تین روز پہلے

www.iqbalmt@oneurdu.com Scanned by

کی آواز سنائی دی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ دو یا تین بار جیسے گھنٹی نے اس پر طنزیہ قہقہہ لگایا ہو۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ اُس کا ایس۔ پی بول رہا تھا۔

"ملک صاحب! چوہدری اکرم اور عبداللہ بخش کے ہاتھ بڑے ہی بُرے لگے ہیں۔ ہوم منسٹر کو اُن پیچھے پڑ گیا ہے جیسے ایک ریٹائرڈ اے۔ ایس۔ آئی نہیں، منسٹر کا باپ قتل ہو گیا ہے۔ مجھے جواب طلبی کی دھمکی دے رہا ہے اور پوچھتا ہے کہ تفتیش کون کر رہا ہے۔۔۔ کیا حال ہے اُس کا؟"

"بُرے ہرش پڑا ہے بدبخت!" — ملک رجب علی نے جواب دیا۔

"مانا نہیں؟"

"نہیں جی!" — رجب علی نے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا — "وہ کیا مانے گا، سرا اس واردات میں اس کا ذرا سا بھی عمل دخل معلوم نہیں ہوتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں صحیح تفتیش شروع کر دیتا ہوں اس پر تو ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔۔۔ سچی بات یہ ہے سر، میں تو اس شخص کے سامنے جاتے ہوئے بھی گھبرانے لگا ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہی تو میں سمجھ نہیں سکتا۔" — رجب علی نے جواب دیا۔

ایس۔ پی نے جب بولنا شروع کیا تو ملک رجب علی کے چہرے سے تذبذب کا تاثر چھٹنے لگا اور رونق عود کرنے لگی۔ ایس۔ پی نے جب ریسیور رکھا تو ڈی۔ ایس۔ پی کے چہرے پر جھنجھلاتی ہوئی سلوٹیں پھر ایں غائب ہو چکی تھیں۔

عبدالجلیل خان اُسی کمرے میں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ اُس کے جسم کا سارا ایک جوڑ دکھ رہا تھا۔ کبھی تو درد کی لہر سے انتڑی اور پاؤں کے ناخنوں تک پھیل جاتی تھی۔ اس پر غشی طاری تھی۔ ایک مسلسل تاریکی تھی جو اُس کی آنکھوں میں چھا گئی تھی۔ اس کا دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اعصاب ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ گزرے ہوئے چوبیس گھنٹوں میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ اسے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اُس نے پانی بھی نہیں پیا تھا۔

اُسے شعوری طور پر یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی آیا تھا اور اس نے پوچھا تھا کہ عبداللہ کو کس نے قتل کیا ہے۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اُس نے رجب علی کی ہر بات کا جواب دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے ایمان پر جان دے دوں گا۔ وہ لاشعوری طور پر جواب دیتا رہا تھا۔ غشی، غنودگی اور ہذیان کی بدمستی میں انسان کی زبان سے وہ باتیں نکلتی ہیں جو اُس کے ذہن لاشعور کی تہوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی فطرت کے ڈھکے چھپے گوشے اور ان گوشوں میں چھپائے ہوئے بھید بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

عبدالجلیل غشی میں ایمان اور ایمان پر جان دینے کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اب وہ اس احساس سے بیگانہ تھا کہ وہ تنہا ہے اور وہ بھوکا اور پیاسا ہے۔ اسے اس تاریکی میں جو اُس کی آنکھوں کے سامنے اور ذہن میں چھائی ہوئی تھی، ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی جیسے پُو پھٹ رہی ہو۔ ایک شور سا کہیں سے اُٹھنے لگا جو آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا۔ پھر اُسے ساتھ سے نظر آنے لگے جیسے سمندر کی بپھری ہوئی سفید خیز لہریں ساحل کی چٹانوں کو پاش پاش کرنے کو بڑھی آ رہی ہوں۔

قریب آئیں تو یہ لہریں انسانوں کا روپ دھارنے لگیں اور ان انسانوں کا شور واضح ہونے لگا — "پاکستان زندہ باد" — یہ شور گھٹاؤں کی گرج بنتا چلا گیا — ڈھلے کے رہیں گے پاکستان۔۔۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان" — "اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ" — تکبیر کے نعرے۔ رسالت کے نعرے۔ نعروں کی گھن گرج جیسے مدد کی کڑک — سبز پرچم اور سبز دوپٹے بھی دکھائی دینے لگے۔

عبدالجلیل کے ہونٹوں پر جو سوکھ کے پھٹ گئے تھے، تبسم آ گیا۔ اس کے جسم میں جو ڈوبی کی طرح دُھنک دیا گیا تھا، حرکت ہوئی۔ جسم کانپا اور ہونٹوں کا تبسم مسکراہٹ بن گیا۔ عبدالجلیل اُٹھ کھڑا ہوا اور انسانوں کے اس سمندر میں گم ہو جانے کو آگے بڑھا۔ سمندر جنگل بن گیا — ہرا سرسبز جنگل — پھڑپھڑاتے، لہراتے اور بڑی شان سے جھومتے ہوئے جھنڈوں کا ہرا بھرا جنگل۔ جھنڈے بڑے بھی تھے، چھوٹے بھی اور سبز جھنڈیاں پنیری کی طرح دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

عبدالجلیل کو ہزاروں چاند اور ہزاروں تارے دکھائی دیئے اور وہ ان میں گم ہو گیا۔ اس نے اپنی ذات بپھری ہوئی طوفانی موجوں جیسے ہجوم میں مدغم کر دی۔ وہ اب ذرہ نہیں کُل تھا۔ وہ اب فلک کی بیکراں وسعت میں ٹمٹماتا ہوا ننھا سا ستارہ نہیں تھا، کہکشاں تھا۔ وہ اب آسمان سے گرنے والا ایک قطرہ

iqbalmt@onenet.com.pk Scanned by

نہیں تھا، سیلابی دریا تھا۔ وہ اب شرارہ نہیں شعلہ تھا —— اور وہ جھنڈوں کے جنگل میں چلا جا رہا تھا۔

آسمان میں دو پتنگ جن کی ڈوریں ایک دوسری سے الجھی جڑی تھیں، اُنہیں ڈوبتی دکھائی دینے لگیں —— ایک پتنگ سبز تھی، دوسری نیلی، سرخ اور سفید لکیروں والی —— ان میں سے ایک کو کٹ جانا تھا۔ عبدالجلیل جس ہجوم کا ایک ذرّہ بن گیا تھا، اس ہجوم سے للکار سنائی دینے لگی —— "سبز پتنگ کی ڈور نہیں کٹ سکتی۔ اسے ہم نے اپنے خون اور شہیدوں کی لپسی ہوئی ہڈیوں کا مانجھا دیا ہے۔"

کچھ دیر کے لیے عبدالجلیل نے اپنے آپ کو ہجوم سے الگ تھلگ دیکھا۔ اُس کا سر ہل رہا تھا اور اس کی سرگوشیاں خدا تھیں —— وہ پولیس کی وردی میں تھا، مگر وہ فوراً ہی ہجوم میں تحلیل ہو گیا۔ اُس نے چلا چلا کر کہا تھا —— "یہ نہ دیکھو میں نے کیا پہن رکھا ہے۔ میں تم میں سے ہوں۔ میں بھی تمہاری ہی منزل کا مسافر ہوں۔"

پھر ایک پتنگ کٹ گئی۔ کٹی ہوئی پتنگ سبز نہیں تھی۔ وہ جو سبز تھی وہ عجب شان سے تیر کی طرح اوپر چلی گئی تھی، اور وہ جو کٹ گئی تھی وہ ذرا ہی دور ہٹی اور گر گئی یا گرا دی گئی۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہجوم کے نعروں کی گرج نے زمین و آسمان ہلا ڈالے۔

○

ایک کانسٹیبل نے اس کمرے کا دروازہ کھولا اور جھٹکا کھا کر قدم رکھتا ہوا اندر کی طرف بڑھنے لگا۔ عبدالجلیل دونوں بازو اوپر کر کے لہرا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے سرگوشیاں پھسل رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کانسٹیبل کوڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کو گیا تھا کو کچھ دیر بعد اسے دیکھ لینا، جب وہ آئے تو اسے پانی پلا دینا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو رجب علی کہہ گیا تھا کہ عبدالجلیل کو معمولی سا کھانا کھلا دینا۔

ہیڈ کانسٹیبل کمرے میں یہ دیکھنے کے لیے داخل ہوا کہ ملزم ہوش میں آیا کہ نہیں، اسے کھانا کھلا دے۔ اس نے دیکھا کہ کانسٹیبل عبدالجلیل کے پاس بیٹھا اس کی سرگوشیاں سن رہا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو دیکھ کر اٹھا۔ اُس نے ہیڈ کانسٹیبل کو سرگوشی کر کے بتایا کہ ہوش میں نہیں۔ دونوں باہر نکل گئے۔

بے ہوشی میں نعرے لگا رہا ہے" —— کانسٹیبل نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا —— "میں نے اس کی سرگوشیاں سنی ہیں۔ یہ پاکستان بنا رہا ہے۔ کہتا ہے، لے کے رہیں گے پاکستان۔"

"مطلب ہے ابھی ہوش میں نہیں آیا" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا —— "یہ سمجھ رہا ہے کہ جواب بے ہوشی میں بنا رہا ہے۔ بھلا پاکستان تو اس نے دیکھا ہی ہے..... پڑا ہنسے دو اسے۔"

دونوں باہر نکل گئے اور باہر سے دروازہ مقفل کر دیا۔

عبدالجلیل کی سرگوشیاں غائب ہو گئی۔ اس کے دانت بجنے لگے —— وہ ہجوم بکھر گیا تھا جس کا وہ حصہ بن گیا تھا۔ کہکشاں کے ستارے اِدھر اُدھر ٹوٹ رہے تھے۔ نعرے کربناک چیخوں اور آہ و بکا میں بدل گئے تھے۔

خون —— ہر سو خون —— زمین سرخ۔ آسمان لال!

خون ٹپکاتے قافلے چلے جا رہے تھے۔ عبدالجلیل اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی بیوی کو، اپنے

بچوں کو دیکھ رہا تھا۔

لاشیں —— بچوں کی، عورتوں کی، بوڑھوں کی اور جوانوں کی —— ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے کھیت مسلمانوں کے خون سے سیراب کر لیا اور ان میں ان کی ہڈیوں کی کھاد ڈال دی۔

ہولناک خواب —— تاریک رات —— اس رات کے بطن سے جس سحر نے جنم لیا وہ مسلمانوں کے خون سے دُھلی ہوئی تھی۔

عبدالجلیل نے منزل پالی —— خون ٹپکاتے قافلے منزل پر آ گئے —— عبدالجلیل تھک کر گر پڑا —— یہاں آ کر تو سبھی گر پڑے تھے لیکن اٹھ کھڑے ہوتے۔ سب نے اس زمین کو دیکھا جس کی خاطر انہوں نے بچے ذبح کرائے تھے۔

ایک صدی بعد قافلہ منزل پر پہنچ گیا۔ آتی لمبی مسافت کے ٹوٹے ہوئے جسم تر و تازہ ہو گئے۔ چہروں پر رونق آ گئی۔ سراپا سچے ہو گئے۔

کانسٹیبل جو کمرے کے باہر ڈیوٹی پر تھا، وہ چونک اٹھا۔ اسے کمرے میں کوئی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دروازہ کھولنے ہی لگا تھا کہ اندر سے دروازے پر بڑی زور سے دستک ہوئی۔ کانسٹیبل دروازہ کھول کر اندر گیا۔ اسے عبدالجلیل دروازے کے پاس کھڑا دکھائی دیا۔

ہوش میں آ گئے ہو؟" —— کانسٹیبل نے اُس سے ایسے لہجے میں پوچھا جس لہجے میں وہ ہوش میں آئے ملزموں کے ساتھ بات کیا کرتا تھا۔

"سب کو ہلاؤ" —— عبدالجلیل نے گھبراہٹ بھری آواز میں کہا —— "یہ دیکھو۔ اس زمین پر کتنے سانپ آ گئے ہیں" —— وہ فرش کی طرف اشارہ کر رہا تھا —— "مار دو ان سانپوں کو۔ یہ ہماری زمین کے اور ہماری قوم کے دشمن ہیں۔ یہ پاکستان کو ڈس لیں گے۔"

کانسٹیبل نے جھنجھلا کر اُسے بازو سے پکڑا اور اسے گھسیٹ کر نیچ کے قریب لے گیا۔

"چلیں ہیڈ جا!" —— کانسٹیبل نے اسے دھکارے کر نیچ پر بٹھاتے ہوئے کہا —— "ابھی تُو بے ہوش پڑا تھا۔ اب تجھے سانپ نظر آنے لگے ہیں۔ یہاں کچھ جیسا جو آتا ہے اُسے سانپ ہی نظر آتے ہیں۔ بیڑا مانج ٹھکانے آجائے گا۔"

عبدالجلیل ہوش میں نہیں تھا۔ اس کا ذہن لاشعور زندہ و بیدار تھا۔ وہ اُٹھ کر دروازے تک جانے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے پاکستان کی سرزمین پر بڑے زہریلے سانپ رینگتے نظر آتے اور وہ بیہوشی کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا جیسے نیند میں چلنے والے کیا کرتے ہیں۔ اُسے تو احساس ہی نہیں تھا کہ کانسٹیبل نے اُسے گھسیٹ کر نیچ پر بٹھا دیا ہے۔

"سانپ..... آستین کے سانپ" —— وہ بڑبڑا رہا تھا۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی آواز دبی جا رہی تھی —— "یہ سانپ پاکستان کو ڈس لیں گے" —— اور وہ نیچ سے لڑھک کر فرش پر جا پڑا۔

○

دو روز بعد اخباروں میں خبر چھپی کہ ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان کو، جو ریٹائرڈ اسسٹنٹ سب انسپکٹر عبدالقدیر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے، آج رات اس کی خانہ تلاشی میں اُس کے گھر

iqbalmt@onenurdu.com scanned by

سے وہ ریوالور، وہ گرینیڈ، ایک شین گن اور چار خنجر برآمد ہوئے ہیں۔ ایک بھی ایونیشن کا بھی ملا ہے معلوم ہوا ہے کہ ملزم عبدالجلیل وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی نے بڑے ڈرامائی انداز میں ملزم کا سراغ لگایا اور اسے گرفتار کیا ہے سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

عبدالجلیل کو جاننے والے اس خبر کو سچ نہیں مانتے تھے لیکن وہ جس محلے میں رہتا تھا، وہاں کے لوگ کہتے تھے کہ عبدالجلیل کو ہتھکڑیوں میں لایا گیا۔ ساتھ ایک ڈی۔ ایس۔ پی اور پولیس کی کچھ نفری تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے عبدالجلیل کے گھر کی تلاشی لی اور اسلحہ برآمد کیا۔

محلے والوں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ تلاشی لینے کے لیے کتنے لوگ اندر گئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ محلے والے دیکھ نہیں سکے تھے کہ جو اسلحہ اور ایونیشن برآمد کیا گیا ہے، وہ باہر سے لایا گیا تھا۔ برآمد کرنے والے یہ اپنے ساتھ چھپا کر لے گئے تھے۔ جن دو گواہوں کی موجودگی میں برآمدگی کی گئی تھی وہ پولیس کے اپنے آدمی تھے۔ وہ پولیس کے تیار کیے ہوئے مقدموں میں استغاثہ کے خالی خانوں کو پُر کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔

عبدالجلیل پر خاموشی طاری تھی۔ اس کا سر ڈول رہا تھا۔ اُسے تو ہوش ہی نہیں تھا کہ دیکھتا کہ اُس کے گھر میں پولیس کس طرح کی مائی کر رہی ہے۔ اُسے ہتھکڑیوں میں اس حال میں دیکھ کر اس کی بیوی رکسانہ بیگم نڈھال ہو گئی تھی۔ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ اُس کا نام اصغر تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرف لپکتا تھا اور پولیس اُسے باپ کے قریب جانے نہیں دیتی تھی۔

یہ خبر راولپنڈی میں ارشد اور طاہرہ نے بھی پڑھی۔ ارشد کچھ ہی دیر خبر کے الفاظ میں کھویا رہا۔ طاہرہ نے ارشد کی زبان سے عبدالجلیل کا نام سنا تھا۔ وہ ارشد سے پوچھ رہی تھی کہ اس خبر میں کہاں تک سچائی ہو سکتی ہے کہ عبدالجلیل وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا۔

"بالکل جھوٹ ہے" — ارشد نے کہا — "میں حیران ہوں کہ عبداللہ پر عبدالجلیل نے کیوں حملہ کیا ہے۔ مجھے لاہور جانا پڑے گا۔ معلوم ہوتا ہے عبدالجلیل کو کسی جال میں پھانسا گیا ہے۔"

اس جال کو کالا تانگے والا بچھا رہا تھا۔ اُس نے یہ خبر پڑھی تو سر سے پاؤں تک ہل گیا۔ وہ عبدالجلیل کے گھر گیا اور اُس کی بیوی سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔ بیوی نے اسے بتایا کہ عبدالجلیل تو جیسے ہوش میں ہی نہیں تھا۔ گھر سے سب کو باہر نکال دیا گیا تھا۔ سنا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ عبدالجلیل کی بیوی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اسلحہ اور ایونیشن جو برآمد کیا گیا ہے وہ پولیس کس طرح اندر لے گئی تھی۔

عبدالجلیل کی بیوی روتی تھی۔ اُس پر خوف و ہراس بھی طاری تھا لیکن اُس کے آنسو تھے اور محسن بیٹے اصغر کی آنکھیں خشک تھیں۔ کالے کو وہ جانتا تھا۔ وہ کالے سے پوچھنے لگا کہ یہ کیا قصہ ہے۔

"اپنا دل چھوٹا رکھو اصغر بیٹا!" — کالے نے کہا — "تمہارے ابّو آجائیں گے۔"

کالے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اُسے کوئی بات سُوجھ ہی نہیں رہی تھی۔

"مُن میری بہن!" — اس نے عبدالجلیل کی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں اپنا آپ قربان کر سکتا ہوں۔ دعا کرنا۔ میں تمہارا سہاگ واپس لا رہا ہوں۔"

کالا جانتا تھا کہ کسی آئی۔ ایس۔ ایے کا طریقۂ تفتیش کیا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ عبدالجلیل کو کیسی کیسی

اذیتیں دی گئی ہوں گی۔ وہ باہر نکلا۔ تانگہ گھر لے گیا۔ گھوڑا کھول کر اس نے گھر لی پر باندھا اور چل پڑا۔

○

ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی دفتر میں بیٹھا عبدالجلیل کا کیس تیار کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اسے بہت سے جھوٹے گواہوں کی ضرورت تھی۔ اس کے دروازے پر کھڑے کانسٹیبل نے اندر جا کر اُسے بتایا کہ ایک آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں کالا تانگے والا ہوں۔ عبدالقدیر کے قتل کا سراغ دے سکتا ہوں۔ رجب علی نے اُسے فوراً بلا کر اپنے سامنے بٹھالیا۔

"میں ایک شرط پر بتا سکتا ہوں کہ قاتل کون ہے" — کالے نے ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا — "انسپکٹر عبدالجلیل خان کو چھوڑ دیں۔ وہ بیگناہ ہے۔"

"تم اسے کس طرح اور کب سے جانتے ہو؟"

"ہماری پوری پاکستان سے پہلے کی ہے جناب!" — کالے نے جواب دیا — "میں اس شخص کا مرید ہوں۔ یہ وطن دشمن نہیں ہو سکتا۔"

اس کے گھر سے ریوالور، سٹین گن اور گرینیڈ برآمد ہوئے ہیں۔"

"سرکار!" — کالے نے ہنس کر کہا — "آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ ان برآمدگیوں سے میں خوب واقف ہوں۔ خان صاحب نے غلطی یہ کی ہے کہ وزیروں اور حاکموں سے دشمنی مول لے لی ہے۔ آپ کو عبداللہ کا قاتل چاہیے۔ وہ میں آپ کو دے دوں گا۔"

"آپ خان صاحب کو چھوڑ دیں" — کالے نے کہا — "ابھی آپ نے مقدمہ تیار نہیں کیا۔ عدالت میں ایک ڈی۔ ایس۔ پی پر اعتبار نہیں کرتے۔"

"تم" — رجب علی نے کہا — "سمجھ لو کہ میں نے اسے گرفتار کر دیا۔ مجھے اصل قاتل چاہیے۔"

"وہ میں ہوں" — کالے نے کہا۔

"تم؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے حیران ہو کر پوچھا — "کیا وجہ تھی قتل کی؟"

"سرکار!" — کالے نے کہا — "وطن دشمن اور تخریب کار عبدالجلیل نہیں، عبدالقدیر تھا۔ وہ ہندوستان کے جاسوسوں کا ساتھی تھا۔"

کالے نے رجب علی کو پوری تفصیل سے سنا دیا کہ اُس نے عبدالقدیر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے۔ اُس نے یہ نہ بتایا کہ اُس نے قتل کر کے عبدالجلیل کو بتایا تھا اور عبدالقدیر کا ریوالور اُسے دے دیا تھا۔ اُس نے یہ بتایا کہ اُس نے مقتول کا ریوالور ندی میں پھینک دیا تھا۔ اُس نے رات سے وہ خنجر نکال دیا جس سے اُس نے عبدالقدیر کو قتل کیا تھا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے کانسٹیبل کو اندر بلایا اور کالے کو اُس کے حوالے کر کے کہا کہ یہ ملزم ہے۔ اسے تھوڑی دیر باہر بٹھاؤ۔ کانسٹیبل کالے کو باہر لے گیا۔ رجب علی نے ایس۔ پی کو فون کیا اور بہت دیر اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔

کالا اُس کانسٹیبل کو اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا جس کے حوالے اسے کیا گیا تھا۔ کانسٹیبل نے کالے سے پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ کالے نے اُسے بتا دیا کہ وہ عبدالجلیل کو چھڑانے کے لیے

iqbalmt@onenurdigital.com Scanned by

اقبالی بیان دینے آیا ہے۔

"مل سے نکال دو کہ عبدالجلیل کو چھوڑ دیا جائے گا" — کانسٹیبل نے کہا — "یہاں قتل کی تفتیش نہیں ہو رہی کامے! یہاں عبدالجلیل کو پھنسی میں پھنسنے کی ترکیب ہو رہی ہے۔ دیکھو کامے! ہماری تمہاری پرانی یاری ہے۔ اگر تم واقعی قاتل ہو تو اقبالی بیان نہ دینا۔ تمہاری یہ شرط کوئی نہیں مانے گا کہ عبدالجلیل کو چھوڑ دو۔ اپنی گردن اپنے ہاتھوں پھانسی کے پھندے میں نہ ڈالو۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے کامے کو اندر بلا لیا۔

"کامے!" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "جانتے ہو قتل کی سزا کیا ہے؟"

"پھانسی یا عمر قید۔"

"اگر میں تمہیں صاف نکال دوں تو خوش ہو گے نا؟"

"میں تو عبدالجلیل خان کو نکلوانے آیا ہوں جناب!" — کامے نے کہا — "میں سوچ سمجھ کر آیا ہوں کہ اقبال جرم کروں گا تو میرا انجام کیا ہوگا۔"

"میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بناؤں گا" — ملک رجب علی نے کہا — "میں نے آپ سے کہا ہے۔"

"لیکن سرکار! واردات تو میں نے اکیلے کی ہے" — کامے نے کہا — "مجھے آپ وعدہ معاف گواہ کس طرح بنائیں گے؟"

"کیا تمہیں پھانسی یا عمر قید کا شوق ہے کامے؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "تم میری مرضی کا بیان دے دو اور مورخ کر دو..... بیان عبدالجلیل کے خلاف دینا ہے۔ اپنے والے اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تم قتل میں اپنے آپ کو شامل رکھو لیکن یہ کہو کہ عبدالجلیل نے مقتول کو مرنے سے پہلے شہر میں پھینکا تھا۔"

"میرے جسم کے ٹکڑے کر دو جناب!" — کامے نے کہا — "عبدالجلیل صاحب کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دوں گا۔"

"تمہیں چھوڑ دوں گا؟" — رجب علی نے کہا — "کل اس وقت تم اپنی زبان سے مکر گئے کہ اقبالی بیان اپنی مرضی کا لکھ لو اور میرا انگوٹھا لگوا دو..... بولو، کیا کہتے ہو؟"

"میں بیان نہیں دوں گا" — کامے نے کہا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے کانسٹیبل کو بلایا اور کہا کہ اے۔ ایس۔ آئی کا نام لے کر کہا کہ اُسے بُلا لاؤ۔ کانسٹیبل چلا گیا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے ریسیور اٹھایا۔ کامے کو معلوم تھا کہ دروازے پر جو کانسٹیبل کھڑا رہتا ہے وہ اسے۔ ایس۔ آئی کو بلانے چلا گیا ہے۔ کاما کرسی سے اٹھا اور بجلی کی تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے ریسیور پھینکا اور دوڑتا کمرے سے نکلا۔ باہر کئی لوگ تھے۔ کاما بڑے دروازے کی طرف نہ گیا۔ وہ بیت الخلاء کی طرف دوڑتا گیا۔ بیت الخلاء کے ساتھ احاطے کی دیوار تھی۔ کاما بیت الخلاء کے عقب میں گیا اور دیوار پر چڑھ کر پرے کود گیا۔

پولیس کے بہت سے آدمی اُدھر کو دوڑے۔ کچھ بڑے دروازے سے باہر نکل گئے سنگکا انہیں نظر نہ آیا۔ وہ شہر کے ہجوم میں روپوش ہو گیا تھا۔

اُس وقت تک لاہور مُجرم اور ہنگامہ پرور شہر بن چکا تھا۔ اس شہر لاہور میں جو چند ہی سال پہلے تک اکھاڑوں، پہلوانوں اور میٹھی زبان والوں کا شہر کہلاتا تھا، جواریوں کے اڈوں اور سینما گھروں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لاہور کی روایتی زندہ دلی کا رنگ بدل گیا تھا۔ اب زندہ دلانِ لاہور کی نوجوان اولاد نے نظر بازی، ہیک جھپک اور راہ جاتی عورتوں پر پھبتیاں کسنے جیسے مشاغل اختیار کر لیے تھے۔ اکھاڑے اُجڑ گئے اور اُن کی جگہ چھوٹے بڑے ہوٹل آباد ہو رہے تھے۔ شہر پھیل رہا تھا۔ گنجان ہو رہا تھا۔ صفائی کے جنگل اور ویرانے کوٹھیوں اور کالونیوں میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے تھے۔

سمگلنگ ہر کاروبار کی طرح ایک کاروبار اور مہذب عصمت فروشی فیشن بن گیا تھا۔ پشاور اور ہیروئن کو تارڑن کے محافظوں کی پشت پناہی حاصل ہو گئی تھی۔ غنڈہ گردی سیاست کی ایک ضرورت بن گئی تھی لہٰذا غنڈے معزز شہری کہلانے لگے تھے۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ روپے پیسے سے وہ لاٹھی خریدی جا سکتی تھی جس کے ہاتھ میں آ جاتے بھینس اُسی کی ہو جاتی ہے۔ سڑکوں پر کاریں، سکوٹر اور پرائیویٹ ٹیکسیاں نظر آنے لگے تھے۔

اب اس شہر میں کسی مفرور مجرم کا روپوش ہو جانا مشکل نہیں رہا تھا۔ کاما بہت سے اڈوں سے واقف تھا۔ دور رہنے والا قوام لشکر کے علاقے کا تھا لیکن آزادی کے گزرے ہوئے آٹھ برسوں میں وہ لاہور انٹرنیشنل اینٹ سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ جب سی۔ آئی۔ اے کے دفتر سے فرار ہوا تھا تو اُس کا ذہن صاف تھا۔ وہ جب ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی کے کمرے سے بھاگا تو اُس نے اپنی حقیقت کو اپنے سامنے رکھ لیا تھا کہ وہ اب سفر پر ہے اور وہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی کو اپنے جرم کا راز دے کر فرار ہوا ہے اور وہ جانتا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں اُس کا انجام کیا ہوگا۔

وہ اُستاد تھا۔ دیسی شراب بھی ہلے تو لی لیتا تھا اور چرس کا تو وہ نشئی تھا۔ سزا یافتہ تو نہیں تھا لیکن سزا یافتہ جرائم پیشہ اُستاد بھی اُسے اُستاد مانتے تھے۔ اُس نے عبدالقدیر کو قتل کر کے، دل میں کوئی خلش یا ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا تھا۔ کہتے ہیں قاتل کے دماغ پر خون سوار ہو جاتا ہے جو اُسے دن رات بے چین اور پریشان رکھتا ہے سنگکا کامے کے دماغ پر ایک اور خون سوار تھا۔ یہ اُن ہزاروں لاکھوں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا خون تھا جو ہندوؤں اور سکھوں نے اس لیے بہایا تھا کہ انہوں نے پاکستان بنا لیا تھا۔

کامے نے ان کی لاشوں میں سے گزر کر آیا تھا۔ اُس نے اپنی قوم کی پیٹیوں کی برہنہ لاشیں بھی دیکھی تھیں۔ وہ تو خون کی وہ دلدل تھی جس میں سے وہ بڑی مشکل سے نکل کر آیا تھا۔ وہ چرس کے نشے میں بہتا یا ہوش میں، پاکستان کا نام آ جاتا تو وہ تصور دل میں خون کی دلدل میں دھنس جاتا اور اپنے آپ سے کہا کرتا تھا —— "پاکستان اُن کی امانت ہے جن کی لاشوں میں سے گزر کر میں پاکستان آیا تھا۔"

☆

iqbalmt@onedrive.com scanned by

وہ جب سی۔آئی۔اے کے تفتیشی مرکز کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلا تو اندھا دھند نہ بھاگا۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا اور اُس طرف چلا گیا جدھر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہجوم میں شامل ہو کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ اُس کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ وہ سنبھل کر یوں چلنے لگا جیسے بہکی چلا جا رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے اس انداز سے دیکھتا تھا جس سے کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہیں سے بھاگ کے آیا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ اس کے پیچھے تو کوئی نہیں آ رہا؟

وہ حیران ہو رہا تھا کہ پولیس اس کے پیچھے کیوں نہیں آ رہی۔ اُسے شک ہونے لگا کہ پولیس نے اُسے دیکھ لیا ہے اور پولیس کے آدمی اچانک سامنے سے اور دائیں بائیں سے آ جائیں گے۔ وہ ہر طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ اُس کے قریب سے تانگے گزرتے جا رہے تھے۔ وہ سب کو جانتا تھا اور سب اُسے جانتے تھے لیکن وہ ان سے نظریں بچا رہا تھا۔

ڈی۔ایس۔پی ملک رجب علی جس کے دفتر سے کامافرار ہوا تھا، کامے کے تعاقب میں بڑے دروازے سے باہر چلا گیا تھا۔ ایک اے۔ایس۔آئی اور تین چار کانسٹیبل اُس کے ساتھ گئے تھے۔ وہ جب اُس طرف گئے جدھر کامافرار ہوا تھا، رجب علی نے انہیں واپس بلا لیا تھا۔

"جانے دو۔۔۔" اُس نے کہا تھا۔۔۔ "گواہ تھا، ملزم نہیں تھا۔ میں اُسے جانتا ہوں، شام کو آ جائے گا"

اسے ایس۔آئی اور کانسٹیبلوں کے چہروں پر روشنی آ گئی تھی کہ ڈی۔ایس۔پی تعاقب روک دیا تھا مگر اسے۔ایس۔آئی نے سینہ تان کر کہا تھا۔۔۔ "حضور! اجازت دیں۔ میں اسے پندرہ منٹ میں پکڑ کر آپ کے قدموں میں لا پھینکوں گا"

"ہاں۔ہاں"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "تم ہی اسے پکڑ کر لاؤ گے۔ میں نہیں بتاتا ہوں وہ کہاں ملے گا"

اسے۔ایس۔آئی کا منہ لٹک گیا۔

دفتر میں آ کر ڈی۔ایس۔پی ملک رجب علی نے اسے۔ایس۔آئی اور کانسٹیبلوں سے پوچھا کہ ان میں سے کوئی جانتا ہے؟ اس کے گھر ٹھکانے کا کسی کو علم ہے؟

وہ کانسٹیبل کامے کو جانتے تھے اور یہ بھی کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ دونوں نے بڑا دعویٰ کیا کہ اس کے ہم سے بھی واقف نہیں۔ ایک نے کہا کہ اُس نے اس کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

ڈی۔ایس۔پی کو اس کا کوئی غم نہیں تھا کہ کامے کا باپ ہاتھ نہیں آئے گا۔ کامے نے اسے عبدالقدیر کے قتل کی تفصیلات سناتے ہوئے اپنے متعلق بتایا تھا کہ وہ تانگہ بان ہے اور سارے شہر میں سلم تانگہ چلاتا ہے۔ کسی ایک روٹ پر دو دو چار چار آنے کی سواریاں لے کر نہیں چلتا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں عبدالجلیل کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اُس نے عبدالقدیر کو اپنے ذاتی مذہبی اور اشتعال کے تحت قتل کیا ہے۔

اُس نے قتل کیا تھا یا نہیں، یہ بعد کی بات تھی۔ اب اُسے پکڑنا تھا اور اُسے پکڑنا مشکل نہیں تھا۔ کسی تانگہ بان کے ٹھکانے کا سراغ لگانا آسان تھا۔ ڈی۔ایس۔پی نے اُسی وقت اپنے شناف کے ایک اے۔ایس۔آئی کو کامے کا نام اور حلیہ بتا کر حکم دیا کہ اس تانگہ بان کا سراغ لگا کر اُسے جس قدر جلدی ہو سکے پکڑ لائے۔

اسے۔ایس۔آئی سراغرسانی اور کامے کی گرفتاری کے لیے نکل گیا۔

ڈی۔ایس۔پی رجب علی گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُسے شک ہونے لگا تھا کہ کامے کا آنا اور اقبالِ جرم کرنا ایک ڈرامہ تھا۔ وہ عبدالجلیل کو چھڑانے آیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ایک تانگے والے میں خلوص اور ایثار کا اتنا جذبہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کی خاطر اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دے۔

"اگر یہ تانگہ بان اقبالِ جرم کرنے آیا تھا تو بھاگا کیوں؟"۔۔۔ ملک رجب علی نے سوچا اور اُس نے اپنے آپ کو جواب دیا۔۔۔ "وہ عبدالجلیل کے زمین دوز گروہ کا آدمی ہے۔" اُس نے اچانک آ کر اس توقع پر اقبالِ جرم کیا کہ میں عبدالجلیل کو چھوڑ دوں گا۔ میں نے اُسے عبدالجلیل کے خلاف گواہی دیتے کو کہا تو وہ سمجھ گیا کہ میں عبدالجلیل کو نہیں چھوڑوں گا۔ اُس نے فرار ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاتل وہی ہے اور عبدالجلیل بے گناہ ہے۔۔۔۔ یہ ایک چال تھی۔"

رجب علی عبدالجلیل کو بیگناہ سمجھتا تھا۔ اُس نے ایس۔پی سے کہا بھی دیا تھا اور ایس۔پی نے اُسے کہا تھا کہ بیگناہ ہے یا گناہگار، یہ ثابت کرنا ہے کہ قاتل عبدالجلیل ہے۔ مگر اب رجب علی عبدالجلیل کو مجرم سمجھنے لگا۔ رجب علی ڈی۔ایس۔پی تھا۔ اُسے غصہ آنے لگا کہ عبدالجلیل نے ایک تانگے والے سے اُسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔

✡

راولپنڈی کی کمپنی باغ روڈ کی کوٹھی "آشیانہ" میں ارشد کا باپ، اُس کی ماں، اُس کا بڑا چچا یوسف اور یوسف کی بیوی اکٹھے بیٹھے ارشد اور طاہرہ کی شادی کا پروگرام طے کر رہے تھے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ یوسف باہر گیا۔ ایک [illegible] کھڑا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ ارشد سے ملنا چاہتا ہے۔ یوسف نے اُسے بتایا کہ [illegible] ہے۔

"آپ کے والد صاحب ہوں گے؟"۔۔۔ اجنبی نے پوچھا۔

"[illegible] ہی ہیں۔"

"بہت ضروری کام ہے۔۔۔" اجنبی نے کہا۔۔۔ "اور میں باہر کھڑے ہو کر نہیں، اندر بیٹھ کر بات کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ایک کمرے میں ارشد کے باپ کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں"۔۔۔ اجنبی نے کہا۔۔۔ "میرا حلیہ، میرا لباس اور میرا رنگ روپ ہی ایسا ہے کہ آپ مجھے مشتبہ سمجھ رہے ہیں لیکن بات کرنے سے پہلے میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اعتماد میں لوں یا نہ لوں!"

پھر کسی سے پوچھ کے آؤ کہ میں قابلِ اعتماد ہوں یا نہیں"۔۔۔ ارشد کے باپ نے قدرے تُرشی سے کہا۔۔۔ "بات کا کوئی سرپیر تو ملے۔۔۔ تم نے ارشد کے متعلق پوچھا تھا۔ اس کی بجائے تم میرے ساتھ بات کرنا چاہتے ہو۔ اگر بات ارشد کے متعلق ہے تو میں واحد آدمی ہوں جس کے ساتھ یہ بات کی جا سکتی ہے۔"

"میرا نام کاما ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ کاما تانگے والا"

"ہاں، میں نے تمہارا نام سنا ہے"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔ "ارشد نے مجھے تمہارے متعلق

by iqbalmt@oneurdu.com scanned

بڑی اچھی باتیں سناتی ہیں.... کہو کامے کیا بات ہے. کوئی کام ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمھاری مدد کروں گا۔"

ارشد جھینپ پوری کر کے راولپنڈی چلا گیا ہے:

"مجھے کوئی مدد نہیں چاہیئے"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"میں آپ کی اور ارشد کی کچھ مدد کرنے آیا ہوں.... میں معذور قاتل ہوں۔ آج صبح پولیس کی حراست سے فرار ہوا ہوں۔"

ارشد کے باپ کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"میں پناہ مانگنے نہیں آیا"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"میں یہاں چھپنے کے لیے اور مالی امداد کے لیے نہیں آیا۔"

"تم کس کام کے لیے آئے ہو فوراً بتاؤ"۔۔۔ ارشد کے باپ نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔"معذور قاتل ہونا کوئی معمولی سی بات نہیں تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔ فوراً بولو کہ ارشد سے تمھیں کیا کہنا ہے۔"

"آپ گھبرائیں نہیں"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"آپ کے بیٹے کا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مقتول سیرا دشمن نہیں تھا۔ وہ پاکستان کا دشمن تھا....."

کامے نے ارشد کے باپ کو پوری تفصیل سے سُنا دیا کہ اُس نے پولیس کے سامنے ایس ایچ او عبدالقدیر کو کیوں اور کس طرح قتل کیا ہے۔ اس میں عبدالجلیل کا ذکر بھی تھا۔ اُن دو ہندو والاکیوں کا بھی ذکر تھا جو سیرا اور عقیلہ کے فرضی ناموں سے لاہور میں تعلیم تھیں۔ کامے نے چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش کا بھی ذکر کیا۔

"میں جانتا ہوں کامے"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔"میں چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش کو جانتا ہوں اور میں انسپکٹر عبدالجلیل کو بھی جانتا ہوں۔ اس قسم میں میرے ساتھ اُس کا ذاتی تعلق بھی رہتا تھا۔ ذاتی بھی۔ اُس نے آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی جس طرح پردہ مدد کی تھی میں وہ بھی جانتا ہوں۔"

"آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش جو آزادی سے پہلے ہندوؤں کے ایجنٹ بنے ہوئے تھے اور پاکستان کے نعرے لگانے والوں کے منہ نوچتے تھے وہ آج پاکستان کے حاکم بلکہ حکمران ہیں"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"اور آزادی کی جنگ کا مجاہد عبدالجلیل پولیس کی حراست میں پڑا ہے۔ اُسے عبدالقدیر کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔"

"کیا میں اُس کے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟"۔۔۔ ارشد کے باپ نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"اُسے چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش نے گرفتار کرایا ہے اور سیرا ریما کا سیکرٹری بھی اس کے خلاف ہے.... میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے عبدالقدیر کو کیوں قتل کیا ہے۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ راولپنڈی جا کر ارشد سے کہہ دیں کہ کسی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُس کا عبدالجلیل کے ساتھ یا میرے ساتھ کوئی تعلق ہے۔"

"کیا عبدالجلیل کے ساتھ اور تمھارے ساتھ ارشد کا کوئی خاص تعلق ہے؟"

"بہت گہرا"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ افسردہ بیٹھے ہیں۔ میں اُن پڑھ ہوں.... ہندوستان کے جاسوس پاکستان کی بنیادوں میں اُتر گئے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ان کے نرسل پر کون سے پاکستانیوں کا ہاتھ ہے۔ آپ اس لیے بھی مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھیں گے کہ ایک تانگے والا پاکستان کے تحفظ اور دفاع کی باتیں کر رہا ہے لیکن جناب! پاکستان ہم لوگوں نے بنایا ہے۔ خون ہمارے بچوں کا بہ گیا تھا یہاں ہماری اعلیٰ اور سرعام بے آبرو ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کا کچھ

نہیں گیا جو وہاں انگریز اور ہندو ساہوکاروں کے خوشامدی اور پٹھو تھے اور یہاں آ کر حاکم بن گئے ہیں:

"کامے! میں سب کچھ جانتا ہوں"۔۔۔ ارشد کے باپ نے قدرے غصّے میں کہا۔۔۔"مجھے وہ بات بتاؤ جس کے لیے آئے ہو۔ اس قتل کے ساتھ ارشد کا کیا تعلق ہے جو تم نے کیا ہے۔ یا تم کہتے ہو کہ تم نے کیا ہے:"

"کچھ بھی نہیں جناب!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"ارشد کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اتنی لمبی بات اس لیے شروع کر دی تھی کہ مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے تانگے والا سمجھ کر بھروسا اعتبار نہیں کریں گے.... قتل کی بات تو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ میری اس واردات کے پیچھے ایک اور وجہ ہے۔ عبدالجلیل نے ایک زمین دوز تحریک اس مقصد کے لیے شروع کی تھی کہ پاکستان کے دشمنوں کو، وہ ہندوستانی جاسوس ہوں یا پاکستانی، ایسے طریقے سے ختم کرتے جائیں کہ کسی کو قاتلوں کا سراغ نہ ملے۔"

"عبدالجلیل یہ سلسلہ کب تک چلا سکتا ہے؟"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔"یہ سب جذباتی باتیں ہیں:"

"ذرا گہرائی میں سوچیں میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"پاکستان کے دشمن کے ایجنٹوں کو پکڑنا، پاکستان کی حکومت کا کام ہے مگر حکومت کا صرف ایک پُرزہ دشمن کے ہاتھ کا اور اس کی مرضی کا فٹ کیا ہوا۔ اگر وہ سیاسی مشین کو اپنے مطابق چلانے گا۔ یہ حال ہماری حکومت کا ہے۔ عبدالجلیل خان صاحب کہتے ہیں کہ ایک ایجنٹ کو قتل کر دو تو سو ایجنٹ زمین کے نیچے چلے جائیں گے، اور اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو دشمن سمجھ جائے گا کہ اس ملک میں پولیس اور فوج کے علاوہ کوئی اور طاقت کام کر رہی ہے..... میاں جی! وہ طاقت ہم ہیں۔ ہم جوتا تانگے چلاتے ہیں، چرس پیتے ہیں، غنڈے اور بدمعاش کہلاتے ہیں..... اور جی! اصل طاقت اس ملک کے یہ نوجوان ہیں جنہیں سیاسی جماعتیں فریب دے کر اپنے اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہیں:"

"خدا نے دشمن کے ایک ایجنٹ کو ختم کروا دیا ہے"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔

"نہیں میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"میں نے نسیم اللہ کی بیوی سے سنا کہ حکومت کے کل پرزے ہم سے زیادہ تیز نکلے۔ میں جانتا ہوں کہ پاکستان کی قسمت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے جن کے دلوں میں پاکستان کی ذرا سی بھی محبت نہیں۔ پاکستان کو وہ مرا سمجھ کر اسے گیدڑوں اور گدھوں کی طرح کھا رہے ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایمان اور انسان کا احترام بالکل ہی اٹھ گیا ہے۔ پولیس نے عبدالقدیر کے قتل کے جرم میں عبدالجلیل کو پکڑ لیا ہے اور اُس کے گھر سے....."

"اوہ!"۔۔۔ ارشد کے باپ نے چونک کر کہا۔۔۔"میں نے یہ خبر اخباروں میں پڑھی ہے۔ یہ آج ہی کی بات نہیں؟..... اُس کے گھر سے کچھ اسلحہ برآمد ہوا ہے:"

"یہ اسلحہ پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے یہ خبر پڑھی تو اپنے آپ کو پولیس کے سامنے پیش کر کے اقبالِ جرم کر لیا اور کہا کہ خان صاحب کو چھوڑیں مگر ایک ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا کہ وہ مجھے سلطانی گواہ بنائیں گے اور میں اس بیان پر انگوٹھا لگا دوں تو پولیس مجھے گی۔ مجھے موقع ملا اور میں وہاں سے بھاگ آیا:"

"اب کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟"

میں آخر پکڑا جاؤں گا"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "اور آپ کو معلوم ہے کہ جب پکڑا جاؤں گا تو کیا ہوگا۔ پکڑے جانے سے پہلے میں اپنا ایک عہد پورا کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں پاکستان کے دو چار دشمنوں کو قتل کر کے پھانسی چڑھوں گا۔ آپ کو میں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں نے ارشد کی ملاقات عبدالجلیل خان سے کرائی تھی اور ارشد بھی ہماری اس خفیہ تحریک میں شامل ہو گیا تھا۔"

"کیا پولیس تک ارشد کا نام بھی پہنچ چکا ہے؟"

"نہ میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "آپ بے فکر رہیں۔ آپ کا بیٹا محفوظ ہے۔"

"میرا بیٹا اگر پاکستان پر قربان ہو گیا تو مجھے کوئی غم نہیں ہوگا"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔ "مگر میں اپنے بیٹے کو اس طرح ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ وہ کچھ کیے بغیر مارا جائے۔ صرف میرا ارشد نہیں کامے! اس قوم میں لاکھوں ارشد موجود ہیں جو پاکستان کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیں گے۔"

"آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "میں بھی یہی کہنے آیا ہوں کہ ارشد کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اس نے بھی آج اخباروں میں عبدالجلیل خان کی گرفتاری کی اور اس کے گھر سے اسلحہ کی برآمدگی کی خبر پڑھ لی ہوگی۔ وہ جو شیلا لڑکا ہے کبھی ایسا نہ ہو کہ وہ دوڑا دوڑا خان صاحب کے گھر چلا جائے۔ وہاں اب مجرا وجرا نہیں ہو رہا ہوگا۔ وہاں اب پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہوں گی۔ مجھے یاد آیا ہے کہ خان صاحب کو عبداللہ پر بڑا بھروسہ تھا اور انہوں نے عبداللہ پر کے ساتھ ارشد کا تعارف کرایا تھا۔ ہو سکتا ہے عبداللہ پر نے کہیں بتا دیا ہو کہ ارشد نام کا ایک لڑکا بھی عبدالجلیل خان کا ساتھی ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ارشد کا ابا پنجر کسی کو معلوم نہیں۔"

"میں ارشد کو آج ہی خط لکھ دوں گا"۔۔۔ ارشد کے باپ نے کہا۔۔۔ "اگر وہ آ گیا تو ارشد کے ساتھ آپ بھی پکڑے جائیں گے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ آپ آج ہی راولپنڈی چلے جائیں اور ارشد کو لکھ دیں کہ وہ عبداللہ پر کے قتل اور عبدالجلیل خان کی گرفتاری کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق ظاہر ہو۔ میں ارشد سے نہیں مل سکوں گا"۔۔۔ کامے نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کے آفیسر نکل آئے۔۔۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب جلال آباد میں ارشد جیسے نوجوانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے سر پھیر دیئے تھے۔ وہ نعرے یاد آتے ہیں مگر آج ہم ارشد سے کہہ رہے ہیں کہ وہ زبان بند کر لے کیونکہ یہ دور مجاہدوں کا نہیں مجرموں کا ہے اور یہاں اب مجاہدوں کو مجرم سمجھا جاتا ہے۔"

کاما اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ارشد کے باپ سے ہاتھ ملانے کو ہاتھ بڑھایا۔

"میں ایک دو دنوں کا مہمان ہوں میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔

"تمہارے بچے ہیں؟"

"نہیں"۔۔۔ کامے نے جواب دیا۔۔۔ "یہی خوش نصیبی ہے میری۔۔۔ بیوی ہے۔ اس کا غم ہے سوچتا ہوں میرے بعد اس کا کیا ہوگا۔"

ارشد کے باپ نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔۔۔ "اللہ تمہیں محفوظ رکھے کامے! اگر کوئی ایسی ویسی ہو گئی تو اپنی بیوی کو میرا گھر دکھا دینا۔"

"وہ آپ کے گھر آ جائے گی"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "آپ میرے گھر نہ جانا۔ میں پاکستان کے نام پر اس دنیا سے جا رہا ہوں لیکن میرا گھر پولیس کی نظر میں رہے گا۔۔۔ اللہ حافظ میاں جی!"

"زندہ رہے تو ملیں گے کامے!"

"اگلے جہان میاں جی!"۔۔۔ کامے نے کہا۔۔۔ "اگلے جہان"۔۔۔ اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

ارشد کا باپ باہر نکلا۔ کاما ایک سائے کی طرح کوٹھی کے پھاٹک سے نکل رہا تھا، پھر یہ سایہ پاکستان کی رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔

✡

جب کامے "آشیانہ بھون" کے پھاٹک سے نکل رہا تھا اس وقت اس کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی بیوی نے یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا۔۔۔ "گھوڑی گھر میں بندھی ہے اور خدا بے لگام گھوم پھر رہا ہے۔"

اس نے ابھی زنجیر کھولی ہی تھی کہ کواڑوں کو باہر سے کسی نے بڑے زور سے دھکیلا۔ کواڑوں کا دھکا اسے بھی لگا۔ وہ سمجھی کہ آج کامے زیادہ پی کے آیا ہے۔ وہ اسے کوسنے لگی تھی لیکن اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ تین آدمی اندر آ گئے اور تینوں ممن میں سے دوڑتے ہوئے مکان کے دونوں کمروں میں داخل ہو گئے۔ کامے کی بیوی ان کے پیچھے دوڑ پڑی۔ اگر وہ تینوں پولیس کی وردی میں نہ ہوتے تو یہ عورت انہیں ڈاکو سمجھ کر شور مچا دیتی مگر وہ پولیس کے آدمی تھے۔ وہ برآمدے میں رک گئی۔

پولیس کے آدمی اندر چارپائیوں کے نیچے بھی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے باورچی خانے میں بھی دیکھا۔ الماریوں کے نیچے اور بیت الخلا میں بھی دیکھا۔ ایک آدمی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جب وہ دونوں کمروں کی اور غسلخانہ کی تلاشی سے فارغ ہوتے تو کامے کی بیوی کو گھیر لیا۔

"کامے کہاں ہے وہ؟"۔۔۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اس سے پوچھا۔

"کون کامے؟"۔۔۔ کامے کی بیوی کے حیران ہو کے پوچھا۔۔۔ "تم ویسے گھر ٹوٹنے آتے ہو۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"وہ تیز قسم کہاں ہے؟"۔۔۔ ایک کانسٹیبل نے پوچھا۔

"اگر جلدی نہ کرو گے تو باہر کھڑی ہو کر وہ سناؤں گی کہ تمہاری ماں سن کو نگا کر کے رکھ دوں گی"۔۔۔ کامے کی بیوی نے کہا۔۔۔ "دماغ ٹھکانے رکھ کر بات کرو۔ تم جیسے تھانیدار اور سپاہی بہت دیکھے ہیں۔"

"مائی!"۔۔۔ اے۔ ایس۔ آئی نے ذرا آرام سے پوچھا۔۔۔ "تم کامے کی گھر والی ہو؟۔۔۔ ہم کامے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"کیا کیا ہے اس نے؟"

"ہم کامے کی پوچھ رہے ہیں"۔۔۔ اے۔ ایس۔ آئی نے کہا۔۔۔ "ہمیں حکم ملا ہے۔ یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں کہ اس نے کیا کیا ہے۔ اسے ساتھ لے جانا ہے گرفتار نہیں کرنا۔"

"ہاں، تم اس کے ماموں لگتے ہو نا!"۔۔۔ کامے کی بیوی نے کہا۔۔۔ "تم اسے گرفتار نہیں کرو گے اسے ویسے پرے بھاؤ گے۔ تم تو اس طرح میرے گھر میں داخل ہوتے تھے جیسے بھوکے ڈنگر

iqbalmt@onelib.com scanned by

کھڑکی پر قدم تولتے ہیں، اور کہتے ہوا سے گرفتار نہیں کریں گے؟"

"مائی! ہم جو پوچھتے ہیں وہ بتا۔۔۔ اے۔ ایس۔ آئی نے کہا۔ "کالا کہاں ہے؟"

"وہ یہاں ہوتا اور تم لوگ اس گھر میں داخل ہوتے تو سارا لاہور تماشا دیکھتا۔۔۔" کالے کی بیوی نے کہا۔۔۔ "وہ گھر میں نہیں ہے۔ تم نے سارا گھر دیکھ لیا ہے۔ یہ چٹیالہ کے سارا جے کا محل تو نہیں۔ وہ ہی تو کمرے ہیں یہاں۔ تم نے چارپائیوں کے نیچے قلس کو بھی دیکھ لیا ہے؟"

"جانتی ہو وہ کہاں ہو گا؟"

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ صبح تانگہ جوت کر نکلا تھا۔۔۔" کالے کی بیوی نے کہا۔ "تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گیا۔ اُس نے تانگہ کھول دیا۔ میں پوچھتی رہی کہ وہ واپس کیوں آ گیا ہے۔ اُس نے گول مول سا جواب دیا۔ میں نے ذرا آنکھیں دکھائیں تو کہنے لگا کہ بہت ضروری کام سے جانا ہے۔ شام کو آؤں گا۔ اور وہ چلا گیا۔ سارا دن گھر نہیں آیا۔ تم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں سمجھی کہ وہ آ گیا ہے؟"

"ذرا کان کھول کے سُن لے مائی!۔۔۔ اے۔ ایس۔ آئی نے کہا۔ "کالا آ جائے یا وہ جہاں کہیں بھی ہے، اُسے بتا دینا کہ پیش ہو جائے۔ اگر وہ کل دوپہر تک پیش نہ ہُوا تو ہم تمھیں اپنے ساتھ لے چلیں گے اور تمھارا تانگہ اور گھوڑی بھی ضبط ہو جائے گی۔"

"یہ نہیں بتاؤ گے کہ اُس نے کیا کیا ہے؟"۔۔۔ کالے کی بیوی نے پوچھا۔

"تمھیں پتہ چل جائے گا۔۔۔" اے۔ ایس۔ آئی نے کہا اور اپنے کانسٹیبلوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

رات کو ہی کالے کے گھر پر نظر رکھنے کے لیے دو خبر مقرر کر دیے گئے۔

☆

ہیڈ کانسٹیبل عبدالجلیل خان کا جسم بے حس ہو چکا تھا۔ وہ چھ کانسٹیبلوں کے اُس کے دونوں ہاتھوں کی رسیاں اور شہادت کی انگلیوں کے درمیان پنسل جتنی موٹی ایک سلاخ ڈال رکھی تھی اور دو کانسٹیبل اس کی انگلیوں کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ درد کی شدت سے عبدالجلیل کی آنکھیں بند تھیں۔ اوپر نیچے کے دانت ملے ہُوئے اور منہ کھلنے کی وجہ سے چہرہ جو کرب کی تصویر بنا ہُوا تھا۔ پسینے سے ڈھل رہا تھا مگر اُس کے مُنہ سے ہلکی سی "سی" بھی نہیں نکلتی تھی۔

"او تے بدبخت! آستری۔ ایس۔ پی ملک رجب علی اُسے تین بار کہہ چکا تھا۔۔۔ "صرف یہ بتا دے کہ کالے تانگے والے کے ساتھ تمھارا کیا تعلق ہے؟"

عبدالجلیل نے تینوں بار نفی میں سر ہلایا تھا۔ اور تینوں بار رجب علی نے کانسٹیبلوں سے کہا تھا۔۔۔ "اور زور سے دباؤ۔۔۔" اب کانسٹیبل اتنی زور سے عبدالجلیل کی انگلیاں دبا رہے تھے کہ اُن کے چہروں پر وہی تاثر آ گیا تھا جو عبدالجلیل کے چہرے پر تھا۔

ملک رجب علی کو ایک ہی بار بے شمار خیالوں نے گھیر لیا اور وہ یوں ہڑبڑا کر اُٹھنے لگا جیسے کوئی غلیظ انسان اپنے رال ٹپکانے منہ سے بار بار مکھیاں اُڑاتا ہو۔

"یہ چھپتا کیوں نہیں؟..... بولتا کیوں نہیں؟..... میں تو اسے سچا اور بے گناہ سمجھتا تھا لیکن کالا اس کے خلاف نیا تنکا پیدا کر گیا ہے..... کیا اسے کالے کی گرفتاری تک کچھ نہ کہا جاتے؟..... کیا کالا گرفتار

ہو جائے گا؟..... عبدالجلیل بے گناہ ہے..... سچے اور نیک انسان کو خدا اتنی طاقت اور اتنی قوتِ برداشت دے دیتا ہے کہ اس کے اعضا کاٹتے رہو اُسے محسوس نہیں ہوتا..... کیا ایسے ہی ہوتا ہے؟..... یہ مجھے کس نے بتایا تھا؟"

عبدالجلیل تو ایذا رسانی کے درد سے بے حال ہو رہا تھا مگر رجب علی کو اُس کے اپنے متضاد خیالات اذیت پہنچانے لگے۔ عبدالجلیل جس صبر اور خاموشی سے اُس کی اذیت برداشت کر رہا تھا ملک رجب علی کے لیے ایک طعنہ بن گئی تھی۔ پھر یہ طعنہ ماں بہن کی گالی بن گیا۔ اُس نے بار بار عبدالجلیل سے کہا کہ وہ کچھ تو کہے مگر نفی میں ہلتا ہُوا اُس کا سر اُسے آگ بگولہ کر رہا تھا۔

اُس کے دل میں رحم کی چنگاری سلگی۔ اُسے خیال آیا کہ ایسی اذیت کوئی سچا اور خدا کا پیارا انسان ہی برداشت کر سکتا ہے۔

"میں ایس۔ پی سے کہہ دوں گا کہ تُو شخص بے گناہ ہے۔ مجھ سے گناہ بخشوا۔۔۔" اُس نے ارادہ کیا۔

"رجب علی!۔۔۔ اُس کے اندر سے ڈی۔ ایس۔ پی کی آواز اُٹھی۔ "تم اسے چھوڑ کر میرا لگا گھونٹ پینا چاہتے ہو؟..... تم ڈی۔ ایس۔ پی ہو۔ انسانوں کی طرح سمت سوچو۔ کیا تم ایس۔ پی نہیں بننا چاہتے؟"

ملک رجب علی اپنے سیدھے خیالوں سے سٹپٹا اٹھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آ گیا۔ اُس کے اندر ایک شعلہ اٹھا۔ اُس وقت عبدالجلیل خان اس پوزیشن میں تھا کہ وہ فرش پر بیٹھا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ دو کانسٹیبل پھیلے ہُوئے تھے۔ ایک ہاتھ ایک کانسٹیبل کے ہاتھوں میں اور دوسرا دوسرے کانسٹیبل کے ہاتھوں میں پایا ہُوا تھا۔ انگلیوں میں سلاخیں تھیں۔ اس سے پہلے عبدالجلیل کے جسم کو مختلف زاویوں میں ڈالا گیا تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔

ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کے اندر سے جو شعلہ اٹھا تھا۔ اس نے اُسے اندھا کر دیا۔ اُس کے سامنے عبدالجلیل فرش پر بیٹھا تھا۔ رجب علی نے پوری طاقت سے عبدالجلیل کے پیٹ میں اس طرح ٹھڈا مارا جس طرح فٹ بال کو گول مادی جاتی ہے۔ عبدالجلیل کا سر اوپر کو اٹھا اور پھر آگے کو گرا۔

اس ٹھڈے نے رجب علی کو جیسے جگا دیا ہو۔ اُس نے یوں محسوس کیا جیسے عبدالجلیل کو یہ ٹھڈا اُس نے نہیں مارا تھا۔ اُس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ غصے کی ایک لہر نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔ یہ غصہ اسے اپنے آپ پر آیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ میں لرزہ سا محسوس کیا۔

اُس نے عبدالجلیل کو دیکھا۔ اس کی ٹھڈی اس کے سینے سے لگی ہُوئی تھی اور اُس کے منہ سے خون کا ایک قطرہ اس کے کپڑوں پر گرا تھا۔ پھر ایک قطرہ اور گرا۔

"اس کے ہاتھ چھوڑ دو۔۔۔" ملک رجب علی نے کانسٹیبلوں سے کہا۔

کانسٹیبلوں نے جب عبدالجلیل کے ہاتھ چھوڑے تو وہ کچھ دیر ڈولتا رہا پھر ایک سائیڈ پر لڑھک گیا۔ اُس کے منہ سے خون کے قطرے فرش پر گرنے لگے۔ رجب علی کا ٹھڈا اُس کے پیٹ پر اتنی زور سے لگا تھا کہ اندر گہرا زخم ہو گیا تھا۔ یہ اندر کے زخم کا خون تھا جو منہ سے باہر آ رہا تھا۔ رجب علی نے اس کی نبض پر انگلی رکھی۔ وہ اچھل کر اٹھا اور دوڑتا باہر نکل گیا۔

دونوں کانسٹیبلوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر دونوں عبدالجلیل کو دیکھنے لگے۔

☆

iqbalmt@onlinepk.com scanned by

اُس وقت کامااُس کوٹھی کے باہر اندھیرے میں کھڑا تھا جس میں نسیرہ رہتی تھی۔ یہ وہ ہندو لڑکی تھی جس کا اصل نام رادھا تھا۔ کاما اس کوٹھی سے اچھی طرح واقف تھا اور اس کوٹھی میں رہنے والوں کو بھی جانتا تھا۔ وہ بہت دن اور اکثر راتیں بجڑوں اور جاسوسوں کی طرح اس کوٹھی کو دیکھتا رہا تھا۔ اُسے جو کچھ نظر آتا وہ عبدالخلیل کو بتا دیا کرتا تھا۔ اُس کا خون کھولتا تھا مگر کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ کیا کرے۔ اب وہ خوش تھا کہ عبدالخلیل جیسا لیڈر مل گیا ہے جو اُسے بتاتے گا کہ دشمن کے ایجنٹوں کے خلاف کیا کارروائی کی جانی ہے۔

آج رات وہ اپنا لیڈر خود بن گیا تھا۔ اُس نے ایک منصوبہ خود ہی بنا لیا تھا۔ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کوٹھی کے قریب آیا تھا۔ نسیرہ کی کار موجود نہیں تھی۔ کار پورچ میں کھڑی رہتی تھی۔ کامے کو توقع تھی کہ نسیرہ واپس آئے گی۔ برآمدے میں روشنی تھی۔ کمروں میں اندھیرا تھا۔

کاما سارا دن ایک دوست کے گھر چھپا رہا تھا۔ شام کے بعد وہاں سے نکلا اور ارشد کے باپ سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہاں سے نسیرہ کی کوٹھی تک آ گیا تھا۔ رات آدھی گزر چکی تھی کہ یہ علاقہ بے روشنی ہو گیا تھا۔ اکّا دکّا کار رکشے سے گزر جاتی تھی یا کوئی تانگہ گڑی سڑک پر جاتا نظر آتا تھا۔ پیدل چلنے والوں کی چہل پہل ختم ہو چکی تھی۔ کامے کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں اندھیرا تھا۔ کوٹھی کے احاطے میں روشنی تھی اور درخت تھے۔

اُسے ایک کار کی آواز سنائی دی۔ وہ دبے پاؤں کوٹھی کی لوہے کے ساتھ ساتھ چلتا پھاٹک تک گیا۔ کار نسیرہ کی ہی تھی۔ اُس کا جعلی خاوند چلا رہا تھا۔ کار پھاٹک کے اندر چلی گئی تو کاما اس کے پیچھے پیچھے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ کار پورچ میں رُکی۔ نسیرہ اور اُس کا جعلی خاوند کار سے نکلے۔ نسیرہ نے کامے کی طرف دیکھا اور خاوند سے کہا کہ یہ دیکھنا کون آدمی ہے۔

فاصلہ تھوڑا سا تھا۔ کاما یوں خود اعتمادی سے چلا جا رہا تھا جیسے اسی کوٹھی میں رہتا ہو یا اسی کوٹھی میں ملازم ہو۔

"کون ہو بھئی تُو" ۔۔۔ خاوند نے کار کے پاس کھڑے کھڑے پوچھا۔

نسیرہ کار کی ڈگی کے پاس کھڑی کامے کو دیکھ رہی تھی۔

"چوہدری صاحب کا پیغام لایا ہوں" ۔۔۔ کامے نے کہا اور ایک ہاتھ اپنی قمیض کے اندر لے گیا جہاں اُس نے وہ خنجر اڑسا ہوا تھا جس سے اس نے عبداللہ پر حملہ کیا تھا۔

"کون سے چوہدری صاحب؟" ۔۔۔ نسیرہ نے پوچھا۔

کاما اُس تک پہنچ گیا۔ وہ خنجر چلانا جانتا تھا۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے ناف سے خنجر نکالا اور نسیرہ کے دل پر وار کیا۔ نسیرہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ کامے نے خنجر نکالا اور دُوسرا وار پیٹ پر کر کے خنجر کو ایک طرف چلا دیا۔ نسیرہ کا پیٹ چاک ہو گیا۔

نسیرہ کا جعلی خاوند جو کار کی دوسری طرف تھا، کامے کی طرف آیا۔ پورچ کی بتی جل رہی تھی۔ کاما اُس کی طرف دوڑا۔ خاوند نے اُس کے ہاتھ میں خنجر دیکھ لیا۔ کاما اُسے بھی قتل کرنا چاہتا تھا مگر وہ وہیں سے گھوما اور اپنے نوکروں کو آوازیں دیتا اتنی تیز دوڑا کہ فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کاما ابھی گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ دشمن کے اس پاکستانی ایجنٹ کے پیچھے نہ گیا۔ اُسے نوکروں

کے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ اُن کے آنے سے پہلے کوٹھی کے احاطے سے نکل گیا۔

✡

وہ دوڑتا ہی چلا گیا۔ اُس کا رُخ اُس کوٹھی کی طرف تھا جس میں نسیرہ جیسی دوسری ہندو لڑکی کرن رہتی تھی لیکن پاکستان میں عقیلہ کے نام سے مشہور تھی۔ اُس کا بھی ایک جعلی خاوند تھا۔ اُس کی کوٹھی کوئی تین فرلانگ دور تھی۔ کاما دوڑتا ہی گیا۔ اُسے پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ اُسے عقیلہ کو قتل کرنا تھا جو وہ اپنی جان دے کر بھی کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

عقیلہ کی کوٹھی میں رونق تھی جو کم ہوتی جا رہی تھی۔ زیادہ تر مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ نسیرہ بھی وہیں سے آئی تھی۔ عقیلہ کے ہاں ابھی چوہدری اکرم، صہبا اللہ بخش اور ہوم سیکرٹری جیسے مہمان موجود تھے۔ فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور عقیلہ کے جعلی خاوند نے اٹھایا۔ اُس نے "ہیلو" کہا اور اس کے بعد اُس کے منہ سے سخت گھبرائی ہوئی آواز نکلی ۔۔۔ "کیا؟ کیا؟" ..... "نسیرہ قتل ہو گئی ہے؟"

اور اس کے ساتھ ہی عقیلہ کی کوٹھی میں ایک بے ڈراؤنی آواز گونجنے لگی ۔۔۔ "نسیرہ قتل ہو گئی ہے" ۔ یہ اطلاع دینے والا نسیرہ کا جعلی خاوند تھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اُس نے کہا تھا ۔۔۔ "عقیلہ کا خیال رکھنا۔ قاتل بھاگ گیا ہے"۔

عقیلہ کی کوٹھی میں جو چند ایک آدمی تھے وہ باہر نکل آئے۔ عقیلہ بھی باہر آئی۔ وہ سب سے زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ باہر تین کاریں کھڑی تھیں۔ کچھ لوگ ان میں بیٹھ گئے۔ عقیلہ ابھی برآمدے میں کھڑی تھی۔ اُس کا جعلی خاوند اندر سے گاڑی نکالنے چلا گیا تھا۔

ایک آدمی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ وہ دوڑا آرہا تھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں چلاتا آرہا تھا ۔۔۔ "نسیرہ قتل ہو گئی ہے..... عقیلہ صاحبہ اظلم ہو گیا..... او تے نسیرہ بے چاری ماری گئی ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں"۔

عقیلہ برآمدے سے اُتر آئی۔ کاروں میں جو بیٹھ گئے تھے، انہوں نے باہر نکلنے کے لیے کاروں کے دروازے کھولے۔ وہ آدمی سیدھا عقیلہ کی طرف گیا۔ عقیلہ اس خیال سے اُس کی طرف چلی کہ وہ نسیرہ کے قتل کا کوئی عینی شاہد ہے مگر اس آدمی نے خنجر نکالا اور پہلا وار عقیلہ کے دل کے مقام پر اور دوسرا پیٹ میں کیا۔ عقیلہ کے منہ سے ویسی ہی آواز نکلی جیسی ذبح ہوتے وقت بکرے کے منہ سے نکلا کرتی ہے۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گر پڑی۔

قاتل نے خنجر ہوا میں لہرا کر کہا ۔۔۔ "پاکستان کے دشمنو! میں ہوں کاما۔ سنگے والا۔ عبداللہ پر کبھی میں نے ہی قتل کیا تھا"۔

اُسے توقع تھی کہ خنجر دیکھ کر سب اِدھر اُدھر ہو جائیں گے اور وہ چوہدری اکرم اور صہبا اللہ بخش کو بھی قتل کر دے گا مگر وہ لوگ زیادہ تھے۔ انہوں نے دور دور اس کے گرد گھیرا ڈال لیا اور وہ ایک دوسرے کو للکارنے لگے ۔۔۔ "ڈرنا نہیں۔ پکڑ لیں گے"۔

کاما کوٹھی کے برآمدے میں چلا گیا۔ دو آدمی برآمدے میں ایک طرف اور دو تین دوسری طرف کھڑے

iqbalmt@onenet.com.pk scanned by

ہو گئے۔ کسی نے کسی کو پکار کر کہا ”اندر سے بندوق اور پیٹی لے آؤ۔“

کامااِیک طرف دوڑا۔ اُدھر جو دو آدمی تھے، انہوں نے اُس کے خنجر سے وار کر اُسے راستے سے ہٹا دیا۔ آگے ایک نوکر آ گیا جس کے ہاتھ میں ٹوٹا تھا۔ اس نے کامے کو روکنے کی کوشش کی لیکن کاما اتنی تیزی سے اُس کی طرف گیا کہ وہ آدمی بھاگ گیا۔ اُس کے سامنے کوٹھی کا لان اور دیوار تھی۔ وہ لان میں سے دوڑتا گزر گیا۔ پھاٹک بند کر دیا گیا تھا۔ وہ اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا۔ بندوق فائر ہوئی۔ اگر رائفل ہوتی تو کاما فوراً ختم ہو جاتا۔ یہ دونالی بندوق تھی جس کے کارتوسوں میں چھرّے تھے۔ کئی چھرّے اُس کی پیٹھ میں اُتر گئے کاما سنبھل گیا۔ وہاں روشنی تو نہیں تھی لیکن دیوار پر ہونے کی وجہ سے وہ نظر آتا تھا۔ وہ دیوار سے باہر کُودنے لگا تو ایک اور کارتوس فائر ہُوا۔ کاما دیوار سے پرے جا پڑا۔ اُسے کچھ اور چھرّے لگ گئے تھے۔ کوٹھی سے سب آدمی پھاٹک کی طرف دوڑے۔ انہوں نے پھاٹک کھولا مگر بڑی احتیاط سے۔ نکلنے کو قاتل کے کوئی ساتھی ہو سکتے ہیں جن کے پاس ریوالور ہوں گے۔ بندوق والا آدمی باہر نکلا۔ اُس کے پیچھے دو تین نوکر نکلے۔ اُس جگہ تک پہنچتے جہاں کاما گرا تھا، کچھ وقت لگ گیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوٹھی کے ارد گرد گھوم کر دیکھا۔ کوئی آدمی نظر نہ آیا ـــــ قاتل نکل گیا تھا۔

✡

آدھی رات سے کچھ بعد کا وقت تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی تھوڑی ہی دیر پہلے سویا تھا۔ اُس کی کوٹھی کے سامنے ایک تانگہ رُکا۔ ایک آدمی اُترا اور تانگہ چلا گیا۔ یہ آدمی کاما تھا۔ وہ دو تین قدم چلا تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ دوسرے کارتوس کے چھرّے اس کی ران پر لگے اور دو چھرّے کھوپڑی کو بھی لگے تھے۔ وہ عقیلہ کی کوٹھی سے بھاگ کر پچھلی طرف چلا گیا تھا۔ اس میں ابھی خون موجود تھا۔ کاما چلتا گیا اور دوسری سڑک پر جا پہنچا۔

اُسے ایک تانگہ آتا دکھائی دیا۔ اُس نے آگے ہو کر تانگہ روک لیا۔ تانگے والے نے اُسے پہچان لیا لیکن اُس کا خون بہتا دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اُس نے کامے کو سہارا دے کر تانگے میں بٹھا لیا اور پوچھا کہ کون سے ہسپتال لے چلوں۔

”مجھے ایک ڈی۔ ایس۔ پی کے گھر پہنچا دو“ ـــــ کامے نے کہا۔ ”ہسپتال سے پہلے اُس کے پاس جانا ضروری ہے۔“

کاما پولیس کے تمام بڑے افسروں کے اتے پتے جانتا تھا۔ اُس نے تانگے والے کو راستہ بتایا اور تانگے والے نے گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ اُس نے کامے سے پوچھا کہ اسے کس نے زخمی کیا ہے۔ کامے نے اُسے ایک من گھڑت کہانی سنا دی۔ تانگے والے نے اُسے ملک رجب علی کی کوٹھی تک پہنچا دیا۔ کامے نے اُسے کہا کہ وہ چلا جائے۔

کاما ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی کی کوٹھی میں داخل ہُوا تو چوکیدار نے اُسے روکا۔ کامے نے کہا کہ ملک صاحب کو فوراً جگا دو۔ میں نرمی بیان دینے آیا ہوں۔ چوکیدار نے اردلی کو جگایا۔ اردلی نے اکو کلے سے کہا کہ وہ تھانے چلا جائے مگر کاما کوٹھی کے برآمدے میں دروازے تک جا پہنچا۔ اس کے جسم سے بہت سا خون نکل گیا تھا اور باقی جو رہ گیا تھا وہ نکل رہا تھا۔

اردلی اور چوکیدار ڈی۔ ایس۔ پی کو جگانے سے ڈرتے تھے اور کامے کو وہ اٹھا کر باہر بھی نہیں

پھینک سکتے تھے۔ کامے نے اردلی کے منع کرنے کے باوجود دروازے پر ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔ اردلی اور چوکیدار اسے روک رہے تھے۔ اس شور سے ملک رجب علی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بڑے غصے سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔ کامے کو خون میں نہایا ہُوا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

”کون ہے یہ؟“ ـــــ رجب علی نے غصے سے گرجدار آواز سے پوچھا۔ ”اسے یہاں کون لایا ہے؟ اٹھا کر لے جاؤ۔ اسے تھانے میں پھینک آؤ۔“

کامے نے سر اٹھا کر کہا۔ ”جناب! آپ کا مخبر و ملزم ہوں۔ کاما تانگے والا۔ یہ لیں خنجر۔ وہ قتل اور کر کے آیا ہوں۔ میرا بیان لے لیں۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔“

”اسے سہارا دے کر اندر لے چلو“ ـــــ ملک رجب علی نے کہا۔ ”اور تم باہر انتظار کرو۔“

✡

کامے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آتا اور گزر جاتا تھا۔

”مجھ سے بھاگے کیوں تھے کامے؟“

”یہی بتانے آیا ہوں“ ـــــ کامے نے لڑکھڑاتی، ہکلاتی اور ڈوب ڈوب کر اُبھرتی آواز میں کہا ـــــ ”آپ یقین کر لیں کہ عبدالحلیل برکو میں نے ہی قتل کیا تھا اور انسپکٹر عبدالجلیل خان صاحب کو اس قتل کا کوئی علم نہیں۔ میں نے جب آپ کی باتیں سنیں تو میں سمجھ گیا کہ آپ خان صاحب کو چھوڑنے کی بجائے اُن کے خلاف قتل ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس جھوٹے مقدمے میں مجھے خان صاحب کے خلاف استعمال کریں گے۔ میں نے انہیں چھڑا لیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں بھاگ جاؤں گا تو پکڑا بھی جاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ سزا سے پہلے میں پاکستان کے اُن دشمنوں کو کیوں نہ قتل کر دوں جنہیں میں جانتا ہوں۔ میں نے آپ کو اُن دو جنسی لڑکیوں کے نام بتائے تھے جو اسلامی ناموں سے یہاں مسلمانوں کی طرح رہ رہی ہیں اور پاکستان کی جڑیں کاٹ رہی ہیں....

میں ان دونوں کو قتل کر آیا ہوں۔ آپ کو وہ لوگ صحیح بتا دیں گے کہ میں نے انہیں کس طرح قتل کیا ہے۔ عقیلہ کو جس کا اصلی نام کرن ہے۔ قتل کر کے میں بھاگا تو احاطے کی دیوار پھلانگتے ہوئے مجھ پر بندوق فائر ہُوئی۔ ساری پیٹھ چھلنی ہو گئی ہے۔ سر میں بھی چھرّے لگے ہیں۔“

کامے کا سر ڈول گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ملک رجب علی نے اُسے پانی پلایا۔ وہ پانی پی رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ سے گلاس گر پڑا۔

”اپنے ملک کو بچاؤ ملک صاحب!“ ـــــ کامے نے کہا ـــــ ”اگر آپ میں اتنی ہمت نہیں تو ملک کو بچانے والوں کو گرفتار نہ کرتے پھرو۔ یہ کل کی بات ہے ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ آپ آج بھول گئے ہیں کہ ہم نے اس ملک کی کیا قیمت دی ہے۔ یہ عہدے دنیا میں رہ جائیں گے ملک صاحب!“

کامے کو ایسا ہچکی آیا کہ وہ ایک طرف لڑھک گیا اور ماتھا فرش پر رگڑ کر سنبھل گیا۔

”مرنے سے پہلے میں ایک خوش خبری سننا چاہتا ہوں“ ـــــ کامے نے کہا ـــــ ”بتا دیں عبدالجلیل خان کو آپ نے آزاد کر دیا ہے؟“

”ہاں کامے!“ ـــــ ملک رجب علی نے کہا ـــــ ”عبدالجلیل آزاد ہو گیا ہے۔“

”میرا دل نہ پرچا دو ملک صاحب!“ ـــــ کامے نے کہا ـــــ ”سچ کہو۔“

iqbalmt@gmail.com scanned by iqbalmt@gmail.com

"سچ کہہ رہا ہوں کامے!" — ملک رجب علی نے کہا — "وہ دنیا کے مکر اور فریب سے آزاد ہو گیا ہے۔"

کامے نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا مگر اُس کی آنکھیں بند رہیں۔ اُس نے سرگوشی کی — "کیا کہا آپ نے؟"

"عبدالجلیل آزاد ہو گیا ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "وہ مر گیا ہے۔"

"مر گیا ہے؟" — کامے کے ہونٹوں سے حیرت زدہ سرگوشی نکلی — "خان صاحب مر گئے ہیں؟"

شبیہ کہو ملک صاحب! پاکستان کو زندہ رکھنے والے مر کر بھی زندہ رہیں گے۔"

اب کاما لڑکھڑا کر اُٹھ نہ سکا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ مر چکا تھا۔

✡

اُس رات کے بطن سے جس رات نے عبدالجلیل خان اور کامے تانگے والے کے خون پر سیاہ پردہ ڈال دیا تھا، پاکستان کی ایک اور صبح نے جنم لیا۔ پاکستانی جاگ اُٹھے۔ یہ صبح ویسی ہی تھی جیسی ہر صبح ہُوا کرتی تھی — ایک عام سی صبح جو اس لیے طلوع ہوتی تھی کہ اسے طلوع ہونا تھا — اور لوگ اس لیے جاگ اُٹھے تھے کہ انہیں جاگنا تھا۔ پیٹ کے تنور کے لیے ایندھن اکٹھا کرنا تھا۔ پاکستانی صرف جاگے تھے، بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرے آنے والے حکمرانوں نے پاکستانیوں کی بیداری کو حکمرانی کی جنگ میں جھونک دیا تھا — لوگ جاگے تھے، بیداری اونگھ رہی تھی۔

کامے تانگے والے کی گھوڑی کھُرلی پر بندھی تھی اور اُس کا تانگہ باہر کھڑا تھا۔ گھوڑی بھی پاکستانیوں کی طرح باہر نکل جانے کو بیتاب ہو رہی تھی۔ اُسے تانگے کے آگے جُت جانا چاہیئے تھا۔ انسانوں کی طرح گھوڑی کو بھی احساس تھا کہ جُتے بغیر اور سارا دن انسانوں کا بوجھ کھینچے بغیر اسے کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ وہ چارہ کھا چکی تھی اور کھُر مار مار کر کامے کو بلا رہی تھی۔

کامے کی بیوی دروازے میں پریشان کھڑی تھی۔ کاما کبھی کبھی ایسے ہی غائب ہو جایا کرتا تھا اور وہ جب واپس آتا تو بیوی اس پر غصہ نکال لیا کرتی تھی۔ کامے نے غصے کا جواب کبھی غصے سے نہیں دیا تھا۔ وہ ہنسی مذاق اور پیار سے بیوی کو راضی کر لیا کرتا تھا۔ بیوی رات بھی عتاب میں تھی۔ کاما تانگہ کھول اور گھوڑی کھرلی پر باندھ کر بیوی کو کچھ کہے بغیر چلا گیا تھا۔ رات پولیس نے اُس کے دروازے پر دستک دی تو بیوی یہ سمجھ کر کہ کاما آیا ہے، غصے کو بھی آئی اور دروازہ کھولا تھا، اور جب پولیس تلاشی لے کر نکلی تو تھانیدار نے کامے کی بیوی سے کہا تھا کہ اگر تانگے والے کو پیش نہ کیا گیا تو اُسے پوری دنیا کو پیش ہو جانے پر مجبور کیا جائے گا۔ بیوی تو ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے اور تھانیدار نے گھوڑی بھی ضبط ہو جائے گی۔

کامے کی بیوی باقی رات سو نہیں سکی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑی انتظار کر رہی تھی کہ گھوڑی اور تانگہ لینے پولیس آئے گی یا کاما۔ وہ ڈر بھی رہی تھی۔ اُسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ "کامے نے کیا کیا ہے؟" — یہ سوال اُسے اور زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ کامے نے اُس سے کبھی کچھ چھپایا نہیں تھا۔ سرحد پار جب کاما جلال آباد میں آزادی کی جنگ میں کود پڑا تھا تو اُس کی بیوی اُس کے شب و روز کے ایک ایک لمحے اور ہر ایک کارروائی سے واقف تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کاما صرف نعرہ باز نہیں اور وہ جلسوں جلوسوں میں عام لوگوں کی طرح صرف نعرے لگانے اور جلسوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے شامل نہیں ہوتا بلکہ اس کی زیادہ تر سرگرمیاں زیرِ زمین ہوتی تھیں۔

پولیس اُن دنوں بھی اُس کے گھر دو تین بار آئی تھی۔ وہ سی۔ آئی۔ ڈی تھی۔ کامے کے گھر کی تلاشی اور تربیت ہوتی تھی اور تین بار سی۔ آئی۔ ڈی پولیس نے کامے کی بیوی سے یہی الفاظ کہے تھے — "اُسے کہہ دینا کہ پیش ہو جائے۔ نہیں تو اُس کی گھوڑی اور تانگہ کبھی سرکار ضبط ہو جائے گا" — کاما پیش نہ ہُوا اور اُس کی گھوڑی تانگے کے آگے جُتی ہُوئی گردن اونچی کر کے جلال آباد کی سڑکوں پر دوڑتی رہی تھی۔ کامے نے جب مٹھیوں کے ساتھ ایک انگریز لیفٹیننٹ کو قتل کر کے اس کی لاش زمین میں غائب کر دی تھی تو بھی کامے کی گھوڑی اُن سڑکوں

scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پرچم آج ہندوستان کی سڑکیں کہلاتی ہیں، سر اونچا کر کے بھاگتی دوڑتی رہی تھی — اور اگست ۱۹۴۷ء میں یہ گھڑی اسی طرح گردان تانے پاکستان میں داخل ہوئی تھی۔

کامے کو اُس وقت پولیس گرفتار کرنے آئی تھی تو اس کی بیوی کا سینہ پھیل جاتا اور سر اونچا ہو جاتا تھا۔ سگراب آٹھ ساڑھے آٹھ سال لمبہ پاکستان میں کامے کے گھر پولیس آ کر چلی گئی تو اس کی بیوی کا دل خوف کے شکنجے میں آ گیا۔ پاکستان میں اس کے پیچھے پولیس کے پھرنے کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے کوئی جرم کیا ہے۔ کامے نے بیوی کو بتا رکھا تھا کہ قوم نے جو پاکستان اپنے بچے، اپنی جائیں اور اپنی بچیوں کی عصمتیں قربان کر کے حاصل کیا تھا، وہ پاکستان بہت بڑے خطرے میں آ گیا ہے اور ملک کو اس خطرے سے بچانے کے لیے ایک زمین دوز تحریک شروع کی گئی ہے۔

"اپنے ملک کو دشمن سے بچانے کے لیے جو تحریک شروع کی گئی ہے وہ زمین دوز کیوں؟" — کامے کی بیوی نے اس سے دو چار مرتبہ پوچھا تھا، وہ کہا کرتی تھی — "مرد تو دشمن کو للکارا کرتے اور کھلے میدان میں لڑا کرتے ہیں۔"

کامے نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اس عورت کا ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کرتا تھا جو اُسے کامے بتاتا تھا۔ وہ کہتی تھی — "دو پلے پیسے کا لوہا تو ہم غریبوں کو ہونا چاہیے۔ ان بڑے بڑے لوگوں کو جن کے گھر سونے چاندی سے بھرے ہوتے ہیں، دولت کا ایسا لوہا کیوں ہونے لگا ہے کہ وہ اپنا ایمان اور اپنا وطن بھی دشمن کے ہاتھ بیچ کھائیں۔"

وہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ لوگوں کو ان پڑھ اور بھوکا ننگا اسی لیے رکھا جاتا ہے کہ ان کی سوچ تا ننگے کی گھڑی سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ضمیر کی، ملاوٹ، جرائم، رشوت خوری، لاقانونیت، بے ایمانی وغیرہ کا علاج اسی لیے نہیں کیا جاتا کہ قوم کا بیشتر حصہ ننگے کی گھڑی بن جائے اور اس کے اندر صرف یہ احساس باقی رہ جائے کہ اُس کے جینے کا مقصد صبحانا اور ایسے انسانوں کا بوجھ گھسیٹے پھرنا ہے جنہیں وہ جانتا پہچانتا بھی نہ ہو اور جو دوست دشمن کی تمیز سے محروم ہو۔

کامے کی بیوی کو کامے جوابات زندگی میں نہیں سمجھا سکا تھا وہ اُس نے مر کر سمجھا دی تھی۔ اس کے سوال کا جواب جو کامے کے خون سے لکھا گیا تھا، اُس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی اخبار پڑھ رہی تھی۔

○

گوالوں، ریڑھا اور تانگہ چلانے والوں، خوانچہ فروشوں اور لوگوں کے گھروں میں جھاڑو برتن کرنے والی عورتوں اور درکشاؤں اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں صبح سے آدھی رات تک کام کرنے والے بچوں کی اس بستی کے لوگ کامے کی بیوی کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ بہت سی لڑکیاں بھی اس کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ بعض عورتوں نے اس کے سامنے سے گزرتے پوچھا تھا — "کامے نہیں اٹھا ابھی؟ دروازے میں کھڑی کیا کر رہی ہو؟"

کامے کی بیوی نے کسی ایک کو بھی جواب نہیں دیا تھا، نہ کوئی جواب سننے کے لیے رکا تھا لیکن ماسٹر احمد علی اس کے پاس رُک گیا۔ ماسٹر احمد علی ایک سرکاری سکول میں دوسری جماعت کو پڑھاتا اور رہتا اس آبادی میں تھا۔ اسے اتنے پیسوں میں یہاں ایک جھگی مل گئی تھی جتنے وہ دے سکتا تھا۔ وہ کامے کی بیوی کے پاس رکا۔ اُس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

"کامے کہاں ہے بُوا؟" — ماسٹر احمد علی نے اس سے پوچھا — "اور سُنا ہے رات پولیس آئی تھی تمہارے گھر میں؟"

"نہ یہ پتہ ہے کہ کامے کہاں ہے نہ یہ جانتی ہوں پولیس کیوں آئی تھی" — کامے کی بیوی نے اُداس سے لہجے میں کہا — "کل تانگہ کھول کے چلا گیا تھا، ابھی تک نہیں آیا۔"

ماسٹر احمد علی نے اخبار اپنے سامنے کر لیا اور دیکھنے لگا۔ اُس نے اخبار سے نظریں ہٹا کر کامے کی بیوی کو دیکھا۔ اُس نے ایسے انداز سے دیکھا تھا کہ کامے کی بیوی کو شبہ سا ہوا۔ اُس نے آگے ہو کر اخبار پر نظر ڈالی جیسے وہ اخبار پڑھ سکتی ہو۔ وہ چونکی اور اخبار ماسٹر احمد علی کے ہاتھ سے کھینچ کر غور سے دیکھا۔

"ہائیں!" — اس نے ایک ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ کر کہا — "یہ تو کامے کی تصویر ہے۔ یہ کیسی تصویر ہے ماسٹر جی؟" پھر تو کامے:

"کامے ہی ہے بُوا!" — ماسٹر احمد علی نے آواز میں درد و غم پیدا کرتے ہوئے کہا — "مگر کامے... کامے زندہ نہیں۔ یہ مرے ہوئے کامے کی..."

کامے کی بیوی نے بڑی زور سے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ مار کر اتنی زور سے چیخ ماری کہ اس آبادی کی عمارتوں کے دل بھی دہل گئے ہوں گے۔ عورتیں اور بچے جھگیوں اور چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکانوں اور کوٹھڑیوں سے اُلٹی ہوتی چیخ و پکار گلیوں سے یوں اُمڈ آئے جیسے زمین سے کیڑے مکوڑے نکل آتے ہوں — پھر ہر جگہ سے آوازیں سنائی دینے لگیں:

"کامے کو مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

"اخبار میں تصویر چھپی ہے۔"

"کامے نے دو عورتوں کو قتل کر دیا ہے۔"

"کامے نے کمال کر دکھایا ہے۔"

"کامے نے تانگے والا ڈاکو مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

"بڑا ہی شیر تھا۔"

"بڑا ہی دلیر تھا۔"

"بڑا ہی چور تھا۔"

"اب بیوی اس کی بھیک مانگتی پھرے گی۔"

کامے کی بیوی کے تو جیسے کان بند ہو گئے تھے۔ وہ بار بار اخبار کو پڑھ رہی تھی۔ اُس کے گرد عورتوں کے ہجوم کے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"یہ بے چاری کہاں دھکے کھاتے گی یا رو!" — ماسٹر احمد علی نے کہا — "چلو کسی سے چندہ کریں۔ کامے کی لاش تو لے آئیں۔"

"پولیس خود ہی اطلاع دے دے گی" — آچھی خوانچہ فروش نے کہا — "مجھے معلوم ہے پولیس اطلاع دے گی۔ گھنٹہ ڈیڑھ دیکھو۔ نہ آئی تو میں جاؤں گا۔"

آچھی کو سب معلوم تھا۔ وہ تھا تو غریب سا خوانچہ فروش لیکن پولیس کا مخبر تھا۔

○

اخبار میں جو خبر چھپی تھی، اس نے صرف کامے کی آبادی کو ہی نہیں، سارے شہر میں سنسنی پیدا کر دی تھی،

دو خطرناک مجرم پولیس مقابلے میں مارے گئے

ایک اے۔ایس۔آئی اور دو کانسٹیبل زخمی ہوئے

کل دو بڑے ہی خطرناک مجرم سی۔آئی۔اے کی حراست سے فرار ہو گئے۔ پولیس نے ڈی۔ایس۔پی رجب علی کی قیادت میں ان کا تعاقب کیا۔ دونوں نے فرار اور تعاقب کے دوران یکے بعد دیگرے دو کوٹھیوں میں گھسنے کی کوشش کی لیکن دونوں کوٹھیوں میں رہنے والے بیدار ہو گئے۔ مجرموں نے دونوں کوٹھیوں میں ایک ایک عورت کو قتل کر دیا۔ پولیس کی دی ہوئی مصدقہ اطلاعات کے مطابق ایک مجرم کا نام عبدالجلیل خان تھا جو پولیس کا ریٹائرڈ انسپکٹر تھا اور دوسرے کا نام کرم دین عرف کاما تھا جو جرائم پیشہ دنیا میں کاما تانگے والا کے نام سے مشہور تھا۔

اس سے پہلے یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر عبدالجلیل خان کو ایک ریٹائرڈ اسسٹنٹ سب انسپکٹر عبدالقدیر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی خانہ تلاشی میں اس کے گھر سے دو ریوالور، ایک شاٹ گن، چار خنجر اور ایک بم ایکسپلوسو کا برآمد ہوا تھا۔ انکشاف ہوا تھا کہ فرزند عبدالجلیل خان ملک وطن سرگرمیوں میں ملوث تھا۔

مزید اطلاعات کے مطابق ریٹائرڈ اے۔ایس۔آئی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا عرف کامے کو بھی گرفتار کیا گیا۔ اس کے اقبالی بیان کے مطابق اس نے اور عبدالجلیل خان نے لکھنی کی تین مسلح وارداتیں کی تھیں اور بھارت کے جاسوسوں کے ساتھ بھی ان کا رابطہ رہا تھا۔ کل رات دونوں کو تفتیش کے لیے سی۔آئی۔اے کے ہیڈ کوارٹر میں لے جایا گیا تھا۔ ان کے گروہ نے دونوں کو بڑے ولیرانہ اور ڈرامائی انداز میں پولیس کی حراست سے فرار کرا لیا تھا۔ وہ خطرناک مجرم اس قدر تجربہ کار اور خطرناک تھے کہ انہوں نے پولیس کے تعاقب کی پروا نہ کی اور ایک کوٹھی میں ڈاکہ زنی کے لیے داخل ہو گئے۔ عقیلہ نام کی ایک خاتون کی آواز سن کر ان میں سے ایک نے اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ کر ہلاک کر دیا اور فرار ہو گئے۔ وہ تھوڑی ہی دور ایک اور گھر میں گھس گئے جس میں نسیم نام کی ایک خاتون جاگ اٹھی۔ مجرموں نے اسے بھی خنجر سے ہلاک کر دیا اور دونوں بھاگ گئے۔

پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔ تعاقب کی قیادت ملک رجب علی ڈی۔ایس۔پی کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک زیر تعمیر کالونی میں چھاپہ مار کر مجرموں کو ایک نئے اور خالی مکان گھیر لیا۔ مجرموں نے پولیس پر فائرنگ کی جس سے اے۔ایس۔آئی عمران خان، کانسٹیبل عبدالمجید ورکا کانسٹیبل نذیر حسین زخمی ہو گئے۔ پولیس نے جوابی فائرنگ کی۔ آدھے گھنٹے کے مقابلے میں دونوں مجرم ہلاک ہو گئے۔ سنسنی خیز انکشافات اور مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ سی۔آئی۔اے کے ذرائع نے ہمارے نمائندے کو بتایا ہے کہ دونوں ہلاک شدہ مجرم ڈاکوؤں اور تخریب کاروں کے بڑے ہی منظم اور خطرناک گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

○

پولیس نے رات ہی رات یہ خبر تیار کی اور اسے سچا ثابت کرنے کے لیے شہادت بھی تیار کر لی۔ عبدالجلیل خان ایذا رسانی سے مرا تھا۔ اس کی لاش میں ریوالور کی دو گولیاں فائر کی گئیں۔ وہ گولیاں کامے کی لاش کے پار کی گئیں۔ رات کو ہی ان کے فوٹو تیار کر کے خبر کے ساتھ اخباروں کو دے دیئے گئے۔ ملک رجب علی کو ہیرو بنایا گیا اور اخباروں میں پاکستان کے دشمنوں کے دو دشمنوں کو پاکستان دشمن، ڈاکو اور تخریب کار بنا دیا گیا۔

عبدالجلیل خان اور کامے کے قریبی دوستوں اور رازداروں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ انہیں جو نہیں جانتے تھے وہ اس خبر کو سچ مان گئے۔ ان دونوں کے خلاف پختے ثبوت تھے کہ ایک پولیس انسپکٹر دو چاقو تھا، اس لیے اس کا دو ستارہ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہونا قابل یقین تھا۔ کامے کے متعلق یہی کہہ دینا کافی تھا کہ وہ تانگے والا تھا۔ لہٰذا لوگوں کی نگاہوں میں دونوں ڈکیتی، قتل اور پولیس کی حراست سے فرار کے مجرم تھے۔

اُس وقت تک پاکستان کے وہ سیاسی لیڈر جو اقتدار میں رہ چکے تھے، وہ پاکستان کو پولیس کی ریاست بنا چکے تھے۔ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے مخالفین کو دبائے رکھنا ضروری تھا اور یہ کام پولیس ہی کر سکتی تھی۔ چنانچہ پولیس نے یہ رول ادا کرنا شروع کر دیا تھا اور پولیس کی سن مانی اور سینہ زوری کا محاسبہ عوام بھی کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

یہ خبر عبدالجلیل خان کے گھر بھی پہنچی اور پولیس کے مخبروں نے اُس محلے میں افواہیں پھیلا دیں — اور جب پوسٹ مارٹم میں اس کی چربی چھاڈی ہوئی لاش اس کے گھر پہنچی، اُس وقت تک عبدالجلیل خان بھارت کا جاسوس، ڈکیت، بردہ فروش اور سمگلر بن چکا تھا۔ اُس کا منہ دیکھنے والے ہجوم کے دل میں اس کی محبت نہیں، نفرت کی مسرت کام کر رہی تھی۔ لوگ دیکھنے کو ٹوٹ پڑے کہ جاسوس، سمگلر، ڈکیت اور پولیس مقابلے میں مارے جانے والے آدمی کیسے ہوتے ہیں۔

○

ڈاکے اور قتل کی خبر کے ساتھ یہ ضرور لکھا جاتا ہے کہ سارے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا لیکن اس خبر سے خوف و ہراس نہ پھیلایا۔ لوگ خوش تھے کہ ملک کے خطرناک مجرموں میں دو کم ہو گئے ہیں۔ البتہ ایک آدمی ایسا تھا جس نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تو خوف و ہراس سے اس کا دل ڈوب گیا۔ یہ شخص "آشا بھون" میں رہتا تھا اور وہ ارشد کا باپ تھا۔ اُس نے ارشد کے بڑے بھائی یوسف کو بلایا اور اسے خبر دکھا کر کہا کہ یہ پڑھو۔ یوسف خبر پڑھ چکا تو اُس کے ہونٹوں پر سکراہٹ آ گئی۔

"یہ شخص" — ارشد کے باپ اشفاق احمد نے کامے کی تصویر پر انگلی رکھ کر کہا — "یہ رات میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ قتل کرنے اور قتل ہونے جا رہا ہے۔"

"آپ کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟" — یوسف نے پوچھا۔

"میرا نہیں" — اشفاق احمد نے جواب دیا — "ارشد کا ان کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔"

"ارشد کا؟" — یوسف نے گھبرائی ہوئی حیرت زدہ آواز میں پوچھا — "ان مجرموں کے ساتھ ارشد کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟"

ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان اور کامے تانگے والے کے متعلق ارشد نے اپنے باپ کو بہت کچھ بتا رکھا تھا اور باقی کہانی رات کو کامے سنائی گئی تھا۔ ارشد کے باپ نے یوسف کو یہ ساری کہانی سنائی۔

"دیکھو، اقتدار کی ہوس پاکستان کو کس مقام پر لے آئی ہے" — اشفاق احمد نے کہا۔

iqbalmt@outlook.com Scanned by

"لیکن اس وقت جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اس میں آپ پاکستان کو بھارتی جاسوسوں سے بچانا چاہتے ہیں یا ارشد کو پولیس سے؟" — یوسف نے پوچھا۔ "کیا پولیس کو معلوم ہے کہ ارشد کا بھی اس تحریک کے ساتھ تعلق ہے جو عبدالجلیل نے شروع کی تھی؟"

"میں تمہارے ساتھ یہی بات کرنا چاہتا ہوں۔" — اشفاق احمد نے کہا۔ "ارشد کا اس تحریک کے ساتھ تعلق ابھی ابھی شروع ہوا تھا۔ انہی دنوں جب وہ طاہرہ کے ساتھ چھٹی پر آیا تھا وہ کالے اور عبدالجلیل سے ملا تھا۔ اس نے مجھے ساری تفصیل اور ان لوگوں نے جو پروگرام بنایا تھا بتا دیا تھا۔ رات کو ہا میرے پاس آیا۔ وہ تھا تو جذباتی قسم کا لڑکا لیکن آدمی عقل والا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ ارشد سے میں کوئی اخباروں میں کوئی خبر پڑھ کر وہ عبدالجلیل کے گھر نہ چلا جائے کیونکہ اس محلے میں سی۔آئی۔ڈی کے دو آدمی اور ان کے مخبر گھوم پھر رہے ہوں گے۔ کالا نے کہا تھا کہ اُسے ڈر ہے کہ ارشد جو مرد مجاہد ہے اور جو نیا نیا جوان ہے، وہ ضائع ہو جائے گا۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" — یوسف نے کہا۔ "میرا تو معلوم نہیں کہ پولیس کو ارشد کے متعلق علم ہے یا نہیں۔"

"مجھے خبر کے یہی الفاظ پریشان کر رہے ہیں کہ مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ ان مزید میں ارشد کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ اُس کے ساتھ نہ ٹیلیفون پر بات کرنی چاہیئے نہ تار دینی چاہیئے۔ میں خود راولپنڈی چلا جاؤں۔" — اشفاق احمد نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اِدھر سے آپ روانہ ہوں اور اُدھر سے ارشد خبر پڑھ کر اِدھر آ جائے۔" — یوسف نے کہا۔ "میں یہاں موجود ہوں گا لیکن ہو سکتا ہے وہ میرے قابو میں نہ آئے۔ آج اتوار کل اسٹاف کریں..... اور گھر میں ابھی ذکر نہ کریں۔"

"یہ کیسا رہے گا کہ ارشد کو سمجھا دیا جائے کہ بہت ضروری کام ہے، تار ملتے ہی وہ ایک دن کے لیے آ جائے۔" — ارشد کے باپ اشفاق احمد نے کہا۔

"یہی بہتر ہے۔" — یوسف نے کہا۔ "میں ابھی جا کے تار دے آتا ہوں۔"

"تار گھر کے پتے پر دینا۔" — اشفاق احمد نے کہا۔ "آج چھٹی ہے۔ ارشد دفتر میں نہیں ملے گا۔" — اشفاق احمد نے چھت کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری اور دکھیاری سی آواز میں بولا۔ "کیا بنے گا اس ملک کا! ایسا ملک کیا ہو گا جہاں سب اقتدار پرستی کی لعنت ہے۔ اقتدار کے ہوس کار اپنے ملک بلکہ اپنے مذہب کے دشمنوں سے بھی دوستی سے گریز نہیں کرتے..... یوسف! تم نے کبھی سوچا ہے کہ آدھا پاکستان ہم سے ایک ہزار میل دور ہے اور پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ہمارا بدترین دشمن موجود ہے۔ اگر بنگالیوں نے ہمارے دشمن سے مدد لینے کی سوچ لی تو پاکستان کو بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

"بنگالی اپنے دشمن سے مدد لیں نہ لیں، دشمن انہیں اپنے پروپیگنڈے سے اپنے زیر اثر کر رہا ہے۔" — یوسف نے کہا۔ "بنگالی ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ مغربی پاکستان والے عیش کر رہے ہیں اور مشرقی پاکستان میں عوام فاقہ کشی تک جا پہنچے ہیں۔ اس میں صداقت ہو یا نہ ہو، ہمارا دشمن یہی پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ اس پروپیگنڈے کا ہماری طرف سے عملی طور پر کوئی جواب دیا جا رہا ہے نہ زبانی۔"

"ہمارے حکمرانوں کو اپنے پروپیگنڈے سے فرصت ہو گی تو وہ دشمن کے پروپیگنڈے کا جواب دیں گے۔" — اشفاق احمد نے کہا۔ "اپنی قوم کی جو حالت ہے وہ دیکھ لو اور اخباروں میں جو کچھ چھپتا ہے وہ بھی تم پڑھتے رہتے ہو۔ جن اخباروں کے پردہ سرکاری وظیفے ملتے ہوئے ہیں، ان کی خبروں اور اداریوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں سب خیر ہے اور ہر کوئی خوشحال ہے۔ حکمران اور اس کے وزیروں کی تصویریں اور تقریریں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف اپوزیشن کے اخبار ہیں۔ وہ حکمرانوں کو یہ بتانے کی بجائے کہ اپنے دشمن سے ہوشیار ہو اور دشمن کے ایجنٹ دیمک کی طرح تمہاری بنیادوں میں اتر گئے ہیں، وہ پاکستان کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر شرم آتی ہے۔ وہ ملی جذبے اور وقار کی، ملک و ملت کے دشمن اور اس کے عزائم کی، پاکستان کے معاشی استحکام کی اور عالمی سیاست میں پاکستان کی پوزیشن کی بات نہیں کرتے۔ ان کا مشن صرف یہ ہے کہ قوم کو برسر اقتدار پارٹی کے خلاف اکسایا جائے اور ملک میں ذہنی انتشار پیدا کر کے حکمران پارٹی کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں۔"

"دیانتدار اور مخلص نہ حکومت کرنے والے ہیں نہ ان کے مخالفین۔" — یوسف نے کہا۔ "آپ دیکھ لینا کہ یہی واقعہ جس میں عبدالجلیل اور کالا مارے گئے ہیں، اپوزیشن کی پارٹیوں کے لیے تقریروں اور بیانوں کا موضوع بن جائے گا۔ ان کے حامی اخبار اسے خوب اچھالیں گے اور حکمرانوں کے اخبار تردیدیں اور مزید چھوٹ شائع کرتے رہیں گے۔ نہ برسر اقتدار پارٹی ضرورت سمجھے گی نہ اپوزیشن والے اس پر زور دیں گے کہ غیر جانبدار کمیٹی یا کوئی ٹریبونل اور ائی کورٹ کا کوئی جج تحقیقات کرے کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا۔"

"اس کا فائدہ ہمارے دشمن کو مل رہا ہے۔" — اشفاق احمد نے کہا۔ "یہ دو عورتیں، عقیلہ اور نسیم جنہیں اخباروں نے خواتین لکھا ہے، بھارت کی جاسوس تھیں۔ مجھے ارشد نے بتایا تھا اور رات مجھے کالا نے بتایا تھا۔ وہ انہی کو قتل کر کے جا رہا تھا۔ میں اُسے روک نہ سکا۔ وہ میری اس دلیل کو سمجھنے کی ذہنی حالت میں نہیں تھا کہ ایک یا دو سانپوں کو مار ڈالنے سے سارے سانپ نہیں مر جاتے۔ اس بل کو بند کرنا چاہیئے جہاں سے سانپ بل بل کر نکل رہے ہیں۔"

"لیکن ابا جان!" — یوسف نے کہا۔ "جسے سانپ نظر آ جاتا ہے وہ تو اُسے مارتا ہی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ سانپ کہاں سے آیا ہے..... یہاں تو آستینوں میں سانپ پالے جا رہے ہیں۔"

"اور یوسف!" — اس کے باپ نے کہا۔ "تم ارشد کو کہاں سے آنے دو گے؟"

○

راولپنڈی میں طاہرہ اپنے باپ جمال بیگ کے ساتھ جسے ہر کوئی جنرل بابا کہتا تھا، اسی کوارٹر میں رہتی تھی جو سکول کی طرف سے جمال بیگ کو ملا ہوا تھا۔ اس کوارٹر میں اخبار کبھی نہیں آیا تھا۔ طاہرہ نے آ کر اخبار جاری کرا لیا تھا۔ اُسی صبح اخبار والا اخبار پھینک گیا تھا لیکن نہ طاہرہ نے اخبار کھول کر دیکھا تھا نہ جمال بیگ نے چھٹی کا دن تھا۔ طاہرہ زیادہ دیر سے اٹھی تھی۔ ارشد اور عفت کا بیٹا طاہر پرویز جو طاہرہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا، طاہرہ کے ساتھ رہتا تھا۔ ارشد ان سے دور اپنے ایک نوکر کے ساتھ کوارٹر کے مکان میں رہتا تھا۔

طاہرہ نے ناشتہ تیار کیا۔ اس کے طاہر پرویز کو نہ جگایا۔ اپنے باپ کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کے باپ کی ذہنی کیفیت اکھڑی اکھڑی سی ہے۔ وہ اپنے آپ کو طاہرہ کی ماں کا قاتل سمجھتا تھا۔ اُس نے لوگوں کے بچوں کے پیار سے گناہ کے اس احساس کو تسکین دے لی تھی لیکن طاہرہ اس کے سامنے آئی تو گناہ کا احساس پھر سے بیدار ہو گیا۔ طاہرہ اور بچہ اسے بار بار چھوڑ چکی تھیں کہ وہ اس احساس سے آزاد ہونے کی کوشش کرے لیکن وہ زندگی کی راہ سے ہٹتا جا رہا تھا۔ اس صبح ناشتے کے وقت بھی طاہرہ نے اُسے جس ذہنی کیفیت میں دیکھا،

iqbalmt@onepurdu.com scanned by

"ابا جان!" — طاہرہ نے مسکرا کر پوچھا — "رات نیند نہیں آئی آپ کو؟"

"نیند تو بڑی گہری آئی تھی بیٹا!" — جمال بیگ نے کہا — "لیکن نیند میں بھی بیدار رہا ہوں" — اُس نے آہ بھری اور کہا — "رات تمہاری ماں آئی تھی" — اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اُداسی اور زیادہ گہری ہو گئی۔ دھیمی سی آواز میں بولا — "مجھے شرمسار کرنے آجاتی ہے:"

"کیا کہتی تھیں میری امّی؟"

"جب آتی ہے ایک بات ضرور کہتی ہے" — جمال بیگ نے کہا — "کہتی ہے، بیٹی تھی نہ وہ بیٹی جو تجھے اچھی نہیں لگی تھی اور تو نے میری جان لے لی۔ دیکھ لی وہ بیٹی! میرے سو بیٹے ہوتے تو اس ایک بیٹی پر قربان کر دیتی۔ اب دل میں اس کا پیار بسا لے اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر:"

"ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "اپنا وعدہ بھول گئے ہیں آپ؟..... آپ نے کہا تھا کہ تمہاری خوشیوں کی خاطر میں زہر کا پیالہ پی لوں گا۔ میں آپ کو اس کیفیت میں دیکھتی ہوں تو میری خوشیاں پامال ہو جاتی ہیں۔ آپ میری امّی کو دیکھنا چھوڑ دیں۔ مجھے دیکھا کریں:"

"کاش! میں نہیں دیکھتا" — جمال بیگ نے آہ بھر کر کہا — "اگر تم میری بیٹی نہ ہوتیں تو میں تم سے اتنی محبت کر جاتا جہاں تمہارا تصور بھی پہنچ نہ سکتا۔ تمہارے پیار نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور تمہارا پیار مجھے میرے گناہ کی سزا دے رہا ہے۔ میں اس سزا سے نہیں بھاگوں گا۔ یہ پیار مقدس ہے۔ میں نے اسے قبول کر لیا ہے۔ تم کہو گی کہ جلتی آگ میں کود جاؤ تو میں کود جاؤں گا طاہرہ بیٹی!"

"لیکن آپ تو مجھے جلتی آگ میں پھینک رہے ہیں" — طاہرہ نے اپنی مخصوص شوخی سے کہا — "آپ کو اس حالت میں دیکھ کر میں کس طرح خوش رہ سکتی ہوں؟"

جمال بیگ چونک اُٹھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ایسا نہ کہو طاہرہ بیٹی!" — اس نے کہا — "جس آگ کے شعلے تمہیں جلانے کو لپکیں گے انہیں میں اپنے خون کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کر دوں گا..... میں جس حالت میں بھی ہوں گا، تم پریشان نہ ہوا کرو۔ تم پر آنچ بھی آئے گی تو میری ذات کے ٹکڑے کر دی جائے گی۔ میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا ہوں۔ اپنے آپ سے بھاگتا رہا ہوں۔ مگر تم نے آ کر مجھے سیاق و سباق بنا دیا ہے۔ مجھے میری ذات کے کھنڈروں میں بند کر دیا ہے:"

"آپ ایک بڑی خوبصورت اور بڑی پختہ عمارت ہیں ابا جان!" — طاہرہ نے کہا — "آپ میری پناہ ہیں:"

جمال بیگ کی فکریں طاہرہ کے چہرے پر چھم گئیں اور اُس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ طاہرہ کا جواں سال اور حسین چہرہ نوزائیدہ دکھی کا چہرہ بن گیا جیسے دائی نے ابھی دھویا بھی نہ ہو۔ جمال بیگ کو ایک گرج سنائی دی — "اے جاسس! بچی کو سیال سے" — یہ کسی درندے کی دھاڑ تھی — یہ جمال بیگ کی اپنی آواز تھی — پچیس سال پرانی آواز — آج وہی آواز اسے سنائی دی تو وہ تڑپ اُٹھا۔ اُس نے پہلے تو بڑی آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھا کر طاہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب اپنے ذہن میں ماضی کی صدا سنی بازگشت سن کر اُس نے جھپٹا مار کر طاہرہ کا ہاتھ، دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

طاہرہ نے اُس کا چہرہ دیکھا تو گھبرا گئی۔ جمال بیگ کے چہرے پر خونخواری کا بھیانک تاثر تھا۔ اس کی آنکھیں اُبل آئی تھیں۔

"کیا ہوا ابا جان؟"

"کس نے کہا تھا، جاسے جاسس بچی کو یہاں سے؟" — جمال بیگ کے ڈراؤنے سے لہجے میں پوچھا۔

"ابا جان؟" — طاہرہ اُٹھ کھڑی ہوئی — "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

جمال بیگ نے طاہرہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"اب میری بچی کو کوئی نہیں لے جا سکتا" — جمال بیگ نے کہا — "میں اپنی بچی کی خوشیوں کی خاطر زہر کا پیالہ پی لوں گا:"

جمال بیگ کی ذات اور شخصیت دو متضاد حصّوں میں بٹ گئی تھی۔

○

دروازے کی دستک نے اُسے بیدار کر دیا۔ وہ طاہرہ سے کہہ کر کہ تم بیٹھو، میں دیکھتا ہوں کون ہے، ارشد ہی ہو گا، دروازہ کھولنے چلا گیا۔

وہ ارشد ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اچھی خبر نہیں لایا۔

"تم نے اخبار پڑھا ہے طاہرہ؟"

"کیا ہوا؟" — طاہرہ نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا — "میں نے تو ابھی اخبار دیکھا ہی نہیں۔"

"محمد اکمل خان اور کامریڈ میں مقابلے میں بدلے گئے ہیں" — ارشد نے کہا اور اخبار اس کے آگے کرتے ہوئے بولا — "یہ خبر پڑھو..... پڑھو یہ جھوٹ:"

طاہرہ خبر پڑھنے لگی۔ جمال بیگ بھی اُس پر جھک کر پڑھنے لگا۔ ارشد کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ طاہرہ کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ خبر پڑھ کر اُس نے خالی خالی نظروں سے ارشد کو دیکھا۔

"کس نے تمہیں بتایا تھا کہ کھیلا اور نسیم ہندو والا کیا ہیں:" — ارشد نے کہا — "عبدالکمل اور کامے نے دونوں کو قتل کر دیا ہو گا:"

"اس سے پہلے تم نے بتایا تھا کہ ایک رپٹائر تھانیدار عبدالقدیر قتل ہو گیا ہے" — طاہرہ نے کہا — "تم کہتے تھے وہ تمہارا آدمی ہے۔ پھر خبر آئی تھی کہ اُسے عبدالکمل نے قتل کیا ہے:"

"یہ بھی بتا نہیں سکتا یہ کیا معاملہ ہے" — ارشد نے کہا — "میں ابھی لاہور چلا جاتا ہوں۔ وہیں سے کچھ پتہ چلے گا۔ رات کی گاڑی سے واپس آجاؤں گا:"

"نہ جاؤ ارشد!" — طاہرہ نے التجا کے لہجے میں کہا — "پولیس تک تمہارا نام بھی پہنچ چکا ہو گا۔ یہ سب ایک ڈرامہ ہے جو پولیس کے لئے بنایا ہے:"

"بات کیا ہے؟" — جمال بیگ نے پوچھا۔ وہ جیسے بیدار ہو گیا تھا۔ کہنے لگا — "بیٹھ جاؤ ارشد بیٹا! اتنا جذباتی ہو کر فیصلہ نہ کرو۔ کچھ مجھے بھی سمجھاؤ:"

ارشد نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ عبدالکمل خان کون تھا، کامریڈ کون تھا اور عبدالکمل نے بھارتی ایجنٹوں کے خلاف ایک تحریک شروع کی تھی۔ ارشد نے اس تحریک کے اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل بھی بتایا اور اُس نے اپنے متعلق بھی بتایا کہ وہ اس تحریک میں کس طرح شامل ہوا تھا۔ جمال بیگ انہماک سے سنتا رہا اور اس کے ماتھے پر شکن پڑتے گئے۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"لاہور نہ جا، ارشد بیٹا!" — جمال بیگ نے کہا — "کچھ کیے بغیر پکڑے جاؤ گے۔ چند دن انتظار کرو معلوم ہوتا ہے تم لوگوں نے عقل سے نہیں جذبات سے کام لیا ہے۔ جوش میں آ کر کسی تحریک کی بنیاد رکھ لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل کام اسے کامیابی سے چلانا ہے جو عقل اور احتیاط کے بغیر ممکن نہیں:"

iqbalmt@onepurdu.com Scanned by

جمال بیگ نے ارشد کو قائل کر لیا کہ وہ لاہور نہ جائے اور دن اُسی کے گھر گزارے۔

o

اُس وقت پاکستان کا دارالحکومت کراچی میں تھا اس لیے دوسرے ملکوں کے سفارت خانے بھی کراچی میں تھے۔ اُس صبح کی خبر نے کراچی میں بھارت کے سفارت خانے کو ہلا کر رکھ دیا جیسے شدید زلزلہ آیا ہو۔ بھارت کی دو ڈپلومیٹک کاریں ماری گئی تھیں۔ اور بھارتی سفارت خانے کے لیے دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ پاکستان میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو جاسوسوں کے خلاف سرگرم ہے۔ بھارت کے ڈی کشنر کو ایک گھنٹے کے اندر اندر لاہور سے ذریعہ ٹیلیفون تفصیلی اطلاع مل گئی تھی کہ اس پولیس مقابلے کی اصل حقیقت کیا تھی۔ اُس نے اپنے سٹاف کے اُس آدمی کو بلایا جس کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ تھا۔ پاکستان میں بھارت کے جو جاسوس اور ان کے جو پاکستانی ایجنٹ تھے ان کی ہدایت کاری، دیکھ بھال، ان سے رپورٹیں لینے کا کام اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے دیگر امور جو بھارت کے کام آ سکتے تھے، ان سب کی ذمہ داری اس آدمی جی۔ بی سی ورما کی تھی۔

ہر ملک میں ہر ملک کا سفارت خانہ ہوتا ہے اور ہر سفارت خانہ جاسوسی کا اڈہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھارت کا سفارت خانہ تو خاص طور پر جاسوسی کا بڑا ہی سرگرم مرکز تھا۔ یہاں سے دولت تقسیم ہوتی تھی۔ یہاں سے وفاداریوں کے ایمان کا نیلام گھر تھا۔ یہاں پرانے اور قابلِ اعتماد ایجنٹوں کے ذریعے نئے ایجنٹ بھرتی کیے جاتے تھے۔ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے ایمان کی قیمت سب سے زیادہ تھی۔ ان کے ذریعے یہ کام تھا کہ اپنے عوام میں ذہنی انتشار اور ذہنی عیاشی پیدا کرتے رہیں۔ وہ پمفلٹ اور سنسنی خیز کہانیوں میں ہندو ازم اور بھارت کا پرچار کرتے رہیں۔ پاکستانیوں کے عسکری جذبے کو نہ اُبھرنے دیں۔ اس قسم کے کچھ اور کام بھی تھے جو فلمکار اور صحافیوں کے ذمے تھے۔

دوسرا گروہ جاسوسوں کا تھا جن میں اسلامی نام سے ہندو بھی تھے اور پاکستان کی سرکاری شعبوں کے اہل کار بھی تھے۔ ان میں اُس افسر شاہی کے کچھ لوگ بھی پائے جاتے تھے جو اقتدار میں آنے والے ہر سیاسی لیڈر پر اپنا طلسم طاری کر کے داخلہ اور خارجہ پالیسیاں بناتے اور سن مانی کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے پاکستان کا کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔

اس گروہ میں دو سیاسی اور مذہبی لیڈر بھی تھے جو آزادی سے پہلے دو قومی نظریہ اور پاکستان کے مخالف تھے مگر اب پاکستان کی سیاست کی قیادت ان کی مٹھی میں تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی نعرہ لے کر ملک میں ہنگامے کراتے رہتے تھے۔ انہوں نے لوگوں پر اپنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور وہ طلبا کو سیاسی ہنگاموں میں استعمال کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے سٹوڈنٹ لیڈر پیدا کیے اور انہیں بے دریغ رقمیں دیتے تھے۔ یہ کثیر رقمیں بھارت کے سفارت خانے سے آتی تھیں۔ روس اور امریکہ کے سفارت خانے بھی پاکستان کے سٹوڈنٹ لیڈروں کو اپنے مقاصد کے لیے بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے۔

طلبا میں سیاست کے جراثیم اور ان کے اپنے لیڈر پیدا کرنے کا فائدہ پاکستان کے دشمن کو یوں پہنچا کہ وہ نوجوان جنہیں پاکستان کا وارث اور پاسبان بننا تھا وہ تخریب کار بن گئے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے کو وہ اقتدار پرستی کی سیاست کے استعمال کی چیز سمجھنے لگے اور خود بخود نہ شعوری طور پر دشمن کے استعمال کی چیز بن گئے۔ لیڈروں نے ان کے منہ میں نعرے بھی دیئے، پیسے بھی دیئے اور انہیں خنجر، چاقو اور ریوالور بھی دیئے۔

اس طرح پاکستان میں بھارتی سفارت خانہ ہندوؤں کی اُس دیوی کی مانند تھا جس کے بیشمار ہاتھ ہیں۔ یہ ہاتھ پاکستان کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے تھے اور پاکستان کے حکمران سیاست کے میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔

o

پاکستان میں بھارت کے ڈی کشنر نے اپنے سٹاف کے انٹیلی جنس کے افسر کو اور وہ اور افسروں کو بلایا اور انہیں یہ خبر سنائی کہ لاہور میں راوھا اور کرن (اسلامی نام نسیم اور جمیلہ) قتل ہو گئی ہیں۔

"اس سے پہلے ہمارا ایک پاکستانی ایجنٹ عبداللہ قتل ہو گیا تھا"۔۔۔ ڈی کشنر نے کہا۔۔۔ "اُس کا قاتل ایک ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس عبدالجلیل خان پکڑا گیا تھا۔ اب خبر آئی ہے کہ اُس کے ساتھ ایک تانگے والا بھی تھا۔ راوھا اور کرن کو بھی انہوں نے ہی قتل کیا ہے اور دونوں قاتل اتنے دلیر اور تجربہ کار تھے کہ وہ پولیس کی حراست سے فرار ہوتے اور انہوں نے پولیس کا مقابلہ کیا اور مارے گئے"۔

"عبدالجلیل خان ہماری دونوں لڑکیوں کے قتل میں شامل نہیں تھا"۔۔۔ انٹیلی جنس کے جی۔ بی۔ سی ورما نے کہا۔۔۔ "وہ دو سیاستدانوں کی ذاتی دشمنی کا شکار ہوا ہے۔ وہ دونوں آدمی چوہدری اکرم اور مہراللہ بخش ہیں۔ البتہ عبدالجلیل خان نے ہماری انٹیلی جنس کے خلاف ایک گروہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن عبداللہ دیر نے اس سے یہ راز لے لیا اور اس کی سکیم بھی معلوم کر لی"۔

جی۔ بی۔ سی ورما نے اس واقعہ کے متعلق اور اس کے ساتھ جن افراد کا تعلق تھا، مکمل معلومات دیں جیسے وہ ذاتی طور پر اس ایک ایک کو جانتا ہو اور وہ اس واقعہ کا عینی شاہد ہو، حالانکہ وہ کراچی میں تھا مگر اس کی آنکھیں پاکستان کے دور دراز اور اندھیرے گوشوں کے اندر جھانک رہی تھیں۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں ہمارے خلاف کوئی تحریک چل رہی ہے"۔۔۔ ڈی کشنر نے کہا۔۔۔ "جس یہاں کے لوگوں کی اس تحریک کو ہم ختم کرنا ہے۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ یہ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر سیاست دانوں کے ساتھ ذاتی دشمنی کا شکار ہوا ہے، یہ بہت اچھی بات ہے۔ ان لوگوں کو آپس میں ٹکرا تے رہو..... اس واقعہ کے متعلق مزید چھان بین کریں اور مجھے بتائیں کہ اس واقعہ میں کون کیا تھا اور آئندہ کیسے کس طرح بہتر طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ کو آپ کے فرائض یاد دلاؤں لیکن میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو ایک بار پھر بتا دوں کہ اپنے آپ کو صرف افسر نہ سمجھیں۔ اپنے آپ کو صرف سفارت کار بھی نہ سمجھیں۔ آپ بھارت کے سپوت ہیں۔ اس حقیقت کو مت بھولیں کہ پاکستان مسلمان قوم کی سیاسی غنڈہ گردی کا نتیجہ ہے۔ یہ بھارت کا حصہ ہے اور اسے ہر جائز اور ناجائز طریقے سے بھارت میں شامل کرنا ہے"۔

"بھارت نہیں"۔۔۔ ایک ہندو افسر نے کہا۔۔۔ "اسے بھارت کہیں"۔

"ہاں اسے بھارت"۔۔۔ ڈی کشنر نے کہا۔۔۔ "جس میں اُدھر برما، ادھر افغانستان اور دہلی اور فرات تک اسے بھارت ہے، جو ہندو پاکستان کے وجود کو تسلیم کرے گا اُسے ہندوستان سے خارج کر دیا جائے گا۔ ہر بھارتی کی عزت ہمیں اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی عزت سے زیادہ عزیز ہے..... ہماری حکومت پاکستان کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف رہتی ہے لیکن ہمیں یہ کمال کرنا ہے کہ فوج کے بغیر پاکستان کو ختم کر دیں"۔

by iqbalmt@yahoo.com Scanned

"اپنی سکیم پر مزید بحث کی ضرورت نہیں"۔۔۔ جی۔ سی۔ وما نے کہا۔ "ہمیں پاکستان کو اس قدر کمزور کرنا ہے کہ جب ہماری فوج پاکستان پر حملہ کرے تو پاکستان کی فوج چند دنوں میں ہتھیار ڈال دے۔ مشرقی پاکستان میں ہم نے زمین کے نیچے قدم جما لیے ہیں۔ ادھر بھی ہم کامیابی حاصل کر لیں گے۔ اس میں وقت لگے گا لیکن ہم فتح حاصل کر لیں گے"۔

بھارتی سفارت خانے میں بہت دیر پاکستان کی تخریب کے منصوبے پر بحث مباحثہ ہوتا رہا اور بات پھر عبدالجلیل خان اور کامے تک آ نکلے۔ اور پولیس مقابلے پر آ گئی۔ بھارتی ہائی کمشنر نے کہا کہ سارے پاکستان میں اپنے آدمیوں کو خبردار کر دو کہ زمین کے نیچے چلے جائیں اور اگلے حکم کا انتظار کریں۔

○

ارشد ابھی جمال بیگ اور طاہرہ کے ساتھ ہی تھا۔ اس کا بیٹا طاہر پرویز جاگ اٹھا تھا۔ وہ اپنے باپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ ارشد اُس کے ساتھ جنسی مذاق کرے گا۔ کھیلے گا مگر ارشد اور طاہرہ کو اُس نے اُداس اور پریشان دیکھا۔ وہ بھی سہم گیا۔ جب ارشد نے اسے کہا کہ جاؤ بیٹا پڑھ لو۔ پھر ہمارے پاس آنا تو اسے بہت ہی مایوسی ہوئی تھی۔ ارشد اور طاہرہ کو عبدالجلیل خان اور کامے کی موت کا نہیں ایک تحریک کی موت کا غم تھا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ وہ سب کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ ارشد کا نوکر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں تار تھا۔ نوکر تار دیتے ہی دوڑا آیا۔ ارشد نے تیزی سے تار کھولا۔ اس کے بھائی یوسف کا تھا لکھا تھا۔۔۔

"فوراً آؤ۔ بہت ضروری کام ہے"۔

"کیا کام ہو سکتا ہے؟"۔۔۔ طاہرہ نے پوچھا۔

"میرے بغیر گھر کا کوئی کام کبھی نہیں رُکا"۔۔۔ ارشد نے کہا۔ "کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے"۔

کھانا کھا کر وہ اپنے گھر گیا۔ درخواست لکھ کر نوکر کو دی اور اُسے کسی کام بہانے کالج کے مختلف دفتروں میں اُسے درخواست دے آئے۔ وہ لاہور کو روانہ ہو گیا اور رات نو بجے لاہور اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کے لباس کا باپ اور بڑا بھائی یوسف اُسے الگ لے گئے۔

"تم نے آج کے اخبار دیکھے ہیں؟"۔۔۔ ارشد سے اس کے باپ نے پوچھا۔

"مجھے پہلے یہ بتاتے کہ وہ ضروری کام کیا ہے جس کے لیے آپ نے مجھے بلایا ہے؟"۔۔۔ ارشد نے پوچھا۔ "آپ نے میرے کان میں کہہ دیا تھا کہ میں ابا اور بھائی کے سامنے اس کام کی بات نہ کروں۔ اب آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں نے آج کے اخبار دیکھے ہیں یا نہیں۔۔۔۔ ہاں دیکھے ہیں۔ عبدالجلیل خان اور کامے پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔ اس کے سوا میں نے اخباروں میں اور کچھ نہیں پڑھا"۔

"ہم نے تمہیں اسی سلسلے میں بلایا ہے"۔۔۔ ارشد کے باپ اشفاق احمد نے کہا اور اُسے بتایا کہ رات کامے کا سالا آیا تھا اور وہ کیا کچھ بتا گیا ہے۔۔۔ "عبدالجلیل خان اور کامے کو قتل کیا گیا ہے۔ کوئی پولیس مقابلہ نہیں ہوا۔ تم نے خبر کے آخری الفاظ پڑھے ہوں گے کہ مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ کامے کو صرف یہ کہنے آیا تھا کہ عبدالقدیر نے عبدالجلیل کا دوست بن کر اُس سے سارا بھید لے لیا اور اُس نے تمہارا نام بھی ظاہر کر دیا ہو گا۔ عبدالقدیر کو کامے نے قتل کیا تھا۔ کامے کو مجھے سختی سے کہنا پڑا ہے کہ ارشد سے کہنا کہ وہ اُس کے اور عبدالجلیل

کے گھر سے دُور رہے ورنہ پکڑا جائے گا اور پاکستان کے لیے کچھ کیے بغیر مارا جائے گا"۔

"ہمیں یہ ڈر تھا کہ تم خبر پڑھتے ہی آ جاؤ گے"۔۔۔ ارشد کے بڑے بھائی نے کہا۔ "اور تم سیشن سے سیدھے عبدالجلیل کے گھر نہ چلے جاؤ۔ ہم نے تمہارا اس لیے بلایا تھا کہ تم ضروری کام کا پڑھ کر پہلے گھر آؤ"۔

"کیا آپ مجھے گرفتاری سے ڈرانا اور بچانا چاہتے ہیں؟"۔۔۔ ارشد نے کہا۔ "کیا ہم نے پاکستان اس لیے بنایا تھا کہ پاکستان بنانے والے مشتبہ اور مجرم بنائے جائیں اور یہ ملک اقتدار پرستوں کا اکھاڑہ اور ہندوستانی جاسوسوں کا گھر بن جائے؟"

"جذبات سے نکلو ارشد!"۔۔۔ باپ نے کہا۔ "تحریکیں جذبات سے نہیں چلا کرتیں عقل سے کام لو۔ میں تمہیں پاکستان کے لیے مرنے سے نہیں روک رہا۔ میں تم جیسے دس بیٹے پاکستان پر قربان کرنے کی ہمت رکھتا ہوں لیکن میں تمہیں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تم ہندوستان کے جاسوسوں کی بات کر رہے ہو۔ ہندوستان کے جاسوسوں سے اور ہندوستان کی فوج سے کون ڈرتا ہے؟ ڈر اپنوں کا ہے۔ قرآن کی سرزمین کے دشمن خود وہ ہیں جو ہر تقریر میں قرآن کے حوالے دیتے ہیں۔ دشمن چنگاری پھینکا کرتا ہے، اپنے ہوا دیتے ہیں۔ ہمیں ان اپنوں کے خلاف محاذ بنانا ہے۔ لوگوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنی ہے۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ کوئی تحریک ایک دن یا ایک مہینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے تمہارے عزم کی تکمیل تمہارا بیٹا جوان ہو کر کرے"۔

"ابا آپ دیکھ نہیں رہے کہ۔۔۔؟"

"ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں"۔۔۔ ارشد کے باپ نے اُسے آگے بولنے نہ دیا۔ "جذبات سے نکلو۔ جذبے کو زندہ رکھو۔ اپنے جذبے اور اپنی روایات کو اپنے بچے کے سینے میں ڈال دو۔ ابھی سے اُسے بتاؤ کہ ہم نے پاکستان کی کیا قیمت دی تھی اور آزادی کی کیا قیمت ہے اور ہمارا دشمن کون ہے"۔

"ابا! عبدالجلیل خان اور کامے جیسی کارروائیاں اور باتیں کرو گے تو تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے"۔۔۔ ارشد کے بڑے بھائی نے کہا۔ "ہمارے ملک میں دو قسم کے مجرم ہیں۔ ایک ہندوستانی جاسوس ہیں اور دوسرے جاسوس اپنے ملک کے ہیں۔ یہ اپنے ملک کی نہیں بلکہ ہر اس حکمران کی اپنی جنس ادھی آتی ہے۔ ڈوبی ہے جو اقتدار میں آتا ہے۔ یہ اپنی جنس اپنے ملک کے دشمنوں کو نہیں اپنے حکمران کے دشمنوں کو پکڑتی ہے۔ یہ دو طرح کے جاسوس تمہارے گرد و کے ایک ایک فرد کو چن چن کر مارتے چلے جائیں گے"۔

رات گزرتی جا رہی تھی اور ارشد کا باپ اور اُس کا بھائی اُسے جذباتیت سے نکالنے اور تلخ حقائق کی طرف لانے کے لیے بولتے چلے جا رہے تھے۔ ارشد پر یہ دلیلیں اثر کر گئیں مگر یہ خطرہ موجود تھا کہ پولیس کی فہرست میں ارشد کا نام بھی ہو گا۔

○

ارشد چار روز کی چھٹی آیا تھا۔ اُس نے یہ دن گھر میں ہی گزارے۔ اُس کی چھٹی کی آخری رات تھی۔ ڈیڑھ بجے تھے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ یوسف باہر گیا اور گھبرایا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں گیا۔

"کون ہے؟"۔۔۔ باپ نے پوچھا۔

"ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی"۔۔۔ یوسف نے سرگوشی کی۔۔۔ "پولیس مقابلے کا ہیرو۔۔۔ ارشد کو ادھر اُدھر کر دیں؟ اس وقت اُس کے آنے کا مطلب ہی کیا ہو سکتا ہے؟"

iqbalmt@yahoo.com Scanned by

"نہیں" — ارشد کے باپ اشفاق احمد نے اٹھتے ہوئے کہا — "میں اُسے جانتا ہوں. اُس وقت سے جانتا ہوں جب یہ اسے . ایس . آئی تھا."

اشفاق احمد باہر گیا اور رجب علی سے بغلگیر ہو کر ملا.

"ارشد غالباً راولپنڈی ہوتا ہے" — ڈی . ایس . پی رجب علی نے پوچھا.

"تم اندر آؤ یار!" — اشفاق احمد نے بے تکلفی سے کہا — "مجھے معلوم ہے تم ارشد کے لیے آئے ہو."

وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے. اشفاق احمد اُس کے ساتھ ہنس ہنس کر اور کچھ خوشامدانہ لہجے میں باتیں کر رہا تھا مگر رجب علی اتنا سنجیدہ تھا کہ چہرے پر سنجیدگی کرب کا تاثر بن گئی تھی. اشفاق احمد نے جب اپنی ہنسی اور خوشامد کو ائیگاں جاتے دیکھا تو خاموش ہو گیا. کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی جسے اشفاق احمد نے توڑا.

"ملک صاحب!" — اشفاق احمد نے کہا — "میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو میں ابھی تک اپنا دوست سمجھتا رہا جب آپ اے . ایس . آئی ہوا کرتے تھے. میں بھول گیا تھا کہ آپ ڈی . ایس . پی ہیں اور میرے بیٹے کو گرفتار کرنے آئے ہیں."

ملک رجب علی نے اُس کی طرف دیکھا پھر اُس کا سر جھک گیا. اس نے جب سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور اُس کے چہرے پر کرب کا تاثر زیادہ نمایاں ہو گیا تھا.

"ملک صاحب!" — اشفاق احمد نے کہا — "بھول جائیں کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی جانتے پہچانتے بھی تھے. پانچ فرض ادا کریں. صاف بات یہ ہے کہ اشفاق میں تمہارے بیٹے کو گرفتار کرنے آیا ہوں."

رجب علی اور زیادہ بے چین ہو گیا. اُدھر دوسرے کمرے میں یوسف ارشد سے کہہ رہا تھا کہ ہم جس بات سے ڈرتے تھے وہی ہو گئی ہے. خبر میں ہیں ڈی . ایس . پی کا نام آیا تھا، وہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا ہے. وہ تمہاری پوچھ رہا ہے.

"میں اُس کے سامنے ہو جاتا ہوں" — ارشد کے اٹھتے ہوئے کہا.

"نہیں" — یوسف نے کہا — "پہلے دیکھ لو ابا جان کیا کرتے ہیں."

"بھائی جان!" — ارشد نے کہا — "میں اپنے باپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا. وہ اس ڈی . ایس . پی کی خوشامد کر رہے ہوں گے. اسے کہہ رہے ہوں گے کہ جو لینا ہے لے لو میرے بیٹے کو گرفتار نہ کرو. میں اپنے باپ کا سر نیچے نہیں ہونے دوں گا" — اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم میں چلا گیا.

"یہ ہے میرا شیار ارشد!" — اشفاق احمد نے رجب علی سے کہا — "مجھے وارنٹ گرفتاری دکھاؤ اور اسے لے جاؤ."

"چوہدری اشفاق!" — ڈی . ایس . پی نے دبے دبے سے لہجے میں کہا — "آپ عقل والے انسان ہیں، آپ خاندانی ہیں. مجھے پوری امید ہے کہ آپ میرے جذبات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں.... چھوڑو جاؤ ارشد.... چوہدری اشفاق! میں آیا تو ارشد کے لیے ہوں لیکن میں اپنے ایک گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں. پولیس بڑا ہی بدنام محکمہ ہے لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ پولیس والے انسان ہوتے ہیں. ہم سے وہ کچھ کرایا جاتا ہے جو ہم نہیں کرنا چاہتے. ہماری ٹریننگ کچھ اور ہوتی ہے لیکن ہمیں فرائض کچھ اور بتاتے جاتے ہیں:

"ملک رجب علی!" — اشفاق احمد نے کہا — "ایسی تمہید کی کیا ضرورت ہے. اس سے مجھے پریشانی اور کوفت ہو رہی ہے. میرا بیٹا حاضر ہے."

"چوہدری اشفاق! خدا بھی حاضر ہے" — ملک رجب علی کی آواز میں جان آ گئی. اس نے کہا — "آپ میرے خاندان کو جانتے ہیں. آپ کو میرا باپ یاد ہو گا. ملک اختیار خان کو سارا مشرقی پنجاب جانتا تھا. اس کی جاگیر دُور دُور تک مشہور تھی."

"مجھے یاد ہے" — اشفاق احمد نے کہا — "ہندوؤں نے انہیں بہت لالچ دیئے تھے. میں امرتسر ڈی سی آفس کا سپرنٹنڈنٹ تھا. میں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں دیکھا تھا. انگریز ڈی سی نے آپ کے والد صاحب کو اپنے دفتر میں بلا کر کہا تھا کہ ان کی جاگیر کے تمام ووٹ کانگرس کے بکس میں جائیں ورنہ ان کی جاگیر کے وہ مربعے جو انہیں انگریزی حکومت سے ملے ہیں ضبط کر لیے جائیں گے. آپ کے والد صاحب نے جواب دیا تھا کہ ساری جاگیر ضبط کر لو لیکن میرے زیر اثر جتنے ووٹ ہیں وہ پاکستان اور قرآن کے نام پر مسلم لیگ کے امیدوار کے بکس میں جائیں گے. میں اپنی جاگیر سے دست بردار ہو سکتا ہوں اپنے مذہب سے نہیں. پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ — یہ میرا کلمہ ہے جو میرے پیدا ہوتے ہی میرے کان میں ڈالا گیا تھا. یہ سُن کر آپ کے والد صاحب نے ڈی سی سے کہا کہ کوئی اور حکم؟ اور وہ اس انگریز کو رسمی سا سلام بھی کیے بغیر چلے گئے تھے."

"وہ نام جاگیر میں رہ گئی" — ملک رجب علی نے کہا — "میرے والد صاحب بہت خوش تھے کہ پاکستان کے نام پر ان کی جاگیر قربان ہو گئی ہے.... وہ پچھلے سال سکون اور اطمینان کی زندگی گزار کر فوت ہوئے ہیں."

"مجھے معلوم ہے" — اشفاق احمد نے کہا — "میں ان کے جنازے میں شریک تھا."

"میں اُن کا بیٹا ہوں" — ملک رجب علی نے کہا — "اُس نے کہا تھا کہ انسان کو انسان اور پاکستان کو اپنا ایمان کہنا مگر جس ملک سے ایمان اُٹھ گیا ہو وہاں کوئی اپنا ایمان کتنا محفوظ رکھ سکتا ہے. ہم نے اس ملک کو بگڑا تو چار ٹیلیفون آ گئے کا خیال رکھنا، اپنی پارٹی کا آدمی ہے، معتدبہ رقم ہتھیلا رکھنا سفارش سے بری کرا لیں گے. کرتے کرتے پولیس کی ڈیوٹی یہ رہ گئی کہ پاکستان کے تخت پر کوئی اُلو کا پٹھا ہی کیوں نہ بیٹھ جائے، اس کی حفاظت کرنا اور وہ جس کی طرف اشارہ کرے اُسے اندر کرو یا اور مخالفین پر ایسے ذلیل الزام عائد کرو کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے... یہ فرض میں بھی ادا کرتا رہا. لوگوں کے گھر لٹتے رہے، جرائم بڑھتے گئے، لوگ پولیس کو گالیاں دیتے رہے لیکن پولیس کو کسی اور طرف مصروف رکھا گیا. پولیس اور غنڈے سیاستدانوں کے ہتھیار بن گئے."

"میں یہ سب کچھ جانتا ہوں ملک صاحب" — اشفاق احمد نے کہا — "آپ یہ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟"

"میں اقبال جرم کر رہا ہوں چوہدری اشفاق!" — رجب علی نے کہا — "میں گناہوں کی گٹھڑی آپ کے آگے پھینکنے آیا ہوں. میں آپ کے بیٹے کو گرفتار نہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں."

"اس کیس کی حقیقت کیا ہے؟" — ارشد نے پوچھا.

"حقیقت یہ ہے کہ کوئی پولیس مقابلہ نہیں ہوا تھا" — ملک رجب علی نے کہا — "عبدالجلیل خان میرے ہاتھوں کمرے کے اندر مرا ہے. میں اس کا قاتل ہوں. وہ پولیس مقابلے کے قابل کہاں تھا. اُسے تو میرے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا.... اور کامران دو ہندو لڑکیوں کو قتل کر کے زخمی حالت میں میرے پاس آیا تھا. اس کی پیٹھ میں بارہ بور بندوق کے چھرّے اُتر گئے تھے. وہ عبدالجلیل کے قتل کا بھی اعتراف کر

کے اور مجھے شرمسار کر کے میرے گھر میں مرا تھا:

میرا جانتے ہو تے وا آپ ایک عظیم باپ کے بیٹے ہیں ملک صاحب!" — اشفاق احمد نے کہا

— پھر بھی یقین نہیں آتا کہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی اس طرح اپنے جرائم کا اعتراف کرے۔"

"آپ کسی بھی پولیس افسر کا سینہ کھول کر دیکھیں" — ملک رجب علی نے کہا — "وہاں آپ کو ایک انسان دبکا بیٹھا نظر آئے گا۔ اس انسان میں انسانیت کی محبت اور درد ہے۔ یہ انسانی مجرموں کا اتنا ہی دشمن ہے جتنا ہر شہری ہے۔ اس انسان کو دفن کر دیا گیا ہے اور اس پر پولیس کی وردی کا کفن چڑھا دیا گیا ہے مگر یہ چنگاریوں کی بھول ہے۔ یہ ہر سب کی بھول ہے۔ اس انسان کو دفن نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم میں نہیں کر سکا۔ اندر کا انسان مر نہیں سکتا کیونکہ وہ خدا کا نائب ہے۔ بٹوارے میں تھا عبدالجلیل کو اس حکم کے ساتھ میرے حوالے کیا گیا کہ اس کے خلاف عبدالقدیر کا قتل ثابت کرنا ہے۔ میں عبدالقدیر کو بھی جانتا تھا، عبدالجلیل کو بھی۔ عبدالقدیر سفاک چالاک اور خطرناک آدمی تھا اور عبدالجلیل مرنجاں مرنج سا۔ سی۔ آئی۔ اے میں اُسے ایسی ایسی اذیتیں دی گئیں جو جگر پارہ پارہ کر ڈالتا کوئی اور پتھر جیسے جسموں والے بھی برداشت نہیں کر سکتے لیکن عبدالجلیل کے یہ الفاظ مجھے مرتے دم تک یاد رہیں گے اُس نے نیم غشی کی حالت میں کہا تھا — "ملک، تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے اور میری سانس تک سلامت رہے گا۔"

"میں نے اُسے اذیت رسانی کے لیے جو دو کنسٹیبل مقرر کیے تھے وہ اس کام کے ماہر تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر مجھے بتایا تھا کہ اُسے برف کے بلاک پر لٹکایا گیا اور اس کے اور اعضا کا کیمیل بچھ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ عبدالجلیل کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ کوئی ورد، کوئی دعا۔ دوسرے کانسٹیبل نے کہا تھا — "یہ کوئی پہنچ والا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت ہے۔" — وہ ٹھیک کہتے تھے۔ عبدالجلیل کے ہاتھ میں حق اور صداقت کی طاقت تھی۔ میں نے اُس کی چمک دیکھی ہے۔ دوسری میں بھی اللہ کا نام لیتا اور مجھے کہتا تھا — "میرا ایمان سلامت ہے ملک!"...

"میں رات کو سو نہیں سکتا تھا۔ اُس کے الفاظ سیسے کی طرح پگھلتے ہوئے میرے کانوں میں ڈالے جاتے تھے۔ میں ہار گیا تھا لیکن میرا ایمان سے پھر ڈی۔ ایس۔ پی بنا دیتا تھا۔ میں سچ اور جھوٹ میں پسنے لگا۔ حق اور باطل نے دو پتھروں کی طرح مجھے اپنے درمیان لے کر میری روح کو کچلنا شروع کر دیا۔ میں بیمار ہونے لگا۔ اگلی صبح اُس کمرے میں گیا جہاں عبدالجلیل فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ تقریباً بے ہوش تھا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ مجھے غصہ اُن پر تھا جنہوں نے مجھے یہ فرض سونپا تھا۔ مجھے غصہ اُن سیاسی لیڈروں پر آ رہا تھا جو پولیس کو جلادوں اور درندوں کی سطح پر لے آتے تھے۔ یہ غصہ قہر بن گیا۔ میں نے اندھا ہو کر پوری قوت سے ایک ٹھڈا مارا جو میں نے اپنے خیالوں کی زہریلی قے میں کسی اور کو مارا تھا لیکن ٹھڈا عبدالجلیل کے پیٹ میں پڑا۔ اُس کے منہ سے خون کے پہلے قطرے گرے۔ وہ لڑھک کر گیا اور مر گیا...

"اور اس کے ساتھ ہی وہ رجب علی مر گیا جو ڈی۔ ایس۔ پی تھا اور وہ رجب علی جاگ اٹھا جو آپ کے آگے اقبالِ جرم کر رہا ہے۔ اُس رات کا ماحون میں ڈوبا ہوا میرے گھر آ گیا۔ رات آدھی گزر گئی تھی لیکن میں جاگ رہا تھا۔ میرے گھر — میں اپنے والد صاحب کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی ہے۔ اس تصویر سے مجھے ڈر آتا تھا لیکن میں اس سے نظریں ہٹا بھی نہیں سکتا تھا۔ والد صاحب مجھے قہر کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تصویر کا چہرہ عبدالجلیل کا چہرہ بن جاتا تھا اور مجھے کمرے میں اندھے چمگادڑ کی طرح بھٹکتی ہوئی آواز سنائی دیتی تھی — "میرا ایمان سلامت ہے۔ آخری سانس تک سلامت رہے گا" — میں یہی آوازیں سنتا اور تڑپتا رہا۔ میں ایمان، حق اور صداقت کا قائل تھا....

"اسی کیفیت میں مجھے باہر اداسی اونچی باتیں سنائی دیں۔ میں غصے میں باہر نکلا۔ وہاں کاما ناگنگے والا جو میری حراست سے بھاگا تھا، خون میں لت پت پڑا نظر آیا۔ میں اُسے اندر لے آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ عبداللہ یہ کا قاتل عبدالجلیل نہیں وہ ہے اور اُس نے دونوں لڑکیوں کے قتل کا اقبال کیا۔ اس لیے کہا — "اپنے ملک کو بچاؤ۔ ملک صاحب! اگر آپ میں اتنی ہمت نہیں تو ملک کو بچانے والوں کو گرفتار نہ کرتے پھرو۔ یہ حصے دنیا میں رہ جائیں گے ملک صاحب!" — پھر وہ مر گیا۔ صبح اخبار آئے تو خبر پڑھ کر میرا رہا سہا دم بھی نکل گیا۔ خبریں مجھے ہیرو بنایا گیا تھا۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا کہ تمہیں انعام و اکرام ملے گا۔ میں اُسے کچھ نہ کہہ سکا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا:

انسان اپنے اوپر ہزار خول چڑھاتے، پردے پر پردہ ڈالا جاتے لیکن وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور جس کا خمیر نیکی اور خیر سے اٹھایا ہے وہ کبھی نہ کبھی خول توڑ کے سامنے آ جاتا ہے۔ اسے آسمانی پردوں میں بھی قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ وقت کڑی آزمائش کا ہوتا ہے جب انسان کے اندر سے مخفی اشرف المخلوقات آزاد ہونے کی جدوجہد کرتا ہے۔ بڑی بھیانک کشمکش ہوتی ہے جس سے انسان گھبرا جاتے ہیں۔ یہ وقت بڑا ہی مقدس ہوتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان اپنے آپ کو اجنبی لگنے لگتا ہے۔

ملک رجب علی اُن انسانوں میں سے تھا جنہیں حالات کا ایک جھٹکا یا کوئی صدمہ یک لخت جھٹکتے سادہ سے انسان بنا دیتا ہے۔ وہ بے بس ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اندر شر کی جو قوتیں پیدا ہو چکی ہوتی ہیں وہ اچانک ختم ہو جاتی ہیں۔ خیر کی قوتیں ابھرنے لگتی ہیں اور شر اور خیر کے درمیان کا فاصلہ خلا بن جاتا ہے۔ انسان دانائی اور فرزانگی کے درمیان معلق ہو جاتا ہے۔

ملک رجب علی کے عظیم باپ کی جو عظمت تھی اور انسان اور پاکستان کی جس محبت کو مرحوم باپ نے ایمان کہا تھا، وہ عظمت اور وہ ایمان ملک رجب علی کے خون میں رواں دواں تھا۔ وہ خون سیلاب بن کے آگیا اور ڈی۔ ایس۔ پی کو اپنے ساتھ بہالے گیا تھا۔ وہ بہت ہی کمزور اور بے عمل ہو گیا تھا۔

"چونکہ مجھے اس خونی ڈرامے کا ہیرو بنا دیا گیا تھا اس لیے اس کے اگلے منظر کی ہدایت کاری بھی مجھے سونپ دی گئی — ملک رجب علی کہہ رہا تھا۔ — "مجھے کہا گیا کہ مزید گرفتاریاں کروں۔ اسمبلیوں کے دو ممبر، ہمدرد اللہ بخش اور چند ایک اکرم، ہوم سیکرٹری اور وزیر داخلہ اس ڈرامے کے روح رواں ہیں۔ ان کا خفیہ والا ہنڈ ستانی سفارت خانے (انڈین کمشن) کے ساتھ ہے۔ انہوں نے ایک فہرست تیار کر کے مجھے دی ہے جس میں اپوزیشن پارٹیوں کے کچھ لوگ شامل ہیں۔ برسرِ اقتدار پارٹی اس طاقت کو اپنے مخالفین کو گرفتار کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ دوسری طرف ہمیں مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ اپوزیشن کی سیاسی پارٹیاں اس طاقت کی اخباری خبر کو سارے ملک میں منظم کر کے جلسوں اور جلوسوں کے لیے استعمال کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں....

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اپوزیشن لیڈر کاسے کی بیوی اور عبدالجلیل کی بیوی سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے ہیں۔ انہیں اصل طاقت کا اور اس کے پسِ منظر کا کچھ علم نہیں لیکن انہوں نے کوئی اور ہی کہانی گھڑلی ہے۔ اب

iqbalmt@hotmail.com scanned by

کچھ دن سڑکوں پر مظاہرے ہوں گے۔ اسمبلیوں میں جھڑپیں ہوں گی۔ گرفتاریاں ہوں گی۔ اخباروں میں بیان بازی ہوگی اور اس طرح قوم کی آنکھوں میں دونوں طرف سے دھول جھونکی جائے گی۔ حکومت کی طرف سے بھی اپوزیشن کے لیڈروں کی طرف سے بھی۔"

"اور اس سے ہمارا دشمن فائدہ اٹھائے گا" — اشفاق احمد نے کہا۔

"دشمن فائدہ اٹھا رہا ہے" — ملک رجب علی نے کہا۔ "ہمارے لوگوں کو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ جب کوئی جلوس نکلتا ہے تو ہمارے دشمن کے آدمی اس میں شامل ہو کر توڑ پھوڑ کرتے اور جلوس اور پولیس کو ٹکراتے ہیں۔"

"آپ فہرست کی بات کر رہے تھے" — اشفاق احمد نے کہا۔

"اس فہرست میں ارشد کا نام بھی ہے" — رجب علی نے کہا۔ "لیکن میں کسی ایک کو بھی گرفتار نہیں کروں گا میں جنہیں جانتا ہوں ان کے متعلق رپورٹ لکھوں گا کہ ان کا اس واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں گناہ کا کفارہ اسی طرح ادا کر سکتا ہوں۔"

"پھر آپ باقی تمام سروس ڈی۔ ایس۔ پی بن جائیں گے" — اشفاق احمد نے کہا۔

"میں شاید استعفیٰ دے دوں گا" — ملک رجب علی نے کہا — "لیکن چوہدری اشفاق! میرا خیال ہے ... ارشد بھائی اگر عبدالجلیل کی تحریک کا کوئی چور ہے تو اس سے لاتعلق ہو جاؤ۔"

"لیکن ملک صاحب!" — ارشد نے کہا — "میں پاکستان سے تو لاتعلق نہیں ہو سکتا۔"

"ہم میں سے کوئی بھی پاکستان سے لاتعلق نہیں ہو سکتا" — رجب علی نے کہا اور اس کے وہی باتیں شروع کر دیں جو اس کا باپ اُسے کہہ چکا تھا۔

"پاکستان شہیدوں کی سرزمین ہے ارشد!" — رجب علی نے کہا — "یہاں ہر حکمران جن مالی کرے گا وہ ذلیل و خوار ہو کر تخت سے گرے گا۔ اپنے جذبے کو زندہ رکھو۔ جھوٹ کی حکومت ہو گی۔"

ملک رجب علی جانے کے لیے اُٹھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"چوہدری اشفاق!" — اُس نے ارشد کے باپ سے کہا — "میں جب ایس۔ ایس۔ آئی ٹبڑاکتا تھا تو آپ نے دو مرتبہ پر میری مدد کی اور مجھے مصیبت سے نکالا تھا۔ اب مجھے پھر آپ کی مدد کی ضرورت ہے ... کبھی کوئی پتہ نہ چلے کہ میں کے بیان آ کر کیا باتیں کی تھیں۔ ارشد کی رپورٹ صاف [illegible] آدمی آپ سے کسی طرح لیٹی گپ شپ کے انداز سے یا سرکاری طور پر پوچھے کہ میں یہاں آیا تھا یا نہیں۔ کہنا کہ میں نے اس کوٹھی میں چھاپہ مارا تھا اور کوٹھی کے تمام کمروں، غسل خانوں اور الماریوں میں سے ہر ایک چیز نکال کر دیکھی تھی۔"

ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کوٹھی سے نکلا اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

اس کے بعد پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں جلسوں اور جلوسوں نے رونق پیدا کر دی۔ اپوزیشن کے اخباروں نے کاسے، تانگے والے اور عبدالجلیل کی بیویوں کی تصویریں اور بیان چھاپے اور ایسی اشتعال انگیز کہانیاں شائع کیں جن کا اصل واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ لوگوں کو خوب بھڑکایا گیا۔ پولیس نے جلوسوں پر لاٹھی چارج کیا اور ہر شہر سے سینکڑوں آدمیوں کو گرفتار کر کے حوالات میں ٹھونس دیا۔

تین چار دن بعد کاسے اور عبدالجلیل کی بیویوں کے بیان پر سراقتدار پارٹی کے اخباروں میں شائع ہوئے جس میں دونوں عورتوں نے اپنے پہلے بیانوں کی دھجیاں تردید کی بلکہ کہا کہ ان کے ناموں سے جو بیان منسوب کیے گئے ہیں وہ اخباروں نے خود ہی گھڑ لیے تھے — حکمران پارٹی کا ایک ممبر اسمبلی عورتوں کو روپیہ بھیجا پندرہ ہزار روپیہ اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں کام کر گئی تھیں۔ عبدالجلیل خان کی بیوی سے کہا گیا تھا کہ اس نے پندرہ ہزار روپے کے عوض حکومت کے لگے ہوئے بیان پر دستخط نہ کیے تو اس کے بیٹے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ یہ عورت ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی لیکن ماتا نے اسے بے بس کر دیا۔

اور پھر ان کی بیٹیوں بعد عبدالجلیل اور کاسے کا قتل برسوں پرانی بات ہو گئی۔ حکمران اور مخالف سیاسی لیڈروں نے نئی باتیں پیدا کر لی تھیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کے استعفے کی خبر کسی بھی اخبار میں شائع نہ ہوئی۔

اس واقعہ کے چار ماہ بعد ۵ جون سے ارشد کی بارات راولپنڈی جا رہی تھی۔ بارات کرائے کی لگژری بسوں کے گھر آ رہا تھا۔ طاہرہ کو دلہن بنایا گیا تھا۔ ارشد کی بارات کے ساتھ اس کا باپ، بڑا بھائی، نوکر فردین اور ارشد کی ماں بھی تھی۔ سبھی بہت خوش تھے۔ سب سے زیادہ خوش تو ارشد کا باپ تھا جو شادی کی تمام خوشیوں سے بہرہ ور ہو رہا تھا۔

[illegible] کے گھر نجمہ نے اور اس کی ساتھی استانیوں نے دلہن بنایا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اس نے پہلی شب گزاری تھی۔ نجمہ اور استانیاں ہنس رہی تھیں، گا رہی تھیں اور طاہرہ سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہی تھیں لیکن طاہرہ گم سم بیٹھی تھی۔ وہ مسکراتی تھی تو اس کی مسکراہٹ بھی گم سم سی لگتی تھی — اسے نعیم یاد آ گیا تھا اور اپنے پہلے سہاگ کی رات بھی یاد آ گئی تھی۔

"طاہرہ!" — نجمہ نے اس کے کان میں کہا — "میں جانتی ہوں تم کہاں کھو گئی ہو۔ نکل آؤ یادوں کے کھنڈروں سے۔ تمہارا دلہا ارشد آ رہا ہے ... تمہارا ارشد ... تمہاری وہ محبت آ رہی ہے جو تم نے عفت پر قربان کر دی تھی۔"

طاہرہ نے نجمہ کی طرف دیکھا اور اب اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ آئی وہ گم سم مسکراہٹ نہیں

"تم قاتل ہو رجب علی!"

"تم نے اُسے قتل کیا ہے۔"

"ترقی کی خاطر۔"

"اوپر والوں کی خوشنودی کی خاطر۔"

"وہ کوئی بیچنے والا تھا۔"

iqbalmt@cinepoint.com scanned by

"تمھاری کہاں تک پہنچ ہے، رجب علی؟"

"اُس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت تھی:"

"عبدالجلیل ... عبدالجلیل خان ... ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان"

"یہ نام ... یہ شخص ... ایک آسیب جو بیسویں عمر تمھارے دل پر، تمھارے دماغ پر، تمھاری سوچوں اور تمھارے اعصاب پر چھایا رہے گا۔"

"عبدالجلیل خان سزا نہیں کرتے ... تم مر گئے ہو رجب علی! ... ڈی۔ ایس۔ پی مر گیا ہے۔ مانگنے والے کاسے پر کبھی زندہ وارد کرتے ہیں۔ تم زندہ رہ کر مرے ہوئے ہو۔"

"اُس کے ہاتھ میں خدائی طاقت تھی؟"

"تمھارے ہاتھ میں کون سی طاقت ہے؟ ... کون سی طاقت تھی تمھارے ہاتھ میں؟ ... کیا رہ گیا ہے تمھارے ہاتھ میں؟"

"کس کی خاطر تم نے ترقی پر ایمان قربان کر دیا ہے؟ ... تمھاری بیوی مر گئی ہے۔ تمھارا کوئی بچہ بھی زندہ نہیں رہا۔"

آوازیں ... کڑوی، تیکھی، زہریلی آوازیں ... ملک رجب علی کے شب و روز اسی اذیت میں گزر رہے تھے۔ یہ آوازیں چمگادڑوں کی طرح اُس کے سر پر اور اُس کے اردگرد سرسراتی پھڑپھڑاتی اور اُس کے دل سے ٹکراتی رہتی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں اس طرح اُس کی اپنی ذات سے اٹھتی تھیں جیسے چمگادڑوں سے بھرے ہوئے غار میں پتھر مار دیا ہو۔

رجب علی کے ضمیر کے غار میں عبدالجلیل خان کے قتل کا پتھر ایسا پڑا کہ آوازوں کے چمگادڑوں نے غل مچا مچا کر بلبلا کر دی۔ اُس نے ان آوازوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے خلاف لڑنے کا کوئی جواز ڈھونڈا۔ اُس نے ان آوازوں کے ہتھیار ڈال دینے اور پہلا کام یہ کیا کہ استعفیٰ دے دیا۔ وہ اب ڈی۔ ایس۔ پی نہیں تھا اور وہ بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کبھی ڈی۔ ایس۔ پی ہوا کرتا تھا۔

وہ لمحے متقدس ہوتے ہیں جب انسان اپنے ضمیر کی آوازوں پر کان دھرتا ہے، یا وہ لمحے متقدس ہوتے ہیں جب انسان اپنے گناہوں کی گٹھڑی کھول کر اپنے آگے رکھتا اور تسلیم کرتا ہے کہ یہ گناہ میرے ہیں۔ ضمیر اپنے ضمیر کی آوازیں سننے اور اپنے گناہوں کو تسلیم کرنے میں ہے مگر یہ حکمت وہ پھول ہے جو کانٹوں میں چھپا ہوتا ہے۔ ہر کانٹے کی جھبن زہر ناک اور درد سے بھرپور ہوتی ہے۔ حکمت کا یہ پھول اُسی نے حاصل کیا جس نے کانٹوں کو اپنا خون دیا اور ان کے زہر کو اپنے آپ میں جذب کر لیا۔

ملک رجب علی اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اُس کی روح میں اتنے کانٹے اُتر گئے تھے کہ روح لہولہان ہو گئی تھی لیکن انسس نے راہِ فرار نہ ڈھونڈی۔ اس اذیت کو وہ دل قبول کر چکا تھا جیسے کوئی رہزن خود ہی قاضی کے سامنے جا کھڑا ہو اور اپنا ہاتھ آگے کر کے کہے کہ یہ ہاتھ کاٹ دو، یہ رہزن کے ہاتھ ہیں۔

○

"ڈاکٹر صاحب! میں سو نہیں سکتا۔" ملک رجب علی نے اپنے فیملی ڈاکٹر سے کہا۔ "میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دیکھیں۔ جسم میں جان نہیں رہی۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کی عمر ستر برس سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ تین نسلوں سے رجب علی کے خاندان کا علاج کرتا آیا تھا۔ وہ رجب علی کے باپ ملک اللہ یار خان کا گہرا دوست تھا۔ رجب علی کی عمر بتیس سال تھی۔ وہ تو جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں میں پیدا ہوا تھا۔ آج ساڑھے آٹھ سال پہلے رجب علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خاندان اکٹھے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

"رجب علی!" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے اُسے کہا — "دوسری شادی کر لو۔ فوراً کر لو۔ تم ابھی جوان ہو۔ تمھارے لیے تنہائی اچھی نہیں۔ تمھارا ایک بھی بچہ ہوتا تو تم اس حال کو نہ پہنچتے۔ تم مجھے اپنی آنکھوں کے صرف حلقے دکھا رہے ہو۔ میں تمھیں سر سے پاؤں تک دیکھ رہا ہوں۔ تمھاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔ تم تندرست نہیں ہو رجب علی!"

"میں شادی نہیں کروں گا ڈاکٹر صاحب!" — رجب علی نے ایسی آواز میں کہا جو دکھ اور کرب سے بوجھل تھی۔ یہ کراہتی ہوئی آواز تھی — "میں اب کسی ساتھی کو خوش نہیں رکھ سکوں گا۔"

"ایک تو تم شمار ہو گئے" — ڈاکٹر نے کہا — "اور ایک غلطی تم نے خود کی۔ سروس سے استعفےٰ دے دینا اچھے بھلے آدمی کو مریض بنا دیتا ہے ... نیند نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ پیٹ ٹھیک ہے تمھارا؟ ... بلڈ پریشر چیک کرتا ہوں ..."

"سب ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" — ملک رجب علی نے کہا — "میرے جسم کی بات نہ کریں۔ میں اپنے جسم کو دستبردار ہو گیا ہوں۔ تین مہینے جو گزرے ہیں وہ جیسے جسم میں گزارے ہیں۔"

"کیسے جسم میں؟" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے مشفق باپ کی طرح پیار سے انداز سے جھنجھلا کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم اپنے والد صاحب اور اپنی بیوی کے مرنے کے بعد تم نے اپنا دماغ خاصا خراب کر لیا ہے۔ تمھارا ایک کارنامہ اخباروں میں شائع ہوا اور ہم نے استعفیٰ دے دیا۔ میں اس خبر کے انتظار میں تھا کہ ڈی۔ ایس۔ پی ہو گئے ہو۔ مجھے وہ خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ تم نے بڑے خطرناک مجرموں کو پکڑا۔"

"ڈاکٹر صاحب!" — ملک رجب علی نے ڈاکٹر کی بات بیچ میں کاٹ دی جیسے ڈاکٹر اُسے گالیاں دے رہا ہو۔ اُس نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا — "جو خبر پڑھ کر آپ کو خوشی ہوئی تھی وہ میرے لیے موت کا پروانہ تھا۔ میری نیند میرا سکون اور میری صحت یہی خبر اُڑا لے گئی ہے جسے آپ میرا کارنامہ لکھتے ہیں ... ڈاکٹر صاحب! مجھے کوئی دوائی نہیں چاہیئے۔ میں آپ سے خیر اور ذہنی سکون کی گولیاں لینے نہیں آیا۔ مجھے جذباتی سہارے کی ضرورت ہے۔"

اُس نے ڈاکٹر کے ساتھ وہی باتیں کیں جو اُس نے تین مہینے پہلے "آشا بھون" میں اشفاق احمد اور اُس کے بیٹے ارشد کے ساتھ کی تھیں۔ اُس نے اسی جذبات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین پر روئیداد جو رجب علی کا اقبالِ جرم تھا یوں گم سم ہو کے سن رہا تھا جیسے نیند میں ہو، یا جیسے ایسی حیران کن اور اُلجھن خیز کہانی اُس نے اتنی لمبی عمر میں پہلی بار سنی ہو۔

"میں قاتل ہوں" — ملک رجب علی نے کہا — "میں نے اپنے ضمیر کی نجات کے لیے ایک قومی کام کیا ہے کہ مجھے جن لوگوں کی گرفتاری کا حکم ملا تھا، ان میں سے میں نے کئی ایک کے متعلق بالکل صاف رپورٹ دی اور باقی جو تھے انہیں میں نے گرفتار نہیں کیا۔ اس کی سزا تو میں نے استعفےٰ دے دیا ہے۔ مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں کر سکتا کہ میں نے مجرموں کو گرفتار کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس فہرست میں کوئی ایک بھی

iqbalmt@onlinepk.com.pk scanned by

جرم نہیں تھا۔ جلیل خان نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ کاسے نے ملک کے تین دشمنوں کو قتل کیا تھا جنکر ان پارٹی اس واقعہ کو ایک ڈرامہ بنا کر اپنے مخالفین کو گرفتار کرنا چاہتی تھی جو اس کے لیے زیادہ خطرناک تھے۔"

"لیکن مخالف پارٹیاں زیادہ ہوشیار نکلیں" — ڈاکٹر نے کہا — "انہوں نے اسی واقعہ کو اپنی ضرورت کا رنگ دے کر خوب ہنگامے اور مظاہرے کیا تھے۔"

"لوگوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اصل واقعہ کیا ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "حقیقت کا کسی کو بھی علم نہیں۔"

"اور نہ ہوگا" — ڈاکٹر نے کہا — "اس ملک میں اب اقتدار کی ہی سیاست چلے گی۔ یہاں ایک سیاسی ٹورنامنٹ چکا ہے۔ پاکستان اب اسی ٹورنامنٹ کے درمیان گیند کی طرح اچھلتا اور اڑتا رہے گا۔ رجب علی! تم جانتے ہو نا، ان لیڈروں کو جن کے ہاتھوں میں پاکستان آگیا ہے انہیں پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ پاکستان میں اگر کوئی دل کی گہرائیوں سے دلچسپی لے رہا ہے تو وہ ہندوستان ہے۔ تم یورپ میں رہتے ہو رجب علی! تمہارا مشاہدہ کیا ہے؟"

"مجھ سے پوچھتے ہیں آپ؟" — رجب علی نے کہا — "میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جب سے یہاں لوگوں نے آپس کی معرکہ آرائی چھوڑ کر مشرقی پاکستان کی طرف توجہ دینی شروع کی ہے ہم ملک کا دفاع کرنے لگے ہیں۔ وہاں ہندوؤں کا اثر زیادہ ہے۔ میں پچھلے سال مشرقی پاکستان گیا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے مجھے بھی شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ ہندو مشرقی پاکستان کی سیاست اور کلچر میں اترگیا ہے۔ ہندو دو قومی نظریے کو تار تار کر رہا ہے۔"

"یہ تو سیاست کی باتیں ہیں رجب علی!" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا — "تم اپنی صحت کے متعلق شکایت لے کر آئے تھے۔ اچھے تندرستی اس رانتے سے اتفاق ہے کہ تمہیں دماغی سکون کی گولیوں کی نہیں دوائی کی ضرورت نہیں۔ تم گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی بات کر رہے ہو۔ تم کیا سوچ سکتے ہو کہ اس کا کیا ہو سکتا ہے۔ تم اشتعلے دے کر مطمئن نہیں ہوتے۔ تم نے ان لوگوں کو کیا نہیں کیا جن کی تمہیں نہیں دی گئی تھی۔ اس سے بھی تمہاری روح کو سکون نہیں ملا..... تمہیں سکون مل جائے گا۔ خدا کی یاد کرو اور اسی سے گناہوں کی بخشش مانگتے رہو۔ خدا نے تمہیں بڑی جائیداد اور زمین دی ہے۔ تمہیں ہومیو کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس جائیداد اور دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جاؤ۔ جتنا خیرخیروں اور ناداروں کی مدد کر سکو، یہی کام آئے گا۔"

"میں اپنی ساری جائیداد دے دوں گا" — رجب علی نے کہا — "اس کے عوض کوئی مجھے راحت اور سکون دے دے۔ مجھے سکون کی نیند واپس لا دے۔"

"میں تمہیں ذہنی سکون کے لیے گولیاں تو لکھ دے سکتا ہوں لیکن نہیں لکھوں گا" — ڈاکٹر نے کہا — "تم ایک دوراہے پر کھڑے ہو۔ ایک راستہ عارضی اور مصنوعی سکون کا ہے اور دوسرا راستہ دائمی سکون کا۔ میں گولیوں کی صورت میں تمہیں عارضی سہارا نہیں دوں گا، ورنہ تم گولیوں کے عادی ہو جاؤ گے۔ نیند ہو جائے گی پھر تم شراب بھی پینے لگو گے۔ آج تم اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتے کہ تم اپنی رفیقہ کو مسرتیں نہیں دے سکو گے۔ تم اپنے آپ کو کبھی سمجھتے ہو۔ ایک بار تم نشے کے عادی ہو گئے تو تم اس لیے شادی نہیں کرنا چاہو گے کہ تمہارے تعلقات کئی عورتوں کے ساتھ ہوں گے۔ تمہاری کوٹھی میں بازاری عورتیں رونق پیدا کیا کریں گی..... رجب علی! میں تمہیں ہوش میں رکھنا چاہتا ہوں۔ ہوش میں رہ کر یہ اذیت جھیلو۔ حقیقت کو ہوش و حواس میں دیکھو۔ اپنے گناہوں کا سامنا آنکھیں کھول کر کرو..... میں وعظ نہیں سنا رہا رجب علی! میں نہیں علم نفسیات کا اصول سمجھا رہا ہوں۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارا ضمیر بول اٹھا ہے۔ تمہاری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ تم نے اپنے ضمیر کی آواز سن لی ہے۔"

"کیا وہ لوگ اچھے نہیں رہتے جو اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتے ہیں؟"

"تم اسی مقام پر کھڑے ہو جہاں لوگ اپنے ضمیر کو جھٹلا کر فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں" — ڈاکٹر نے کہا — "وہ شراب، انیم، جنسی لذت اور تصور پرستی میں جا پناہ لیتے اور اسے اپنی جنت سمجھتے ہیں مگر وہ ایک نہ ایک روز پکڑے جاتے ہیں۔ وہ پھر بھاگنے ہیں اور یوں ان کی زندگی مفرور مجرم کی طرح گزر جاتی ہے۔"

"دوسرا راستہ عزلت، اور ذہنی سکون کی طرف جاتا ہے۔ یہ راستہ دشوار اور پُرخار ہے لیکن اس منزل تک جہاں تم پہنچنا چاہتے ہو، یہی راستہ جاتا ہے۔ اس ذہنی اذیت سے نہ گھبراؤ جس نے تمہاری بنیاد اڑا دی ہے۔ اس آگ سے نکل کر تم کندن بنو گے۔ انسانوں سے اور اپنے دل سے محبت کرو۔ اپنی ذات کو الگ رکھ دو۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین بولتا جا رہا تھا اور اس کا ایک ایک لفظ رجب علی کی روح میں اترتا جا رہا تھا۔ وہ رجب علی سے اعلیٰ تر وہ کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔

○

وہ دوائی کوٹھی کی طرف پیدل چل پڑا۔ اس کے قریب سے لوگ گزرتے جا رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ اس کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔ اس کا اُسے ذرا سا بھی افسوس نہیں تھا۔ اسی کے متعلق تو سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ اُسے جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے قریب کاریں، بسیں اور انگے گزر رہے ہیں۔ اس کے گرد ابھی تک ڈاکٹر ذاکر حسین کی باتیں گونج رہی تھیں۔

سامنے سے ایک آدمی فٹ پاتھ پر چلا آ رہا تھا۔ اس کا کاروبار ایسا تھا کہ پولیس کے ساتھ اس کا واسطہ اکثر پڑتا تھا۔ اسی سلسلے میں اس نے ملک رجب علی کے ساتھ دو سناٹہ گانٹھ رکھا تھا۔ اُسے تحفے بھی پیش کیا کرتا تھا۔ آٹھویں دسویں روز رجب علی کی کوٹھی میں جاتا اور خوشامد کے نت نئے کرتب دکھاتا تھا۔ وہ سامنے آیا تو رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس کے قدم سست ہو گئے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آدمی ڈھیلے گا۔ اس سے جھک کر پھر بغلگیر ہو کر ملے گا اور اپنی کوٹھی کی طرف گھسیٹے گا۔ رجب علی اس کے گھر جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے فوراً ایک بہانہ تراش لیا۔

وہ آدمی اور قریب آیا تو رجب علی اور زیادہ آہستہ ہو گیا اور اس کا والیاں ہاتھ مصافحے کے لیے اٹھنے لگا۔ وہ آدمی پہلے ہی دو قدم ایک طرف ہو گیا تھا۔ اس نے رفتار اور تیز کر لی اور رجب علی کے قریب سے گزرتے رسمی انداز سے بولا۔ "خیریت ہے ملک صاحب؟" — اور وہ یوں بے رخی سے آگے نکل گیا جیسے رجب علی کو اتنا ہی جانتا ہو کہ کسی ہوٹل میں یا کبھی سینما ہال میں یا کبھی ریل گاڑی کے ڈبے میں ملاقات ہوئی تھی۔

رجب علی کے قدم جو اس شخص کو دیکھ کر رکنے لگے تھے وہ رکتے ہی گئے جیسے وہ تھک کر چور ہو چکا ہو

وہ شخص جو اس کے پاؤں میں چلتا رہتا تھا، اس کے قریب سے اکڑ کر گذر گیا تھا۔ رجب علی نے اپنے دل میں درد سا محسوس کیا لیکن اُسے ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ یاد آ گئے ــــ ہوش میں رہو کہ یہ اذیت جھیلو حقیقت کو ہوش و حواس میں دیکھو۔ اپنے گناہوں کا سامنا آنکھیں کھول کر کرو۔"

رجب علی کے دل میں درد کا جو احساس اٹھا تھا وہ دل میں ہی کہیں غائب ہو گیا۔ اُس کے قدموں میں کوشش کے بغیر تیزی آ گئی۔ اُس نے ایسی بات نہ سوچی کہ ــــ تاریکی میں سایہ بھی جدا انسان سے رہتا ہے!

"یہ شخص جو میرے پاس سے گزر گیا ہے میرے گناہوں کی چلتی پھرتی یادگار ہے" ــــ رجب علی کو خیال آنے لگے ــــ "اچھا بڑا جوڑ کا نہیں، گزر گیا ہے۔ رکی تو محض رسمی باتیں کرتا۔ اس کے دل میں میری ذرا سی بھی محبت نہیں، اور میرے دل میں اس کی کوئی محبت نہیں تھی۔ یہ مجھے تجھے دیتا اور اپنا کام کراتا تھا اور اس کے تجھے مجھے اچھے لگتے تھے۔ اب یہ اُس کے قدموں میں تجھے پیش کرتا ہو گا جو میری جگہ لگا ہو گا .... یہی ہے زندگی... زندگی یہی ہے۔ محبت وہی زندہ رہتی ہے جو دلوں سے اُبھرے اور راہوں میں بچھے .... اس شخص کا میں شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے احساس دلا دیا ہے کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں جو پاؤں پر پیدل چلے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے کو پہچاننے کی انہیں مہلت، فرصت بلکہ ضرورت بھی نہیں ہے۔"

وہ اپنی سوچوں میں کھویا مڑا چلا جا رہا تھا اور اُس کے قدم اپنے آپ اُسے لیے جا رہے تھے۔ اُسے آواز سنائی دی ــــ "او بھائی صاحب، آگے نہ جانا" ــــ وہ رک گیا اور اُس نے ہاتھ اِدھر اُدھر دیکھا جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ ایک کانسٹیبل اُس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ رجب علی سڑک پار کرنے لگا تھا۔ وہ سڑک پر رکا کھڑا تھا۔

"آپ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں" ــــ کانسٹیبل نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔ پھر اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا ــــ "اپنی عزت کا خیال نہیں تو ہماری عزت کا ہی خیال کرو۔ چلو پیچھے۔"

ملک رجب علی نے ماحول کا جائزہ لیا۔ سڑک پر کوئی ٹریفک نہیں تھی۔ ابھی ابھی ٹریفک بند ہی تھی۔ وہی سڑک خالی ہو گئی۔ سڑک پر پولیس کا قبضہ تھا۔ لوگ فٹ پاتھوں پر کھڑے تھے۔ کسی کو سڑک پار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کانسٹیبل جب رجب علی کو دھکیل کر پرے ہٹانے لگا تو ایک اے۔ ایس۔ آئی دوڑا آیا۔ اُس نے رجب علی سے ہاتھ ملایا۔

"یہ جنٹلمز آپ کو جانتا نہیں تھا" ــــ اے۔ ایس۔ آئی نے رجب علی سے معذرت کے لہجے میں کہا ــــ "آپ تو جانتے ہیں کہ یہ حرام خور جب گزرتے ہیں تو پولیس کی ڈیوٹی کیا ہوتی ہے۔"

"کون گزر رہا ہے؟"

"گورنر" ــــ اے۔ ایس۔ آئی نے نفرت سے کہا ــــ "آپ جانتے ہیں وہ جا کہاں رہا ہے؟.... پانی کی ایک ٹینکی تعمیر ہوئی ہے۔ گورنر صاحب اس کے افتتاح کے لیے جا رہے ہیں.... جیسے ٹینکی نہیں ملک کا سب سے بڑا ڈیم تعمیر ہوا ہو.... آیئے، آپ کو سڑک پار کرا دوں۔ اس کے آنے کا کوئی پتہ نہیں۔"

"میں اب ڈی۔ ایس۔ پی نہیں، صفر ہوں" ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "میں اب عوام میں سے ہوں۔ تم اپنی ڈیوٹی پوری کرو۔"

صفر کو ملک رجب علی کے اخراجِ سوخ سے پولیس میں اے۔ ایس۔ آئی لیا گیا تھا۔ وہ اس کا احسان

تھا۔ وہ کچھ دیر رجب علی کو دیکھتا رہا اور رجب علی اُسے دیکھ کر مسکراتا رہا۔ دونوں کو ایک دوسرا نا ہموار نے جیسے بیدار کر دیا ہو۔ اے۔ ایس۔ آئی ملک رجب علی سے ہاتھ ملا کر اور یہ کہہ کر چلا گیا ــــ "عالم پناہ کی سواری آ رہی ہے۔"

رجب علی وہیں کھڑا رہا۔ آگے آگے پولیس کی جیپ تھی۔ پیچھے پولیس کی کار تھی اور اس کے پیچھے اُس وقت کے جدید ماڈل کی کار تھی جس کے آگے پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ کار کے دروازوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ ملک رجب علی کو گورنر نظر آ رہا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ ہلا رہا تھا اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے ــــ "یہ کوئی وزیر ہے؟" ــــ ملک رجب علی کے قریب کھڑے ایک آدمی نے کہا ــــ "انگریز اپنا بلیک لاٹ صاحب پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔"

گورنر بند کار میں ہاتھ ہلا رہا تھا مگر اُسے رک کر دیکھنے والوں میں سے کسی کا بھی ہاتھ نہیں ہل رہا تھا۔ بہت سے لوگ تو اُسے دیکھنے کے لیے رُکے بھی نہیں تھے۔ رجب علی اس شخص کو جانتا تھا۔ بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اتنی قریب سے جانتا تھا جیسے بیوی اپنے خاوند کو اور خاوند اپنی بیوی کو پہچانتا ہے۔ وہ حکمران پارٹی کا آدمی تھا۔ ملک رجب علی ڈان تین جوان اور بڑی ہی خوبصورت عورتوں کو بھی جانتا تھا جو گورنر ہاؤس میں ہوتیں تو صوبائی کی معزز خواتین سمجھی جاتیں اور گورنر ہاؤس سے باہر انہیں صرف پولیس اور کسٹم والے جانتے پہچانتے تھے۔ وہ دنیا میں اس کلاس کی تتلیں جو کہا کرتی ہیں ــــ "میں کسی کی بیٹی نہیں۔"

رجب علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ شخص جو گورنر ہے اور پاکستان کا پرچم لہرا تا گزر گیا ہے شراب کون سی پیتا ہے اور جب گورنر نہیں تھا تو کون سی شراب پیا کرتا تھا اور جب گورنر نہیں رہے گا تو اسی اعلیٰ شراب کہاں سے [illegible]

رجب علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ مملکت خداداد پاکستان کا یہ گورنر پانی کی ایک ٹینکی کا افتتاح کرنے کا تو اس کی تعمیر کے اخراجات کیا ہوں گے ــــ اس ٹینکی کی تعمیر سے پاکستان ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے کہ خود حکومت نے عہد کر رکھا ہے کہ پاکستان کو پانی کے معاملے میں خود کفیل کر دیا جائے گا۔ ایک کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے جو یہ جائزہ لے گی کہ مزید ٹینکیوں کے لیے کون سے ملک کے ٹیوب ویل درکار کیے جائیں۔ صدرِ پاکستان اور وزیرِ اعظم امریکہ سے امداد کے طور پر ٹیوب ویل حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

سابق ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کو یہ بھی معلوم تھا کہ گورنر کی یہ تقریر ٹھیکیدار توجہ اور دلچسپی سے سُنے گا جس نے تین لاکھ روپوں میں ٹینکی تعمیر کر کے دس لاکھ روپوں کا بل وصول کیا ہو گا۔ اور یہ تقریر اُن بڑے صاحبوں اور اُن کے کلرک بادشاہوں کو اچھی لگے گی جنہوں نے اس ٹینکی کا ٹھیکہ دیا، بل پاس کیا، چیک لکھا۔ بڑے صاحب کے دستخط کرائے اور چیک ٹھیکیدار کو دیا ہے ــــ اور کل صبح اخباروں کے پہلے صفحوں پر یہ شہ سرخی ہو گی ــــ "پاکستان ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے۔" ــــ اور اس کے ساتھ گورنر کی دو تین تصویریں ہوں گی۔

اور اس کے بعد اخباروں میں خطوط شائع ہونے لگیں گے کہ فلاں آبادی میں ٹینکی بنے آٹھ نو مہینے گزر گئے ہیں لیکن وہاں کا ٹیوب ویل بیکار پڑا ہے کیونکہ اسے بجلی کا کنکشن نہیں دیا گیا۔ پھر لوگ اس ٹینکی کو اسی طرح دیکھا کریں گے جس طرح دو مغلیہ دور کے کسی بادشاہ کے مقبرے کو دیکھا کرتے ہیں ــــ عوام پانی کی ایک بوند کو ترستے رہیں گے اور گورنر ہاؤس میں شراب کی نہریں بہتی رہیں گی۔

www.iqbalmir.com scanned by iqbalmir@yahoo.com

ملک رجب علی سب کچھ جانتا تھا جیسے دائی عورت کے پیٹ کا حال جانتی ہے۔ اس گورنر نے کتنے آدمیوں کو سیکورٹی ایکٹ کے تحت مقدمے کے بغیر جیلوں میں بند کیا، کتنے شریف لوگوں کو چور، اُچکا، غنڈہ قرار دیا اور کتنے بے گناہوں کو جیلوں سے نکلوایا تھا، ملک رجب علی کو اچھی طرح یاد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک روز یہ گورنر بھی شکار ہُوا انسان بن جائے گا اور جب اس کی پارٹی کی حکومت نہیں رہے گی یا جب اپنی پارٹی کی حکومت میں ہی اس سے کوئی سیاسی بدپرہیزی ہو جائے گی تو یہ فٹ پاتھ پر کھڑا اپنے جانشین کو دیکھ رہا ہوگا اور اگلے روز کے اخبار پڑھ کر کہا کرے گا — بے ایمان، چور۔ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ ایک ٹینکی کی تعمیر سے پاکستان ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے۔ ابھی تک اپنے ملک میں ٹیوب ویل بھی نہیں بنا سکتے..... یہ سب اقتدار کی سیاست کی چکر بازیاں ہیں جی!

ملک رجب علی نے اپنی سوچوں کو اقتدار کی سیاست کے گورنروں، صدروں اور وزیروں کو زمین سے نکال دیا۔ اُسے تسکین سی محسوس ہونے لگی کہ وہ اب عوام کو دھکے دینے والوں میں سے نہیں، دھکے کھانے والے عوام میں سے ہے۔

گورنر نے والا گزر گیا۔ لوگ جو عقیدت سے نہیں، تماشہ دیکھنے رک گئے تھے اور جو روک لیے گئے تھے جوش میں آیا، کھلتے ہوتے چل پڑے۔ پولیس کا ہر فرد جو وہاں جانے کب سے ڈیوٹی پر تھا، اکتایا، اُکتایا سا دکھائی دے رہا تھا۔ ملک رجب علی بھی چل پڑا۔ وہ لوگوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اُن کی سنتا جا رہا تھا۔ پولیس کو بُرا بھلا کہتے جا رہے تھے۔

رجب علی بڑھا نہیں تھا۔ اُس کے پاؤں میں لغزش نہیں تھی۔ ڈاکٹر اسلم کی باتوں نے بہت تک دی تھی، اور جب اُس نے دیکھا کہ لوگ حکمرانوں اور ان کی پولیس کو بُرا بھلا کہتے چلے جا رہے ہیں تو اسے اور زیادہ اطمینان ہوا کہ لوگ جنہیں بُرا بھلا کہہ رہے ہیں، ان میں اب وہ شامل نہیں — وہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں سے چلتا گیا۔

○

ارشد اور طاہرہ اب میاں بیوی تھے۔ شب عروسی دو مہینے پرانی ہو گئی تھی۔ اُس رات ان کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات تھی، اُنہوں نے بہت باتیں کی تھیں۔ رات باتوں میں بیت گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، یادوں کی روشنی میں اُدھر پیچھے ماضی میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے نکلے تو سحر ہو چکی تھی۔ گم گشتہ محبت انہیں مل گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی پہلی محبت تھے مگر حالات نے انہیں ایک دوسرے سے توڑ پھینکا تھا۔ ان کے خوابوں کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔

وہ سرحد پھلانگ گئے اور جلال آباد پہنچے تھے۔ انہوں نے ایک ایک لمحے کو یاد کیا۔ ہر اُس انسان کو یاد کیا جو تحریک پاکستان کے میدان میں ان کے دوش بدوش لڑا تھا۔ وہ جلال آباد سے نکلے تو یادیں چلتے مکانوں میں چلنے لگیں۔ وہاں سے جھلستی ہوئی نکلیں تو خون میں ڈوبنے لگیں۔ ان پر ہندو اور سکھ غرانے اور چھلنے لگے یادیں برچھیوں سے چھلنی اور کرپانوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگیں۔

انہیں وہ پاکستان یاد آیا جس میں وہ خون کے دریا پار کر کے آتے تھے — ارشد چونک اُٹھا جیسے اُسے کوئی بھولی بسری بات اچانک یاد آ گئی ہو۔

"عبدالخلیل خان مارا گیا ہے" — ارشد نے کہا۔

"اور کاہی بھی مارا گیا ہے؟" — طاہرہ نے کہا۔

دونوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ان کے چہروں پر ایک ہی جیسا تاثر آ گیا۔

"کیا یہ وہی پاکستان ہے؟" — طاہرہ نے سکوت توڑا۔

"وہی ہے طاہرہ!" — ارشد نے کہا — "یہ وہی پاکستان ہے۔ شہیدان کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔"

وہ اس پاکستان کی باتیں کرنے لگے جس کی عمر نو سال ہو چلی تھی۔ اُس رات یہ باتیں صرف ارشد اور طاہرہ ہی نہیں، ہر وہ پاکستانی کر رہا تھا جس نے تحریک آزادی میں ذرا سی بھی قربانی دی تھی۔ ارشد اور طاہرہ کی باتوں میں کوئی بات نئی نہیں تھی۔ ان کے پاس کوئی منصوبہ نہیں تھا جو پاکستان کو اقتدار پرست لیڈروں سے بچا کر اس ملک کو ہر سچے پاکستانی کے خوابوں جیسا بنا سکتا۔ ان کے پاس جذبہ اور جوش تھا۔

ایسا ہی جذبہ اور جوش ساری قوم میں تھا۔ قوم کے ہر فرد میں تھا۔ پاکستان کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے کے لیے قوم اب بھی تیار تھی مگر اب قوم افراد میں بٹ گئی تھی — سورج کی کرنیں بکھر گئی تھیں — انہیں بکھیر دیا گیا تھا اور بکھیر اس لیے دیا گیا تھا کہ کرنیں جب ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں تو آگ لگا دیا کرتی ہیں۔ یہی کرنیں جب مرکوز ہوتی ہیں تو برصغیر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ پاکستان جن کے چنگل میں آ گیا تھا وہ جانتے تھے کہ یہ افراد اگر قوم بنے تو مغادپرست لیڈروں کے ٹکڑے کر دیں گے۔

ہر پاکستانی وطن پاکستانی غم و غصے سے جل رہا تھا، جوش و خروش سے پھٹا جا رہا تھا مگر ہر شخص کی توانائی ضائع ہو رہی تھی۔ یہی حال ارشد اور طاہرہ کا تھا۔ ہر پاکستانی کی طرح وہ بھی سمجھتے تھے کہ پاکستان کی کایا پلٹ دیں گے مگر ان کی جوش و جذبے سے پھٹ جانے والی سوچیں جذبہ جھاگ بن کر اُڑ جاتی تھیں اور عفریت منہ کھولے سوچ رہے تھے: "کیا یہ اجڑتی ہوئی نسل اس پاکستان سے محبت کر سکے گی؟" — طاہرہ نے کہا۔

"اپنے بچوں کے دلوں میں وطن کی محبت ہم پیدا کریں گے" — ارشد نے کہا — "طاہرہ پرویز صرف اُس حکومت میں پاسبان وطن بنے گا کہ ہم اسے بتائیں کہ پاکستان کی ماتیں بچوں کو سینے سے لگانے کے لیے نہیں جنا کرتیں۔"

ارشد اور طاہرہ طاہر پرویز کی تعلیم و تربیت کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ پھر ازدواجی زندگی کی پہلی رات گزر گئی۔

○

ان دو مہینوں میں پاکستان میں کوئی انقلاب نہ آیا۔

اپنی دو جاسوس لڑکیوں کے قتل سے ہندوستان کی انٹیلی جنس میں ذرا سی ہلچل پیدا ہوئی۔ راوھا اور کرن کے نام جاسوسوں کی فہرست سے کاٹ دیے گئے اور ان کی جگہ دو اور نام لکھ دیے گئے اور خفیہ فہرست میں ان دو نئے ناموں کے آگے لکھ دیا گیا — "پاکستان"۔

ہندوستان کے جاسوس کو ختم کرنے کی جو تحریک عبدالخلیل خان نے شروع کی تھی وہ اُس کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی۔ اس شخص نے جو گروہ بنایا تھا وہ بکھر گیا اور قتل جذبے سینوں میں قید ہو گئے۔

ہندوستان کا سفارت خانہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔

پاکستان کے حکمرانوں کی پولیس کا خفیہ شعبہ ان کے سیاسی مخالفین کو ہراساں اور گرفتار کرتا رہا۔

iqbalmt@ohearn.com scanned by

الیکزیشن پارٹیاں برسرِ اقتدار پارٹی کو ذلیل و رسوا کرنے کا ہر حربہ استعمال کرتی رہیں۔ دونوں دھڑے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے جبکہ ان پارٹی کے اخباروں کے مطابق پاکستان خوش حال ملک تھا اور ہر کسی کو انصاف مساوی اور مفت ملتا تھا جبکہ اپوزیشن کے اخباروں کے مطابق پاکستان ایک کنگال اور بھکاری ملک بن چکا تھا جہاں کے عوام کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بھوکے پیاسے مر رہے تھے۔ ان کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔

ہر فرد عوام جانتے تھے کہ وہ کس حال میں جی رہے ہیں۔ پاکستان کی عمر کے نویں سال بھی بے گھر اور بے آسرا مہاجرین کو معلوم تھا کہ پاکستان کی قیمت کیا ہے۔ اقتدار کی سیاست کے لیڈروں کو یہ تو یاد رہ گیا تھا۔۔۔ "پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ" — لیکن وہ بھول گئے تھے کہ پاکستان کی قیمت کیا ہے۔ ان کی دھواں دھار تقریروں کا اور ان کی گرما گرم پریس کانفرنسوں کا نشانہ اور ہدف تھا — اقتدار اور صرف اقتدار!

ان دو مہینوں میں پاکستان دو سال اور پیچھے چلا گیا تھا۔

ہمارے ازلی دشمن ہندو نے جب دیکھا کہ پاکستان کی حکومت کو معذوم ہی نہیں ہو سکا کہ جو دو ایک [illegible] گئی ہیں وہ ہندوستان کی جاسوس تھیں اور ریٹائرڈ اے۔ ایس۔ آئی عبدالقدیر بھی ہندوستان کا ایجنٹ نکلا تو اس نے پاکستان میں مزید انسانی بارودی سرنگیں بچھا دیں۔ ہندوؤں کو پتہ چل گیا کہ پاکستان کے لیڈر اقتدار اور سرحد کے پیچا پنا رنگ چڑھا کر اسے سیاسی معرکہ آرائی میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے میں تو ہندوؤں نے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے انتظامات پہلے سے زیادہ تیز رفتار اور تباہ کن کر دیئے۔

○

ایک رجب علی تھا جس کی ذات اور جس کے گرد میں انقلاب آ رہا تھا۔ ایک اوسط درجہ کا انسان تھا۔ کبھی تو وہ اس اذیت سے گھبرا کر فرار کی راہیں ڈھونڈنے لگتا اور کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین کی باتیں اسے نیا حوصلہ اور نیا ولولہ دے دیتیں اور وہ مستقبل سے سرشار ہو جاتا مگر بعض حقائق بازل سے سہلا نہیں کرتے۔ جب یلغار کرتے ہیں تو بڑے بڑے جابروں اور حوصلہ مندوں کے بھی پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔

رجب علی کو سب سے بڑی جس حقیقت کا سامنا تھا وہ اس کی اپنی ذات تھی۔ اُس کا اپنا ذہن اور اس کی سوچیں تھیں۔ ریٹائرڈ انسپکٹر عبدالجلیل خان ایک دانا کی طرح اور کبھی آسیب کی مانند اُس پر غالب آیا تھا۔ پہلے اُس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اتنا ہی بتایا تھا کہ اُسے نیند نہیں آتی اور اس کے خیالات پریشان رہتے ہیں لیکن اس کے کچھ دنوں بعد اُس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنی جو کیفیت بتائی اس سے ڈاکٹر بھی پریشان ہو گیا۔

"آپ نے میری کوٹھی دیکھی ہے" — اُس نے ڈاکٹر کو بتایا۔ "بہت بڑی ہے۔ اس کے بہت سے کمرے ہیں۔ اس میں رہنے والا میں اکیلا ہوں۔ ایک خانساماں ہے اور ایک نوکر۔ کبھی یہ کوٹھی پُر رونق ہوتی تھی۔ جس کے دم قدم سے رونق تھی وہ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ پہلے والدہ پھر والد صاحب اللہ کو پیارے ہوئے۔ پھر بھائی جان بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پیچھے ان کی بیوی اور دو بچوں کی رونق رہ گئی تھی مگر بھائی نے ہمارے ایک دشمن خاندان کے ایک آدمی کے ساتھ شادی کر لی اور بچوں کو لے کے چلی گئی۔ میں نے بیوی سے کہہ دیا تھا کہ بچوں کو ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ گئی۔ اب میں ہوں اور اتنی بڑی کوٹھی کی تنہائی ہے۔ وحشت ہوتی ہے وہاں ڈاکٹر صاحب! وحشت۔۔۔۔ اگر آپ نے بھی سجائی، ایرانی قالینوں اور نفیس قیمت فرنیچر سے مزین کمروں کی وحشت دیکھی

نہ دیکھی ہو تو میری کوٹھی میں دیکھ لیں۔۔۔۔

"بیوی کے مرنے کے بعد مجھے کئی لوگوں نے بیٹیاں پیش کیں۔ یہ سب کنواری تھیں، بیوہ کوئی بھی نہیں تھی۔ میں نے کسی کو قبول نہ کیا۔ یہ لوگ مجھے نہیں میری کوٹھی، میری جائیداد اور میری ان زمینوں کو بیٹیاں دے رہے تھے جو کسی کو میرے جذبات سے ذرا سا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ کبھی کبھی کو میری تنہائی پر رحم نہیں آتا تھا۔ وہ رجب علی کو نہیں بلکہ ایکڑ، ڈی۔ ایس۔ پی کو جو صاحبِ جائیداد بھی تھا اپنی بیٹیاں پیش کر رہے تھے۔۔۔۔

"اور ڈاکٹر صاحب! میری کوٹھی میں شام کے بعد سیلز لگ جایا کرتا تھا۔ یہ لوگ بھی رجب علی کے پاس نہیں، ایک ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان میں میرے ماتحت ہوتے تھے۔۔۔۔ انسپکٹر، سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل۔۔۔۔ یہ سب خوشامدی تھے۔ وہ سب سے پہلے میرا ٹروڈ دیکھتے تھے۔ میں ٹرسٹ آلا تروڈ قہقہے لگاتے تھے۔ میرے چہرے پر سنجیدگی ہوتی تو وہ منہ بسور لیتے تھے۔ میں ان کو رات کھول تو وہ پولیس والی وردیاں دے کر خجالت کر دیتے تھے کہ یہ وردیاں رات ہے۔۔۔۔

"ان کے علاوہ میرے پاس وہ لوگ آتے تھے جن کا پولیس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب بیچل ہوتے تھے۔ ان میں گاسے ماچھے نہیں، اونچی سوسائٹی کے، آپ کی اور میری سوسائٹی کے لوگ ہوتے تھے۔ ان میں بیوپاری لیڈر بھی ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی غیبت کرنے آتے تھے؛

"ڈاکٹر صاحب! تمہارے پاس نہیں رجب علی جی — ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا — "تمام بڑے افسروں کے پاس بھی خوشامدی اور چغل خور جایا کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ترقیاں انہی لوگوں کی جھولی میں گرا کرتی ہیں اور روکی جاتی ہیں؟۔۔۔۔ کامیاب نظام ان تین چیزوں پر چل رہا ہے۔۔۔۔ خوشامد، چغلی اور رشوت۔۔۔ چڑیا سی سے چیئرمین تک خوشامدی، چغل خور اور رشوت خور ہیں۔ حکومت کے اندر کے جز تو خوشامد اور چغلی سے ہوتے ہیں۔ وزارتیں انہی سے بنتی اور بنتی ہیں۔ مشورے اُن کے قبول ہوتے ہیں جو خوشامد اور چغل خوری کے ماہر ہوتے ہیں:

"اور یہی تین چیزیں پاکستان کو لے ڈوبیں گی — رجب علی نے کہا — جس طرح آپ انسان کے جسم کے اندر کی مشینری کو سمجھتے ہیں اور کوئی نقص ہو تو اس کی نشاندہی فوراً کر دیتے ہیں۔ اسی طرح پولیس کا ہر ایک ای ہیں پی اور اس سے اوپر کے افسر جانتے ہیں کہ پاکستان کے قصرِ صدارت سے لے کر چونگی کے محرر تک سرکاری مشینری کس طرح چل رہی ہے۔ اس کے نقائص کی نشاندہی صرف ہم لوگ کر سکتے ہیں۔۔۔۔

"ذرا گہری نظر سے دیکھیں کہ قوم کو کس طرح ذہنی طور پر مفلوج کیا جا رہا ہے۔ مجھے ذہنی مریض بنا دیا گیا ہے۔ اب جب خود مجھ پر بیتی ہے تو میں مجاہدوں کو جسے کوئی غلط کام کرنے سے انکار پر نہ صرف نوکری سے برطرف کر دیا جاتا ہے بلکہ اس کی برطرفی کی رپورٹ میں یہ لکھا جاتا ہے کہ اس نے مجرموں کو سزا سے بچانے کی کوشش کی اور رشوت لی۔ اُس انسان کا دماغی توازن کھو بیٹھنا حیران کن نہیں ہوتا۔ مجھ جیسے کئی ہیں جو گھروں میں بیٹھے خون جگر پی رہے ہیں۔۔۔۔

"قوم کو چوروں اور اٹھائی گیروں کے رحم و کرم پر ڈال کر اور قوم کو انصاف سے محروم کر کے اور رنڈی کے بھاؤ چڑھا کر اور اس ملک کو پولیس سٹیٹ بنا کر نفسا نفسی کی ایسی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے کہ قوم افراد میں بٹ گئی ہے۔ جھاڑو کے تنکے بکھر گئے ہیں۔ ایک تنکا ملک سے برائیوں اور قباحتوں کو صاف نہیں کر سکتا۔ تنکا جو جھاڑو سے الگ ہوتا ہے وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ شاخ جو شجر سے الگ ہو جاتی ہے سوکھ جاتی ہے۔ قوم کے

iqbalmt@ore.com.pk scanned by

افراد کا یہی حال ہو رہا ہے۔"

○

"ہم بہت دور نکل گئے ہیں۔" ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا۔ "تم اپنی بات کر رہے تھے۔ اپنی ہی بات کرو۔ میں یہی کہہ رہا تھا کہ اب ہر پاکستانی اپنی ہی بات کرتا ہے۔" رجب علی نے کہا۔ "میں پھر کہہ رہا ہوں۔ میرے بچے برباد ہیں۔ ایک جائز کام کی مجھ سے رشوت لی گئی ہے۔ میرا گھر لٹ گیا ہے۔ ۔۔۔ قوم کو پستی کے اس مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں ہمارا وطن ہے۔ پاکستان یا موت۔ بے معنی ہو کے رہ گیا ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ سارا پاکستان بیمار ہے، سارا پاکستان رشوت دے رہا ہے، پاکستان لٹ رہا ہے، پاکستان آٹے کی بھیک مانگ رہا ہے۔"

ملک رجب علی بولتا جا رہا تھا۔ زبان رک نہیں رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ کے آثار بڑے صاف تھے۔ رجب علی نے اپنی بات کا رُخ پھیر دیا۔

"میں اپنی کوٹھی کی ویرانی کی بات کر رہا تھا۔" اس نے کہا۔ "جس کوٹھی میں شام کے بعد پرندہ پر نہیں مارتا تھا وہاں اب اُلو بولتے ہیں۔ اب وہاں کوئی نہیں آتا۔ کوئی نہیں آتا ڈاکٹر صاحب!" ۔۔۔ دفعتہً رجب علی کا لہجہ بدل گیا اور بدلی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "صرف دو آتا ہے۔۔۔۔ دوسری تیسری رات آجاتا ہے۔" ۔۔۔ اور اس نے خلا میں گھنگی باندھ لی۔

"وہ کون؟" ۔۔۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے پوچھا۔

ملک رجب علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"میں نے پوچھا ہے وہ کون ہے؟" ۔۔۔ ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "رجب! کس کی بات کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس شخص کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی جو رجب علی کے گھر جاتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر اس کی نفسی کیفیت سے چونک پڑا تھا جو اچانک اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رجب علی کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں رہی۔

"رجب علی!" ۔۔۔ ڈاکٹر نے اب اُسے ذرا زور سے جھنجھوڑا اور پوچھا۔ "باتیں کرتے کرتے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کون دوسری تیسری رات آجاتا ہے؟"

"عبدالجلیل خان!" ۔۔۔ رجب علی نے کہا۔ "صرف عبدالجلیل خان میرے پاس آتا ہے۔" ۔۔۔ رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے کہا۔ "میں نے اُسے دن کے وقت بھی اپنی کوٹھی میں دیکھا ہے۔"

"تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی رجب علی!" ۔۔۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہیں کیا نظر آتا ہے۔ تمہارا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ اب تمہیں تمہارا کوئی علاج کرانا پڑے گا۔"

○

تقریباً ایک مہینہ گزرا۔" ۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔ "میں کوٹھی میں اکیلا بیٹھا تھا۔ سامنے دیوار پر والد صاحب کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میری نظریں اس تصویر پر جم گئیں۔ ایسے لگا جیسے تصویر نے مجھے جپھا مار کر میرے دماغ اور سر سے جسم پر اس تصویر نے قبضہ کر لیا۔ میں کوشش کے باوجود نظریں تصویر سے ہٹا نہ سکا۔ آپ اسے واہمہ

کہیں مجھے لیکن حقیقت ہے کہ میں نے تصویر کی آنکھیں بند ہوتے دیکھیں اور ذرا سی دیر بعد تصویر نے آنکھیں کھولیں تو میرے والد صاحب کا چہرہ عبدالجلیل خان کا چہرہ بن گیا۔ میں نے عبدالجلیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی اور مجھے اُس کی آواز سنائی دی۔ "ملک! تم میری ہڈیاں توڑ سکتے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے اور آخری سانس تک سلامت رہے گا۔"۔۔۔

"ڈاکٹر صاحب! میں کمزور دل تو نہیں لیکن میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ تصویر کا چہرہ اور یہ پھر میرے والد صاحب کی تصویر بن گئی۔ مجھے ایک اور آواز سنائی دی۔ "یہ کوئی پینچ والا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت ہے۔" ۔۔۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی ہر چیز کو دیکھا۔ کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟۔۔۔ یہ خواب نہیں تھا۔ یہ میرا تصور بھی نہیں تھا۔"

"یہ جو کچھ بھی تھا تمہارے لیے ٹھیک نہیں تھا۔" ۔۔۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا۔ "تم نے عبدالجلیل کو اپنے ذہن پر سوار کر لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ تم نے اپنے ایک گناہ کو اپنے ذہن میں زندہ اور تروتازہ رکھا ہوا ہے۔ اسے ذہن سے نکالو۔ گناہ جو ہو چکے، لغزشیں جو ہو چکیں، انہیں بھول جاؤ۔ یہ گناہ کا احساس یا پچھتاوا ضمیر کو دبائے رکھتا ہے۔ پہلے ذہن بگڑتا ہے۔ پھر انسان کا دماغی توازن خراب ہوتا ہے یا جسمانی مشینری میں بگاڑ پیدا کرتا ہے۔"

"اُسی رات کا واقعہ ہے۔" ۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔ "رات شاید ابھی آدھی ہی گزری تھی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کسی نے میرے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو پکڑ کر کھینچا بھی تھا اور دائیں بائیں ہلایا بھی تھا۔ اگر یہ میرا وہم یا خیال ہوتا تو مجھے کیسے پتہ چلتا کہ کسی نے میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ابھی کسی نے مجھے انگوٹھے سے پکڑ کر ہلایا ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیبل لیمپ جلایا۔ کسی سنسناتی سی دی۔ میں نے دروازہ دیکھا۔ چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے کواڑ کھلے ہوئے تھے جو میں ہوا کے لیے کھول کے رکھتا ہوں۔۔۔۔

"ایک خیال یہ آیا کہ مجھے قتل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے جن کے راز میرے سینے میں ہیں، انہوں نے کرائے کے کسی قاتل کو بھیجا ہو گا لیکن میری آنکھ کھل گئی۔۔۔۔ یہ قاتل نہیں تھا۔ مجھے جگانے کی اُسے ضرورت تھی۔ میں ریوالور تیار رکھتا ہوں۔ ریوالور اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ کوٹھی بالکل خاموش تھی۔۔۔۔ میں اب بھی ہنسی کی ہلکی ہلکی مدھم مدھم سی سن رہا تھا۔ میں اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازے اور کھڑکی کی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ میں ڈر رہا تھا۔ اگر یہ کوئی زندہ انسان ہوتا تو میں اسے للکارتا لیکن وہ عبدالجلیل تھا۔ میں نے آیت الکرسی پڑھی اور لیٹ گیا مگر باقی رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں کمرے میں کسی ایسی چیز یا کسی ایسے انسان کی موجودگی محسوس کر رہا تھا جسے انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔"

○

"اگلی رات پھر ایسے ہی ہوا۔" ۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔ "میرے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کو کسی نے کھینچا اور ہلایا۔ میں جاگ اُٹھا اور ہاتھ لمبا کر کے ٹیبل لیمپ جلایا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن میں نے کل رات والی ہنسی سنی۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ ہنسی تھی اور کبھی سوچتا ہوں کہ کسی کی سسکیاں تھیں۔ دروازے کی اندر کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ یہ کوئی چور نہیں تھا۔ کوئی قاتل بھی نہیں تھا۔ چور اور قاتل اپنا کام کر کے کھسک

iqbalmt@oneurdu.com scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جاتے ہیں۔ ہنستے یا سسکتے نہیں....

"اگلی رات پھر ایسے ہی ہُوا تو میں جاگ کر پلنگ پر بیٹھا رہا۔ ٹیبل لیمپ نہ جلایا۔ میں نے کہا — 'عبدالجلیل! میں تمہارا قاتل ہُوں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں تمہیں قتل کر کے خوش نہیں ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اذیت میں ڈال دیا ہے۔ نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں تمہیں دنیا میں واپس نہیں لا سکتا۔ میں گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں'.... ڈاکٹر صاحب! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ مجھے کمرے میں کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ میں نے ٹیبل لیمپ جلا دیا اور تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ اُف میرے خُدا! میں نے کیا منظر دیکھا۔ کمرے کے فرش پر عبدالجلیل بیٹھا تھا۔ اُس کا سر سینے پر ڈھلک گیا تھا اور اُس کے منہ سے خون کے ایک دو قطرے اُس کی قمیض پر گرے۔ میں پلنگ سے اٹھ کر اور ریوالور پھینک کر اُس کی طرف لپکا مگر عبدالجلیل وہاں نہیں تھا۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کے چہرے پر پریشانی صاف نظر آنے لگی تھی۔ اُس کے گھریلو دوست ملک اللہ یار خاں مرحوم کا بیٹا ذہنی طور پر نارمل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ حادثہ ہُوا تھا۔ اس سے ایک غلط کام کرایا گیا اور اُس نے اپنی نوکری ختم کر ڈالی تھی۔

"عبدالجلیل کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ رات کو کوئی چور، ڈاکو یا قاتل نہیں آتا" — رحیب علی نے کہا — "میرے ہاتھ سے میرے دل سے قتل ہونے کا ڈر نکل گیا لیکن مجھ پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ خدا نے مجھے معاف نہیں کیا اور میرے مقتول کی روح ساری عمر میری تنہائی کی ساتھی بنی رہے گی۔"

"اس کے بعد بھی تمہیں وہ نظر آیا ہے؟"

"ایک بار نہیں کئی بار" — رحیب علی نے کہا — "کبھی تو میں اسے دیکھ کر ہفتوں تک پریشانی میں مبتلا رہتا ہوں اور کبھی میں اُس سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا ہوں تو میری روح مطمئن ہو جاتی ہے۔"

"وہ تمہیں اسی حالت میں نظر آتا ہے؟" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے پوچھا — "کیا مطلب ہے؟ مرا ہُوا؟"

"کبھی زخمی حالت میں اور کبھی بالکل تندرست و توانا" — ملک رحیب علی نے کہا — "جس رات اُسے پہلی بار دیکھا تھا اس سے ایک رات بعد میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا تو مجھے کھلی ہوئی کھڑکی میں کسی لڑکی کی آہٹ سنائی دی۔ وہ سایہ سا تھا۔ یہ واہمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی زندہ آدمی کھڑا تھا۔ میرے لیے آسان تھا کہ ریوالور نکال کر اُسے گولی مار دیتا لیکن اسے زندہ پکڑنا بہتر سمجھا۔ میں آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا کہ اندھیرے میں مجھے اس سائے کے خدوخال نظر آنے لگے — وہ عبدالجلیل تھا — میں نے ٹیبل لیمپ نہ جلایا۔ پلنگ سے اٹھا بھی نہیں۔ میں نے کہا — 'تم نے میری معافی قبول نہیں کی؟ میں تمہیں اپنی جان پیش کرتا ہُوں، پھر میں بھی تمہاری طرح روح بن کر بھٹکتا رہا کروں گا۔ مجھے جیتے جی سزا نہ دو'....

وہ مُسکرایا اور اُس کے آنسو بھی نکل آئے۔ اُس کے ہونٹ کانپے مگر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے اُسے کہا — 'میں تم سے بدتر ہوں۔ میں حقیر ہوں' — میری آواز اپنے آپ ہی بلند ہو گئی — 'میں قابلِ نفرت ہوں' — میں نے اُس کی آواز سنی — 'عظیم اور بدتر ہی رہو گے۔ میں بھی پولیس آفیسر تھا لیکن میں مر کر بھی زندہ ہُوں، تم زندہ رہ کر بھی مرے ہوئے ہو۔ میرا ایمان سلامت ہے۔ تمہارا ایمان کہاں ہے؟ اپنا ایمان ڈھونڈو' — اور وہ اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔"

"رحیب!" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے جھنجلائے ہُوئے لہجے میں کہا — "یہ تمہارے اپنے ذہن کی آواز ہیں۔ جتنا جلد اس کے کہ یہ تمہارے ذہن لاشعور میں اُتر جائیں انہیں ذہن سے نکال دو۔ تم ان پڑھ نہیں ہو، گنوار اور سادہ نہیں ہو۔ اپنے اوپر احساسِ گناہ و ندامت کے رکھنے کے نتائج بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ تم اب گناہ گار نہیں ہو۔"

"لیکن وہ کہتا ہے کہ میں آتا رہوں گا" — رحیب علی نے کہا — "دو رات بعد وہ پھر آیا تھا۔ میرے کمرے میں ٹہلتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔"

"یہی باتیں کرتا رہا ہو گا جو تم مجھے سنا چکے ہو؟"

"نہیں" — رحیب علی نے کہا — "کہتا تھا — 'تم نے مجھے مار ڈالنے سے پہلے استعفیٰ کیوں نہ دے دیا؟ تم مجھے قتل کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے' — میں نے اُس سے التجا کی — 'جلیل! خدا کے لیے مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ تمہارا قتل میرا حکم نہیں تھا' — اُس نے کہا — 'اور یہ حکم خدا کا بھی نہیں تھا۔ انسان جب خُدا بن جاتے ہیں تو وہ نہیں سمجھتے کہ ایک دروازہ بند پڑے جائیں گے اور اندر کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے.... تُو نے جس پینے والے تانگہ بان کا ایمان دیکھا ہے؟' — مجھے جھرجھری آگئی اور جب میں ذرا سنبھلا تو کمرے میں تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

"بہت دیر بعد میری آنکھ لگی۔ اگر نوکر مجھے نہ جگاتا تو میں دن بھر سویا رہتا۔ نوکر کی آواز پر آنکھ کھلی تو میرے ذہن میں سب سے پہلے جو چیز آئی وہ چرس آئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کہیں گے کہ میں دماغی توازن کھو بیٹھا ہوں لیکن میرا ذہن جسمانی دنیا سے کٹ چکا تھا۔ عبدالجلیل نے کہا کہ تُو نے چرس پینے والے تانگہ بان کا ایمان نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا تھا ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کو کالے تانگے والے کی ساری بات سنائی تھی.... مجھے نوکر نے جگایا تھا۔ میرے ذہن میں چرس تھی۔ میں نے نوکر سے کہا کہ مجھے تھوڑی سی چرس لا دو۔ اُس نے مجھے حیران ہو کر دیکھا۔ میں نے پھر کہا کہ مجھے تھوڑی سی چرس لا دو۔ اُس نے کہا — 'ملک صاحب! دسکی کی آدھی بوتل پڑی ہے' — میں نے غصے سے کہا — 'تم جانتے ہو کہ جب سے استعفیٰ دیا ہے میں نے شراب نہیں پی۔ میں کہہ رہا ہوں چرس لا دو'....

"اور وہ چرس لے آیا۔ میں نے چرسیوں کی طرح سگریٹ میں چرس بھری۔ نوکر میرے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میں جب سگریٹ مُنہ میں لینے لگا تو ایک اور سگریٹ اور میرے منہ کے درمیان آ گیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ ہاتھ میرے نوکر کا تھا۔ میں نے اُس کے منہ کی طرف دیکھا تو اس نے کہا — 'چرس کوشش نہیں لگانے دوں گا' — میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس نے میرا غصہ بھی سلب کر لیا تھا۔ وہ میرا نوکر تھا جیسے گھروں میں نوکر ہوتے ہیں۔ مالک کو خوش کرنے کو احسان سمجھتے ہیں لیکن میرے نوکر نے میرے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا اور بولا — 'میں آپ کی خوبیوں کا بھی خادم ہوں۔ لعنت ہے میری وفاداری پر کہ میں آپ کو چرس پینے دوں۔ بہت بڑی چیز ہے ملک صاحب! میرا باپ چرسی نہ ہوتا تو میں گھروں میں نوکری نہ ڈھونڈتا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نہ ہوتا تو انسپکٹر نہ ہوتا.... اگر آپ کو میری یہ حرکت بُری لگے تو مجھے معاف کر دیں یا گھر سے نکال دیں۔ چرس نہیں پینے دوں گا' — میں نے سر سے اشارہ کیا کہ جاؤ....

"وہ سگریٹ لے گیا۔ باقی چرس بھی لے گیا۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں سے دیکھنے لگا۔ نوکر مجھے دکھائی دیا۔ اُس نے چرس کوٹھی سے باہر پھینک دی اور سگریٹ مروڑ اور مسل کر پھینک دیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور خیال آیا کہ اس کی جگہ وہ خوشامدی ہوتے جو میرے زرخرید غلام بنے رہتے تھے تو وہ چرس

iqbalmt@onelurdu.com scanned by
خوبصورت لوگوں کی محفل

کی تعریف کرتے اور اگلے روز ان میں سے ہر ایک باری باری حاضر کرتا۔"

"کچھ سمجھے رجب علی؟" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا — "علم اور ایمان کتابوں میں نہیں، دولت میں نہیں اور جاگیرداری میں نہیں۔ علم یہ ہے جس سے ایک اَن پڑھ نے تمہیں پڑھایا اور ایمان یہ ہے جو اس گنوار نے تمہیں دکھایا ہے۔ اس نے حقِ نمک ادا کیا ہے۔ اس نے تمہاری خوشنودی کو اور اپنی نوکری کو تمہارے بھلے پر قربان کر دیا تھا، اور تمہارا غصہ اس لیے سلب ہو گیا تھا کہ وہ حق پر تھا۔ وہ سچ بات کہہ رہا تھا۔"

"سب کچھ سمجھنے کے باوجود ایسے لگتا ہے جیسے میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا" — رجب علی نے کہا — "میں تو اب اپنے نوکر کا سامنا کرنے سے بھی گھبراتا ہوں..... میں نے سوچا کہ شہر سے نکل جاؤں۔ میں اپنی زمینوں پر چلا گیا۔ میرا چھوٹا سا ایک مکان وہاں بھی ہے۔ نوکر چاکر ساتھ تھے۔ مزارعے بھی تھے۔ انہوں نے مجھے شہزادہ بنا دیا مگر وہ میرے دل کا حال نہ سمجھ سکے۔۔۔

"میں سورج غروب ہونے سے پہلے کھیتوں کو نکل گیا۔ بہت خوبصورت ماحول تھا۔ فضا خوشگوار تھی۔ میں لہلہاتے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آگے ویرانے میں چلا گیا۔ میں چلا جا رہا تھا۔ اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ خیال آیا کہ جھاڑیوں میں سے ہوا گزر کر گا گزر رہا ہوگا۔ میں اطمینان سے چلنے لگا۔ ایک آدھ منٹ بعد مجھے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے پہچان لی۔ میں اس ہنسی کو پہچانتا ہوں۔ عبدالجلیل کی ہنسی تھی یہ۔۔۔۔

"میں رک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ایک درخت سے ایک گدھ اُڑا۔ اسے لگا جیسے پہلے بھی اسی کے پروں کی آواز تھی، ہنسی نہیں تھی لیکن وہ سامنے آ گیا۔۔۔ عبدالجلیل خان۔۔۔۔ آپ نے اسے دیکھا نہیں تھا ڈاکٹر صاحب! بہت خوبصورت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر نُور تھا۔ وہ مجھ سے دس بارہ قدم دور ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ میں رک گیا، بلکہ زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں اونچی آواز میں بولا تھا یا نہیں لیکن میں کچھ کہہ رہا تھا — 'خدا کے لیے مجھے بخش دو جلیل، یا مجھے بتا دو کہ میں تمہاری خوشی کے لیے کیا کروں'۔۔۔ وہ مُسکرایا اور بولا — 'جرس تمہیں اذیت سے نہیں بچا سکتی۔ شراب تمہاری روح کو سکون نہیں دے سکتی' — اور وہ غائب ہو گیا۔۔۔۔

"میں کہاں تک سناتا چلوں ڈاکٹر صاحب! وہ آتا ہے اور ایسی ہی کوئی بات کہہ کر چلا جاتا ہے۔ میری نیند ختم ہو گئی ہے۔ سکون ختم ہو گیا ہے۔۔۔۔ یہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟ میرے مُنہ کی رَوہیں اس طرح نظر آیا کرتی ہیں؟ کیا مجھے کسی پیر فقیر کے پاس جانا پڑے گا؟"

"ڈاکٹری میں اس کا علاج سکتن اور خواب آور گولیاں ہیں جو میں تمہیں نہیں دوں گا" — ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا — "میں نے تمہیں اُس روز بھی بتایا تھا کہ تمہیں مصنوعی اور جھوٹے سہارے اور زیادہ خراب کریں گے۔ ذہنی سکون اور نیند کی گولیاں ذہنی بیساکھیاں ہیں۔ اپنے پاؤں چلو۔ تم جس عبدالجلیل کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ایک واہمہ ہے۔ یہ روح یا بدروح نہیں۔ یہ ایک جرم کا احساس ہے جس نے تمہارے دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ کنفیسر کی گرفت ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ تم سنبھل جاؤ گے رجب! تم سنبھل جاؤ گے۔ گناہ کا کفّارہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نیکی کرو۔ نیکی اور بدی کے درمیان ایک خلا ہے، تم اس میں بھٹک رہے ہو۔ عبادت کرو۔ دکھی انسان کے دکھ اپنے سینے میں ڈال لو۔ بہترین علاج تو یہ ہے کہ شادی کر لو۔ زندگی کا ساتھی ڈھونڈ لو۔"

"شادی نہیں کروں گا" — ملک رجب علی نے کہا — "ہو سکتا ہے میں پاگل ہو جاؤں۔ ہو سکتا ہے میں خودکشی کر لوں۔ کیوں کسی عورت کی زندگی تباہ کروں؟"

"پھر میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔"

✪

ملک رجب علی نے وہی کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے خانساماں کا ایک لڑکا جس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی کسی ہوٹل میں اور اس سے چھوٹا کسی گھر میں نوکر تھا۔ رجب علی نے خانساماں سے کہا کہ وہ دونوں کو نوکری سے ہٹا لے اور شام کو انہیں کوٹھی میں لے آیا کرے۔ دونوں چونکہ سکول میں داخل ہونے کی عمر سے بہت آگے چلے گئے تھے اس لیے رجب علی نے ان کے لیے ایک سکول ماسٹر کے ساتھ بات طے کر لی جس نے کوٹھی میں آ کر دونوں بچوں کو روزانہ گھنٹے دو گھنٹے روزانہ پڑھانا شروع کر دیا۔ رجب علی نے ان کے لیے نئے کپڑے سلوائے اور ان میں دلچسپی لینے لگا۔

اُس کے ذہن میں اب یہی ایک مسئلہ رہتا تھا کہ وہ اور کس کس کو اپنی پناہ میں لے کر اُس کا مستقبل سنوارے۔ اُس نے تین اور غریب بچوں کے ماہوار وظیفے لگا دیے۔

ایک روز اُس نے سوچا کہ کسی ایسے سکول کے ہیڈ ماسٹر سے ملے جہاں غریبوں کے بچے پڑھتے ہیں اور جو ایک بچوں کی کم از کم فیسیں اپنے ذمے لے لے۔ اس کی اپنی سوسائٹی میں کوئی بچہ کسی کا محتاج نہیں تھا۔ اس کی کوٹھی شہر کے پرانے حصّے میں ہی تھی۔ ایک روز وہ پیدل چلتا ایک ہائی سکول کے صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ اسے ہیڈ ماسٹر سے ملنا تھا لیکن وہ صدر دروازے میں ہی رُک گیا۔ وہاں تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا اپنے ہاتھ میں بستہ اٹھا رکھا تھا اور وہ بہت اداس تھا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رو رہا ہے۔ بچے کلاسوں میں پڑھ رہے تھے اور یہ بچہ اکیلا باہر اُداس کھڑا تھا۔

"اتنی دیر سے آتے ہو اس لیے اندر جانے سے ڈرتے ہو؟" — رجب علی نے اُس سے پوچھا۔

لڑکا اس قدر غمگین تھا کہ اُس کے مُنہ سے جواب نہ نکلا۔ اُس نے سر ہلایا کہ نہیں، وہ دیر سے نہیں آیا۔ رجب علی نے دیکھا کہ بچہ غریب سا تو لگتا ہے لیکن چہرے سے کسی شائستہ گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔ رجب علی اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ بچے کی آنکھوں سے آنسو ئیر نکلے۔ رجب علی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے تم کیوں رو رہے ہو؟"

بچے نے ہاتھ سے دونوں آنکھیں پونچھیں اور رُندھی ہوئی آواز میں بولا — "ماسٹر صاحب نے بیت بیٹا ہے اور کلاس سے نکال دیا ہے۔"

"کوئی شرارت کی تھی؟"

"نہیں جی!" — اُس نے سسکتے ہوئے کہا — "میرے پاس دو کتابیں نہیں ہیں۔ میں خرید نہیں سکتا۔ آنی کرا بھی پیسے نہیں ملے۔ ماسٹر ہر روز کہتا تھا کہ کتابیں لاؤ۔ کل اُس نے مجھے غدّار کا بچہ اور ڈاکو کی اولاد کہا تھا۔"

"تمہارا باپ زندہ ہے؟"

"اگر وہ زندہ ہوتا تو مجھے غدّار کا بچہ اور ڈاکو کی اولاد کہنے والا ماسٹر زندہ نہ ہوتا" — بچے نے غصے سے جواب

iqbalmt@onedrive.com scanned by

دیا اور اُس نے دانت پیس کر کہا — آج چھوڑا ہوں تو کبھی ہتھ نہ آنا اور بڑا ہوں تو اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

رجب علی پولیس میں رہ چکا تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بچے کس طرح مجرم بنتے ہیں۔ یہ آئی پیاری شکل و صورت، معصومیت اور غصے کی وجہ سے عادی مجرموں کے راستے پر چلنے والا تھا۔ رجب علی نے اُس سے پوچھ کر کتابوں کی دکان کہاں ہے۔ بچے نے بتایا کہ یہ قریب ہی ہے۔ رجب علی بچے کو ساتھ لے گیا اور دونوں کتابیں خرید دیں۔ پھر اُس کا بستہ کھلوا کر دیکھا۔ کاپیوں کی بھی کمی تھی۔ اُس نے بچے کے لئے مضمون والی چھوٹی بڑی کاپیاں اور پنسلیں بھی خرید دیں۔

بچہ رجب علی کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ رجب علی نے اُسے کہا "میرے ساتھ آؤ۔"

"آپ کون ہیں؟" — بچے نے حیران ہو کے پوچھا۔

"میں کوئی بھی ہوں تمہیں اس کی فکر نہیں کرنا چاہیئے" — رجب علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — "آؤ میں تمہارے ماسٹر کے نام کا لفافہ لکھ کر آؤں۔ وہ آئندہ تمہیں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہے گا۔"

بچہ جھجک رہا تھا۔ اُس کے ساتھ چلنے سے گریز کر رہا تھا۔

"آؤ نا بیٹا!" — رجب علی نے اُس کا بازو پکڑا — "ڈر کیوں رہے ہو؟"

"مجھ سے امّی پوچھیں گی کہ یہ کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں کہاں سے لائے ہو تو میں کیا جواب دوں گا۔" بچے نے کہا — "آپ مجھے بتا دیں نا آپ کون ہیں!..... آپ میرے ابّا جان کے دوست ہیں؟..... آپ نے مجھے کتابیں اور کاپیاں کیوں لے دی ہیں؟"

"اس لیے کہ تم ہونہار طالب علم ہو" — رجب علی نے کہا — "اور تم صرف اس لیے کلاس سے نکال دیئے گئے ہو کہ تمہاری امّی تمہارے لیے کتابیں اور کاپیاں نہیں خرید سکتیں۔"

"میرے ابّا جان کہا کرتے تھے کہ کسی کا سہارا نہیں لینا چاہیئے" — بچے نے کہا — "امّی بھی مجھے یہی کہا کرتی ہیں کہ تمہارے ابّا جان خوددار اور دیانتدار تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔ کسی کے آگے سر جھکاتے تھے۔ امّی نے مجھے بتایا ہے کہ میرے ابّا جان نے پولیس کے آگے بھی سر نہیں جھکایا تھا۔ وہ....." بچہ چپ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پھر کیا ہوا تھا؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"نہیں بتاؤں گا" — بچے نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "پھر آپ بھی مجھے غدّار اور ڈاکو کا بچہ کہیں گے۔"

"نہ بتاؤ بیٹا!" — رجب علی نے پیار سے کہا — "یہ بتاؤ کہ انہوں نے پولیس کے آگے سر نہیں جھکایا تھا تو انہیں پولیس سے نکال دیا گیا تھا؟"

"پولیس نے انہیں جان سے ہی مار دیا تھا" — بچے کے منہ سے نکل گیا۔

"وہ پولیس میں تھے؟"

"انسپکٹر تھے" — بچے نے جواب دیا — "ریٹائر ہو گئے تھے۔"

"کیا نام تھا اُن کا؟"

"عبدالجلیل خان"

رجب علی کے سر میں بڑی زور کا دھماکا ہوا۔ اُسے چکر آ گیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اُس نے بچے کا بازو سے پکڑا اور اُسے

تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ دوڑاتا لے گیا۔ اُس کے اس انداز میں اور چلنے کی رفتار میں غصہ تھا۔ بچہ گھبرا گیا۔

○

رجب علی سکول کے گیٹ میں داخل ہوا اور پھر سکول کے ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں چلا گیا۔ رجب علی دراز قد، خوش وضع اور خوش شکل آدمی تھا۔ اُسے دیکھ کر ہیڈ ماسٹر اُٹھ کھڑا ہوا۔ رجب علی سے ہاتھ ملا کر اُسے بیٹھنے کو کہا۔

"کیا آپ کے ماسٹر جاہل اور گنوار ہیں؟" — رجب علی نے ہیڈ ماسٹر سے کہا — "اس بچے کا ماسٹر اسے غدّار اور ڈاکو کا بچہ کہتا رہتا ہے اور آج اس کے اسے کلاس سے نکال دیا ہے؟"

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟" — ہیڈ ماسٹر نے کہا — "بچوں کے والد آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ پہلی بار آئے ہیں؟"

"میرا کوئی بچہ اس سرائے میں نہیں پڑھتا" — رجب علی نے کہا — "یہ بچہ میرا بھتیجا ہے۔ میں اسے چوتھی کلاس کے اس وِنگ روم میں داخل نہ کراؤں گا..... میں اپنا تعارف نہیں کراؤں گا..... اس کا باپ عبدالجلیل خان مرحوم میرا دوست تھا۔ اس بچے کے ماسٹر کو بلائیں۔"

بچے نے اپنی کلاس بتائی اور اس ماسٹر کا نام بتایا۔ ہیڈ ماسٹر نے ماسٹر کو بلوایا۔ مریل اور نرم جاتے ہوئے چپڑاسی والا دبلا پتلا سا ماسٹر ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ غلاموں کی طرح جھک گیا۔

"تم ہو ماسٹر اس کے؟" — رجب علی نے کہا — "میں نے اسے کتابیں لے دی ہیں۔ اگر آج کے بعد اسے غدّار کا بچہ اور ڈاکو کا بچہ کہا تو صرف تمہارے لیے بلکہ تمہارے پورے خاندان کے لیے بہت برا ہو گا..... سمجھ گئے ہو؟"

ماسٹر صاحب! میں اس بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔"

ہیڈ ماسٹر نے اس ماسٹر سے کہا — "کچھ شرم آئی ہے آپ کو قریشی صاحب؟"

ماسٹر نے کہا — "یہ اُس انسپکٹر عبدالجلیل کا بیٹا ہے جو پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ کتنی مہینے گزر گئے ہیں آپ کو یاد ہو گا۔ اخباروں میں خبریں آئی تھیں۔"

رجب علی کا جسم کانپنے لگا۔ جھوٹ تھا — سفید جھوٹ تھا — رجب علی نے گرج کر کہا اور ہیڈ ماسٹر سے مخاطب ہو کر بولا — "آپ کو سب بکواس تھ

اور ہیڈ ماسٹر کے ساتھ کلاس روم میں چلا گیا۔ ہیڈ ماسٹر جب علی کی بارعب اور دلکش شخصیت اور اُس کی باتوں سے بہت متاثر ہو چکا تھا۔ رجب علی نے کہا تھا کہ اس کا تعلق پولیس کے ساتھ ہے۔ ہیڈ ماسٹر کو خیال آیا کہ یہ شخص انسپکٹر نہیں ہو سکتا۔ ایس۔ پی یا ڈی۔ ایس۔ پی ہو گا۔

رجب علی ہیڈ ماسٹر سے ہاتھ ملا کر چلا گیا تو ہیڈ ماسٹر نے اصغر کے ماسٹر کو پھر دفتر میں بلا لیا اور اُسے اور زیادہ ڈانٹا اور ڈرایا دھمکایا۔

o

"بیٹا! اُس کا نام پوچھ لینا تھا نا؟" — اصغر سے اُس کی ماں نے کہا۔

"اُس نے ہیڈ ماسٹر کو بھی اپنا نام نہیں بتایا تھا۔" — اصغر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو ساری بات سنا چکا ہوں۔ میں اُس سے زبردستی تو نام نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اُس نے ہیڈ ماسٹر کو اتنا ہی بتایا تھا کہ میرا تعلق پولیس کے ساتھ ہے۔"

اُس کی ماں سوچ میں پڑ گئی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے لہجے میں بولی — "کون ہو سکتا ہے؟ اتنے مہینے گزر گئے ہیں۔ آج اُن کا کوئی سادہ دست جاگ اٹھا ہے..... ہو سکتا ہے کسی اور جگہ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو..... کوئی ایسا ویسا ہی نہ ہو۔ کوئی جرائم پیشہ نہ ہو۔ میرے بچے کو اُڑا کے ہی نہ لے جائے۔ اتنے بڑے بچے کو وہ اٹھا کے تو نہیں لے جا سکتا۔ اسے پیار اور پیسے کا جھانسہ دے کر ورغلا لے جاتے ہیں..... لیکن اصغر کہتا ہے کہ وہ خوبصورت آدمی ہے۔ افسر معلوم ہوتا ہے..... پولیس کا افسر تو نہیں..... پولیس کا کوئی افسر میرے بچے کے باپ کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا..... اُس نے میرے بچے کی فیس اپنے پاس سے لے لی ہے..... اوہ..... ارشد ہو گا..... نہیں ارشد نہیں ہو سکتا۔ اُس نے اتنے مہینوں سے شکل ہی نہیں دکھائی۔ فاتحہ کے لیے بھی نہیں آیا..... اُس نے بھی جلیل کو ہندوستان کا جاسوس، ڈاکو اور قاتل مان لیا ہو گا۔" — اُس نے ٹھنڈی اور جلتی ہوئی آہ بھری۔ "کیا انجام ہونا تھا؟..... کہاں ہے خدا..... میرا خدا کہاں ہے؟..... ارشد کہاں ہے؟ ظاہر کیا ہے؟..... کوئی بھی نہیں رہا..... ہمارا کوئی بھی نہیں رہا۔"

جیسی کشش اور جاذبیت خدا نے عبدالجلیل خان کے قد بُت اور چہرے مُہرے کو دی تھی ایسی ہی جاذبیت اور

کشش اُس کی بیوی سلمٰی کو عطا ہوئی تھی۔ یہ تن، روح کا پرتو تھا۔ اس میں ایمان کی روشنی تھی۔ اُس نے بھی جلال آباد میں طاہرہ کے ساتھ جلوسوں کی قیادت کی اور تحریکِ پاکستان کی سرگرم مجاہدہ رہی تھی۔ عبدالجلیل خان کے ساتھ شادی ہوئے پانچ چھ سال ہو گئے اور اُس کا یہ بچہ اصغر ابھی چند مہینوں کا تھا۔ وہ اصغر کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر تحریکِ پاکستان کے مہم میں شامل ہوتی تھی۔

اب اُس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا — ماں نہ رہی، باپ نہ رہا۔ کوئی بھی اپنا نہ رہا۔ خاوند اس طرح مارا گیا۔ اصغر کے بعد دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ دونوں زندہ نہ رہیں۔ عبدالجلیل کا ایک بھائی تھا۔ پاکستان میں دونوں بھائیوں کو زمین اور مکان کی الاٹمنٹ ہوئی۔ بھائی نے ایسا ہاتھ پھیرا کہ ساری زمین کا مالک بن بیٹھا۔ اس کی بیوی اچھی عورت نہیں تھی۔ عبدالجلیل نے پولیس میں ہوتے ہوئے اپنے بھائی کے خلاف کچھ نہ کیا۔ سلمٰی سے کہا کہ بھائی کو زمین پیاری ہے تو لے لینے دو۔

دو بھائیوں کو زمین اور ایک عورت نے جدا کر دیا۔ جدا بھی ایسا کیا کہ عبدالجلیل کی وفات پر نہ بھائی آیا نہ اُس کی بیوی۔ سلمٰی بے آسرا رہ گئی۔ جاننے والوں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے خاوند کے بھائی کے پاس جائے اور اُسے کہے کہ وہ بیوہ اور بے سہارا ہو گئی ہے۔ کچھ زمین ہی دے دے لیکن سلمٰی نے کہا کہ میرے خاوند کی روح کو تکلیف ہو گی۔ سلمٰی نے خودداری اور وقار کو یوں قائم رکھا کہ اڑوس پڑوس کے بچوں کو پڑھانے سینے اور سوئٹریں بنانی شروع کر دیں۔ اُس کے خاوند کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ ہندوستان کا جاسوس اور جرائم پیشہ تھا۔ اس لیے بعض گھروں سے سلمٰی کو کام نہیں ملتا تھا۔ اس وجہ سے آمدنی بہت کم تھی۔ بچے کے سکول کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔

اب اصغر نے اُسے بتایا کہ ایک آنٹی نے اُسے کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں لے دی ہیں اور اُس کی فیس بھی اپنے ذمے لے لی ہے تو وہ پریشان ہو گئی۔ کئی دھچکے ذہن میں آئے۔ کئی خدشے محسوس ہوئے مگر اس آنٹی نے اپنا ذرا سا بھی سراغ نہیں دیا تھا۔

"اصغر بیٹا!" — سلمٰی نے کہا۔ "مہینہ ختم ہونے والا ہے۔ وہ جب بھی تمھاری فیس دینے آئے اُس سے اُس کا نام پوچھنا اور گھر کا اتا پتا بھی لے لینا۔"

"اگر اُس نے نہ بتایا تو؟"

"کتنا پیسہ اُس بہت پریشان ہے؟" — سلمٰی نے کہا۔ "مجھے دینا کہ اتنی سستی تھی کہ وہ کوئی ایسا ویسا آدمی ہو گا۔ تمھیں ورغلانے کی کوشش کرے گا۔"

سلمٰی کو اصغر کی بات سمجھ آ گئی۔ اُسے اپنے خاوند کی موت کی خبر یاد آنے لگی۔ خبر کے الفاظ اُسے زبانی یاد ہو گئے تھے، "ورچوئل پولیس مقابلے کے بعد میر دنیا گیا۔ ماؤس کے نام کو وہ ساری عمر نہیں بھول سکتی تھی — "رجب علی ڈی سی، پی۔ ایکٹنگ جے۔ ایف۔ سی۔" "قاتل..... میرے سہاگ خاوند کا قاتل" — اُس نے اپنے آپ سے کہا — "اگر میں مرد ہوتی تو اس شخص کو [illegible] ڈالتی۔ [illegible] تو ہے..... اندر تو ہے۔"

iqbalmt@onedu.com scanned by

سلمٰی کو اپنے بچے اصغر کے متعلق خطرہ یہی تھا کہ اُسے اغوا کر لیا جائے گا۔ عبدالجلیل خان کی موت اُس کے دل پر دہشت بن کر چھا گئی تھی۔ موت تو ہوتی ہی دہشت ناک ہے لیکن عبدالجلیل خان کی موت کچھ اور تھی۔ اُس کی موت کی خوفناک خبروں میں شائع کرائی گئی تھی وہ زہریلی ناگن کی طرح سلمٰی کے وجود پر لپٹ گئی اور اُسے ڈنک مارتی رہتی تھی۔ عبدالجلیل خان کو اچھی طرح جاننے والوں نے بھی اس خبر کو سچ مان لیا تھا کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ سلمٰی کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ اُس کا خاوند، ڈاکوؤں، قاتلوں اور پاکستان کے دشمنوں کے جاسوسوں والی خفیہ زندگی بھی گزار رہا تھا۔

ایک سانپ اور تھا جو اُس نے ایک ٹرنک میں بند کر رکھا تھا۔ یہ سرسر روپے کے نوٹوں کی ایک گٹھی تھی جس پر ایک کاغذ چڑھا ہوا اور اُس پر دھاگہ بندھا ہوا تھا۔ یہ رقم پورے پندرہ ہزار روپے تھی ——— پاکستان کی عمر کے آٹھویں نویں سال پندرہ ہزار روپے آج کے ایک لاکھ کے برابر تھے۔ اُس گٹھی کو وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھی۔ اس کا اُسے صرف خیال آتا تھا تو اُس کے خون کی گردش تیز ہو جاتی اور اُس کا پسینہ نکل آتا تھا۔

یہ رقم اُسے حکمران پارٹی کی طرف سے ملی تھی۔ مخالف پارٹیوں کے [illegible] سے اور کاسے تانگے والے کی بیوی سے بیان لے کر اپنے اخباروں میں شائع کیے۔ دونوں کی تصویریں بھی شائع کیں اور لوگوں سے حکومت کے خلاف مظاہرے کرائے تھے۔ ایک رات سلمٰی کے گھر دو آدمی آئے تھے۔ ساتھ ایک تھانیدار تھا۔ تھانیدار نے اُس کے آگے نوٹوں کی یہ گٹھی رکھی، ساتھ ایک کاغذ رکھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ تھانیدار نے اُسے کہا کہ اس تحریر پر دستخط کر دے اور پندرہ ہزار روپیہ اٹھا لے۔

اُس نے تحریر پڑھی تو مکلاتی ہوئی زبان میں بولی ——— نہیں۔ لے جاؤ یہ پندرہ ہزار۔ میں ایسی تحریر پر دستخط نہیں کروں گی۔ میرا خاوند غدار اور قاتل نہیں تھا۔ وہ ہندوؤں کا ایجنٹ نہیں تھا:

تھانیدار اور اُس کے ساتھ کے دو آدمی مسکرا رہے تھے۔ انہیں سلمٰی کے غصّے اور احتجاج کی ذرا سی بھی پروا نہیں تھی۔

"تمہیں یہ رقم لینی پڑے گی" ——— تھانیدار نے اُسے ایسی دھیمی آواز میں کہا جس میں عداوت تھی، چیلنج تھا اور دھمکی تھی۔ اُس نے کہا ——— "اور تمہیں اس کاغذ پر دستخط کرنے پڑیں گے۔ یہ حکم میرا نہیں۔ میں خود حکم کا بندہ ہوں۔ یہ حکم بڑی اُوپر سے آیا ہے۔ وہ عبدالجلیل خان جیسے کئی آدمیوں کو غائب کر چکے ہیں۔ بہت سے شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں زندہ درگور ہیں۔ کوئی حکمران اپنے مخالف کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے مخالفوں کو رام کرنے یا انہیں لاپتہ کرنے والوں کا حکم ہے کہ تم اس تحریر پر دستخط کرو۔ اگر تم یہ حکم نہیں مانو گی تو تمہارا بیٹا لاپتہ کر دیا جائے گا۔"

سلمٰی پاکستان کی بیٹی تھی۔ وہ پاکستان بنانے والے کی بیوی تھی۔ پاکستان کے لیے ہم پر قربان ہونے والوں کا نام وہ بڑے احترام سے لیا کرتی تھی۔ لگڑ بگھے اور یتیم بچے کی ماں۔ اس دھمکی نے کہ اُس کے بچے کو لاپتہ کر دیا جائے گا، اُس کی جسمانی اور روحانی قوتیں سلب کر لیں۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر اُس

نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا، پھر اُسے کمرے میں بٹھا کر دروازہ بند کیا اور باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ تیز قدم چلتی اُس کمرے میں گئی جہاں تھانیدار بیٹھا تھا۔ تھانیدار نے اپنا پین نکال رکھا تھا۔ سلمٰی نے پین اٹھایا اور اس تحریر پر جہاں تھانیدار نے کہا وہاں دستخط کر دیئے۔

"یہ رقم اُٹھاؤ" ——— تھانیدار نے کہا ——— "اور زبان بند رکھنا۔ پاکستان میں ابھی وہ قانون نافذ نہیں ہوا جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا۔ یہاں اُس کا قانون چلتا ہے جس کی حکومت ہوتی ہے۔"

تھانیدار اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کمرے سے نکل رہا تھا تو سلمٰی نے لپک کر اُس کا بازو پکڑ لیا اور روتے ہوئے التجا کی ——— "اب میرا بچہ محفوظ رہے گا؟"

"اب تمہارا بچہ بھی محفوظ ہے اور تم بھی محفوظ ہو" ——— تھانیدار نے اپنائیت کے لہجے میں کہا ——— "یہ بھی خیال رکھو کہ تم خوبصورت عورت ہو۔ ان سیاسی چکر بازیوں سے بچو۔ اگر دوسری پارٹیوں کے آدمی تمہیں آ کے پریشان کریں تو مجھے اطلاع دینا۔ میں تمہیں اپنا آپ بتا دیتا ہوں" ——— اُس نے سلمٰی کو بتایا کہ وہ اُسے کہاں مل سکتا ہے۔ اُس نے کہا ——— "پندرہ ہزار معمولی رقم نہیں۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں، زبان بند رکھنا!"

سلمٰی نے زبان بند رکھی اور اُس نے نوٹوں کی گٹھی اٹھا کر ٹرنک میں بند کر دی تھی۔ اس رقم کو اُس نے اپنے لیے اور اپنے تیرہ چودہ سالہ بچے کے لیے حرام قرار دے دیا تھا۔ اُس رات وہ بہت روئی تھی۔ حکومت نے اُس کی گواہی کی قیمت پندرہ ہزار دی تھی اور اس میں اُس کے دستخط کی قیمت بھی شامل تھی جو اُس سے اس تحریر پر کروائے گئے تھے کہ اُس کے خاوند کا سیل ملاپ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ تھا اور گھر میں اُسے مشکوک لوگ ملتے رہتے تھے۔ اس تحریر میں یہ بھی تھا کہ سلمٰی کا اخباروں میں جو بیان شائع ہوا تھا وہ اُس سے دو تین خنڈوں نے اس طرح کروایا تھا کہ ایک کے ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔

سلمٰی نے ٹرنک میں رکھی ہوئی اس رقم سے اس طرح ڈرتی تھی جیسے زہریلا سانپ ہو۔ ٹرنک کھولا تو اُس بے گناہ کے بیٹے کو ماسٹر نے اس لیے کلاس سے نکال دیا تھا کہ اُس کے پاس دو کتابیں نہیں تھیں اور اُس نے فیس بھی وقت پر نہیں دی تھی۔

اب اُسے بیٹے نے بتایا کہ ایک آدمی نے اُسے کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں خرید دی ہیں اور اُس کی فیس بھی اُس آدمی نے اپنے ذمّے لے لی ہے تو سلمٰی کو پہلا خطرہ یہ نظر آیا کہ تھانیدار کہہ گیا تھا کہ اُس کے بچے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ سلمٰی نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ تین چار مہینے گزر گئے ہیں۔ اگر اصغر کو کسی نے اغوا کرنا ہوتا تو کبھی کا کر چکا ہوتا۔ اس کے علاوہ اُس نے تھانیدار کے کہنے پر دستخط بھی کر دیئے تھے اور اُس نے زبان بھی بند رکھی تھی مگر اُس کا دل خوف سے آزاد نہ ہو سکا۔ وہ اصغر کو سکول سے بلانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بچہ سکول جاتا تھا تو وہ اُس کی واپسی تک پریشان رہتی تھی۔

تین مہینے گزر گئے۔

اصغر نے ماں کو بتایا کہ اُس نے ماسٹر کو فیس دی تو ماسٹر نے کہا کہ اُس کی فیس آگئی ہے۔ ٹک ٹک جب ملی ان تین چار مہینوں میں چار پانچ بار سکول میں اصغر سے ملا اور اس سے پوچھا کہ اُسے کسی کتاب یا کاپی کی ضرورت تو نہیں؟ اُس نے ہر ملاقات میں اصغر کی جیب میں زبردستی تیس چالیس روپے ڈال دیئے۔ ہر بار اصغر نے

اُسے کہا کہ اُس کی اتنی سبت پریشان ہے کہ وہ کون ہے جو اُس کے بیٹے پر اتنا مہربان ہے۔ اصغر نے کئی بار رجب علی سے پوچھا کہ وہ اپنا نام اور گھر بتا تے لیکن رجب علی نے پیار سے اُسے ٹال دیا۔

ایک روز رجب علی اصغر کے سکول گیا تو ہیڈ ماسٹر نے اُسے بلا لیا۔

"آپ جس بچے کی فیس دیا کرتے ہیں اُس کی ماں میرے پاس آئی تھی"۔۔۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔۔۔ "میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ اُس کے بچے کی تعلیم کے اخراجات کون دے رہا ہے؟"

"اور یہ ضروری بھی نہیں کہ اُسے معلوم ہو"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "میری دلچسپی اس بچے کے ساتھ ہے اس کی ماں کے ساتھ نہیں بلکہ میری دلچسپی ہر اُس بچے کے ساتھ ہے جسے ماں باپ اس لیے نہیں پڑھا سکتے کہ ان کے پاس پیسے نہیں"۔

"لیکن یہاں مسئلہ کچھ اور ہے"۔۔۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔۔۔ "یہ بچہ اُس کا اکلوتا بچہ ہے اور اُسے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے بچے کو کوئی ورغلا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بچہ خوبصورت ہے۔ میں نے تسلی دی ہے اور زبانی ضمانت بھی دی ہے کہ جو صاحب بچے کی فیس اور دیگر اخراجات دے رہے ہیں، وہ معزز شخصیت ہیں مگر اس خاتون کو کوئی تسلی دے سکی تھا کہ اس کے بچے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ وہ بات پاگل پن کی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن وہ ماں ہے۔ اُس کے ساتھ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو گا۔ خاوند کی موت کے بعد وہ نارمل نہیں رہی۔۔۔ آپ اُسے مل ہی کیوں نہیں لیتے۔ میں آپ کو اچھی طرح بتا نہیں سکتا کہ وہ کسی پریشان ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ آدمی مجھے نہ ملا تو میں اپنے بچے کو سکول سے اٹھا لوں گی"۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہونے دوں گا"۔۔۔ رجب علی نے تڑپ کر کہا۔۔۔ "بچہ اسی سکول میں رہے گا۔ میں اس کی ماں سے ملوں گا"۔

"مل ہی لینا چاہیئے"۔۔۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔۔۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے"۔

"اس خاتون کی طرح میں بھی نارمل نہیں ہوں چوہدری صاحب!"۔۔۔ رجب علی نے بچہ سے لہجے میں کہا۔۔۔ "میں اس بچے کی مدد اپنی روح کی تسکین کے لیے کر رہا ہوں۔ اگر یہ اڑاکڑ مجھے یہ راستہ نہ دکھاتا تو شاید میں پاگل ہو چکا ہوتا"۔۔۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھا۔ ہیڈ ماسٹر سے ہاتھ ملایا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔ "میں اُسے ملوں گا۔ اُس کے گھر چلا جاؤں گا"۔

○

وہ عبدالجلیل خان کا گھر جانتا تھا۔ چوبیسویں میں وہ عبدالجلیل کی گلی اور مکان کو نہیں بھولا تھا۔ اس مکان کی خاطر اپنے وہ پولیس پارٹی کے ساتھ گیا تھا لیکن اندر نہیں گیا۔ باہر اور زیادہ دور کھڑا رہا تھا۔ تلاشی ایک سب انسپکٹر، دو ہیڈ کانسٹیبلوں اور دو کانسٹیبلوں نے لی تھی۔ یہ تلاشی نہیں تھی بلکہ اندر کچھ اسکور رکھنا تھا اور پھر یہ برآمد کرتا تھا۔ پولیس اپنے دو آدمی ساتھ لے گئی تھی جنہیں برآمدگی کے مشیر نامے پر دستخط کرنے تھے۔ رجب علی زیادہ دور کھڑا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اُس نے عبدالجلیل کے بیٹے اصغر اور اُس کی بیوی سلمٰی کو نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے صرف مکان دیکھا تھا۔

اب چھ سیزن بعد وہ پھر اُسی گلی میں داخل ہوا۔ وقت رات کا ہی تھا۔ نو بج رہے تھے۔ گلی میں ایک بلب روشن تھا۔ رجب علی بڑی جرأت والا پولیس آفیسر ہوا کرتا تھا مگر اپنے منزل کی گلی میں داخل ہوا تو اُس نے

محسوس کیا جیسے وہ ڈر رہا ہے اور اُس کی جرأت گلی کے باہر ہی کہیں رہ گئی ہے۔ روح پر گناہ کا بوجھ آ پڑا لیکن وہ کچھ سوچنے کی بجائے تیز چل پڑا اور عبدالجلیل خان کے دروازے پر دستک دی۔

سلمٰی کہیں کے کپڑے سی رہی تھی۔ اصغر سو گیا تھا۔ سلمٰی کے دروازے پر رات کے اس وقت دستک دینے والا کوئی نہ تھا۔ خون کا رشتہ تو کوئی تھا نہیں۔ کوئی ہمراز اور ہمدرد سہیلی بھی نہیں تھی۔ جب سے اُس کے خاوند کی پولیس مقابلے میں" مارے جانے کی خبر چھپی تھی، اُس نے محلے کی عورتوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ عورتیں اُس کے ہاں آتیں اور ہمدردی کی باتیں کرتی تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ یہی عورتیں اُسے ڈاکو، قاتل اور ہندوؤں کے جاسوس کی بیوہ کہتی ہیں۔ اُس پر بڑے غلیظ الزام تھوپے گئے تھے۔

رات کی دستک نے اُسے پریشان نہ کیا۔ وہ سمجھی کہ کوئی عورت سلائی کے لیے کپڑے دینے یا لینے آئی ہو گی۔ محلے کی عورتوں کے ساتھ اُس کا یہی کاروباری سا تعلق رہ گیا تھا کہ سلائی کے لیے وہ اسے کپڑے دیتی تھیں اور وہ مردوں کی نسبت کم اُجرت پر سی دیتی تھی۔

اُس نے کواڑ کھولا تو شش و پنج میں رہ گئی۔ اُس کے سامنے ایک دراز قد، خوش شکل اور میرزا نہ لباس میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ دونوں پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ رجب علی کی زبان اس لیے بند رہی کہ وہ سلمٰی کے خاوند کا قاتل تھا اور سلمٰی اس لیے چپ لگ گئی کہ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ بگولے کی طرح کئی وسوسے اور وہم ایک ہی بار اُس کے ذہن میں گھوم گئے۔ محلے میں اس قسم کی آواز بھی سرگوشیوں میں گھوم گئی تھی کہ سلمٰی کا خاوند جرائم پیشہ تھا اور وہ یہ دھندہ پیشہ کماتی ہے۔ اب اس آدمی کو اپنے دروازے پر دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ یہ آدمی اُسے عصمت فروش سمجھ کے ہی تو نہیں آ گیا؟

"نہیں۔ ایک خیال یہ آیا"۔۔۔ عبدالجلیل کے دشمنوں نے کوئی نئی چال چلی ہو گی۔

"تمہارے بچے کی فیس دینے والا"۔۔۔ رجب علی نے سکوت توڑا۔۔۔ "آج ہیڈ ماسٹر نے بتایا ہے کہ تم مجھے دیکھ کر تسلی کرنا چاہتی ہو کہ میں بچے کو ورغلا نہیں رہا، اور تم پریشان بھی ہو۔ میں تمہاری تسلی کے لیے آیا ہوں۔ میں اندر نہیں آؤں گا۔ تم اکیلی ہو۔ یہ محلہ ہے۔ یہاں ایک سے ایک گھٹیا آدمی رہتا ہے"۔

"دروازے پر کھڑے رہنا بھی تو مناسب نہیں"۔۔۔ سلمٰی نے کہا۔ اُس کی دلیری عود کر آئی تھی۔ وہ کسی سے ڈرنے والی عورت نہیں تھی مگر اسے ایسی چوٹ پڑی تھی جس نے اسے بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے کہا۔۔۔ "آپ اندر آ جائیں"۔

انہوں نے جب اندر جا کر سوئچ بورڈ کے بلب کی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھا تو دونوں پر ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ اس لیے کہ سلمٰی کو توقع نہیں تھی کہ یہ اجنبی جو اُس کا مرد پرور محسن بن گیا ہے، اتنا دلچسپ اور پُراثر شخصیت والا ہو گا اور رجب علی کو اس بچگانہ نے خاموش رکھا کہ سلمٰی خوبصورت عورت تھی اور اس خوبصورتی میں جلال اور وقار کی جھلک بڑی نمایاں تھی۔ اس چہرے پر جو اداسی تھی اس میں بھی حُسن تھا اور ایسا تاثر جیسے یہ عورت سراپا روح ہو۔

سلمٰی فرش پر بچھی ہوئی دری پر سلائی کی مشین کے پاس بیٹھ گئی اور اُس نے رجب علی کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا لیکن وہ دری پر بیٹھ گیا۔

"آپ کو ہیڈ ماسٹر نے ٹھیک بتایا ہے کہ میں سبت پریشان ہوں"۔۔۔ سلمٰی نے مدھم سی آواز میں کہا

iqbalmt@yahoo.com Scanned by CamScanner

—"میں آپ کی اس بات کو تسلیم نہیں کروں گی کہ آپ اتنے سخی اور اتنے برگزیدہ ہیں کہ کسی کے ساتھ نیکی کر کے اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ برگزیدہ لوگ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ میں انہیں اُن کہانیوں کے فرضی کردار سمجھا کرتی ہوں جو بچوں کو سُلانے کے لیے سنائی جاتی ہیں..... آپ کون ہیں؟ اصغر کے ابّا کے دوست ہیں؟"

"ہاں!" — عبدالجلیل نے جیسے آہ بھری ہو۔ کہنے لگا — "جلیل میرا دوست تھا۔"

"میں اُس کے سب دوستوں کو جانتی ہوں" — سلمیٰ نے کہا — "آپ کا نام؟"

"میرا نام نُور علی ہے" — رجب علی نے جھوٹ بولا — "میں امرتسر کے دیہاتی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ ہماری بہت بڑی زمینداری تھی۔ میرے بھائی نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ علاقے کا تھانیدار جلیل تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میرا جوان بھائی پھانسی چڑھ رہا ہے۔ اسے بچاؤ ورنہ میری ماں زندہ نہیں رہ سکے گی۔ گواہ پختہ کے تھے۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جلیل نے میرے بھائی کو گرفتار تو کر لیا لیکن گواہوں کو بڑی استادی سے گمراہ کر کے مقدمہ اتنا کمزور بنایا کہ میرا بھائی بری ہو گیا۔ جلیل سے اپنی نوکری خطرے میں ڈال دی تھی۔ اس کا ایمان اتنا پکا تھا کہ میں نے اسے کچھ رقم پیش کی تو اُس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ حرام نہیں لی جاتی۔"

"آپ پہلے شخص ہیں جس نے اُن کی موت کے بعد انہیں نیک اور ایماندار کہا ہے" — سلمیٰ نے آہ جیسا سانس لے کر کہا — "سب انہیں ڈاکو اور قاتل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔"

"لوگوں کو حقیقت بتانے والا کوئی نہیں" — رجب علی نے کہا — "اور کسی کی زبان بند نہیں کی جا سکتی۔ خوشنودی خدا کی چاہیے انسانوں کی نہیں..... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں تمہارے خاوند کو کس طرح جانتا تھا۔ تمہارے بیٹے سے جس طرح ملاقات ہوئی وہ بیٹے نے تمہیں بتایا ہو گا۔ اسے تو میں جانتا ہی نہیں تھا۔ مجھے ذرا سا بھی شک نہیں تھا کہ یہ بچہ جو سکول میں کلاس سے باہر کھڑا رو رہا ہے جلیل کا بچہ ہے۔ میرا اس بچے نے مجھے بعد میں بتایا تھا۔ اس نے جب بتایا تو میں نے اس کے ماسٹر سے کہا کہ آئندہ اس کی فیس میں دیا کروں گا۔ اس بچے کے باپ نے ہمارے خاندان پر جو احسان کیا تھا وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم مجھے روکنے کی نہ سوچو۔ میرے ہاتھ نہ روکو۔ دل سے سب خوف اور وہم نکال دو۔ تمہارا بچہ میری حفاظت میں ہے۔ مجھ سے اپنے بچے کا مستقبل نہ چھینو، ورنہ میری روح مر جائے گی۔"

"آپ کے اپنے بچے بھی ہوں گے؟"

"نہیں" — رجب علی نے جواب دیا — "خدا نے سب کچھ دیا ہے، بچہ نہیں دیا۔ بیوی مر گئی ہے۔ میرے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں سوائے سکون کے۔ تنہا ہوں۔ تمہارے بچے کے ساتھ یہ ذرا سی نیکی کر کے میں اپنی روح کو سکون دے رہا ہوں۔"

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کا گھر دیکھ لوں؟" — سلمیٰ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"دکھا دوں گا" — رجب علی نے جواب دیا — "کل چل سکو گی؟..... میں تمہیں گھر آ کر نہیں لے جاؤں گا۔ تمہیں ایک جگہ بتا دیتا ہوں۔ وہاں آ جانا۔ میں تمہیں وہاں سے لے جاؤں گا۔ بن کے وقت۔ اصغر تمہارے ساتھ ہو گا۔"

○

اگلے روز جب سلمیٰ رجب علی کے ساتھ اُس کی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو حیرت سے اُس کی

آنکھیں کھُل گئیں۔ یہ کوٹھی اُس کے تصور سے زیادہ وسیع و عریض اور عالی شان تھی۔ اس کا لان بڑا ایک باغ تھا جس میں ایک مالی کام کر رہا تھا۔ رجب علی اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس کوٹھی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہو" — رجب علی نے کہا — "یہ میرے والد صاحب نے بنائی تھی۔ ہم مشرقی پنجاب میں بہت سی زمین اور جائیداد چھوڑ آئے تھے۔ آتی ہمیں یہاں مل گئی تھی۔ یہ سب اس زمین کی آمدنی سے بنی ہے۔ اس کوٹھی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے ہیں۔ بتیس حیران اس پر ہونا چاہیئے کہ میں یہاں اکیلا کس طرح رہ رہا ہوں..... اوہ... میں نے اپنی شروع کر دی ہے۔ تم میرے ساتھ یہ دیکھنے آئی ہو کہ میرا رہن سہن کیسا ہے اور میں بروہ فروش تو نہیں؟..... اچھی طرح دیکھ لو۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔"

سلمیٰ جھینپ رہی تھی۔ اس محل میں اس پُراثر شخصیت والے آدمی کے سامنے بیٹھ کر وہ اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ رجب علی نے جب کہا کہ اچھی طرح دیکھ لو، مجھے کسی چیز کی کمی نہیں، تو سلمیٰ کو یوں لگا جیسے رجب علی نے اُس کی غربت پر طنز کی ہو۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" — سلمیٰ نے دبی دبی زبان میں کہا — "اتنی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والوں کی ہر بات ٹھیک ہوتی ہے۔ میں اپنی سطح پر سوچ رہی تھی۔ میں ماں ہوں نُور علی صاحب! اور میں بیوہ ہوں۔ آپ نے میرے خاوند جلیل کا بتایا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ اُسے ایک کمرے میں تفتیش کے دوران اتنا مارا گیا تھا کہ وہ مر گیا اور اخباروں میں خبر دی گئی کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

رجب علی نے بتایا ہے کہ اُسے کمرے میں مارا گیا تھا؟

رجب علی کے کچھ خیر خواہ بھی تھے" — سلمیٰ نے جواب دیا — "میں اس کا نام نہیں بتاؤں گی جو وہاں موجود تھا۔ اس نے جلیل کے قاتل کو قتل کرنے والا ایک ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی تھا۔ اُس نے جلیل کے سپلوں میں آتنی زور سے ٹھڈا مارا تھا کہ اس کے منہ سے خون نکلا اور وہ مر گیا۔ اس کی تصدیق دوسرے دن اخباروں سے ہو گئی۔ خبر میں یہ بھی تھا کہ رجب علی کو پولیس مقابلے کا ہیرو بنایا گیا تھا۔"

رجب علی جس نے سلمیٰ کو اپنا نام نُور علی بتایا تھا، بے چین ہو گیا۔ بے چینی تیزی سے بڑھتی گئی۔ آتنی بڑھی کہ اُس کے چہرے پر پسینہ چھوٹ آیا۔ سلمیٰ اس کی بدلتی کیفیت کو دیکھے اور سمجھے بغیر بولتی جا رہی تھی۔ غصے اور بغاوت کی شدت سے اُس کے دانت پسنے لگے اور آنسو بہنے لگے۔

"ایک ایسے آدمی کو جو پاکستان کا شیدائی تھا اور جس نے پاکستان کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی، سیاسی عداوت میں قتل کر کے اس ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کو کتنا انعام ملا ہو گا؟ کیا وہ اس قسم کی شہنشاہی کوٹھی میں رہتا ہو گا؟ میں ایک پولیس انسپکٹر کی بیوہ ہوں۔ میں جانتی ہوں اُسے کیا ملا ہو گا۔ اُسے ایس۔ پی بنایا گیا ہو گا اور اُسے اُوپر والوں کی خوشنودی حاصل ہو گئی ہو گی۔ بدنجت بھول گیا ہے کہ اُس کے اُوپر حاکموں کے اوپر بھی کوئی ہے اور کبھی وہی رہنا ہے جسے اُس اوپر والے کی خوشنودی حاصل ہو۔"

"اُس ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی نے استعفیٰ دے دیا تھا" — رجب علی نے کہا — "وہ خود اس صدمے بلکہ اس گناہ کو برداشت نہ کر سکا اور اوپر والوں کی خوشنودی اور ایس۔ پی کے عہدے کو ٹھکرا کر وہ گھر چلا گیا ہے۔"

"آپ اُسے جانتے ہیں؟"

iqbalmt@onepoint.com scanned by CamScanner
خوبصورت لوگوں کی دنیا

وہ بہت اچھی طرح؟"

"ایک بار، صرف ایک بار مجھے اُس کے پاس لے چلیں" ـــــ سلمٰی نے کہا۔

"کیا کرو گی اُس کے پاس جا کر؟"

"میں عورت ذات، بے بس اور مجبور، کیا کر سکتی ہوں" ـــــ سلمٰی نے کہا ـــــ "اُس کے مُنہ پر تھوک کر واپس آجاؤں گی۔"

"سلمٰی!" ـــــ ملک رجب علی نے دُکھی ہوئی سی آواز میں کہا ـــــ "میں تمہیں انتقام کے اس جذبے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ ایک بات کہوں گا۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرنا۔ تم اب کسی کے مُنہ پر تھوک کر، کسی کا منہ نوچ، جمیل کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ایک ہزار آدمیوں کا خون کر دو، جمیل واپس نہیں آسکتا۔ اب توجہ اپنے بچے پر مرکوز کر دو۔ تم اس طرح کی باتیں اس کے ساتھ بھی کرتی ہو گی۔ اُس کے سامنے روتی بھی ہو گی۔ اس طرح اُس کی شخصیت بڑی گہی بنے گی۔ اُسے مسکراہٹیں دو۔ اُسے جذبہ دو۔ اُسے پاکستان کا بیٹا بننے دو۔"

"کون سے پاکستان کا بیٹا؟" ـــــ سلمٰی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ پاکستان جس کی خاطر تم، میں اور ہم دونوں جیسے لاکھوں مسلمان بے گھر ہوئے تھے" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "لاکھوں کٹ گئے تھے جس کی خاطر ہماری ستر ہزار بیٹیاں اغوا ہوئیں۔"

"کہاں ہے وہ پاکستان؟" ـــــ سلمٰی نے کہا ـــــ "وہ پاکستان ابھی نہیں بنا، جس کی خاطر ستر ہزار بیٹیاں اغوا اور بے آبرو ہوئی تھیں۔ یہ وہ پاکستان نہیں۔ یہ حکمرانی کے بھوکے لوگوں کا ملک ہے جو ہمیں کبھی نہیں کہ جیلی کی آبرو مقدس ہوتی ہے۔ حکمرانی کے ان بھوکوں نے پوری قوم کو بھوکا مار دیا ہے۔ یہی لوگ وہ پاکستان بنا رہا ہے۔"

ملک رجب علی سلمٰی کو معمولی سے ذہن کی عورت سمجھتا تھا لیکن اُس کے بولنے کے انداز اور خیالات میں اُسے ایک جذبہ اور دانش نظر آئی۔ رجب علی کو خیال آیا کہ یہ عورت ظاہری حُسن سے زیادہ حسین ہے۔

"آپ کو معلوم نہیں کہ اس پاکستان میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے" ـــــ سلمٰی نے کہا ـــــ "میرے خاوند کو اس جُرم میں قتل کیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جاسوسوں کے خلاف خفیہ محاذ بنا رہا تھا۔ پھر مجھے اور میرے خاندان نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ دیا۔ میرے بیٹے کو لاپتہ کر دینے کی دھمکی دے کر ایک ایسی تحریر پر دستخط کرائے گئے جس کا ایک ایک لفظ بچھو کی طرح زہریلا تھا ـــــ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ پتے سے آنسو پونچھ کر بولی ـــــ "میں اس بچے کو اس پاکستان کا بیٹا نہیں بننے دوں گی جس کے حکمرانوں نے مجھے میرا بچہ اغوا کرنے کی دھمکی دی اور کہا کہ میں زبان بند رکھوں گی تو محفوظ رہوں گی؟"

"صبیحہ جلیل خان کی بیوی کے خیالات اتنے مایوس کن نہیں ہونے چاہئیں" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "کیا تم بھول گئی ہو کہ اُس نے تھانیدارنی کی وردی میں پولیس ڈیوٹی پر ایک انگریز لیفٹیننٹ کو قتل کر کے اُسے قتل کر دیا تھا؟"

"میں نہیں بھولی الحاج علی صاحب!" ـــــ سلمٰی نے کہا ـــــ "لیکن خیال آتا ہے کہ میرے خاوند کو اس انگریز لیفٹیننٹ کے قتل کی سزا ملی ہے۔ جمیل نے قتل کیا اور قتل ہو گیا۔"

"سلمٰی!" ـــــ رجب علی نے جھنجھلا کر کہا ـــــ "ہوش میں آؤ۔ انہیں کو سزا اور بددعائیں دو جنہوں نے پاکستان پر قبضہ کر لیا ہے اور جو ذاتی اور سیاسی مفاد کے لیے پاکستان کو وہ پاکستان نہیں بننے دے رہے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان پر ہمارے دشمن کا قبضہ ہو جائے تو دشمن کے خلاف لڑو گی یا پاکستان کو نرا بھلا کہہ کر اس سے دست بردار ہو جاؤ گی؟..... ہم اپنے پاکستان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ یہ شہیدوں کی سرزمین ہے۔ یہ بابا پیر سے پاکستان تک کے شہیدوں کی سرزمین ہے۔ یہ اُن شہیدوں کا پاکستان ہے جو ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں شہید ہوئے۔"

سلمٰی گم صم ہو گئی۔

"میں جاتی ہوں" ـــــ سلمٰی نے کہا پھر جھنجھلا کر بولی ـــــ "میں بھٹک گئی ہوں انور علی صاحب! کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میرے خاوند کو نہیں میرے جذبے کو قتل کر دیا گیا ہے، جیسے میرے نظریئے پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں..... مجھے ایسے خلا میں دھکیل دیا گیا ہے جہاں میرا دماغ بھی ایک خلا بن گیا ہے" ـــــ وہ بے قابو ہو کے روپڑی ـــــ "میرا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہیں۔ میں تو پاکستان کو دشمنوں سے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا عزم دل میں لیے ہوئے تھی مگر اپنے بچے کو بچانا مشکل ہو رہا ہے۔"

"اپنے بچے کو محفوظ سمجھو" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "وہ میرا بچہ ہے۔ خدا کے لیے کچھ پڑھو سمجھو کرو۔ اگر اسے ورغلانا ہوتا تو کیا میں ان تین مہینوں میں اسے غائب نہیں کر سکتا تھا؟" ـــــ رجب علی کو جیسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو۔ اُس نے سلمٰی سے پوچھا ـــــ "تیس پندرہ ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔ اتنی رقم کہاں گئی؟ آمدنی جلد ہی ختم ہو گئی ہے کیا تم نے بچے کو دودھ بھی نہیں لے کر دیا؟"

"اس رقم کو میں نے ٹرنک میں پھینک دیا تھا" ـــــ سلمٰی نے کہا ـــــ "پھر اسے نہیں دیکھا۔ یہ رقم کچھ حرام کی ہے۔ میرے سہاگ، میرے ایمان، میرے جذبے اور میرے بچے کی قیمت ہے جو مجھے دی گئی ہے۔ میں نے اس لیے نہیں لی تھی کہ انہوں نے کہا تھا کہ نہیں لو گی اور اس تحریر پر دستخط نہیں کرو گی تو تمہارا بچہ غائب کر دیا جائے گا..... میں اپنے بچے کے ساتھ بھوکی مر جاؤں گی۔ بچے کو ان پڑھ رکھوں گی لیکن اس رقم سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔ میرے گھر چل کے دیکھ لیں۔ رقم وہیں رکھی ہے۔ میں نے گنی بھی نہیں۔"

رجب علی نے ریک کر بے ساختہ سلمٰی کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی بے ساختگی سے سلمٰی کا ہاتھ پہلے اپنی ایک آنکھ پر پھر دوسری آنکھ پر رکھا۔ سلمٰی نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھڑایا نہیں۔ رجب علی نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ بھیگ گیا تھا۔ یہ رجب علی کے آنسو تھے۔ اُس نے سلمٰی کا ہاتھ چھوڑ کر رومال اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

رجب علی نے رومال سے اور سلمٰی نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ رجب علی کی بڑی لمبی آہ نکل گئی۔

"میں جاؤں؟" ـــــ سلمٰی نے یوں کہا جیسے بے بسی کی ہو۔

"کیا میں مطمئن ہو جاؤں کہ تمہیں کچھ پڑھا قبلہ آگیا ہے؟" ـــــ رجب علی نے پوچھا۔

سلمٰی نے یوں سر ہلایا جیسے اُس کی ہو اور نہ بھی، یا جیسے وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی ہو۔

"اب تو رہے سلمٰی! تم مجھے سہارا دو، میں تمہارا سہارا بنوں۔ ہم سب پاکستانی ایک دوسرے کا خیال رکھیں" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "پاکستان اللہ کی سرزمین ہے۔ اسے اللہ بچاتے گا۔"

سلمٰی ماں سے ایسا تاثر لے کر نکلی جس میں اطمینان اور سکون تھا لیکن وسوسے بھی دل میں موجود رہے۔

by iqbalmt@gmail.com scanned by iqbalmt@gmail.com

چند دنوں بعد ارشد اور طاہرہ غیر متوقع طور پر سلمٰی کے گھر آ گئے۔ ارشد کو رجب علی نے عبدالجلیل کے گھر جانے سے منع کیا تھا۔ اُس بات اور اُس واقعہ کو چھ مہینے گزر گئے تھے۔ ان چھ مہینوں میں لوگ اور ان کے بیڈ رولز عبدالجلیل کو بھول چکے تھے۔ اس عرصے میں کئی عبدالجلیل اقتدار کی سیاست کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ کئی سیکورٹی ایکٹ میں گرفتار ہوئے اور جیلوں میں پھینک دیئے گئے تھے۔ چھ مہینے پہلے والی وزارت بھی بدل چکی تھی۔

ارشد اور طاہرہ کو دیکھ کر سلمٰی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بہت دیر تک طاہرہ کے گلے لگ کر روتی رہی۔ طاہر پرویز بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کی عمر آٹھ سال ہو چکی تھی۔ اصغر گھر تھا۔ وہ اور طاہر پرویز آپس میں گھل مل گئے اور کھیل کود میں لگ گئے۔

خاوند کی وفات کے بعد سلمٰی کو پہلی بار وہ انسان ملے جن کے ساتھ وہ دل کی ہر بات کر سکتی تھی اور جنہیں وہ دل کے پھپھولے دکھا سکتی تھی۔ اُس نے سینے میں دبی ہوئی ہر بات ارشاد، طاہرہ سے کی۔ پھر باریں نہیں سر ہو پا رہے تھے۔ باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔

یہ تینوں کوئی نئی بات نہیں کر رہے تھے۔ سیاست جو یہاں رائج ہو چکی اور جڑ پکڑ چکی تھی اس سے عام آدمی اُس سطح تک پہنچا دیا تھا کہ جہاں دو چار آدمی جمع ہوتے یہی باتیں کرتے اور حکمرانوں کو برا بھلا کہتے۔ مہنگائی اور جرائم کے روز افزوں اضافے پر کڑھتے اور ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے تھے۔ بعض لوگ لیڈروں کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ بحث ہوتی اور بحث لڑائی جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر جاتی۔ عوام دھڑوں میں تقسیم ہوتے جا رہے تھے۔

ارشد، طاہرہ اور سلمٰی دلوں کا غبار نکال چکے تو سلمٰی نے کہا کہ الزعلی نام کا ایک نوجوان اس کے بیٹے کی فیس ادا کرتا ہے اور اسے پیسے بھی دیتا ہے۔ اُس نے ساری بات سُنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ الزعلی اُس کے گھر گیا اور وہ الزعلی کے گھر گئی تھی۔

"اس شخص کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر میرے سارے وہم دور ہو گئے تھے" — سلمٰی نے کہا — "لیکن وہم پھر پریشان کرنے لگتے ہیں..... ارشد! تم عقل والے ہو۔ مرد کو مرد ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں نہیں اُس کی کوئی کاٹ بتا سکتی۔ کیا تم اُسے مل کر بتا سکو گے کہ یہ شخص اپنی باتوں جیسا ہی مخلص ہے یا کیسا ہے؟"

"اگر آپ رکھیں پھر بھی میں اس شخص کے متعلق پہچان ہیں کرتا" — ارشد نے کہا — "بچے کا معاملہ ہے اور زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ بھیڑیوں نے بھیڑوں کی کھالیں اوڑھ لی ہیں۔ اب کسی کا چہرہ دیکھ کر کہنا کہ یہ معزز آدمی ہے بہت بڑی غلطی ہے۔ میں دیکھنے جاؤں گا کہ وہ کون ہے اور اُس کی نیت کیا ہے۔"

سلمٰی نے اُسے کوٹھی کا ایڈریس بتا دیا۔

o

کوٹھی کی تلاش مشکل نہیں تھی۔ ارشد نے بڑی جلدی [illegible] نکالی اور وہ سڑک پر رُک گیا۔ اتنی بڑی اور اتنی عالیشان کوٹھی اُس کے دل میں شک پیدا کرنے لگی۔ اُس نے سوچا کہ یہ ہندوستان کے کسی نمائندے کی کوٹھی ہے۔ اس میں رہنے والے سب کچھ ہو سکتے ہیں، کسی غریب آدمی کے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ اسے خیال آیا کہ اصغر تیرہ چودہ سال کی عمر کا خوبصورت لڑکا ہے۔

کوٹھی کے قریب سے دو آدمی ٹہلتے گزر رہے تھے۔ ارشد ان کے قریب چلا گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ کوٹھی کس کی ہے۔

"امرتسر کے علاقے کے ملک اللہ یار خان ٹبہ کرتے تھے" — اُسے جواب ملا — "وہاں بھی بہت بڑے زمیندار تھے۔ یہاں بھی زمین الاٹ ہو گئی۔ بڑے نیک انسان تھے۔ تھوڑا عرصہ بیمار رہ کر فوت ہو گئے ہیں۔"

ارشد ان کے ساتھ چل پڑا اور ویسے ہی باتیں کرنے کے انداز سے اسی کوٹھی کی باتیں پوچھتا گیا۔

"اب ان کا بیٹا یہاں رہتا ہے" — ان آدمیوں نے ارشد کو بتایا — "وہ بھی غریب پرور ہے۔ پولیس میں ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ کہتے ہیں اس نے خود نوکری چھوڑ دی ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ تو معلوم نہیں..... نیک آدمی پولیس میں کہاں رہ سکتا ہے۔"

"نام کیا ہے اس کا؟"

"ملک رجب علی خان" — ارشد کو جواب ملا — "بڑا خوبصورت جوان ہے۔ اس کے نوکر بتاتے ہیں کہ جب سے اس نے نوکری چھوڑی ہے یہ بالکل بدل گیا ہے۔ غریبوں کی مالی مدد کرتا ہے اور نوکروں کے بچوں کو اپنے خرچ پر پڑھا رہا ہے۔"

ارشد کے قدم رک گئے اور وہ دو آدمی آگے نکل گئے۔ ارشد ملک رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی کا نام سُن حیران [illegible] گیا۔ اُسے خیال آیا کہ قاتل اپنے مقتول کی بیوہ کی مدد کر کے شاید اپنے جرم کا ازالہ کر رہا ہے۔ ارشد کو وہ رات یاد آئی جب رجب علی اُس کے گھر گیا تھا اور اُس نے جرم کا اقبال کرنے کے انداز سے بتایا تھا کہ طاہرہ [illegible] کے ہاتھ سے کس طرح مرا تھا۔ اگر اُس کی ذہنی کیفیت اب بھی ویسی ہی ہے تو سلمٰی کو اس کی [illegible] نہیں کرنا چاہیئے۔

ارشد کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ رجب علی باغ نما لان میں ٹہل رہا تھا۔ ارشد کو دیکھ کر وہ تیز قدم اس تک پہنچا۔

"آپ شاید بھول گئے ہوں گے" — ارشد نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوئے کہا — "میرا نام ارشد ہے۔ آپ ہمارے ہاں آئے تھے۔"

"میں واقعی بھول گیا تھا" — رجب علی نے ہنستے ہوئے کہا — "تم اشفاق صاحب کے بیٹے ہو نا! میں تمہیں گرفتار کرنے گیا تھا..... اب تو کسی خفیہ تحریک کے چکر میں نہیں ہو ارشد؟"

"تحریک تو کوئی نہیں ملک صاحب!" — ارشد نے کہا — "چکر میں ضرور ہوں۔"

رجب علی نے لان میں ہی کرسیاں منگوا لیں اور وہ بیٹھ گئے۔

"اب کس چکر میں ہو؟" — رجب علی نے کہا — "میں آپ سے کر تمہارے ابو سے ملا تھا میں نے تمہارے ابو سے ایک بار پھر کہا تھا کہ ارشد کو جذباتی قسم کی تحریکوں سے بچائے رکھیں۔ ہمارا دین اور ہمارا ایمان پاکستان ہے ارشد! تم دیکھ لینا، اس ملک کو اپنی جاگیر سمجھنے والے حکمرانوں کا انجام کیا ہو گا۔ جو آئے گا ذلیل و خوار ہو کر جائے گا! 'زندہ باد' کے نعرے لگا کر آئے گا 'مردہ باد' کے نعرے اُسے کرسی سے اٹھا کر پھینکیں گے۔ رہے گا نام اللہ کا اور پاکستان کا۔ شرط یہ ہے کہ اپنے بچوں کے خون میں پاکستان کی محبت اور عظمت

iqbalmt@gmail.com scanned by
اقبال کتابیں
خوبصورت لوگوں کی محفل

شامل کردو۔ بچوں کو پاکستانی بناؤ..... تمہارا ایک بچہ ہے۔ تمہارے اور بچے بھی ہوں گے۔"

"ملک صاحب!"۔۔۔ ارشد نے کہا۔"ایک اور بچہ بھی ہے جو میرے لیے، اور شاید آپ کے لیے بھی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ وہ عبدالجلیل خان کا بچہ ہے۔"

"کیا مطلب اس بچے کا؟"۔۔۔ رجب علی نے اپنے آپ کو جھٹکا سے کر آگے کرتے ہوئے گھبراہٹ کے لہجے میں پوچھا۔"کیا مسئلہ ہے جلیل کے بچے کا؟"

"مسئلہ اس کی ماں کا ہے"۔۔۔ ارشد نے کہا۔"اپنے بچے کے متعلق وہ بہت حساس ہے۔ آپ سے مل چکی ہے پھر بھی اُسے وہم ہے کہ آپ اس کے بچے کو ورغلا لیں گے..... آپ نے اُسے اپنا نام الفرعلی بتایا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ آپ ہوں گے۔"

"اُسے معلوم ہے کہ جلیل پولیس مقابلے میں نہیں، میرے ہاتھوں مرا تھا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔"اس لیے میں نے اُسے اپنا نام الفرعلی بتایا ہے۔"

"آپ کب تک اُس سے اپنا آپ چھپائے رکھیں گے؟"

"میں اُسے ہر روز تو نہیں ملوں گا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔"اس کا تک رفع کرنا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے۔ اچھا ہوا ہے کہ تم آ گئے ہو۔ تم تو میری نیت پر شک نہیں کرو گے؟"..... اس کا دل رکھنا..... ارشد!"۔۔۔

رجب علی ہکلانے لگا۔"انسان کو زرا سا تبدیل ہو جاتا ہے تو سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں طاقت آ گئی ہے اور اس جیسا کوئی نہیں مگر ایک طاقت اس کی اپنی ذات سے اٹھتی ہے اور اُس کے سر پر الیا چھپر مارتی ہے کہ انسان کو اپنی اصلیت نظر آ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی سلوک خدا نے میرے ساتھ کیا ہے۔ میں تو ظالموں میں سے تھا ارشد! مگر کسی مظلوم کی ایک آہ یا فریاد نے مجھے میرا اصل چہرہ دکھا دیا ہے۔"

"کیا یہ آپ کی خوش نصیبی نہیں؟"

"یقیناً خوش نصیبی ہے"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔"خدا نے مجھے صراطِ مستقیم دکھا دی ہے۔ لیکن ارشد! میں نے جو روحانی اذیت دیکھی ہے وہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔ میری نیند اڑ گئی تھی۔ میں نے جلیل کو اپنے کمرے میں ہر رات دیکھا۔ میں کہیں چلا جاتا، ہوٹل میں، سفر میں، تو جلیل میرے راستے میں آ جاتا۔ مقتول نے اپنے قاتل کو ایسی سزا دی ہے جو اذیت عمر قید سے کہیں زیادہ ہے۔ اس نے مجھے اپنا آپ گہری تاریکی میں بھی دکھایا۔ میں کبھی کبھی شراب پیا کرتا تھا وہ چھوڑ دی۔ ایک روز میں اپنے مقتول کی روح یا بدروح یا اس کے بھوت سے اتنا خوف زدہ ہو گیا کہ اپنے نوکر سے کہا کہ مجھے چرس لا دو۔ چرس تو نہ ملی لیکن میرے نوکر نے مجھے پینے نہ دی۔ میں اپنے آپ کو، اپنے وجود کو نشے میں غرق کر دینا چاہتا تھا لیکن خدا نے اپنا ہاتھ ایک نوکر کے ہاتھ کی صورت میں آگے بڑھا کر مجھ سے چرس چھین لی۔ میں نے سنا تھا کہ کوئی بے گناہ مارا جائے تو اُس کی روح دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے اور بدروح بن کر زندہ لوگوں کو پریشان کرتی ہے۔ میں جلیل کے دامن کو بدروح سمجھتا رہا....."

"میں اپنے خاندانی ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس گیا۔ اُسے بتایا کہ مجھ سے کیا گناہ ہو گیا ہے اور اب میرا کیا حال ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر بھی ہیں اور عالم بھی۔ انہوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے یہ تمہاری روح اور تمہارا اپنا ضمیر ہے۔ تم نے ان پر ایک گھناؤنے گناہ کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ گناہ کے بوجھ کو صرف ایک چیز ضمیر سے اتار سکتی ہے۔ یہ ہے اللہ کے بندوں کی محبت اور دکھی انسانوں کا درد۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم

ظالم تھے، اب مظلوم بن کر مظلوموں کے دکھ کی دوا ڈھونڈو....."

"ارشد! میں نے یہ نکتہ سمجھ لیا۔ یہ راز پا لیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی کوٹھی کو دیکھا۔ یہ مجھے اپنے مقبرے کی طرح نظر آتی جیسے مغل بادشاہوں نے مرنے سے پہلے بادشاہوں کے مقبرے بنائے تھے۔ یہاں میں اکیلا رہتا ہوں۔ میں نے نیچے دیکھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ جنہیں کیڑے مکوڑے سمجھ کر ان پر چلتے رہے ہو، یہ تو مجھ جیسے انسان ہیں..... پھر ارشد! مجھے میری اپنی پولیس آسمان سے نوچ کر زمین پر لے آئی۔ گورنر کی سواری آ رہی تھی۔ میں نے ایسی بہت سی سواریاں گزاری ہیں اور لوگوں کو دھکے دیئے اور انہیں ڈنڈے بھی مارے ہیں۔ استعفیٰ دینے کے بعد ایک روز ایک کانسٹیبل نے مجھے دھکا دے کر سڑک سے فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ میں انسانوں کے روپ میں آ گیا....."

"ارشد بھائی! لوگ خدا کو یاد کرتے ہیں تو اوپر دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں خدا اوپر ہے..... نہیں..... خدا اوپر نہیں، نیچے ہے۔ نیچے دیکھو کہ چلو تو تمہارے قدم کسی انسان کو، انسان کے کسی بچے کو روندیں گے نہیں۔ کسی کو نشانہ بنا کر نہیں مارو گے۔ کسی کا مسلہ گے نہیں، کسی کو کچلو گے نہیں، اور نظریں نیچی رکھو گے تو ٹھوکر بھی نہیں کھاؤ گے..... خدا کو اپنے وہ بندے عزیز ہیں جو گردنیں اکڑا کر چلنے والوں کو نظر نہیں آیا کرتے....."

"میں نے خدا کو غریبوں کے بچوں کے روپ میں دیکھا اور انہیں پیسنے سے لگا لیا۔ بستی سلمٰی نے بتایا تھا کہ اُس کا بیٹا اصغر مجھے کس طرح اتفاق سے ملا تھا۔ اگر وہ مجھے یہ نہ بتاتا کہ کس کا بیٹا ہے تو بھی میں اُسے اپنا لیتا اور کہاں سے دیتا لیکن اُس نے جب اپنے باپ کا نام بتایا تو میں وہ رجب علی نہ رہا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ میری روح نے کہا کہ یہ ہے وہ بچہ جو تمہاری روح کی نجات کا سبب بن سکتا ہے۔ میں نے اُسی وقت اس بچے کی سرداری اپنے سر لے لی۔"

ارشد یوں اس کی باتوں میں گم ہو گیا تھا جیسے مسحور ہو گیا ہو۔ یا علم و فضل کی کسی کتاب میں محو ہو گیا ہو۔ ملک رجب علی ایک کتاب ہی تھی جو ارشد کو اپنا آپ پڑھا رہی تھی۔

"پھر میری روح کو نجات مل گئی"۔۔۔ ملک رجب علی کہہ رہا تھا۔"اس روز کے بعد مجھے اپنے مقتول کی نہ روح نظر آئی نہ بدروح، نہ مجھے شراب کی ضرورت محسوس ہوئی نہ چرس کی۔ مجھ پر جو نشہ طاری ہو چکا تھا اس نے میری روح اور میرے ضمیر کو بڑی بھیانک اذیت اور بڑی زہریلی قید سے آزاد کر دیا۔۔۔ ارشد!"۔۔۔ ملک رجب علی نے آگے ہو کر ارشد سے التجا کے لہجے میں کہا۔"بستی سلمٰی کو پتہ نہ چلنے دینا کہ میں اُس کے سہاگ کا قاتل ہوں۔ اُسے میرا نام نہ بتانا۔ تم عقل مند ہو۔ گریجویٹ ہو۔ اگر تم بھی مجھے سزا دینا چاہتے ہو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ سلمٰی کے بچے کو اپنا بچہ بنا کر مجھے نجات مل جائے گی۔ سکون مل جائے گا۔ اگر مجھے پھر اسی اذیت میں پھینک دیا گیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ مجھے نظر آ رہا ہے جیسے یہی میرا انجام ہے۔ خون کا بدلہ خون۔"

"نہیں بتاؤں گا"۔۔۔ ارشد نے کہا۔"جن حالات میں عبدالجلیل خان آپ کے ہاتھوں مرا ہے ان حالات کے ذمہ دار آپ نہیں تھے۔ میں آپ کو قاتل نہیں سمجھتا۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ میں لاہور میں رہتا ہی کہاں ہوں۔ دس بارہ دنوں کی چھٹی آیا ہوں پھر راولپنڈی چلا جاؤں گا۔ سلمٰی سے میری ملاقات ہوتی ہی کہاں ہے۔"

"اُسے تسلی دو"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔"سلمٰی کو یقین دلاؤ کہ میں اُسے دھوکہ نہیں دے رہا۔ میں اُس کے بچے کا مستقبل بنا رہا ہوں۔ دراصل یہ نیکی میں اپنے ساتھ کر رہا ہوں۔ سلمٰی کو بتانا کہ میری بیوی مر چکی ہے اور

iqbalmt@gmail.com scanned by

سیرا کوئی پیغمبر نہیں، میں اپنی تنہائی اور خلش کو تسکین دے رہا ہوں۔"

ارشد نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اُس کے راز کو اپنے سینے میں رکھے گا لیکن یہ سوچ اُسے پریشان کر رہی تھی کہ یہ راز کب تک راز رہے گا اور جب یہ راز فاش ہو گیا تو سلمیٰ کا ردِعمل کیا ہو گا اور پھر رجب علی کیا کرے گا۔

اُس نے اُسی روز سلمیٰ کے گھر جا کر اُسے یقین دلایا کہ الٰہ علی کو مخلص اور اپنا محسن سمجھے۔ اُس نے سلمیٰ سے کہا کہ الٰہ علی تنہا ہے، نہ بیوی نہ کوئی بچہ، اس لیے وہ اپنی تسکین کے لیے صرف اصغر کے ہی نہیں تین چار اور بچوں کے بھی اخراجات ادا کر رہا ہے۔

○

سلمیٰ کے شکوک رفع ہو گئے اور دل سے وہم اُتر گئے۔ اس نے سکون اور اطمینان کی آہ بھری اور رجب علی کا سراپا اُس کے سامنے آ گیا۔ اُسے رجب علی کی باتیں سنائی دینے لگیں جو اس نے رجب علی کی کوٹھی میں کی تھیں۔ چونکہ اُس کے ذہن اور دل پر شک کی دھند چھائی ہوئی تھی اس لیے اُس نے رجب علی کی باتوں کا اثر کم ہی قبول کیا تھا، اب جب شک کی دھند چھٹ گئی تھی اُسے وہ باتیں پھر سنائی دینے لگیں۔ اُسے ہر بات اچھی لگی۔ اُسے خیال آیا کہ الٰہ علی پُرجلال شخصیت ہے۔ یہاں ہر کوئی قاتل اور لٹیرا نہیں ہے جو سوتے دلوں میں جان ڈالنے والے اور جھولی بھرنے والے بھی ہیں۔

سلمیٰ کے ہاتھ سلائی کی مشین چلا رہے تھے لیکن اُس کے ذہن میں الٰہ علی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ تن تنہا بیوہ کو جس پر خاوند کے قتل کی اور اوپر سے آئی ہوئی دھمکی کی دہشت غالب رہتی تھی، اب اُس کو ہر طرف سے تحفظ ہی تحفظ نظر آنے لگا جیسے سمندر میں ڈوبتے ہوئے انسان کو ایک کشتی اپنی طرف بہتی دکھائی دے رہی ہو۔ اُس کا لاشعور اُس کی جسم کی مثل طاقت کو جگانے کی اور کشتی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی ہی کوشش سلمیٰ کی ذات میں بیدار ہونے لگی اور وہ اُن چھوڑ کر سوچوں میں کھو گئی۔

وہ باوقار خاندان کی بیٹی تھی۔ خاوند بلا تو وہ بھی باوقار ملا۔ کبھی کسی کے سامنے اُسے پھیلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ زبان بند رکھنے کے لیے اور پولیس کی لکھی ہوئی تحریر پر دستخط کرنے کے لیے اُسے جو رقم دی گئی تھی وہ اُس نے بنک میں جمع کرا دی تھی۔ کچھ مہینے گزر گئے تھے۔ اس رقم کو اُس نے ابھی چھیڑا نہیں تھا۔ اب اُس کا وقار اُس سے تقاضا کر رہا تھا کہ وہ اُس شخص پر جس نے اپنا نام الٰہ علی بتایا تھا، اپنا بوجھ نہ ڈالے اور اُس کے سامنے غریب اور مظلوم نہ بنے۔

ایک شام رجب علی کھانا کھا کر ٹہلنے کے لیے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں اُس نے ایک ٹانگہ روکا اور سوار ہو گیا۔ دروازے پر کسی کی دستک نے اُسے خیالوں سے بیدار کر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور اُسے شک ہونے لگا جیسے اس دروازے پر اس نے دستک دی ہے۔ وہ وہاں سے ہٹنے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ اس نے دیکھا۔ اس کا پسینہ نکل آیا۔ وہ ارادہ کر کے نہیں آیا تھا۔ اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح وہ اس دروازے تک پہنچ گیا ہے۔

"اوہ.... آپ!" — اُسے سلمیٰ کی آواز سنائی دی — "آ جائیے نا!"

وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ اُس نے اپنی اس ذہنی کیفیت کو چھپانے کے لیے کوئی جھوٹ نہ تراشا، نہ ہچکچاہٹ کی۔ خاموشی سے اندر چلا گیا۔ سلمیٰ نے دروازہ بند کر دیا۔

"اصغر کہاں ہے؟" — رجب علی نے ایسی آواز میں پوچھا جو اُس کی اپنی نہیں لگتی تھی۔

"ابھی ابھی سویا ہے۔"

"میں یہیں سے واپس نہ چلا جاؤں؟" — رجب علی نے بوجھل آواز میں کہا۔

"آئے کیوں تھے؟"

"کیا کیوں تھا؟" — رجب علی نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہا — "یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔"

"الٰہ علی صاحب!" — سلمیٰ نے حیران سا ہو کے پوچھا — "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

وہ اندر چلا گیا اور سلائی کی مشین کے پاس بیٹھ گیا۔ سلمیٰ بھی بیٹھ گئی۔

"سلمیٰ! مجھے معاف کر دینا۔" — رجب علی نے کہا — "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں ارادے سے یہاں نہیں آیا۔ تم تعلیم یافتہ ہو سلمیٰ! معلوم نہیں میری ذہنی حالت کو سمجھ سکو گی یا نہیں۔ اگر نہ سمجھ سکو تو مجھے معاف کر دینا۔ میری نیت پر شبہ نہ کرنا۔"

"میں سمجھنے کی کوشش کروں گی الٰہ علی صاحب!" — سلمیٰ نے کہا — "آپ کی نیت پر مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ آپ کہنے کہتے سے کیوں ہیں؟"

"اگر کچھ بتا کر سکو تو کچھ بات بتا دیتا ہوں۔" — رجب علی نے کہا — "مجھے اُس وقت پتہ چلا کہ میں تمہارے دروازے پر کھڑا ہوں جب میں اس دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ تم کہو گی کہ اتنی دور سے تم تانگے پر آئے ہو گے۔ کیا اتنا حاصل تم نے بے ہوشی میں طے کیا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہوں گی۔"

"میں بے ہوش نہیں تھا۔" — رجب علی نے کہا — "تانگے والا میرے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا۔ اب یاد آتا ہے، جب میں تانگے میں داخل ہوا تو میں ہوش میں تھا۔ تم نے دروازہ کھولا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں تمہارے خیال میں کھویا ہوا تھا.... سلمیٰ! بات یہ ہے کہ مجھے اتنا بڑا صدمہ پہنچا ہے کہ میری ذہنی حالت کبھی کبھی ہی ہو جاتی ہے۔ صدمہ نہ کہیں، حادثہ کہہ لو.... کسی کی وفات کا؟.... کسی عزیز کا؟"

"نہیں۔" — رجب علی نے جواب دیا — "یہ تو میرا مستقل روگ ہے۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے ہیں۔ مجھ سے نہ پوچھو کہ صدمہ کیا تھا۔ میری روح زخمی ہو گئی ہے ضمیر پر ایک ناسور ہے.... میری ان باتوں سے گھبرا نہ جانا۔ مجھے سیانوں نے بتایا ہے کہ جن کے دل دکھی ہیں اُن کا دکھ بانٹ لو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اپنے بچے کو میرے خلاف نہ کر دینا.... میں جا رہا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلمیٰ بھی اٹھی۔ وہ چل پڑا۔ سلمیٰ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ڈیوڑھی میں پہنچے تو وہاں اتنی ہی روشنی تھی جو دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ سلمیٰ اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"میں کہتی نہیں الٰہ علی صاحب!" — اُس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں طنز نہیں تھی، غصہ نہیں تھا اور جس لہجے میں شک کے اظہار کی بھی جھلک نہیں تھی۔ اُس نے کہا — "آپ میرے محسن ہیں۔ میں نے آپ سے نہیں کہا کہ آپ چلے جائیں لیکن مجھے شک میں مبتلا چھوڑ کر نہ جائیں.... آپ میرے پاس آئے تھے۔"

"سلمیٰ! میں بیداری میں یہاں آیا ہوں بے خیالی میں، کیا تمہارے پاس ہی تھا؟" — رجب علی نے کہا —

iqbalmt@outlook.com scanned by iqbalmt

"لیکن قرآن کے آواز میں قسم کھا کر تمہیں یقین دلاؤں کہ میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ تم خوبصورت بیوہ ہو اور میں تنہائی کا مارا ہٹا مرد ہوں جس روز تنہائی سے گھبرا کر آؤں گا اس روز پہلی بات یہ کہوں گا کہ سلمیٰ! تنہائی میں دل نہیں لگتا تھا، تمہارے پاس آگیا ہوں۔"

اُس کے لب و لہجے میں کوئی ایسا تاثر تھا جس نے سلمیٰ کے دل میں کوئی شک پیدا نہ ہونے دیا تھا۔ رجب علی نے بے ساختہ سلمیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا — "مجھے معاف کر دینا۔" — اور وہ لپک کر باہر نکل گیا۔

○

اُس رات رجب علی زیادہ وقت جاگتا رہا۔ کبھی کبھی پچھتانے لگتا کہ اُسے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن جب یہ خیال آتا کہ وہ بے خیالی میں وہاں جا پہنچا تھا تو وہ بے چین ہو جاتا اور پریشان کہ یہ ذہنی کیفیت اس کے لیے اچھی نہیں۔ وہ سلمیٰ کو ذہن سے اتار دینے کی کوشش کرنے لگا لیکن سلمیٰ کے خیال سے ہی اُسے تسکین ہوتی تھی۔ رات کے آخری پہر اس کی آنکھ لگی اور خواب میں وہ سلمیٰ کو ہی دیکھتا رہا۔

سلمیٰ بھی اُلٹے سیدھے خیالوں میں الجھی رہی۔ بار بار ایک ہی خیال غالب آتا تھا کہ انور علی اس کے لیے آیا تھا اور ہو سکتا ہے وہ دولت کے نشے میں ہو لیکن دولت کے نشے والے اس طرح گھبرائے ہوئے نہیں ہوتے۔ وہ روح اور ضمیر کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ یہ آدمی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ ہے تنہا، دکھی معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے دن جب اصغر سکول چلا گیا تو سلمیٰ گھر سے نکل گئی۔ وہ انور علی سے ملنے جانا چاہتی تھی لیکن فیصلہ نہ کر سکی کہ جائے یا نہ جائے۔ اسی کو شش کی کیفیت میں وہ بس میں سوار ہو گئی۔ اس کا ذہن اسی ایک سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا — مجھے وہاں جانا چاہیے یا نہیں — اور وہ انور علی کی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ رجب علی کو جب نوکر نے بتایا کہ ایک خاتون آئی ہے تو وہ دوڑتا باہر آیا اور سلمیٰ کو اندر لے گیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے" — رجب علی نے کہا — "میں رات کو سو نہیں سکا۔"

سلمیٰ گھبرانے لگی۔

"میں آ تو گئی ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتی کہ مجھے آنا چاہیے تھا یا نہیں۔"

"نہیں آنا چاہیے تھا" — رجب علی نے کہا۔

سلمیٰ ایک گھنٹے بعد کوٹھی سے نکلی۔ اُس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی —

"یہ کوئی درویش ہے۔ مجھے پھر بھی یہاں آنا چاہیے۔"

وقت گزرتا چلا گیا۔ رجب علی اور سلمیٰ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے۔ سلمیٰ کے دل سے وہم اور وسوسے نکل گئے تھے۔ رجب علی کی باتیں سن کر اُسے سکون سا محسوس ہوتا تھا۔ اصغر رجب علی سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ رجب علی نے اصغر کو بائیسکل لے دیا تھا۔ اُس نے سلمیٰ سے کہا تھا کہ دو لوگوں کے کپڑے سینے چھوڑ دے۔ سلمیٰ نہیں مانی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ اپنے وقار کو مجروح نہیں ہونے دوں گی۔

اصغر نویں جماعت میں پہنچ گیا۔

سلمیٰ نے بڑی خاموشی سے اپنے خاوند کی برسی کی۔ وہ لوگوں کا سلاتی کا کام کرتی رہی۔

ایک سال گزر چکا تھا۔ اس ایک سال میں انور علی سلمیٰ کے دل میں اُتر گیا۔ رجب علی ہر روز اس کی راہ دیکھنے لگا — پھر وہ وقت آیا کہ دونوں اپنی اپنی تنہائی سے اکتا گئے اور دونوں اُس مقام تک جا پہنچے جہاں انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔

اور ایک روز یوں ہوا کہ سلمیٰ رجب علی کی کوٹھی میں گئی اور سیدھی اُس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ سویا ہوا تھا۔ تپائی پر تین چار لفافے پڑے تھے جو ڈاک سے آئے تھے۔ رجب علی سویا ہوا تھا اس لیے نوکر لفافے تپائی پر رکھ گیا تھا۔ سلمیٰ نے تمام لفافوں کے ایڈریس پڑھے۔ سرِ لفافے پر نام ملک رجب علی خان لکھا ہوا تھا! ایک لفافے پر لکھا تھا — ملک رجب علی خان سابق ڈی۔ ایس۔ پی۔

اس سے پہلے رجب علی کی محتاط فطرت نے گوارا نہ کیا تھا کہ اُس کے کمرے میں کوئی ایسا کاغذ نہ ہو جس پر اُس کا نام لکھا ہو۔ یہ مسئلہ اُسے ہر وقت پریشان رکھتا تھا کہ اپنے نام کے راز کو وہ کب تک سلمیٰ سے چھپائے رکھے گا، اور کبھی سلمیٰ پر یہ راز فاش ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اُس نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ سلمیٰ کو اپنی اصلیت بتا دے لیکن وہ جرأت نہ کر سکا۔

اب یہ راز سلمیٰ کے ہاتھ آ گیا۔ سلمیٰ نے تینوں لفافے تین چار بار پڑھے۔ کوٹھی کا نمبر بھی لکھا تھا۔ اُس کا جسم کانپنے لگا۔ اُس کے دانت بجنے لگے۔ اتنے میں رجب علی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور سلمیٰ کے ہاتھ سے لفافے لے لیے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"ان لفافوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" — سلمیٰ نے دھیمی سی آواز میں پوچھا۔ اُس کا چہرہ غصے اور انتقام سے سرخ ہو گیا تھا۔

"یہ نام ہے" — رجب علی نے کہا۔

"نام ہے؟ آپ ہیں آپ؟" — سلمیٰ نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا — "آپ انور علی ہیں نا؟"

"نہیں" — رجب علی نے تحمل سے کہا — "میں ملک رجب علی ہوں۔ سابق ڈی۔ ایس۔ پی۔ تمہارے خاوند کا قاتل!"

سلمیٰ کے سر نے گھومنا شروع کر دیا۔ اُس کا حسین چہرہ بالکل ہی بدل گیا۔ اب اس چہرے پر تمکنت نہیں قہر تھا۔ اُس نے رجب علی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"فریبی۔ دھوکہ باز" — سلمیٰ نے دانت پیس کر کہا — "اپنا اصل نام مجھ سے کیوں چھپایا تھا؟"

"میں نے تمہیں کوئی فریب نہیں دیا" — رجب علی نے کہا — "کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ میں نے تمہارے جسم کے ساتھ ہلکی سی دلچسپی کا بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔"

"قاتل!.... خونی!" — سلمیٰ نے قہر بھری آواز میں کہا — "میرا سہاگ اجاڑنے والے...."

"سلمیٰ!" — رجب علی نے التجا کی — "مجھے بتانے دو کہ میں نے تمہیں اصل نام کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں" — سلمیٰ تیز قدم دروازے کی طرف چل پڑی۔ دروازے میں رک کر بولی — "میرے بیٹے کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی فیس نہ دینا.... میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔"

"سلمیٰ!" — رجب علی اُس کی طرف بڑھا اور بولا — "رک جاؤ سلمیٰ، میری بات سن کے جاؤ۔"

سلمیٰ چلی گئی اور رجب علی سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

iqbalmt@yahoo.com Scanned by

اسے ایک اطمینان تو یہ تھا کہ اُس نے سلمٰی اور اس کے بیٹے کو دیا تھا، لیا کچھ نہیں تھا۔ اس نے اس بچے کا سکول میں وقار بحال کروایا تھا۔ سلمٰی کے ذہن سے بچے کے مستقبل کا بوجھ اُتار دیا تھا۔

اور اطمینان اسے یہ بھی تھا کہ سلمٰی بیوہ تھی، خوبصورت تھی، تندرست اور اُس کی محتاج تھی لیکن رجب علی نے اُسے کبھی بُری نیت سے نہیں دیکھا تھا۔ بیوہ اگر محتاج ہو تو وہ اُن لوگوں کو خوبصورت ہی نظر آتی ہے جن کی جیب میں چند روپے ہوتے ہیں۔ سلمٰی تو تھی ہی خوبصورت۔ رجب علی کے پاس دولت تھی۔ وہ تنہائی کا مارا ہُوا تھا۔ اُس کے جذبات پیاسے تھے۔ وہ پولیس آفیسر رہ چکا تھا۔ انسانوں کو پہچاننا جانتا تھا۔ اس نے سلمٰی کو اپنے ساتھ بے تکلف کر بھی لیا تھا لیکن اُس نے اپنی نظروں میں کبھی میل نہیں آنے دی تھی۔ سلمٰی فرشتہ تو نہیں تھی لیکن رجب علی نے اُسے فرشتوں کے آسمان سے کبھی نیچے نہیں آنے دیا تھا۔

☆

رجب علی جیلو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ سلمٰی یہ نہیں کر سکتی کہ رجب علی نے اُس کے بیٹے کی تعلیم کے لئے رقمات اور دیگر ضروریات اپنے ذمے لے کر اُس کی عصمت کی بولی دی تھی۔

رجب علی کو گزرے ہُوئے ایک سال کی باتیں اور ملاقاتیں یاد آنے لگیں۔ ادھورے ہُوئے لوگ اچھے لوگوں کی یادوں میں پناہ لیا کرتے ہیں۔ رجب علی تو شکست خوردہ اور زخمی تھا ــــ سلمٰی کے ساتھ اس کی ملاقاتیں ایک سال سے کچھ دن اوپر کے عرصے پر پھیلی ہُوئی تھیں۔ وہ سلمٰی کو اتنی آسانی سے دل سے نہیں اُتار سکتا تھا۔ ایک سال کے تھوڑی دُور اکٹھے چل کے جُدا ہو جائیں تو اجنبیت کے باوجود کچھ عرصے تک ایک دوسرے کو یاد کرتے ہیں۔ سلمٰی اور رجب علی کا تو ایک سال کا ساتھ تھا۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو اپنے دل کھول کر دکھائے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ اور درد اپنے سینوں میں ڈالے تھے۔ ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنوں کی تیزیوں کی تھیں۔ ایک دوسرے کو مسکراہٹیں دی تھیں۔ رجب علی نے سلمٰی کے آنسو پونچھے تھے سلمٰی نے رجب علی کی آہوں کو اپنے آنسوؤں میں ڈبویا تھا۔

ایک دو ملاقات تھی کہ فلک رجب علی اپنے گھر سے کہیں اور جانے کو نکلا تھا اور بے خیالی میں سلمٰی کے گھر جا پہنچا تھا۔ پھر سلمٰی ارادے سے اُس کی کوٹھی میں پہلی بار گئی تھی تو اُس نے پریشان سا ہو کے رجب علی سے کہا تھا ــــ "میں آ تو گئی ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتی کہ مجھے آنا چاہیئے تھا یا نہیں" ــــ یہ جھجھک، یہ تذبذب اور یہ جھجک دوسری ملاقات میں ہی ختم ہو گئی تھی اور وہ بے تکلفی سے ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے تھے۔

اُسے ایک ملاقات یاد آئی۔ رجب علی رات کے وقت سلمٰی کے گھر گیا تھا۔ اصغر سو گیا تھا۔ کچھ دیر سلمٰی اپنے خاوند عبدالخلیل خان کی باتیں کرتی رہی پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ رجب علی کی طبیعت کی شگفتگی بیدار ہو گئی اور ان کا انداز بے تکلف دوستوں کا سا ہو گیا۔

"آپ باقی عمر تنہا ہی گزاریں گے؟" ــــ سلمٰی نے بے تکلفانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

رجب علی کے ہونٹوں پر آ گئی تھی کہ فیصلہ اور ارادہ تو یہی تھا لیکن تم نے میرے فیصلے اور ارادے توڑ ڈالے ہیں، مگر اُس نے جواب دیا ــــ "کبھی سوچا نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے خواہشیں مر گئی ہیں"

"اتنی جلدی؟" ــــ سلمٰی نے کہا ــــ "مرد تو مر کے بھی دوسری شادی کی سوچ لیتے ہیں"

سلمٰی اُس کے گھر سے نکل گئی تو فلک رجب علی یُوں سُن ہو کے رہ گیا جیسے اُس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ اُس کی نظریں اُس کھلے دروازے میں ٹک گئیں جس سے سلمٰی نکل کے گئی تھی۔ وہ یوں اُس دروازے کو دیکھتا رہا جیسے سلمٰی ابھی واپس آ جائے گی۔ وہ بُت بن گیا جس کے جذبات نہیں ہوتے۔ احساسات نہیں ہوتے۔

پھر اس بُت میں جان آنے لگی۔ بُت سانس لینے لگا پھر اس بُت کا دماغ بیدار ہونے لگا۔ اس کے جذبات رینگنے لگے اور اس کے احساسات نے انگڑائی لی۔ اُس نے درد کی ایسی ٹیس محسوس کی جیسے ایک کانٹا دل میں اُتر گیا ہو اور دوسرا احساس یہ کہ یہ کانٹا اُسے جینے بھی نہ دے گا مرنے بھی نہ دے گا۔

دروازہ دھندلا گیا۔ گھر کے ہر ایک چیز اُسے یُوں دکھائی دینے لگی جیسے پانی میں ان کے عکس دیکھ رہا ہو۔ یہ اُس کے آنسوؤں میں جھلمل کرتے عکس تھے۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ اُس نے آنکھوں کو بند کیا تو آنسو بہہ گئے جو اُس نے رومال سے پونچھ ڈالے۔

"کیا خون کا بدلہ خون ہی ہو گا؟" ــــ اُسے خیال آیا ــــ "کون لے گا کچھ سے بدلہ ــــ سلمٰی؟ ــــ عبدالخلیل خان کی روح؟ ــــ میں خود؟ ــــ مجھے اپنے آپ کو سزائے موت دینی پڑے گی ــــ اور کیا لوگ اسے خودکشی کہیں گے؟ ــــ اخباروں میں ایک بار پھر فلک رجب علی کا نام چھپے گا۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وہی رجب علی ہے جو ڈی۔ ایس۔ پی ہُوا کرتا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے بڑے خطرناک قسم کے پولیس مقابلے میں ڈاکو مار گرائے تھے ــــ اس کی آہ نکل گئی ــــ مرنے کے بعد بھی یہ جھوٹ میرے نام کے ساتھ چپکا رہے گا۔ میرے اعمال نامے میں یہ میرے ساتھ جائے گا۔"

فلک رجب علی نے سلمٰی کے بیٹے اصغر سے پہلے جو ملاقات کی تھی وہ ناخوشگوار تھی۔ اصغر کی وہ ملاقات اُسے یاد آنے لگی اور وہ ڈرنے لگا کہ اب عبدالخلیل خان کا داماد یا اُس کی روح اُسے پریشان کرنا شروع کر دے گی۔ وہ تو مطمئن ہو گیا تھا کہ اُس نے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے اور خدا نے اُس کا کفارہ قبول کر لیا ہے مگر سلمٰی نے اُسے یوں دھتکار دیا جیسے کسی قاتل کو پھانسی کی تاریخ کے انتظار میں پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہو۔

سلمٰی کا اتنا شدید ردِعمل اُس کے لیے جان لیوا صدمہ تھا لیکن وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں اور وہ اپنے آپ سے شرمسار بھی نہیں جیسے وہ سلمٰی سے ملنے سے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ اب اُس کے وجود میں کوئی ایسی قوت بیدار ہو گئی تھی جو اُس کے پاؤں اکھڑنے نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اپنے دل میں ایک گانٹھ کی جو اُس نے محسوس کی تھی وہ بھی اس کے دل نے اپنے اندر جذب کر لی۔ رجب علی کو توقع تھی کہ سلمٰی کے ردِعمل کا پہیل اُسے جہنم میں پھینک دے گا لیکن ایسا نہ ہُوا۔

وہ اپنے آپ پر حیران ہونے لگا اور سوچنے لگا کہ اس کے ضمیر نے اُسے لعنت ملامت کیوں نہیں کی؟ شاید اس لیے کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے؟ شاید اسی لیے ــــ اُس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ خون کا بدلہ خون ہی ہوتا ہے اور اُسے اپنے آپ کو سزائے موت دینی پڑے گی۔

iqbalmt@onedotcom scanned by

رجب علی نے بات کا رخ پھیرنے کے لیے کہا ــــ یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو کیا جواب ہوگی؟

سلمٰی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ اُس کی مسکراہٹ جو کہ اُس کے چہرے کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ رجب علی نے اُس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا چہرہ اوپر اُٹھایا۔ سلمٰی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رجب علی نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا ہاتھ ہٹا لیا۔ سلمٰی کے آنسوؤں نے رجب علی کو بلا ڈالا۔ کسی نے جیسے اُسے کہا ہو ــــ اس چہرے کی رونق اور مسکراہٹ کو تم نے قتل کیا ہے۔ اس کے سہاگ کے قاتل تم ہو!

رجب علی پر سُن سا ہو کر آ پڑا اور اس کا سر جھک گیا۔ اُس کے جی میں آئی کہ سلمٰی کے قدموں میں سر رکھ دے اور اسے کہے کہ میں تمہارے خاوند کا قاتل جیسے تم ایک بار دیکھنا اور اُس کے مُنہ پر تھوکنا چاہتی ہو، مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

ضمیر پر گناہ کا بوجھ بڑے بڑے جابر، عالم اور عاقل انسانوں کو بھی اتنا کمزور کر دیتا ہے کہ وہ کمزوروں کے آگے شرمسار ہوتا اور سر جھکا لیتا ہے مگر سرکش جھکتا ہے اگر کوشش گناہ کو چھپائے رکھنے کی ہوتی ہے۔ دروغ کے پردے ڈالے جاتے ہیں۔ جابر جبر اور تشدد سے، عالم علم کی موہوم سی تفسیروں اور الفاظ سے بھی سچائی دلیلوں سے اور عاقل عقل کی قلابازیوں سے اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرتا ہے اور یوں ایک گناہ کئی نئے گناہوں کو جنم دیتا ہے۔

ملک رجب علی جبر و تشدد کے ڈھنگ بھی جانتا تھا۔ اس کے پاس علم بھی تھا اور عقل بھی اور یہ عقل پولیس کے سہا گئے سے ڈھلی ہوئی تھی۔ سوچیں مار سکتی تھی مگر رجب علی اُس مقام پر تھا جہاں انسان اپنے ضمیر کی آواز سُن کر اُسے دبانے کے لئے جتن نہیں کرتا بلکہ اس آواز کو اُبھرنے دیتا ہے۔ بلند ہونے دیتا ہے کہ اس کا ہر ایک لفظ واضح ہو جائے۔ رجب علی نے ضمیر کی آواز کو روح کی پکار اور اس پکار کی آواز کو حق جان کر اسے روح کی روشنی بنا لیا تھا۔

وہ سلمٰی کے آگے دوانگارے اُگل دینے کو بے قرار ہونے لگا جو اُس نے نگل رکھے تھے یا حالتوں نے اس کے حلق میں ٹھونسے تھے مگر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ سلمٰی کے ردِعمل سے ڈرتا تھا پہلے سلمٰی نے سر جھکا لیا تھا اب رجب علی کا سر جھک گیا۔ سلمٰی تو جیسے تڑپ اٹھی ہو۔ اُس کے بے اختیار ہاتھ رجب علی کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور کچھ چہرہ اٹھایا کچھ خود جھکی۔

"میں اپنے گھر میں آپ کو اداس نہیں ہونے دوں گی" ــــ سلمٰی نے اپنی جذباتی آواز میں کہا جو صرف اُس عورت کی ہو سکتی ہے جس کا دل محبت سے اُبل رہا ہو۔ اس نے کہا ــــ "آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ آپ کو گھڑی دو گھڑی کی مسکراہٹیں دے سکتی ہوں۔ میں نے اپنی اداس اور یاس آلود دنیا میں چند مسکراہٹیں سنبھال کے رکھی ہوئی ہیں۔ یہ میں اپنے اکلوتے بچے کو دیا کرتی ہوں۔ میں اسے اُداس نہیں دیکھ سکتی۔ میں اپنے اصغر کو آنسوؤں اور آہوں سے محفوظ رکھنے کا عہد کیے ہوئے ہوں۔ آپ کو بھی میں اصغری سمجھنے لگی ہوں۔ اپنے بچے کے پیار کا کچھ حصّہ تو آپ کو دے ہی سکتی ہوں۔"

"مجھے صلہ نہیں چاہیے سلمٰی!" ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "مجھے گھڑی دو گھڑی..... نہیں سلمٰی! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

سلمٰی کی اس وارفتگی کا کیا مطلب تھا؟ وہ توصیلہ دینے کی باتیں کر رہی تھی مگر رجب علی نے اپنے سینے

پر سِل رکھ لی تھی۔ اُس نے کوئی اور اچھی بات نہیں کی تھی۔

☆

"طاقی..... خرنی..... وھرکو باز؟"

رجب علی کے کمرے میں سلمٰی کی لرزتی کانپتی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔ وہ گرج کر نہیں بولی تھی۔ اُس کی آواز سرگوشیوں سے اونچی نہیں تھی مگر الفاظ اُس کی زبان سے تیروں کی طرح نکلے اور رجب علی کے سینے میں اُتر گئے تھے ــــ اور رجب علی کو ایک اور ملاقات یاد آنے لگی۔

سلمٰی اُس کی کوٹھی میں آئی تھی۔ اصغر بھی ساتھ تھا اور وہ باہر لان میں پتنگ اڑا رہا تھا۔ رجب علی اور سلمٰی اسی کمرے میں بیٹھے تھے جہاں رجب علی اکیلا بیٹھا گزرے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔

"مجھے تمہارے گھر بار نہیں جانا چاہیئے" ــــ ملک رجب علی نے کہا ــــ "لوگ باتیں کرتے ہوں گے"

سلمٰی اُنہوں نے پہلے ہی بدنام کر رکھا ہے۔"

"کرنے دو" ــــ سلمٰی نے کہا ــــ "اپنے دل اور اپنے ضمیر کی باتیں سننی چاہئیں۔ لوگوں کی باتیں نہیں تو دوسروں کی باتیں سنیں گے۔ بھی ہی نہ سکیں۔"

سلمٰی!" ــــ رجب علی نے پوچھا ــــ "ہم کیوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں؟ اس لیے کہ میں..... وہ دکھی ہو گیا اور پریشان بھی۔

"اس لیے کہ میرے سینے پر سے بیٹے کا مال مدد سے رہے ہیں" ــــ سلمٰی نے رجب علی کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا اور آہ بھر کر بولی ــــ "آپ ایسی بات کہہ سکتے ہیں لیکن میں آپ کو یاد دلانا چاہتی ہوں کہ میں نے ابھی تک بند و ہزار اس رقم کو ہاتھ لگایا ہے جو مجھے اپنے خاوند کی موت کے بعد اس لیے دی گئی تھی کہ میں نے اُس تحریر پر محفوظ کر دیں گے ہم پاکستان کی سیاسی حکومت نے میرے خاوند کو مجرم ثابت کرنے کے لیے لگی تھی۔"

میں احسان نہیں جتا رہا سلمٰی!" ــــ ملک رجب علی نے شرمسار سا ہو کے کہا ــــ "میں کوئی احسان کر رہا ہوں۔"

سلمٰی جو سنجیدہ ہو گئی تھی ہنس پڑی اور بولی ــــ "محبت خریدی نہیں جا سکتی ظفر صاحب!"

سلمٰی کی ہنسی مسکراہٹ بن گئی۔ جب علی نے اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ کئی بار دیکھی تھی اور اسے یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ سلمٰی عام قسم کی عورت نہیں اور اسے روپے پیسے سے نہیں خریدا جا سکتا۔ اگر اس عورت میں وقار نہ ہوتا تو وہ اتنی خوبصورت بھی نہ لگتی۔

اُس روز بھی ملک رجب علی نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ وہ سلمٰی سے اتنی سی بات بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ پیار اور محبت کا پیاسا ہے۔

اُسے اور کئی ملاقاتیں یاد آئیں۔ سلمٰی ہر ملاقات میں پہلے سے زیادہ کھل جاتی تھی۔ پہلے وہ اپنے خاوند کی باتیں زیادہ کرتی تھی۔ وہ جب بھی رجب علی سے ملتی تو باتوں باتوں میں ایسا ذکر ضرور لے آتی۔ جلیل نے ایک بار یوں کہا تھا..... اصغر کے ابا نے ایک بار.....؟ اور رجب علی عبدالجلیل خان کو عظیم انسان ثابت کرنے کے لیے کئی باتیں گھڑ لیتا تھا۔ اُس نے سلمٰی کو بتا رکھا تھا کہ عبدالجلیل نے اُس کے بھائی کو قتل کے الزام سے بری کرایا تھا اور ان کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔

iqbalmt@outlook.com scanned by

تین چار ملاقاتوں کے بعد سلمیٰ خاوند کی باتیں کم کرنے لگی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی اپنے بیٹے کے لیے وقف کر دی تھی۔ بعد کی ملاقاتوں میں سلمیٰ نے عبدالجلیل کا ذکر ترک کر دیا اور وہ رجب علی کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہو گئی مگر اُس نے کبھی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی تھی نہ کوئی ایسی بات کی تھی جس سے رجب علی کو شک ہوتا کہ یہ عورت اس پر مہربان ہے۔

کوئی دو مہینے پہلے رجب علی شام کے بعد سلمیٰ کے گھر گیا تھا۔ بہت دیر کی گپ شپ کے بعد وہ جانے کے لیے اٹھا تو سلمیٰ اُس کے ساتھ آئی۔ باہر کے دروازے تک پہنچے تو رجب علی نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ سلمیٰ کے ہاتھ میں تھا اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر دونوں بیک وقت چونکے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رجب علی سنجیدہ رہا۔ سلمیٰ کے ہونٹوں پر تبسم آگیا اور دونوں کے ہاتھ الگ ہو گئے۔

☆

ایک روز ملک رجب علی اپنا ریوالور صاف کر رہا تھا۔ سلمیٰ آگئی۔ اُس نے ایک برتن اٹھا رکھا تھا۔ برتن تپائی پر رکھ دیا۔

"اُس روز آپ نے کہا تھا کہ آپ کا خانساماں کوئی اچھی طرح نہیں پکا سکتا۔" — سلمیٰ نے کہا — "آپ کے لیے کوفتے پکا کے لائی ہوں۔"

رجب علی نے خوشی سے اچھلتے ہوئے برتن کا ڈھکنا اٹھایا۔ ایک کوفتہ منہ میں ڈالا اور قمقموں کے بل باندھنے لگا۔

"سچ بتائیے آپ سرال رکھ رہے ہیں یا میں نے واقعی کوفتے آپ کی پسند کے پکائے ہیں؟" — سلمیٰ نے کہا — "میرے اور آپ کے خانساماں کے کوفتوں میں کیا فرق ہے؟"

"سچ پوچھتی ہو سلمیٰ؟" — رجب علی نے کہا — "فرق یہ ہے کہ یہ کوفتے کسی عورت نے پکائے ہیں اور میں عورت کے ہاتھ کی ہانڈی کو ترس گیا ہوں۔ پاکستان کے صدمے کے بعد سے کسی عورت کے ہاتھ کے پکے ہوئے کوفتے بھی مجھے ان کوفتوں سے بہتر نہیں لگیں گے۔"

"آپ کوئی بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟" — سلمیٰ نے کہا — "آپ ابھی جوان ہیں۔"

رجب علی نے عادت کے مطابق بات ہنسی میں ٹال دی اور دیوان پر نیم دراز ہو گیا۔ سلمیٰ صوفے پر بیٹھنے کی بجائے اُس کے پاس دیوان پر بیٹھ گئی اور ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اُس کی نظر رجب علی کے ریوالور پر تھی جو تپائی پر رکھا تھا۔ تپائی قریب ہی تھی۔ سلمیٰ نے ریوالور اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگی۔ اس نے ریوالور کھول لیا اور سیلنڈر ایک طرف کر دیا۔

"تم ریوالور سے واقف ہو" — رجب علی نے کہا — "جو ریوالور سے واقف نہ ہو وہ اسے اس طرح نہیں کھول سکتا۔"

"اصغر کے ابا کے پاس ہمیشہ ریوالور رہا ہے" — سلمیٰ نے کہا — "انہوں نے مجھے ریوالور کھولنا، اس میں گولیاں ڈالنا اور نکالنا سکھایا تھا۔ اُدھر سے ہم پاکستان کو آ رہے تھے تو راستے میں جلیل نے مجھے ریوالور فائر کرنا بھی سکھایا تھا۔ میں نے دو گولیاں چلائی بھی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے میں راستے میں مارا جاؤں، پھر یہ ریوالور تمہارے کام آئے گا۔"

سلمیٰ چپ ہو گئی اور اُس کی نظریں ریوالور پر جم گئیں۔ رجب علی نے محسوس کیا کہ سلمیٰ خیالوں کی دنیا میں کہیں دور نکل گئی ہے۔ سلمیٰ بڑی آہستہ آہستہ واپس آئی اور اتنی ہی آہستہ آہستہ اُس کی نگاہیں رجب علی کی طرف گھومتی گئیں۔ اُس کی نظریں رجب علی کے چہرے پر رُک گئیں۔

"وہ وقت یاد ہے آپ کو؟" — سلمیٰ نے سنجیدہ اور سنگین لہجے میں کہا — "وہ خاک اور خون میں ڈوبا ہوا وقت؛ جس وقت سے پاکستان نے جنم لیا تھا؛ وہ شعلے اور وہ لاشیں یاد ہیں آپ کو؛ پاکستان شعلوں اور لاشوں میں سے اٹھا تھا..... وہ بڑا ہی ہولناک اور بڑا ہی بھیانک وقت تھا:"

"ہاں سلمیٰ؛ میں اُس وقت کو نہیں بھول سکتا۔"

"بھولنے والے بھول گئے ہیں" — سلمیٰ نے کہا — "انہوں نے مجھے بیوہ اور میرے بچے کو یتیم کر دیا ہے۔ اُنہوں نے پھول کو توڑ کر مسل ڈالا ہے....." سلمیٰ کو ہچکی آئی اور اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بڑی لمبی آہ لے کر اور دوپٹے سے آنسو پونچھ کر بولی — "کیا خدا ان پاکستانیوں کو بخش دے گا جنہوں نے مجھ جیسی عورت کو ایک غیر مرد کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے؟"

رجب علی تڑپ کے اُٹھ بیٹھا۔ اس نے سلمیٰ کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور کراہتی ہوئی سی آواز میں بولا — "مجھے غیر مرد کہو۔ میں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ تم میرے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھو۔ میری نیت پر شک نہ کرو۔"

"میں نہیں تو زمانے نے کتنی عورتوں کو مجبور کر کے خرید لیا گیا ہے" — سلمیٰ نے کہا۔ اُس کا چہرہ جذبات کے اُبال سے سرخ ہو گیا تھا۔ کہنے لگی — "آج پاکستان کو لاشوں میں سے اٹھانے والے ایک مجاہد کا بچہ یتیم ہو گیا ہے اور اُس کی ماں....."

"خاموش ہو جاؤ" — ملک رجب علی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ تم کہنا چاہتی ہو کہ اس یتیم بچے کی ماں بچے کی خاطر ایک غیر مرد کے پاس بیٹھی ہے؟"

سلمیٰ نے جیسے رجب علی کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"ایک خواہش ہے" — سلمیٰ نے کہا — "مجھے ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی مل جائے اور آپ مجھے یہ ریوالور دے دیں" — اس کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہو گیا۔ دانت پیس کر بولی — "میں ریوالور فائر کرنا جانتی ہوں۔ صرف ایک گولی چلاؤں گی۔ دوسری نہیں۔ میں اُسے ٹوٹتا اور تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ گولی جو اُس کے سینے میں جائے گی وہ میرا سینہ ٹھنڈا کر دے گی:"

"اپنے بچے کے حال پر رحم کرو سلمیٰ!"

"جلیل کا ریوالور پولیس لے گئی تھی" — سلمیٰ نے رجب علی کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا — "اُس کا لائسنس تھا سو پولیس لے گئی..... آپ اپنا ریوالور چھپا کر رکھیں ورنہ میں کسی روز چرا کر لے جاؤں گی:"

رجب علی دیوان پر بیٹھا تھا۔ اُس کی ٹانگیں دیوان پر تھیں۔ سلمیٰ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں فرش پر تھے۔

"اگر میں کہوں کہ تمہارے خاوند کو میں نے قتل کیا تھا تو....."

iqbalmt@onenet.com.pk scanned by

سلمیٰ نے ریوالور دیوان پر پھینک کر رجب علی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم کسی کے قاتل نہیں ہو سکتے اختر آ ــــ جذبات کی شدت سے اُس کے منہ سے آپ کی بجائے تم نکل گیا ــــ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"

"اور تم بھی ایسی باتیں ذہن سے نکال دو" ــــ رجب علی نے کہا اور ایک بازو سلمیٰ کے کندھے پر رکھ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

✡

اُسے تمام ملاقاتیں اور باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے دل پر صدمے کا بوجھ بڑھتا اور ضمیر کا بوجھ گھٹتا جا رہا تھا۔ سلمیٰ نے اُسے فریبی اور دھوکہ باز کہا تھا لیکن اُس نے اس بیوہ کو کوئی فریب دیا تھا نہ اُسے کوئی دھوکہ دیا تھا۔ سلمیٰ جب اس کے ساتھ ہوتی تھی تو کبھی بار سلمیٰ پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی لیکن رجب علی نے اُسے کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کی تھی کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ دو چار مرتبہ وہ بے قابو ہو چلا تھا مگر اس لیے اپنے آپ سے لڑا جھگڑا کہ اپنے دل میں یقین پیدا کر لیا کہ سلمیٰ فرشتہ ہے۔

کوئی نامہ اور پارسا ہو تو اُسے اپنے بھٹکے ہوئے خیالوں کو راہِ راست پر لانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ رجب علی کا معاملہ کچھ اور تھا۔ اُس نے بھٹکی ہوئی زندگی گزاری تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو کبھی شریف آدمی نہیں سمجھا تھا۔ وہ خراب کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ جب سرحد میں تھا تو وہ رشوت میں لڑکیاں بھی قبول کر لیا کرتا تھا۔ وہ اپنے اوپر ہر طرح کا ٹوٹ طاری کر سکتا تھا۔ ہر حال بچپا نے کی مہارت رکھتا تھا۔ کل عبدالجلیل اُس کے ہاتھوں مر گیا تو وہ خرابی کی انتہا، باشی اور عشرت پسند رجب علی مر گیا۔ سلمیٰ کے خواہ مخواہ کے اصرار پر وہ بڑی تیزی سے اُس کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی تھی لیکن اس خوبصورت عورت نے اُس پر اپنے رجب علی کا بیدار کر لیا تھا اور اُسے بڑی کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

ملک رجب علی ہر بار کڑی آزمائش میں پورا اُترا مگر سلمیٰ اُسے دھتکار کر چلی گئی تو اُس کے پاؤں کے نیچے زمین بہنے لگی۔ ایک بیوہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ سلمیٰ اُسے قتل نہیں کرا سکتی تھی۔ وہ اُس کے ہاتھ سے اُسے گولی نہیں مار سکتی تھی مگر سلمیٰ چلی گئی تو رجب علی کی دنیا تاریک ہو گئی۔

اُس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سنبھالا دینے کی کوشش کی کہ اس عورت نے اُس کی اعانت اور نیکی کو قبول نہیں کیا تو نہ کرے۔ وہ اور کیا کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے سلمیٰ کو ذہن سے آمار دینے کی کوشش کی مگر اُس کا دم گھٹنے لگا جیسے کسی کے نظر نہ آنے والے ہاتھوں نے اُس کا گلا دبا لیا ہو۔ اُس کے دل پر گھبراہٹ طاری ہو گئی جو بڑھنے لگی۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بار بار سر کو جھٹکتا تھا مگر سلمیٰ ذہن سے غائب نہیں ہوتی تھی۔ وہ پسپا ہونے لگا۔

وہ رک گیا جیسے کسی نے اُسے پکارا ہو۔ یا جیسے اس کے ذہن میں اچانک کوئی خیال آ گیا ہو جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اُس نے اس خیال کو بھی جھٹک دینا چاہا مگر ناکام رہا۔ وہ جھنجھلایا اور پھر وہ اندر ہی اندر تڑپنے لگا۔

"سلمیٰ آ ــــ اُس کے دل نے دہائی مچا دی ــــ نہ جاؤ سلمیٰ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے وہ محبت ہے جو میں نے کبھی نہیں کی تھی۔"

اُس نے جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ صوفے پر گر پڑنے کی طرح بیٹھ گیا۔ کنپٹیاں گھٹنوں پر اور

سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ جس حقیقت کو اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اُبھر کر سامنے آ گئی۔ جس چنگاری کو اُس نے برسوں میں دبا رکھا تھا وہ بھک سے شعلہ بن گئی ــــ وہ سلمیٰ کی محبت میں جلنے لگا۔ بے حال ہونے لگا۔

✡

اُسے سلمیٰ کے بیٹے اصغر کا خیال آیا۔ اس کا دل یوں ڈوبنے لگا جیسے اس کا اپنا بچہ اُس سے چھین لیا گیا ہو۔ اصغر ذہین اور پیارا بچہ تھا۔ وہ اب نویں جماعت میں تھا۔ اس کے مستقبل کے لیے رجب علی نے کئی منصوبے بنا رکھے تھے۔ اسے ٹرامسٹر نے کلاس سے نکال دیا تھا۔ اس کے مستقبل پر سیاہ مہر ثبت ہو گئی تھی لیکن رجب علی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا گیا اور بچے کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔

اب اصغر کی ماں نے اس کا مستقبل بھی تاریک کر دیا تھا۔ وہ رجب سے کہہ گئی تھی کہ میرے ــــ بیٹے کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ رجب علی سوچنے لگا کہ محنت مزدوری کرنے والی ماں اپنے بچے کو وہ سہولتیں بھی نہیں پڑھا سکے گی۔ ایک ہونہار بچہ پھیرنے سے کسی کارخانے میں یا موٹر سائیکلوں کی ورکشاپ میں کام سیکھنے میں لگ جائے گا جہاں وہ نوکری عادتوں کے سوا کچھ بھی نہیں سیکھ سکے گا۔

"میں اس بچے کو اُس کے باپ کی عظمت دوں گا" ــــ رجب علی کے سینے میں عزم سا بیدار ہوا ــــ پھر جلیل کی روح مجھے معاف کر دے گی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اُس دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں کچھ دیر پہلے سلمیٰ کھڑی تھی اور اُسے دھتکار کر چلی گئی تھی۔

"میں سلمیٰ کے گھر جاؤں گا" ــــ ذہن میں ایک اور ارادہ اٹھا ــــ "اُسے مناؤں گا۔ اُسے اُس کے بچے کا واسطہ دوں گا۔ وہ مان جائے گی... نہیں مانے گی۔ سمجھ بوجھ والی خوددار عورت ہے۔ مجھے اپنی طرف سے اٹھنے کا قدم نہیں رکھنے دے گی۔ اگر ایسے ہوا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ خدا کو شاید یہی منظور ہے کہ میں اپنے آپ کو سزائے موت دوں... ہاں، مجھے منظور ہے۔ خون کا بدلہ خون!"

✡

کبھی انسان کسی کی محبت میں جلتا ہے کبھی اُسے کسی کی نفرت جلاتی ہے۔ محبت کسی اور سے ہوتی ہے اور نفرت کسی اور سے۔ کسی کی نفرت دل کو جلاتی ہے تو انسان کسی کی محبت کے مرہم سے نفرت کی تپش کو سرد کر لیتا ہے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی انسان کے ساتھ محبت بھی ہو اور نفرت بھی۔ محبت اور نفرت ایک ہی انسان پر مرکوز نہیں ہو سکتیں۔ کوئی ایسا کرے تو یہ اُس کا دماغی توازن بگڑنے کا ثبوت ہے اور اگر ایک ہی انسان سے محبت بھی ہو اور نفرت بھی تو دماغی توازن بگڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ اسی کیفیت میں مبتلا تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی سے اُسے اتنی نفرت تھی کہ اُسے وہ رجب علی کے ریوالور سے قتل کرنا چاہتی تھی۔ اُس کے سامنے وہ رجب علی آ گئے ــــ ایک ہی صورت، ایک ہی قدوقامت۔ فرق یہ تھا کہ ایک پولیس کی وردی میں تھا اور دوسرا شہری کپڑوں میں۔

رجب علی کی طرح اُسے بھی ایک سال کی ملاقاتیں اور باتیں یاد آنے لگیں۔ ان یادوں میں وہ ایسی باتیں ڈھونڈنے لگی جن میں دھوکے اور فریب کا کچھ ثبوت یا ذرا سا اشارہ مل جاتے۔ اُسے ہر بات الٹی یاد آئی۔ اُس نے ہر بات سے اُلٹے معنی اخذ کرنے کی کوشش کی مگر اُسے کوئی بات یا رجب علی کی کوئی ایسی حرکت

bylqbalmt@onedrive.com Scanned by

یاد نہ آئی جس سے اُس کی نیت پر وہ شک کر سکتی۔

"مگر وہ قاتل ہے ماں۔" اس نے جھنجھلا کر اپنے آپ سے کہا — "اس نے مجھے بیوہ کر کے بھکاری بنا دیا ہے میرے بچے کو اسی نے یتیم کیا ہے۔"

"کیا اتنا پیارا آدمی قاتل بھی ہو سکتا ہے؟" — اُس کی آنکھوں کے آگے یہ رجب علی آگیا جو اب ڈی۔ ایس۔ پی نہیں تھا — "نہیں.... یہ افواہ علی ہے۔ اس نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے" — اور اس کے ساتھ ہی اُس کے دانت غصے سے بجنے لگے — "یہی تھا.... لیکن...."

اس "لیکن" سے پھر تو خیالوں کی بھرمار شروع ہو گئیں اور وہ ان میں بھٹک گئی۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کس راستے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ تن تنہا عورت، بیوہ، بے بس اور پھر کر بھی کیا سکتی تھی۔ اپنے سہاگ کے قاتل کو اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ محل میں رہتا ہے۔ ایک نادار بیوہ اُس کا بال بھی بیکا کرنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔

اس بے بسی کے ساتھ اُسے یہ بھی یاد آگیا کہ وہ اپنے خاوند کے قاتل کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ رجب علی کے ساتھ مگ کو بیٹھا کرتی تھی۔ اُسے سلمٰی نے روح کا سکون اور پتا نہیں کیا کیا کہا تھا۔ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتی تھی۔ اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا کرتی تھی اور کبھی کبھی تو اسے بھینچ بھی لیا کرتی تھی۔

اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا اور وہ شرمسار بھی ہونے لگی۔ ناچاہتے ہوئے بھی تھا اور کھچا دا بھی۔ اُس پر ہر طرف سے تیر برسنے لگے۔ وہ بے حال ہو گئی اور سر ہاتھوں میں تھام کر فرش کی طرح بچھ گئی۔ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ کئی منٹوں سے نہیں روئی تھی۔ رجب علی کے ساتھ، سہارے اور دلاسوں نے اسے کبھی رونے نہیں دیا تھا۔ آج بند ٹوٹ گیا اور آنسوؤں کا سیل منہ زور بہہ کے نکلا۔

اُس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ چونک کر دیکھا۔ اُس کا بچہ اسکول سے آگیا تھا۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن آنسو مسکراہٹوں میں چھپ نہیں جایا کرتے۔

"امّی جی!" — اصغر نے اداسیوں کے مارے ہوئے لہجے میں کہا — "آپ تو مجھے منع کرتی تھیں کہ دنیا سے اُٹھ جانے والوں کی یاد میں رونا نہیں چاہیئے ورنہ انسان اپنی بہتری کی سوچ ہی نہیں سکتا۔ آپ خود رو رہی ہیں نا امّی! کچھ اور تو نہیں ہوا؟"

"نہ جانے! اور کچھ بھی نہیں ہوا" — سلمٰی نے کہا — "تیرے ابّو یاد آگئے تھے۔ اب نہیں روؤں گی" — مگر وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔

سلمٰی فہم و فراست اور سوجھ بوجھ والی عورت تھی۔ وہ اصغر کے سامنے رونے سے اس لیے گریز کیا کرتی تھی کہ بچے کی ذہنی نشوونما پر بُرا اثر پڑے گا۔ بچے کے ساتھ اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس میں مایوسی اور شکست کا تاثر ہو۔ بچے کے باپ کے متعلق وہ اسے صحیح بات بتایا کرتی تھی کہ وہ کس طرح مارا گیا تھا۔ اس سے بچے کے دل میں پاکستان کے حکمرانوں اور پولیس کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی لیکن سلمٰی نے اُس کے دل میں پاکستان کی محبت کم نہیں ہونے دی تھی۔ بچے میں اپنے باپ کے اوصاف اور باپ کا ہی قومی جذبہ بھر گیا تھا۔ بچے نے اپنے آپ ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فوج میں جائے گا۔

اصغر کمال نے تفصیل سے بتایا تھا کہ اُس کا باپ عبدالجلیل خان اس لیے مارا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کے جاسوسوں کے خلاف محاذ بنا رہا تھا۔ سلمٰی نے اُسے صمد اللہ بخش اور چوہدری اکرم کے نام بھی بتائے تھے اور یہ بھی کہ یہ دونوں سیاسی لیڈر عبدالجلیل کے کیوں دشمن ہو گئے تھے لیکن سلمٰی نے اپنے بچے کے دل میں اپنے سیاسی لیڈروں کے خلاف کوئی دشمنی پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ لوگ میں ترمیم ناک لیکن اتنے نہیں جتنا سمجھ رہے ہو۔ دراصل سلمٰی اپنے بچے کو نفرت کے جذبے سے بچاتی تھی۔ نفرت صرف دشمن کی تھی جو اُس نے بچے کی سوچوں کا حصہ بنا دی تھی۔

اصغر کہا کرتا تھا — "میں بڑا ہو کر فوج میں جاؤں گا اور ہندوؤں کو ایسا سزا چکھاؤں گا کہ انہیں پاکستان میں اپنے جاسوس بھیجنے کا ہوش ہی نہیں رہے گا۔"

اُس کے اس جذبے کو رجب علی نے پختہ کر دیا تھا۔ رجب علی نے بچے میں وقار اور خود اعتمادی پیدا کی تھی۔ اصغر تو رجب علی کو ہی اپنا باپ سمجھنے لگا تھا اور وہ اسے اپنا دوست بھی سمجھتا تھا۔ رجب علی کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اُس نے اصغر کو اپنا بچہ بنا لیا اور تمام تر پیار اُسے دے دیا تھا۔ اصغر جب رجب علی کی کوٹھی میں جاتا تو وہ ہر کمرے میں یوں بھاگتا دوڑتا اور جس چیز کو چاہتا یوں اُلٹ پلٹ کرتا تھا جیسے وہ اسی کوٹھی میں پیدا ہوا ہو۔ سلمٰی کو روتے روتے ایک سوال پریشان کرنے لگا — "کیا اصغر کو بتا دوں کہ اُس کے باپ کا قاتل رجب علی ہے — وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اُسے یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ بچے پر اس کا بہت بُرا اثر ہو گا۔ وہ رجب علی کی مخالف نہیں ہو گا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ بچہ اب پندرہ سولہ سال کا ہو گیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ باپ کے خون کا انتقام لینے کے لیے چل پڑے۔

سلمٰی اصغر کی غیر حاضری میں اداس ہوتی یا آنسو بہاتی تھی۔ ڈیوڑھی میں اُس کے قدموں کی آواز سنتے ہی سلمٰی کو رونا آنے لگتا تھا لیکن آج وہ ایسی بے قابو ہوئی کہ اصغر کے بار بار کہنے کے باوجود وہ روتی ہی رہی۔ اُس نے اصغر کو اپنی گود میں ڈال لیا اور وہ اور زیادہ رونے لگی۔

اصغر پریشان ہو گیا۔ وہ اٹھا اور ماں سے یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ ذرا کھیلنے جا رہا ہے۔ سڑک پر جا کر وہ بس کا سوار ہو گیا۔

☆

فلک رجب علی ڈرائنگ روم میں ایوان پر لیٹا پڑا نے تکلیف دہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے ڈرائنگ روم میں قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اُس نے اِدھر نہ دیکھا۔ وہ سمجھا خانساماں چائے لے کے آیا ہے۔ چائے کا وقت تھا۔ "السلام علیکم انکل" کی آواز پر وہ چونکا۔ وہ خانساماں نہیں اصغر تھا۔ رجب علی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ حیران بھی ہوا کہ اصغر کیسے آگیا ہے۔ کیا ماں کا کوئی پیغام لایا ہے یا.... وہ بدک کر اُٹھ بیٹھا۔ اصغر کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا بھی تاثر نہ تھا۔ وہ ایوان پر بیٹھ گیا۔

"امّی نے کچھ کہا ہے اصغر؟"

"نہیں انکل!" — اصغر نے کہا — "آپ میرے ساتھ چلیں امّی رو رو کر اپنا بُرا حال کر رہی ہے۔ وہ ایسے تو کبھی نہیں روئی تھی۔ آج نہ جانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔ روئے جا رہی ہے۔ میرے کہنے کا تو اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا؟"

iqbalmt@onaura.com scanned by iqbalmt@yahoo.com

"تمہیں امّی نے کچھ بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں رو رہی ہے؟"

"نہیں"۔۔۔ اصغر نے جواب دیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کہنے لگا۔۔۔ "آپ ساتھ چلیں انکل! میں امّی کو روتا نہیں دیکھ سکتا۔"

رجب علی نے کچھ دیر سوچا کہ جانے جائے لیکن اصغر کے آنسو دیکھ کر اُس نے نتائج کی پروا نہ کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔۔۔ "چلو اصغر! میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

☆

سلمیٰ کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ دستک دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ سلمیٰ کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اُس نے اصغر کے ساتھ رجب علی کو اپنے گھر میں دیکھا تو وہم کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ اُس کے ہونٹ کانپے۔ اُس کے چہرے پر غصّے کی سرخی آ گئی۔ اُس نے اصغر اور رجب علی کو گھور کر دیکھا۔ اصغر کو معلوم تھا کہ اُس کی ماں اور رجب علی میں بے تکلفی ہے۔

"دیکھا انکل!"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "میں دیکھ کر بھی امّی خوش نہیں ہوئی۔۔۔ اور اُس نے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور کہا۔۔۔ میں انکل کو گھر سے لایا ہوں۔"

"تم مجھے بڑا گئے تھے کو کھیلنے جا رہے ہو۔۔۔ سلمیٰ نے اصغر سے کہا۔۔۔ "اور اُس نے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور ۔۔۔ تم نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا ہے۔"

"ہرش میں آؤ سلمیٰ بی بی۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔ "بچے کو پریشانی میں میرے پاس آ گیا۔ اسے میرے پاس ہی آنا چاہیے تھا۔۔۔ اُس نے اصغر سے کہا۔۔۔ "میں جاتے چھوڑ کر تمہارے ساتھ آ گیا ہوں۔۔۔ یہ لو پیسے اور سموسے لے آؤ۔۔۔ اُس نے اصغر کو سموسوں کی ایسی جگہ بتائی جو اصغر کی نانی کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اصغر ذرا زیادہ دیر کے لیے باہر رہے۔

"اس بچے کی زندگی تباہ نہ کرو سلمیٰ"۔۔۔ رجب علی نے کہا اور وہ سلمیٰ کے جواب کا انتظار کیے بغیر چارپائی پر بیٹھ گیا اور کہا۔۔۔ "میں اس کے کہنے پر آیا ہوں۔"

"اور میں نے تمہیں اسی لیے نہیں کہا کہ نکل جاؤ میرے گھر سے کہ تمہیں اصغر لایا ہے۔۔۔ سلمیٰ کی آواز غصّے سے کانپ رہی تھی۔

"کیا تم نے اسے بتایا ہے کہ اس کا باپ میرے ہاتھوں مرا تھا؟"

"نہیں"۔۔۔ سلمیٰ کے لہجے میں حقارت نمایاں تھی۔۔۔ "میری ایک بات اصغر کے آنے سے پہلے سن لو۔ میں اپنے بچے کو نفرت، دشمنی اور انتقام جیسے خطرناک جذبوں سے پاک رکھنا چاہتی ہوں۔ اسے میں یہی بتاتی رہوں گی کہ تم وہ نہیں ہو۔ تم اور علی ہو۔ میں اس کے ساتھ تمہارے خلاف کوئی بات نہیں کروں گی۔ تم مجھ پر اور میرے بچے پر یہ کرم کرو کہ آہستہ آہستہ اس سے دُور ہٹتے جاؤ۔ یہ جب دیکھے گا میں تمہارے پاس اور تم میرے پاس نہیں آ رہے تو اس کی توجہ تم سے ہٹ جائے گی۔ جس طرح میں تمہاری زندگی سے نکل آئی ہوں اسی طرح تم میرے بچے کی زندگی سے نکل جاؤ۔"

"اس کے دل سے میری محبت کم نہیں ہو سکتی"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "اس نے مجھے اپنے باپ کا نعم البدل بنا لیا ہے۔ اس میں کمزوری کا احساس پیدا نہ کرو۔"

"میں اپنے بچے کی بہتری دیکھ رہی ہوں۔"

"میں بھی بچے کی بہتری ہی دیکھ رہا ہوں"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "اس کی فطرت میں تم زہر بھر دو گی۔"

"میں نے کہا ہے کہ میرے بچے سے اپنا اثر ختم کر دو"۔۔۔ سلمیٰ نے کہا۔۔۔ "اور عرض یہ کی ہے کہ آہستہ آہستہ تاکہ میرا بچہ۔۔۔"

"اصغر تمہارا بچہ ہے نہ میرا بچہ"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "یہ پاکستان کا بچہ ہے۔"

"تم!"۔۔۔ سلمیٰ نے دانت پیس کر کہا۔۔۔ "تم پاکستان کا نام لیتے ہو؟ پاکستان پر جانیں قربان کرنے والوں کے قاتل کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ پاکستان کو اپنا ملک کہے؟۔۔۔ میں ایک بیوہ تم جیسے جاگیردار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔ نہ میں تمہیں دھتکار دوں۔"

اصغر آ گیا۔ سلمیٰ نے اُسے کہا۔۔۔ "بیٹا! تم گول گپّا کھا لو۔ چائے تیار ہو گئی تو تمہیں بلا لوں گی۔"

اصغر کمرے میں چلا گیا۔ سلمیٰ باورچی خانے میں چلی گئی۔ رجب علی بھی باورچی خانے میں چلا گیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے انتقام نہیں لے سکتیں"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "مجھے تمہارا ذرا بھی ڈر نہیں۔ پھر بھی تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ میں تم سے جان بخشی نہیں کرا رہا۔ کوئی بات ہے سلمیٰ! کوئی وجہ ہے جو میں تمہیں بتا نہیں سکتا؟"

سلمیٰ نے اسے گھور کر دیکھا جیسے پڑھ رہی ہو کہ اس بکواس کا مطلب کیا ہے۔

"میں تم سے دور نہیں ہٹ سکوں گا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "اور۔۔۔ اور۔۔۔ میں تم سے بھی دُور نہیں ہٹ سکوں گا۔"

سلمیٰ نے اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"سنا نہیں تھا کہ تم حاضر ہوں"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "جس طرح تم نے کہا ہے کہ میں تمہیں اس سے نہیں روک سکتا کہ تم مجھے دھتکار دو اسی طرح تم مجھے نہیں روک سکتیں کہ تمہاری محبت کو اپنے وجود میں پاتا اور گرفتار ہوں۔"

سلمیٰ نے سر کو جھٹک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظروں میں قہر بھی تھا اور حیرت بھی۔

"سلمیٰ!۔۔۔ اب اُس نے بڑی جانفزا اور جذباتی آواز میں کہا۔۔۔ "میری زندگی میں کئی عورتیں آئی ہیں۔ میری بیوی بھی تھی۔ یہ سب تم سے زیادہ خوبصورت تھیں مگر میں محبت کے نام سے ناآشنا رہا۔ وہ جسم کا معاملہ تھا۔ جسے محبت کہتے ہیں وہ تم نے میرے دل میں پیدا کی ہے۔"

"تم پاگل ہو"۔۔۔ سلمیٰ غصّے کے غلبے میں اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں شرابی بھی تھا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "میں نے تمہارے سامنے اپنی مری ہوئی بیوی کا کبھی نام بھی نہیں لیا تھا۔ وہ ایک جسم تھا جو میرے جسم کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ وہ جسم خاک میں مل گیا ہے۔ میں نے اس کی یاد کو بھی خاک میں ملا دیا ہے۔ مجھے محبت تم نے دی ہے۔ میں اس حقیقت کو اب چھپا نہیں سکتا۔۔۔ اور تم اس حقیقت کو مجھ سے چھپا لو، اپنے آپ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکو گی کہ تمہارے دل میں میری محبت ہے۔"

"اگر سے تو بھی میں ایک قدم بھی تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی"۔۔۔ سلمیٰ نے کہا اور اصغر کو آواز دے کر کہا کہ چائے تیار ہے۔ اُس نے رجب علی سے کہا۔۔۔ "اصغر کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔"

اصغر آیا تو سلمیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کا تبسم اور عتاب غائب ہو گیا۔ چائے کے بعد تک

iqbalmt@onedrive.com scanned by

جب ملی جانے کے لیے اُٹھا سلمٰی دروازے تک اُس کے ساتھ گئی۔

"میں صرف یہ کہنے کے لیے تمہارے ساتھ آئی ہوں کہ مجھے اور میرے بچے کو زمین سے اٹھا دو"۔۔۔ سلمٰی نے کہا۔

رجب علی نے نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ سلمٰی نے اُسے دیکھا۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ سلمٰی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ تیزی سے گھومی اور اندر چلی گئی۔

✡

ملک رجب علی اپنے کمرے میں مثل رہا تھا۔ کبھی وہ یوں محسوس کرنے لگتا کہ اُس کے ذہن اور جسم کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ کبھی اُسے یوں لگتا جیسے اس کا ذہن آگے نکل گیا ہے اور جسم پیچھے رہ گیا ہے۔ انسپکٹر شام کا کی ابھی اسی کیفیت میں کھویا تھا۔ اُسے نوکر نے بتایا تھا کہ اس نے کھانا آدھا کھایا ہے۔ نوکر نے اُس سے پوچھا بھی تھا کہ طبیعت ٹھیک تو ہے؟ اُس نے بے خیالی میں کہا تھا۔ "ٹھیک ہوں"۔۔۔ اور نوکر نے خانساماں سے کہا تھا کہ آج ملک صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ رجب علی تو جیسے کھانے پینے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

اُس نے سلمٰی کی محبت کو لاشعوری طور پر دبا رکھا تھا۔ اپنی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سامنا کرتے ہوئے انسان کتراتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں۔ وہ ان باتوں کو اپنے آپ سے چھپاتا ہے مگر رجب علی اس راز کو اپنے آپ سے چھپا نہ سکا کہ سلمٰی کی محبت نے اُسے اور رجب علی سے بہت کچھ دیا تھا جو کبھی نہ ہوا کرتا تھا۔ اُس نے سلمٰی سے ٹھیک کہا تھا کہ اُس نے محبت کا ذائقہ کبھی نہیں چکھا تھا۔ وہ جسم کا ملاپ، حسرتوں کی آسائش، کیف اور لذت کو اُن اور آخر سمجھتا تھا۔ اس میں کبھی کمی بیشی ہو جاتی تو اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اور اب کی وہ شراب سے اور اب کی کروٹ تھا مگر اب سلمٰی نے اسے اعتکاف دیا تھا اس نے اپنی ذات اور اپنے وجود کے ایک بہت غلاظت کش کونے سے بے زاری کا احساس ہونے لگا تھا جیسے اُس کے آگے پیچھے، اُوپر نیچے، دائیں اور بائیں کچھ بھی نہیں اور وہ معلق ہے اور اُس کا وزن ہوا کے ایک ٹکڑے جتنا بھی نہیں اور کبھی کبھی اُس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اوپر نیچے، آگے پیچھے، دائیں اور بائیں، پانی ہی پانی جو کبھی گدلا ہو جاتا کبھی اتنا شفاف کہ تہ تک نظر آنے لگتا مگر سب کچھ صرف سلمٰی تھی۔

اُس کی زندگی میں کئی عورتیں آئی تھیں جن میں سے دو اُسے اتنی اچھی لگی تھیں کہ وہ محسوس کیا کرتا تھا کہ یہ عورتیں نرینہ اولاد سے محروم رہیں گی۔ وہ دو سوکنیں تھیں۔ رجب علی سے اُن کی بول چال بند تھی۔ وہ ایک دوسری کی بیزار

پاس روپیہ پیسہ ہے سکون کے جتنے ذریعے چاہوں خرید سکتا ہوں۔ میں شراب پیا کرتا تھا مگر شراب چھوڑ دی۔ کم آئیں تو تیز سکون آگیا۔ روح نے پہلی بار وہ مسرت پائی جو نہ شراب دے سکتی ہے نہ کوئی حسین گناہ۔۔۔ جگر سلمیٰ! ابدی سکون کے لیے مجھے موت کے راستے پر جانا ہوگا۔ میں آگیا ہوں اس راستے پر۔ صرف فیصلہ اور ارادہ کر لینے سے ہی روح مسرور ہوگئی ہے۔"

"اگر تمہارے دل میں واقعی میری محبت ہے تو چلے جاؤ۔۔۔" سلمیٰ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لیے چلے جاؤ۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اصغر اگر تمہارے پاس آنا چاہے تو میں۔۔۔ میں۔۔۔ اسے نہیں روکوں گی لیکن اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے رہنا۔"

"میں تم سے کشش مانگنے نہیں آیا سلمیٰ!۔۔۔" رجب علی نے ایسی آواز میں کہا جو دبی ہوئی تو تھی لیکن بے حس میں فیصلہ اور عزم تھا۔۔۔ "اب اصغر آئے گا تو کس کے پاس آئے گا۔ اب اسے میرے پاس آنے سے روک دینا۔ کہنا تمہارا انکل تمہارے ابو کے پاس خون کفنوانے چلا گیا ہے۔"

سلمیٰ گم صم کھڑی تھی۔ رجب علی کے لب و لہجے نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔ رجب علی نے اس کا ایک ہاتھ پکڑا اور اس ہاتھ کو آنکھوں سے پھر ہونٹوں سے لگایا۔

خدا کو کچھ منظور تھا۔۔۔ رجب علی نے جیسے سسکی لی ہو۔۔۔ "سزائے موت۔ خون کا مدعی خون۔۔۔" اور وہ ڈیوڑھی سے نکل گیا۔

سلمیٰ وہیں کھڑی رہی جیسے اس کی آنکھ لگ گئی ہو۔ کچھ دیر گزر گئی اور وہ بیدار ہوئی تو اس کے کانوں میں پہلی آواز یہ گونجی۔۔۔ "اب اصغر آئے گا تو کس کے پاس آئے گا۔۔۔ خدا کو یہی منظور تھا۔۔۔ خون کا بدلہ خون۔"

گزرے ہوئے ایک سال میں سلمیٰ جب علی کے اتنا قریب ہوگئی تھی کہ اس کی فطرت اور شخصیت کے گوشوں تک چلی گئی تھی، وہ جانتی تھی کہ یہ شخص بغض بات کرنے کی خاطر بات نہیں کیا کرتا۔

ڈیوڑھی میں ایک بگولا اٹھا جس نے سلمیٰ کو لپیٹ میں لے لیا۔۔۔ "بڑی چالاک ہے۔۔۔" سلمیٰ کی دنیا ایک بھنور کی طرح بڑی تیز گھومنے لگی۔ وہ دوڑتی اندر گئی، چادر اٹھائی اور پھر رک گئی۔ "کس کی خاطر؟" نے فیصلہ بدل دیا ہو۔ اس کی سنسنی اور تشنی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھوں نے چادر اس کے سر پر ڈال دی اور وہ دوسرے کمرے میں دیکھا۔ اصغر سویا پڑا تھا۔ سلمیٰ چادر کو اچھی طرح اوڑھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ سڑک پر جاتے ہی اسے تانگہ مل گیا۔ اس نے پیسے نہ پوچھے۔ "اسے جہاں جانا تھا وہ تانگے والے کو بتایا اور یہ کہہ کر کہ بہت جلدی میں ہوں، بہت تیز چلانا ہے، تانگے میں سوار ہوگئی۔

☆

ملک رجب علی اس ذہنی کیفیت کی آخری سٹیج پر پہنچ چکا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی، یا کم از کم انسان اپنی کوشش سے واپس نہیں آسکتا۔ نفسیات کے عالموں نے اسے ایک لمحے کا پاگل پن کہا ہے۔ قتل اور خودکشی کی وارداتیں اسی ایک لمحے میں ہوا کرتی ہیں۔

رجب علی اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ ریوالور اس کے سامنے میز پر پڑا تھا۔ اس نے لکھتے لکھتے جب یہ الفاظ لکھے۔۔۔ "تمام زرعی زمین جس کے کاغذات موجود ہیں علی اصغر ولد عبدالجلیل خان مرحوم کے نام کر دی جائے اور یہ کوٹھی سلمیٰ بیوہ عبدالجلیل خان مرحوم کی ملکیت میں دے دی جائے۔۔۔" تو اس کی آنکھوں سے

دو آنسو اس تحریر پر گر پڑے۔ وہ لکھ چکا تھا کہ وہ کیوں خودکشی کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ پاکستان کا دشمن پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اسے ایک ہی صورت میں پاکستان پر فتح حاصل ہوگی کہ پاکستان کے نیشنل ازم پر وہ اس کے ہاتھ مضبوط کریں اور اپنے دماغ میں افتخار کے کیڑوں کی پرورش کرتے رہیں۔ وہ وقت بڑی تیزی سے آرہا ہے۔

اسے برآمدے میں بڑے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی لیکن وہ دنیا کی آوازوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اسے یہ محسوس کرنے کا بھی ہوش نہ تھا کہ ان قدموں کی آہٹ اس کے قریب آکر رک گئی ہے اور وہ آنکھیں اس تحریر کو پڑھ رہی ہیں جس پر اس کے آنسو گرے ہیں۔

ایک ہاتھ نے لپک کر ریوالور اٹھا لیا۔ تب رجب علی بیدار ہوا۔ اس نے دیکھا، وہ سلمیٰ تھی۔ وہ ہانپ رہی تھی جیسے دوڑتی آئی ہو۔ سلمیٰ نے ریوالور کھولا اور اس کے سیلنڈر سے چھ گولیاں نکل کر قالین پر بکھر گئیں۔ اس نے ریوالور آتشی زور سے پھینکا کہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس نے وہ کاغذ جس پر رجب علی وصیت لکھ رہا تھا پھاڑ کر اس کے سو ٹکڑے کر دیئے اور یہ ٹکڑے ریوالور کی گولیوں کے ساتھ بکھر گئے۔

سلمیٰ اور رجب علی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ سلمیٰ کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس کا سر ڈھلا اور اس نے سر رجب علی کے سینے پر پھینک دیا۔ رجب علی نے اسے اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے لیا۔ سلمیٰ کا جسم ہچکیوں سے ہل رہا تھا۔ پھر اس نے رجب علی کے بازوؤں سے نکل کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"نہیں نہیں۔۔۔" وہ سر کو جھٹک جھٹک کر کہہ رہی تھی۔ "اپنی محبت کو خودکشی نہیں کرنے دوں گی۔۔۔" اور رجب علی سے لپٹ کر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔

☆

وہ ایک خاموش سی تقریب تھی۔ سلمیٰ کے پڑوسیوں کو اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ یہاں سے چلی گئی ہے۔ کسی نے کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی۔ آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ پہلے چوری چھپے ملتی تھی، اب باقاعدہ پیشہ کرے گی۔ کسی نے کہا کہ پولیس کا ایک ڈی۔ ایس۔ پی اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس پر کسی نے کہا کہ پولیس کی خبر بنے گی۔ پڑوس کے بہت سارے منہ تھے۔ ہر منہ نے اپنی سی کہی۔ سلمیٰ کے چلے جانے کے تیسرے روز سلمیٰ کا مکان فروخت ہوگیا۔ رجب علی نے اس تھڑے سے سلمیٰ اور اصغر کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔

اور وہ ایک خاموش سی تقریب تھی۔ رجب علی سلمیٰ اور اصغر کو ان کے سامان سمیت دو روز پہلے اپنی کوٹھی میں لے گیا تھا۔ آج کی تقریب میں ارشد کا باپ اشفاق احمد تھا، ارشد کا بھائی یوسف تھا، اور طاہرہ اور ارشد کو بھی راولپنڈی سے بلوایا گیا تھا۔

ان کے علاوہ ایک نکاح خواں تھا جس نے رجب علی اور سلمیٰ کا نکاح پڑھا۔ اس تقریب میں آنسو مسکراتے اور مسکراہٹیں روتیں اور "مبارک ہو، مبارک" کی پُرمسرت آوازوں نے آنسوؤں اور مسکراہٹوں کو گھلا ملا دیا۔

اس تقریب سے بے نیاز اصغر اور ارشد کا بیٹا طاہر پرویز لان میں بیٹھے ہنس کھیل رہے تھے۔ طاہر پرویز کی عمر نو سال سے کچھ اوپر ہوگئی تھی۔ یہ ان کی ملاقات تھی۔ طاہر پرویز نے اصغر سے پوچھا کہ وہ پڑھ کر کیا کرے گا۔

iqbalmt@onenurad.com scanned by

"ابھی میری عمر سولہ سال نہیں ہُوئی" — اصغر نے کہا "سترہ سال کا ہو جاؤں گا تو اگلے بھیجے دیں گے۔ میں فوج میں ہی جانا چاہتا ہوں۔"

"میرے ابّا دادا بھی مجھے فوجی بنانا چاہتے تھے" — طاہر پرویز نے کہا — "میں ٹینک چلاؤں گا اور گولیاں چلانے والا ہوائی جہاز بھی چلاؤں گا۔"

اصغر ہنس کے بولا — "ٹینک فوج میں ہوتے ہیں اور ہوائی جہاز ایئر فورس میں۔ تم دونوں میں تو نہیں جا سکتے۔"

طاہر پرویز ابھی بچہ تھا کہنے لگا — "میں کبھی فوج میں رہا کہ دل کا کبھی ایئر فورس میں۔"

"ٹینک اور ہوائی جہاز سے کس پر گولیاں چلاؤ گے؟"

"ہندوستان پر" — طاہر پرویز نے سبق سنانے کے انداز سے کہا — "امّی نے مجھے بتایا ہے کہ ہندو ہمارے ملک کا اور اسلام کا سخت دشمن ہے۔ اس نے مجھ جیسے لاکھوں مسلمان بچے مروا ڈالے تھے۔ میں ان بچوں کے خون کا بدلہ لوں گا اور جب ہمارا دشمن پاکستان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا تو میں اپنے ٹینک کے گولے سے اُڑا دوں گا۔"

۷/۸ اکتوبر ۱۹۵۰ء کی درمیانی رات —

رجب علی اور سلمٰی کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات!

سابق ڈی۔ ایس۔ پی رجب علی کے ضمیر پر جس جرم کا آسیب طاری تھا وہ طاری ہی رہا۔

سلمٰی پر حجاب بھی طاری تھا اور جھینپ بھی۔ یہ احساس اُسے بے چین کیے ہُوئے تھا کہ وہ اپنے خاوند کے قاتل کی بیوی بن گئی ہے۔ کبھی وہ رجب علی کو یوں دیکھتی جیسے وہ اس شخص کے جُرم میں شریک ہو۔ جیسے دونوں نے مل کر ایک جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ کبھی اُسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی جیسے اس شخص نے اُسے پناہ میں لے لیا ہو اور اگر اُس نے جرم کی بھی ہے تو یہ شخص اُسے سزا سے بچا لے گا۔

دونوں مسرور تھے لیکن اُن کی مسرت اُس مسافر کی مانند تھی جو چلچلاتی دھوپ میں چلا جا رہا ہو۔

"میرا سینہ جل رہا ہے سلمٰی!" — رجب علی نے کہا — "میں یہ انگارے تمہارے آگے اُگل دینا چاہتا ہوں۔ میں نہیں نہیں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہاری مجبوری اور کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھایا اور میں نے...."

"آپ وہ انگارے میری ڈیوڑھی میں اُگل چکے ہیں" — سلمٰی نے کہا — "مجھ میں اب یہ روئیداد سُننے کی سکت نہیں..... ایک بار سن لی ہے۔ اب ہمت اس لیے نہیں کہ اس میں جلیل کا نام بار بار آتا ہے۔ میں ایسے محسوس کر رہی ہوں جیسے میں نے جلیل کو دھوکہ دیا ہے۔ جیسے میں بھی اُس کے قاتل میں شریک ہوں" — اُس نے رجب علی کے چہرے پر نظریں جماتے ہُوئے اور ذرا توقف سے کہا — "آپ کہتے ہیں کہ آپ نے میرے ساتھ شادی کر کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے لیکن میرے احساسات کچھ اور ہیں۔"

"محبت بھی ایک وجہ تھی سلمٰی" — رجب علی نے کہا — "لیکن میں نے تمہیں پناہ میں لیا ہے۔ تم نے ہوگی دیکھ لی ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ خاوند کے بغیر عورت کس طرح بدنام ہو جاتی ہے۔ لوگ اُس کی ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں...."

"میرے محلّے والوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا یارانہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ لگ گیا ہے" — سلمٰی نے کہا — "میں کسی کا منہ بند نہیں کر سکتی تھی۔"

"لوگ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسروں کو گناہگار کہتے ہیں" — رجب علی نے کہا — "تم اتنا نہیں جانتیں جتنا میں جانتا ہوں۔ معاشرے کو جتنا ایک پولیس آفیسر جانتا ہے اتنا ایک گھریلو عورت نہیں جان سکتی۔ تم جیسی خوبصورت بیوہ کو سوا کر کے سوری بھی خیالوں میں جنسی لذت حاصل کرتے ہیں۔ طوائفیں اسی معاشرے کی پیداوار ہیں جو عصمت فروشی بند کرو، کے نعرے لگاتا رہتا ہے۔ مجھے تم نہ بتاتیں تو بھی میں جانتا تھا کہ تم بدنام ہو رہی ہو۔ آج جو عورتیں تمہیں بدکار اور دریدہ دہن

iqbalmt@oneurdu.com Scanned by

لگانے والی کہتی رہی ہیں وہ عبدالجلیل خان کو ہوس کی نگاہوں سے دیکھتی رہی ہوں گی۔ عبدالجلیل خان خوبصورت جوان تھا۔ سب اُس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنا چاہتی تھیں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی سلمیٰ اس اذیت سے نکلنا چاہتا تھا۔

سلمیٰ اس اذیت کو برداشت کر ہی رہی تھی مگر ایک مرد کی پناہ میں آکر اُس نے محسوس کیا کہ یہ اذیت کس قدر تلخ، زہرناک اور ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس نے رجب علی کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اپنا سر رجب علی کے سینے پر ٹیک دیا۔ جیسے وہ تھک کر چُور ہو گئی ہو اور اب اکیلے اور بے سہارا چلنے کی ہمت نہ رہی ہو۔

"...اور تم اپنے آپ پر ایک جرم کا بوجھ محسوس کر رہی ہو" — رجب علی نے کہا — "اس بوجھ کو اُتار پھینکو۔ شادی کیے بغیر تم اپنے بچے کو اچھا پہنا اور اچھا کھلا سکتی تھیں مگر اُسے یتیمی اور محرومی کے احساس سے نجات نہیں دلا سکتی تھیں۔ محرومی کا احساس اصغر کی شخصیت اور کردار کی نشوونما روک دیتا۔ اب بچہ سر اونچا کر کے بات کر سکتا ہے۔"

رجب علی کے اپنے ضمیر پر جرم کا بوجھ پڑا ہوا تھا مگر اُس نے سلمیٰ کے ضمیر سے بوجھ اُتارنے کے لیے اتنی زیادہ باتیں کیں تو اُس کا اپنا بوجھ اُتر گیا۔ وہ یوں جانتا تھا۔ دلائل گھڑنے کے فن کا ماہر تھا اور اُس نے یہ مہارت پولیس میں حاصل کی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا کہ سلمیٰ کو بھی اس نے اس اعتراف کو دہرایا کہ سلمیٰ اُس کے دل میں اُتر گئی تھی۔

★

دوسری ازدواجی زندگی کی پہلی رات گزرتی جا رہی تھی:

"جلیل نے جو تحریک شروع کی تھی، کیا وہ اُسے شروع کرنی چاہیے تھی؟" — سلمیٰ نے آہ بھر کر کہا — "اُس نے اس تحریک پر جان دے دی ہے۔"

"میں اُس کی تحریک کو زندہ کروں گا" — رجب علی نے پُرعزم لہجے میں کہا — "میری زندگی کو کچھ اسی طرح ملے گی کہ جس تحریک کی خاطر وہ میرے ہاتھوں مرا ہے اُسے میں زندہ کروں اور اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں۔"

"کیا اس سیاست کے خلاف بھی ایک تحریک نہیں چلنی چاہیے جس نے ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کو بھی حکومت میں شامل کرایا ہے جو نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے؟" — سلمیٰ نے پوچھا۔

"عبدالجلیل کی تحریک ہندوستان کے ان ایجنٹوں اور جاسوسوں کے خلاف تھی جنہیں ہمارے ملک میں پناہ اور تحفظ حاصل ہے۔" — ملک رجب علی نے کہا — "غور سے دیکھو تو یہ تحریک اس سیاست کے بھی خلاف ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے۔ یہ اقتدار کی سیاست ہے۔ اقتدار کی خاطر دشمن کو دوست بنانا پڑے تو بنا لیا جاتا ہے۔ دشمن کے کچھ مطالبے ہوتے ہیں جو وہ منوا کر دوست بنتا ہے لیکن یہ مطالبے اپنے ملک کی سلامتی کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ دوستی دیرپا نہیں ہوتی۔"

یہ مجھ سے پوچھو سلمیٰ! ان خفیہ دوستیوں کا تحفظ پولیس سے کرایا جاتا ہے۔"

"کتنی محبت تھی میرے دل میں پاکستان کی اور اپنی قوم کی۔"

"تھی نہ کہو سلمیٰ!" — رجب علی نے کہا — "ہے کہو۔ یہ وہی پاکستان ہے جو ہم نے خون کی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے، اور یہ وہی قوم ہے جس نے خون کی قربانیاں دی تھیں۔"

"گیارہ برسوں میں اس قوم کو لوگوں کا ہجوم بنا دیا گیا ہے۔"

"اور ہر فرد اس ہجوم میں اکیلا ہے۔" — ملک رجب علی نے کہا — "ہجوم میں ہوتے ہوئے ہر شخص تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ اس ہجوم کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ اپنے شہیدوں کو دفن کر دے۔ لوگوں نے شہیدوں کو اپنے سینوں میں دفن کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہر شخص چلتا پھرتا مقبرہ بن گیا ہے۔ یہ اس سیاست کا کرشمہ ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے۔"

"انجام کیا ہوگا؟"

"لوگ اٹھیں گے" — رجب علی نے کہا — "وہ پھر قوم بنیں گے۔"

"میں تو مایوس ہوتی جا رہی ہوں۔" — سلمیٰ نے کہا — "اقتدار کی خاطر سیاستدانوں کی مسلسل سعی کہ آزادی نے قوم کو کیا دیا ہے؟ گیارہ برسوں میں لوگ گیارہ سے زیادہ وزیراعظم اور وزرا نہیں دیکھ چکے ہیں۔ جو بھی آیا وہ پاکستان کو تباہی کے قریب لے گیا۔ قومی وقار اور جذبوں کا لہو سیاسی اقتدار کی قربان گاہ پر چڑھایا جاتا رہا۔"

ملک رجب علی اور سلمیٰ نہیں، اُن دنوں جہاں دو چار آدمی اکٹھے ہو جاتے یہی باتیں کیا کرتے تھے۔ لوگ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ وہ کر سکتے کچھ چاہتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اُن کا اپنا ملک ان کے اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں لُٹ رہا ہے اور حکمرانوں کو صرف حکمرانی کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ملک کی سلامتی کے ساتھ نہیں۔ اپنے ملک کی قیمت صرف قوم جانتی تھی لیکن لیڈر شپ اقتدار پرست ہو گئی اور قوم کو کھلے نعروں اور جذباتی تقریروں سے پرچا رہی تھی۔ پہلے وزیر ہوتے تھے پھر وزارت میں ایک اور وزیر کا اضافہ ہو گیا۔ وزارتیں ٹوٹنے دیر نہیں لگتی تھی۔ آج کا وزیراعظم کل نئے وزیراعظم کی حکومت کے خلاف جلوس کی قیادت کر رہا ہوتا تھا۔ ایک پریذیڈنٹ سیاست اور سیاسی قیادت کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

عدل و انصاف کو نیلام گھر میں رکھ دیا گیا تھا۔ اب تو جیسے کا کھیل تھا۔ کسمپرسی اور نفسا نفسی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جذبے پیٹ کے تنور میں جلنے لگے تھے۔ لوگوں کی ذہنیت بدلنے لگی تھی۔ لوگ اپنی اپنی پسند کے لیڈروں کی زبان میں باتیں کرتے اور اپنی اپنی پسند کی سیاسی پارٹیوں کے جلوسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ان کے لیڈران کے منہ میں جو نعرے دیتے وہ لگاتے تھے۔

یہ ایسا عمل ہے جو انسانوں میں جوش تو بھر دیتا ہے لیکن لائحہ عمل سے محروم رکھتا ہے۔ انسان کچھ نہ کرتے ہوئے بھی سمجھتے ہیں کہ بہت کچھ کر رہے ہیں۔ دوڑ رہے ہوتے ہیں بلکہ دوڑتے بھی ہیں مگر جا کہیں بھی نہیں رہے ہوتے۔ کولہو کے بیل اور تانگے کے گھوڑے کی کوئی منزل نہیں ہوتی مگر وہ چلتے ہی رہتے ہیں، دوڑتے ہی رہتے ہیں۔

یہی کیفیت قلعت پاکستان کی کر دی گئی تھی۔ قوم لوگ بن گئی تھی۔ ہر آدمی حکومت کو، ہر وزیر اور ہر افسر کو کوستا رہتا تھا۔ ہر محفل میں بے انصافی اور انسانی حقوق کی پامالی کی مثالیں دی جاتیں اور اخباری بیانوں پر تبصرے ہوتے تھے جو پہلے سے کم اور کوسنے زیادہ تھے۔ ذہنی انتشار تھا۔ کسی کو کسی پر اعتماد نہ تھا۔ وہ سیاسی فریب کاری کے عروج کا زمانہ تھا جس کے خلاف ایک تحریک کی ضرورت تھی لیکن کوئی تحریک منظم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ تو پہلے ہی ایک تحریک چلا رہے ہیں۔

iqbalmt@onenet.net.pk scanned by

قوم مرثی تھی، افراد زندہ تھے۔

★

ملک رجب علی اور سلمٰی کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات پاکستان کی تاریخ کو اُس راستے پر ڈال دیا کیا جو تباہی کی طرف تو نہیں جاتا لیکن یہ ایک پہاڑی راستہ ہے جس کے ایک طرف اونچی پہاڑیاں اور دوسری طرف دُور نیچے تک گہری بڑی ڈھلانیں اور گہری کھائیاں ہوتی ہیں۔ ذرا سا پاؤں غلط پڑ جاتے تو زندگی کا آخری قدم ہوتا ہے۔ گاڑی کو ذرا زیادہ یا ذرا کم موڑ دو تو زندگی کا آخری موڑ بن جاتا ہے۔ گاڑی کے مسافروں پر خوف و ہراس طاری رہتا ہے۔

رجب علی اور سلمٰی نے رات جاگتے اور باتیں کرتے گزار دی تھی۔ سلمٰی نے رجب علی سے کہا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں سننا چاہتی جس میں اس کے مرحوم خاوند عبدالجلیل خان کا ذکر ہو کیونکہ وہ اپنے ضمیر پر اس جُرم کا بوجھ محسوس کر رہی تھی کہ اُس نے اپنے خاوند کے قاتل کے ساتھ شادی کر کے خاوند کی روح کو دھوکہ دیا ہے لیکن رات جو بھی بات ہُوئی اس میں عبدالجلیل کا ذکر ضرور آتا تھا۔ وہ عبدالجلیل کی خفیہ تحریک کو زندہ رکھنے کے منصوبے بھی بناتے رہے تھے، اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُن کی آنکھ لگ گئی تھی۔

انہیں جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ سلمٰی کے پیٹے اصغر کو گذشتہ شام ارشد اور ثابرہ اپنے گھر لے گئے تھے۔ رجب علی اور سلمٰی کو دیر تک سونا تھا مگر سڑکوں پر گھوم پھر کر اخبار بیچنے والے لڑکوں کی چیخ و پکار نے انہیں جگا دیا۔ اکا دکا دوسرے کے پیچھے سائیکلوں پر سوار گزر رہے تھے اور چلاتے جا رہے تھے ــــ "مارشل لاء لگ گیا..... آئین توڑ دیا گیا..... سیاسی پارٹیاں کالعدم قرار دے دی گئیں..... پڑھیے..... آج کی تازہ خبر..... یہ دیکھئے کیا ہو گیا..... سارے ملک میں مارشل لاء لگ گیا..... سیاسی لیڈر بھاگ گئے..... فوج آ گئی..... پاکستان میں انقلاب آ گیا۔"

ملک رجب علی دوڑتا باہر آیا۔ اُس کے نوکر برآمدے میں کھڑے اخبار بیچ رہے تھے۔ حالسا ماں مارشل لاء کی خبر پڑھ کر سنا رہا تھا اور دوسرے دونوں نوکر خوشی کے دبے دبے نعرے لگا رہے تھے۔ کسی نوکر نے رجب علی کو دیکھ لیا۔

"ملک صاحب!" ــــ ایک نوکر نے اُسے کہا ــــ "سارے ملک میں مارشل لاء لگ گیا ہے یہ دیکھیے۔"

رجب علی نے اخبار ان سے لے لیا اور انہیں کہا کہ وہ اپنے لیے ایک اور اخبار لے آئیں۔

رجب علی نے اخبار کی شہ سرخی دیکھی اور خبر پڑھنے لگا۔ نوکروں نے اُس سے باری باری پوچھا ــــ "ملک صاحب! یہ اچھا ہُوا ہے یا اچھا نہیں ہُوا؟" ــــ مگر وہ خبر میں اتنا محو ہو گیا تھا جیسے اُسے نوکروں کی آواز سنائی ہی نہ دے رہی ہو۔

وہ خبر پڑھ چکا تو نوکروں نے اُس سے پھر پوچھا کہ اب کیا ہو گا؟

"جو ہو گا اچھا ہو گا۔" ــــ اُس نے جواب دیا اور کہا ــــ "یہ خیال رکھنا کہ مارشل لاء کے خلاف کوئی بات نہ کرنا۔ دو سال کے لیے اندر ہو جاؤ گے..... یہ اچھا ہُوا ہے۔ مارشل لاء اچھا نہیں ہوتا مگر اچھا ہُوا ہے۔" اب یہی کہو کہ اچھا ہُوا ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔"

رجب علی اخبار پڑھتے پڑھتے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ سلمٰی باہر آ رہی تھی۔

"فوج نے حکومت سنبھال لی ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "سیاسی بازی ختم کر دی گئی ہے۔ سیاست بازی جُرم قرار دے دی گئی ہے۔"

"کیا خیال ہے آپ کا؟" ــــ سلمٰی نے پُوچھا ــــ "اچھا نہیں ہُوا؟"

"جو آسمان سے گرا کرتا ہے وہ کھجور میں اٹک جاتا ہے" ــــ رجب علی نے کہا ــــ "لگ بھگ سارے ہی لیڈروں نے پاکستان کو آسمان سے ایسا گرایا ہے کہ کھجور میں نہیں اٹکا بلکہ پستیوں میں جا پڑا ہے۔ اللہ پاکستان کو محفوظ رکھے۔ ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے کہ فوجی حکومت نجات کا ذریعہ بنے گی یا ہم مارشل لاء سے نجات کی دعائیں مانگیں گے۔ ابھی اسی کو غنیمت سمجھو کہ ملک اُن سیاسی لیڈروں سے آزاد ہو گیا ہے جنہوں نے اپنے اپنے درمیان تنازعہ زمین بنا لیا تھا اور اس کی شکایت پر لڑ رہے تھے۔"

لوگ خوش تھے۔ بعض نے اپنے مکانوں پر چراغاں بھی کی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ فوجی حکومت کیسی ہوتی ہے۔ وہ اسی پر خوش تھے کہ کچھ تو تبدیلی آئی۔ سیاسی لیڈروں اور ان کی سیاسی بازی گری سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ اب وہ شکنجہ کا سانس لینے لگے، جیسے وہ ڈوب رہے تھے اور انہیں ڈوبنے سے بچا لیا گیا ہو۔ لوگوں کا موضوع سخن بدل گیا۔ حالات و واقعات کے متعلق رائے بدل گئی۔

غلط فہمیاں دُور ہو گئیں۔

خوش فہمیوں کا دور آ گیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ تبدیلی جو آئی تھی وہ واضح ہونے لگی۔ آئین جو معطل ہو گیا تھا اُس کی جگہ مارشل لاء ریگولیشن لے چکے تھے۔ پہلے لوگ چوکوں میں کھڑے ہو کر حکومت کو بُرا بھلا کہہ لیتے تھے۔ اب وہ جرم قرار دے دیا گیا۔ مارشل لاء نئی زنجیریں لے کر آیا۔ اخبار اس نئے سورج کی پوجا کرنے لگے جو مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو طلوع ہُوا تھا۔ اس سورج کی تپش بڑی تیز تھی۔ لوگوں کی امیدیں جھلسنے لگی تھیں۔ اخبار نئے دیوتا کے گیت سنانے لگے۔ سیاسی لیڈر آندھی میں جلتے دیوں کی مانند بجھ گئے۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

★

ایک سال گزر گیا۔

ریڈیو اور اخبار مژدہ سنانے لگے کہ بے انصافی، رشوت اور دیگر جرائم ختم کر دیئے گئے ہیں۔ ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہے ــــ لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں پوچھنے لگے کہ اخباروں اور ریڈیو والا پاکستان کہاں ہے جو خوشحالی سے اور جہاں کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوتی؟ لوگ ایک اور تحریک کی تیاری کرنے لگے لیکن اخباروں اور ریڈیو والوں کو بھی اس پاکستان کا اتا پتا معلوم نہ تھا۔

قدرت کے کھیل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ وہ سب لوگ جو ان دنوں میں دیوتا کے گیت گاتے تھے وہ بار بار سے نکل آئے۔ انہوں نے خاکی وردی والے اس دیوتا کے تیور، عزائم اور انداز بھانپ لیے اور نیا پاٹھ کے انداز و اطوار بنانے لگے۔ یہ بات کہ اس کے نعروں میں تبدیلی بھی ہے، انہوں نے جان لی اور اس کی خوشنودی حاصل کر لی۔

دیوتا کے بُت نے اپنے پاؤں میں اتنے زیادہ انسانوں کو سجدہ ریز دیکھا تو وہ بڑی حماقت سے

iqbalmt@onenet.com.pk Scanned by

تی کہانی پڑھ رہی تھی، اور جب اُس نے اپنی مدح کے بھجن سنے تو اُس کا سر آسمان سے جا لگا

تو ہی ہے دھن کی عمر راہ دیکھ رہے تھے —

"رگ تیرے نام کی مالا جپتے ہیں"

"اب ملک میں کوئی بھوکا نہیں، کوئی ننگا نہیں"

"کوئی چور نہیں..... لوگ راتوں کو دروازے کھول کر سوتے ہیں"

"تُو نے ڈوبی ہوئی قوم کو زندہ و پائندہ کر دیا ہے"

"تُو نہ ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا"

"یہ دور جس ابراہیم کی تلاش میں تھا وہ تُو ہے"

"تو جمہوریت کا سلطان ہے"

"دیکھ ہم نے سرکاری دفتروں میں قائدِ اعظم کی تصویر کے ساتھ تیری تصویر لٹکا دی ہے"

"لوگ قائدِ اعظم کے بعد تیرا نام لیتے ہیں"

"تُو ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے"

اقتدار کی سیاست کے سومنات کا یہ بُت ہر امر میں معلق ہو گیا۔ صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں نے اُس کے قدموں میں الفاظ کے پھول نچھاور کیے اور انعام و اکرام سے نوازے گئے — اندلس کی تاریخ کا وہ باب دہرایا جانے لگا جب اندلس کے سلطانوں نے اپنی مدح سرائی کے لیے ادیبوں اور شاعروں کو دربار میں رکھنا شروع کر دیا تھا۔ شاعر اپنے اپنے گویّے ساتھ لے جاتے جو اُن کا غزلیہ کلام دربار میں گا کر سناتے تھے۔ اندلس کے آخری دور کے سلطانوں نے مدح سرائی کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ ادیب اور شاعر مدح سرائی کے ایسے ایسے کمالات دکھاتے کہ سلطانوں کے لیے اپنی پہچان محال ہو جاتی۔

ان خوشامد پرست سلطانوں، خوشامدیوں، مدح سرا ادیبوں اور شاعروں نے اس سلطنت اسلامیہ کی جڑیں کھوکھلی کر دیں جسے فتح کرنے کی خاطر اللہ کے سپاہیوں نے کشتیاں جلا ڈالی تھیں کہ واپسی کا کوئی راستہ نہ رہے — فتح یا موت — ان مفاد پرستوں نے اسلام کی تاریخ میں پہلے سقوط کا باب لکھ ڈالا — اب ایک بار پھر وہی عناصر اسلام کی تاریخ کو ایک اور سقوط کی طرف لے جا رہے تھے۔

☆

طاہرہ نویں جماعت میں اُسی سکول میں پڑھاتی تھی جس میں اُس کا باپ جمال بیگ پڑھایا کرتا تھا۔ طاہرہ کو یہ نوکری نجمہ نے دلائی تھی اور یہیں اُسے اپنا یہ باپ ملا تھا جس کے متعلق اُسے یقین تھا کہ اُس نے اُس کے پیدا ہوتے ہی خودکشی کر لی تھی۔

طاہرہ کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ وہ لکیر کی فقیر نہیں تھی نہ وہ تنخواہ کی خاطر اس سکول میں ملازم ہوئی تھی۔ وہ اپنی کلاس کی بچیوں، وہ بچوں کو بتاتی تھی کہ وہ دنیا میں کیوں آئے ہیں۔ ان کے جینے کا مقصد کیا ہے پڑھنے کا مقصد کیا ہے۔ اُن کی روایات کیا ہیں اور ان روایات کو زندہ رکھنا ان کا سب سے بڑا فرض ہے وہ بچوں کو وہ باتیں بھی بتاتی تھی جو ان کے کورس میں نہیں تھیں۔ طاہرہ کورس کی پابند ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ اپنی کلاس کے بچوں کو بتاتی تھی کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا اور کس طرح بنایا ہے۔ کتنا خون دے کر زمین کا یہ ٹکڑا حاصل کیا ہے۔ وہ ان بچوں کو جب ہجرت کے واقعات سناتی اور انہیں بتاتی کہ ان جیسے بچے کس طرح ہندوؤں اور سکھوں کی کرپانوں اور برچھیوں سے کٹ گئے تھے اور جو زندہ ہے وہ کس حال میں پاکستان تک پہنچے تھے تو کلاس پر سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ بعض بچوں کے آنسو نکل آتے تھے۔ بچے اُس سے پوچھا کرتے تھے کہ وہ اُن بچوں کے خون کا بدلہ کس طرح لے سکتے ہیں۔ وہ انہیں بتایا کرتی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں پاکستانی بچے بن کر دشمن سے انتقام لے سکتے ہیں۔

"ہندو لیڈر کہتے ہیں کہ پاکستان ہندوستان کا حصّہ ہے" — طاہرہ اپنی کلاس کے بچوں کو سبق دیا کرتی تھی — "اس لیے پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرنا ہے لیکن بچو! حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کا ملک تھا جو ہمارے بادشاہوں کی لغزشوں اور عیاشیوں کی وجہ سے انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اب ہندو اس کے مالک بن بیٹھے ہیں اور ہندوستان سے مسلمانوں کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ ہمیں اسے ہندوستان کو پاکستان بنانا ہے۔"

طاہرہ بچوں کو بتاتی تھی کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں بچوں نے کیا کام کیا تھا۔ وہ انہیں بتاتی تھی کہ ان کا دشمن کون ہے، کب سے دشمن ہے، وہ کیسا ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں۔ طاہرہ نے بچوں میں عسکری روح پیدا کر دی تھی۔

مارشل لا کا دوسرا سال تھا۔ ایک روز سکول کے پرنسپل نے اُسے اپنے دفتر میں بلایا۔

"مسز طاہرہ ارشد!" — پرنسپل نے کہا — "اب آپ اپنی کلاس کی پڑھائی کو کورس تک ہی محدود رکھیں اور کلاس کے ساتھ التوفا لتو باتیں نہ کیا کریں۔"

"کون سی باتوں کی وضاحت کر رہی ہیں؟" — طاہرہ نے کہا — "میں نے انہیں جنوں بھوتوں اور پریوں کی کہانیاں کبھی نہیں سنائیں۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان جیسے کیسے بھی بنا بن گیا، اسی کی کہانیاں بچوں کو سناتے چلے جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔" — پرنسپل نے کہا — "آپ انہیں ہجرت کی داستانیں سنا سنا کر ڈرا رہی ہیں۔"

"آپ کی رائے صحیح نہیں سر!" — طاہرہ نے کہا — "بچوں کے ردِعمل کو متاثر میں سمجھتی ہوں اتنا ایک نہیں سمجھتے۔ میرا فرض ہے کہ میں انہیں ان کی تاریخ سناتی رہوں۔"

"دوسرے تیسرے گریڈ کے بچے آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکتے مسز طاہرہ!" — پرنسپل نے پریشان سا ہو کر کہا — "آپ انہیں یہ بھی کہتی رہتی ہیں کہ پاکستان کے حکمران اس ملک کو لے ڈوبیں گے اب ایسی باتیں چھوڑ دیں۔"

کوئی بات ہے، جھگڑا نہیں۔ میں آپ سے اور کچھ نہیں کہوں گا۔ اپنی تنخواہ سے اور جس کام کی تنخواہ ملتی ہے اس کام سے مطلب رکھیں۔ کہاں آپ اُس پاکستان کو ڈھونڈنے چلی ہیں جو آپ نے بنایا تھا۔"

"ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے" — طاہرہ نے کہا — "وہ پاکستان یہیں ہے۔ یہیں ہے وہ پاکستان میں اسی کی بقا کی خاطر بچوں کو تیار کر رہی ہوں۔ میں ایک ورثہ ان کے حوالے کر رہی ہوں۔ اس ورثے میں کچھ روایات ہیں اور پاکستان ہے۔"

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں۔"

"آپ نے جو بات کہی ہے یہ میں نے سرحد پار آزادی سے پہلے جلال آباد میں اُس وقت سمجھ لی

idbalmt@onepublication.com Scanned by

تھی جب میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی"۔۔۔ یہی سنز کنجر جو آپ کے سکول میں اُستانی ہیں جلال آباد میں میری اُستانی ہُوا کرتی تھیں۔ ان کی قیادت میں ہم بہت سی سنسان لڑکیاں جلوسوں میں شریک ہوتیں اور تحریک کو گھر گھر پہنچانے کا کام کرتی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس نے یہی الفاظ جو آپ نے مجھے کہے ہیں انہیں کہے تھے ۔۔۔ سکول کی گرانٹ بند ہو جائے گی۔ لڑکیوں کو خراب نہ کرو۔۔۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں بھی مجھے یہی الفاظ سُننے پڑیں گے۔ آپا کنجر نے ہیڈ مسٹریس کو اپنے استعفے کی صُورت میں جواب دیا تھا۔ میں بھی آپ کو اپنے استعفے کی صورت میں جواب دیتی ہُوں۔ آپ کو سرکاری گرانٹ بند ہونے کا خطرہ ہے۔ مجھے پاکستان خطرے میں نظر آ رہا ہے۔"

"اپنا رویّہ آپ بدل کیوں نہیں لیتیں؟"

"جسے آپ میرا رویّہ کہہ رہے ہیں یہ میرا ایمان ہے"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔ "میں اپنے ایمان سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ کیا آپ ہندوستان کے لیڈروں کے بیان اخباروں میں نہیں پڑھ رہے؟ ان کی دھمکیاں آپ کے کانوں میں نہیں پڑ رہیں؟ ہندوؤں نے پاکستان کو ختم کرنے کے عزم کو اپنے دھرم میں شامل کر لیا ہے۔ کیا آپ پاکستان کے لیے لڑیں گے؟..... ان بچوں کو لڑنا ہے لیکن یہ اسی مٹی سے ہیں جس سے ہمارے ملک کو بچانے والے ہیں گے کہ ہم ان کو بتا دیں کہ ہمارا دشمن کیا چاہتا ہے اور وہ کس سے پاکستان کی حفاظت لے چکا ہے۔"

"آپ بہت جذباتی ہیں مسز طاہر ارشد!"۔۔۔ پرنسپل نے کہا۔۔۔ "میرا خیال ہے کہ..... دیکھیے نا مسز طاہر! میں کہہ رہا ہُوں:"

"اوہ! میں سمجھ گئی ہُوں سر!"۔۔۔ طاہرہ نے کہا۔۔۔ "اب حکومت بدل گئی ہے جو....."

"جو آپ کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لے گی"۔۔۔ پرنسپل نے طاہرہ کی بات کاٹ کر کہا۔۔۔ "خدا سے ڈریں یا نہ ڈریں، مارشل لاء سے ڈریں..... مسز طاہر ارشد!"۔۔۔ پرنسپل نے آگے کو ہو کر دھیمی سے کہا۔۔۔ "ابھی تم کہتی ہُوں نہ آپ، دو باتیں کہنے کی کوشش کر رہے ہیں جو آپ کا ضمیر آپ کو کہنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ اگر آپ میری بات نہیں سمجھ رہے تو میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کروں گی۔ میں استعفے دے رہی ہُوں۔"

اور وہ پرنسپل کو بوکھلاہٹ کے عالم میں چھوڑ کر اُس کے دفتر سے نکل آئی۔

تھوڑی دیر بعد جمال بیگ پرنسپل کے دفتر میں داخل ہُوا اور وہ استعفے اُس کے آگے رکھ دینے ایک طاہرہ کا دُوسرا اپنا۔

"اور میری جگہ سے"۔۔۔ جمال بیگ نے کہا۔۔۔ "میں اُس کے بغیر سکول میں نہیں رہ سکتا۔ آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہُوں کہ ان شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے کر آپ بہت بڑا گناہ کر رہے ہیں۔"

☆

سلمیٰ کے بیٹے اصغر کی عمر سترہ برس ہو گئی۔ وہ سیکنڈ ایئر میں پہنچ گیا تھا۔ سلمیٰ اُسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی لیکن اصغر کا ارادہ کچھ اور تھا۔ اُس نے فوج میں جانے کی ضد شروع کر دی تھی جو ماں نہیں مان رہی تھی۔

"اسے فوج میں جانا ہے سلمیٰ! اسے فوج میں ہی جانا ہے۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "میں اُس فوج کی بات کر رہا ہُوں جو پاکستان کو بڑے طاقتور دشمن سے بچانے گی۔ میں اسے ذریعۂ معاش کے لیے فوج میں بھرتی نہیں کرا رہا۔ میں اس جیسے ایک درجن بیٹوں کو فارغ بٹھا کر عیش کرا سکتا ہُوں لیکن میں وہ فوج تیار کرنی ہے جو تنخواہ کی خاطر نہیں اپنے قومی وقار کی خاطر لڑے گی۔"

"پھر آپ مجھے پاکستان کی کہانیاں کیوں سناتی رہی ہیں امّی!"۔۔۔ اصغر نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "میں اب کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اب آپ مجھے مُردہ نہیں کر سکتیں۔"

سلمیٰ اُنہی ماؤں میں سے تھی جنہوں نے اپنے اندر پاکستان بنایا تھا۔ اُس نے اصغر کو پاکستان کی باتیں سُنا سُنا کر جوان کیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ارادے کو دبا سکی اور نہ اُسے فوج میں جانے کی اجازت دے سکی۔

اصغر ذہین لڑکا تھا جسمانی لحاظ سے بھی چست اور صحت مند تھا۔ وہ کمیشن کے لیے منتخب ہو گیا اور ایک روز ٹریننگ کے لیے ملٹری اکیڈمی میں چلا گیا۔

☆

چھ سال اور گزر گئے۔

اپریل ۱۹۶۵ء آ گیا۔

پاکستان کی عمر اٹھارہ برس ہو چکی تھی۔

سلمیٰ کا بیٹا اصغر فوج میں کیپٹن تھا۔

اصغر پرویز کی عمر سولہ برس ہونے والی تھی۔

ہندوستان اب بھارت کہلانے لگا تھا۔ اُس کی انٹیلی جنس کے پاس پاکستان کی روپڑوں کے اندر تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے جاسوس پاکستان کے گوشے گوشے میں موجود اور سرگرم تھے۔ صحافت اور سیاست اور ادب میں بھی بھارتی ایجنٹ موجود تھے۔ افسر شاہی بھی بھارتی ایجنٹوں سے پاک نہیں تھی تینوں مسلح افواج کے ہیڈ کوارٹر بھی بھارت کے جاسوسوں کی نظر میں تھے۔ اس سال پسلے کرن اور راد ھانام کی دو ہندو لڑکیاں جو پاکستان میں عقیلہ اور فریحہ کہلاتی تھیں اور جن کے سیال جلی خاندان کا سے تانگے والے کے ہاتھوں ماری گئی تھیں۔ اُن کی جگہ بھارت کی کئی اور کرنیں اور رادھائیں پاکستان کی "اونچی" سوسائٹی میں آ گئیں اور انہوں نے یہاں کی نازک جگہیں اپنی مٹھی میں لے لی تھیں۔

۱۹۶۵ء کے ابتدائی دنوں میں بھارت میں ایک کانفرنس ہندو رداؤں میں منعقد ہُوئی۔ اس میں تینوں مسلح افواج کے کمانڈر انچیف موجود تھے۔ بھارت کی ملٹری انٹیلی جنس کا ایک سینئر جنرل بھی تھا۔ فضیر دفاع بھی موجود تھا۔ سیکرٹری دفاع اور متعلقہ محکمے کے مشیر بھی موجود تھے اور اس کی صدارت اُس وقت کا وزیر اعظم کر رہا تھا۔

"یہ ایک تاریخی کانفرنس ہے جس کا ذکر تاریخ میں نہیں آئے گا کیونکہ یہ خفیہ ہے"۔۔۔ بھارتی وزیر اعظم نے کانفرنس سے خطاب کیا۔۔۔ "پیشتر اس کے کہ ہم پاکستان کے متعلق رپورٹ سنیں اور اس مسئلے پر بحث کریں کہ پاکستان پر فوج کشی کے لیے حالات ہمارے موافق ہیں یا نہیں، میں آپ سے

by iqbalmt@onenet.com.pk Scanned by

وہ باتیں کرنا چاہوں گا جو آپ پہلے سے جانتے ہیں۔ میں ان کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں.... پاکستان پر فوج کشی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اشارہ برسوں سے اس کی تیاری کیوں کرتے رہے ہیں؟..... صرف اس لیے کہ پاکستان کو ختم کرنا ہے اور ختم اس لیے کرنا ہے کہ یہ ایک غیر قدرتی تقسیم تھی۔ پاکستان بھارت کا حصہ ہے۔ اسے بھارت میں واپس لانا ہے....

"صرف پاکستان نہیں۔ ہمارے پیش نظر بہت کچھ ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارا بھارت میں مشرق میں انڈونیشیا، برما اور ملائشیا اور مغرب میں وجلہ اور فرات تک کے ملک شامل ہیں۔ افغانستان پہلے ہی ہمارے زیر اثر ہے لیکن اسے ابھی ہم بھارت میں شامل نہیں کریں گے۔ اسے پاکستان کے خلاف استعمال کرنا ہے۔ اسی لیے ہم نے پختونستان کی تحریک چلائی ہے اور پختونستان کی سرحد اٹک تک لگی ہے۔ نیپال، بھوٹان اور سکم وغیرہ کو بھی بھارت میں شامل کرنا ہے۔ ہمارا سب سے پہلا نشانہ پاکستان ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے ملکوں میں صرف پاکستان ہے جو ہمارا مقابلہ کچھ دن کر سکتا ہے۔ اس قوم کی کچھ روایات ہیں اور یہ جنگجو قوم ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ پاکستان [illegible] دے [illegible] سے ملک میں شامل کر لیں گے لیکن اس قوم کی جو فوجی روایات ہیں انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے....

"بھارت میں اسلام کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہمارے باپو، سوگ گاشی مہاتما گاندھی کہا کرتے تھے کہ میرے جسم کے دو ٹکڑے کر دو۔ بھارت ماتا کے دو ٹکڑے نہیں ہوں گے (مگر بھارت ماتا کے دو ٹکڑے اُن کی زندگی میں ہو گئے۔ سوگ گاشی پنڈت نہرو نے اسے جیتے جی پر پتھر رکھ کر بھارت ماتا کی تقسیم پر دستخط کیے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ انہوں نے کہا تھا کہ میں نے ملک کی تقسیم کو قبول تو کر لیا ہے لیکن اسے ادا کچھ اور ہے۔ محمد علی جناح کو پاکستان بنا لینے دو۔ ہم بہت جلد [illegible] سے ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ جناح خود میرے پاس درخواست لے کر آئے گا کہ ہمیں ہندوستان میں شامل کر لو....

"ہمیں صرف گاندھی اور پنڈت نہرو جی کی روحوں کو خوش کرنا ہے۔ پاکستان کو ختم کرنا ہمارا [illegible] ہے اور پاکستان پر فوج کشی دھرم یُدھ (مذہبی جنگ) ہو گا۔ آج ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ آپ ایئر چیف مارشل [illegible] نہیں اور بتائیں کہ حملے کے لیے یہ وقت موزوں ہے یا نہیں؟"

★

انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر ہندو میجر جنرل نے کانفرنس میں بتایا کہ پاکستان پر حملے کے لیے اس سے زیادہ موزوں وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جنگی طاقت کے لحاظ سے ہمارے مقابلے میں پاکستان ایسے ہی ہے جیسے شیر کے مقابلے میں بکری۔

"اس وقت بھارت اپنے آپ کو شیر اور ہمیں بکری کہہ سکتا تھا۔ پنڈت نہرو نے بھارت کو جنگی طاقت بنانے کے لیے ایک دلیرانہ ناٹک کھیلا تھا۔ یہ تھا چین کے جنوبی علاقے پر حملہ۔ پنڈت نہرو جانتا تھا کہ وہ شیر کے کچھار میں سر دے رہا ہے۔ ہر قوم حیران تھی کہ پنڈت نہرو جیسے دُور اندیش اور دانشمند سیاست دان نے یہ کیا کیا؟ اس نے ایک ڈویژن چین جیسی عالمی طاقت کے آگے پھینک دیا۔ اس بھارتی فوج کو اگر چینی فوج کے ہاتھوں نہیں تو اس برفانی علاقے کی ناقابل برداشت صعوبتوں سے مرنا

تھا۔ وہ علاقہ تھا ہی چٹیلوں کا جسے پنڈت نہرو نے بھارت کا علاقہ کہا تھا۔

دو تین دنوں میں بھارت کے اس ڈویژن کے پرخچے اڑ گئے لیکن پنڈت نہرو نے ساری تیاریاں ثابت کر دیا کہ وہ احمق نہیں۔ اُدھر اس نے اپنی فوج چین کی سرحدی چوکیوں پر چڑھا دی، اِدھر وادیلا پاکر دیا کہ یہ دیکھو دنیا والو! چین نے بھارت پر حملہ کر دیا ہے۔ اگر کسی نے ہماری مدد نہ کی تو سارے بھارت پر چین کا قبضہ ہو جائے گا۔

امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ بھاگ اٹھے۔ انہوں نے بھارت کے اسلحہ خانے جدید ہتھیاروں اور گولہ بارود سے بھر دیے۔ اسے لڑاکا طیارے دیے۔ توپیں اور ٹینک دیے۔ نیوی کو جنگی جہاز دیے اور امریکہ نے بھارت کی فوج کی تنظیم نو اور ٹریننگ اپنے ذمے لے لی۔

بھارت نے دو چار دنوں میں ہی چین کے جنوبی علاقے نیفا میں جو شکست کھائی وہ ایک ضرب المثل اور مذاق بن گئی۔ پنڈت نہرو اور اس کے ساتھی سمجھ رہے تھے کہ ایسا ہی ہو گا لیکن انہوں نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی — تمام بڑی طاقتیں جو چین سے مخالف تھیں بھارت کی مدد کو آ گئیں۔ بھارت کی فضائی فوج میں نو نئے ڈویژن بن گئے جو امریکہ نے مسلح اور تیار کیے۔ اس کے آرمرڈ (بکتر بند) ڈویژن [illegible] مکینائزڈ بریگیڈ میں گئے۔ انڈی پنڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ بن گیا۔ توپ خانے جدید توپوں سے لیس ہو گئے۔ فوج کی تعداد اور طاقت چین کے دشمن کمالک کی جنگی اور مالی امداد سے اتنی بڑھ گئی جس کے مالی بوجھ کا مستقل بھارت نہیں سہہ سکتا تھا۔

پنڈت نہرو کو توقع بہت مختصر سے کی تھی لیکن اتنا مل گیا جو اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ پنڈت نہرو کا بڑا دماغ اور توقع سے کہیں زیادہ کامیابی کا دھچکا برداشت نہ کر سکا اور وہ مر گیا لیکن بھارت جنگی طاقت بن گیا۔

بھارت کے ایک ہندو جرنیل (بی۔ ایم۔ کول) نے جو چین کے خلاف لڑا اور اس حال میں واپس آیا تھا کہ اسے اپنے ڈویژن کی کچھ خبر نہ تھی، ایک کتاب میں لکھا تھا — "چین پر بھارت کے حملے کا مقصد یہ تھا کہ چین کے مخالف ملکوں سے اتنا اسلحہ بارود اکٹھا کر لیا جائے کہ پاکستان کو ایک ہی ہلے میں ختم کر دیا جائے۔"

★

۱۹۶۵ء کے اوائل کی اس کانفرنس میں بھارت کے انٹیلی جنس کے میجر جنرل نے بتایا کہ پاکستان کے پاس فوج کے پانچ پورے ڈویژن نہیں۔ ابھی تک اس فوج کے پاس شرمن ٹینک ہیں جو چلتے چلتے رُک جاتے ہیں۔ انٹیلی جنس ڈائریکٹر نے بتایا کہ یہ مقابلہ پانچ اور ایک کا ہو گا۔ اس نے پاک فضائیہ اور بحریہ کی طاقت بھی بتائی۔

"ہمارے پاس طیارہ بردار بحری جہاز 'وکرانت' ہے" — اس نے کہا — "میرا خیال ہے کہ کراچی کے ہوائی اڈوں اور بندرگاہ کو تباہ کرنے کے لیے یہی ایئر کرافٹ کیریئر کافی ہے" — اس نے پاکستان کی جنگی طاقت کے اعداد و شمار پیش کر کے کہا: — "اس وقت پاکستان پر ایک جرنیل کی حکمرانی ہے۔ کوئی جرنیل حکومت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی حکومت تھی۔ انہوں نے اپنے ملک کی صنعت کو

iqbalmt@olen.com.pk scanned by

کھو کھلا کر دیا تھا۔ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ غنڈہ گردی کی سیاست تھی اس لیے غنڈوں کو تحفظ حاصل رہا۔
... سے ہتھیار، تھیلے بڑھے کہ بات تو لوگ خوف کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ بھگدڑ نے لوگوں کو تتلیت کر دیا ہے۔ اس مارشل لاء نے عبرت کا بھس بھر لیا ہے اور لوگوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔۔۔

"آپ کو شاید یاد ہو گا کہ پاکستان کی سیاست میں اس وقت چند ایک لیڈر ایسے تھے جو پاکستان کے مطالبے کے سخت خلاف تھے۔ ان میں کچھ کانگرسی تھے، کچھ نیشنلسٹ پارٹی کے ممبر تھے اور ان میں کچھ مذہبی لیڈر بھی شامل ہیں۔ ہماری قوم نے سکھوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس سے ڈر کر وہ مسلمان بھی پاکستان چلے گئے جو پاکستان کے خلاف تھے۔ ہماری خوش قسمتی سے یہ لیڈر پاکستان کی سیاست میں شامل ہو گئے۔ پھر یہی لیڈر پاکستان کی سیاست کے ستون بن گئے۔۔۔۔

"ان کے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ پاکستان کے لوگ بھارت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ میرے سامنے کئی رپورٹوں کے مطابق وہاں صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں جو بھی سیاسی پارٹی اقتدار میں آئی وہ ہمارے لیے اچھی رہی لیکن عوام ہمیں دشمن سمجھتے رہے۔ آج اٹھارہ سال بعد ۱۹۶۵ء میں بھی وہاں [illegible] کے حکمران ہماری دوستی کے خواہاں ہیں اور لوگ ہمارے خون کے پیاسے لیکن ان کی [illegible] قائم رکھنے کے لیے اور کچھ ہم سے پرانی دوستی نبھانے کے لیے اور کچھ اپنی [illegible] وجہ سے اپنی پالیسی کا یہ حال کر دیا ہے کہ لوگ پیٹ کے غلام ہو گئے ہیں۔ وہ ہم سے دوستی کو اپنے لیے بھی دشمن سمجھتے ہیں لیکن معاشی مسائل اور دیگر حالات نے ان کے جذبے کو سرد کر دیا ہے اب انہیں ہوش نہیں کہ ان کے درمیان ہمارے کتنے جاسوس گھوم پھر رہے ہیں۔۔۔۔

"دس سال گزرے لاہور میں ہماری دو بڑی قیمتی لائبریاں قتل ہو گئی تھیں۔ ہم ایک خفیہ تحریک کا پتہ چلا رہے تھے جو ہمارے جاسوسوں کے خلاف چل رہی تھی لیکن وہاں کے دو تین افسروں، ایک [illegible] اور ایک سول کے دو جاگیردار لیڈروں نے تحریک شروع کرنے والے کو ذلیل اور رسوا کر کے مار ڈالا۔ تحریک دبا دی گئی۔ ہمارے آپریٹر نے وہاں کے سرکاری حلقوں کو اپنی مٹھی میں لے کر ایسے اقدامات کرائے کہ لوگوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ پاکستان کا وہ کون سا گوشہ اور کون سا علاقہ ہے جو ہماری زد میں نہیں۔ آپ کو ان رپورٹوں پر اعتبار کرنا چاہیے۔ حملے کا یہ وقت موزوں ہے۔"

☆

"پاکستان پر حملہ ملٹری ایکشن نہیں پولیس ایکشن ہو گا۔" — بھارت کی تری فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا۔ "پاکستان کو فتح کرنے میں اتنا ہی وقت لگے گا جتنا ہم نے حیدر آباد دکن پر قبضہ کرنے میں لگایا تھا۔"

"پاکستان کے آسمانوں میں انڈین ایئر فورس کی حکمرانی ہو گی۔" — انڈین ایئر فورس کے کمانڈر انچیف نے کہا۔ "میرے فائٹر پائلٹ پاکستان کے طیاروں کو زمین سے اٹھنے کی مہلت ہی نہیں دیں گے۔"

سب نے انڈین نیوی کے کمانڈر انچیف کی طرف دیکھا۔

"کچھ اختلاف ہے؟" — اس نے کہا۔ "دشمن کو اتنا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں مانتا ہوں کہ پاکستان کی جنگی طاقت ہمارے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے اور اس کا اسلحہ بہت پرانا ہے، اور میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ پاکستانی قوم بحیثیت قوم کمزور ہو چکی ہے اور حکمرانوں کے پیدا کردہ حالات نے پاکستانیوں

کے جذبے کو مجروح کر دیا ہے لیکن میں اپنی قوم کو بھی جانتا ہوں کہ اس میں کتنا کچھ جذبہ ہے۔"

"میں اس رائے کی تائید کرتا ہوں۔" — دفاع کے سیکرٹری نے کہا۔ "آپ کو کشمیر کی جنگ جو پینتالیس اڑتالیس میں لڑی گئی تھی یاد نہیں رہی۔ ہم نے اپنی پوری ایئر فورس اور زیادہ سے زیادہ فوج استعمال کی تھی پھر بھی ہم پاکستان آرمی کی قلیل نفری کو تہ تیغ نہیں بٹا سکے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ پاکستان آرمی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر گرم وردی کے بغیر لڑی تھی۔ اگر فائر بندی نہ ہو جاتی تو آج کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہ مت بھولیے کہ جنگ ہتھیاروں سے نہیں جذبے اور مورال سے لڑی جاتی ہے۔ میں آپ کی اس رائے کی تائید نہیں کر سکتا کہ پاکستان آرمی اور پبلک جذبے سے بالکل ہی خالی ہو گئی ہے۔"

"تو پھر ہمیں دیکھ لینا چاہیے کہ پاکستان کتنے پانی میں ہے۔" — بری فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا۔

"یہ آپ کیسے دیکھیں گے؟"

"ہم کسی محدود علاقے میں پاکستان کو گھسیٹ لیں گے۔" — اس نے جواب دیا۔ "وہاں پہنچ جائے گا کہ پاکستان آرمی کی لڑنے کی اہلیت کس سطح پر ہے۔"

"ایسا علاقہ کون سا ہو سکتا ہے؟" — وزیر دفاع نے پوچھا۔ "کشمیر کے سوا مجھے اور کوئی علاقہ [illegible]"

"[illegible] کے متعلق کیا خیال ہے؟" — وزیر اعظم نے کہا۔ "یہ علاقہ کتنا زرخیز ہے۔"

"[illegible] بری فوج کے کمانڈر انچیف نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "[illegible] موزوں رہے گا۔"

"اور دنیا کو اس لیے بھی موزوں رہے گا کہ ہمیں پاکستان کی توجہ کشمیر سے ہٹانی ہے۔" — وزیر اعظم نے [illegible] اور وائسرائے جیسے کسی ٹیچر سے مخاطب ہو کے کہا۔ "اب آپ انہیں اپنی رپورٹ کا وہ حصہ سنائیں [illegible] نے کہا تھا کہ سب سے آخر میں میرے کہنے پر بتانا۔"

"میں نے اس وقت تک آپ کو یہ بتایا ہے کہ پاکستان کی فوج اور وہاں کے عوام کی کیفیت کیا ہے۔" — انٹیلی جنس کے سیکرٹ جنرل نے کہا۔ "یہ کیفیت ہمارے لیے سازگار ہے اور پاکستان میں [illegible] پیدا کرنے میں ہمارا [illegible] بھی ہے مگر وہاں ایک کمانڈو فورس تیار ہو رہی ہے جس میں پاکستان آرمی اور آزاد کشمیر آرمی کے چنے ہوئے افسر اور جوان شامل کیے گئے ہیں۔ اس فورس میں آزاد کشمیر کے [illegible] فوجی بھی شامل کیے جا رہے ہیں اور اس فورس کا ابتدائی مقصد کشمیر کے بعض لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کمانڈو فورس کشمیر کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ کشمیر میں اگر پاکستان نے کمانڈو ایکشن شروع کر دیا تو بہت مشکل صورت حال پیدا ہو جائے گی۔"

"آپ تجربہ کار ہیں۔" — ڈیفنس سیکرٹری نے جو ریٹائرڈ جنرل تھا، اور جس نے جنگ عظیم دوم بھی لڑی تھی، کہا۔ "دشمن کو تیاری کی حالت میں پکڑ لینا چاہیے۔ پیشتر اس کے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی مشترکہ کمانڈو فورس مقبوضہ کشمیر میں ایکشن شروع کر دے۔ ہمیں کہیں نہ کہیں ایسا وار کرنا چاہیے کہ پاکستان کو جان کے لالے پڑ جائیں۔"

"آپ نے پاکستان کے متعلق ساری رپورٹ سن لی ہے۔" — وزیر اعظم نے کہا۔ "میں ایک غیر فوجی ہوں لیکن یہ نکتہ میں بھی سمجھ سکتا ہوں کہ بعض حالات میں کمزور دشمن ایسا وار کر جاتا ہے کہ طاقتور کمزور

iqbalmt@onedumb.com scanned by

بتا دیتا ہے۔ پاکستان کی توجہ کشمیر آپریشن سے ہٹانے کے لیے رن کچھ ایک اچھا میدان ہے اور اس علاقے کا ہمارا پاکستان کے ساتھ تنازعہ بھی چل رہا ہے۔ اگر ہم نے رن کچھ میں اپنی فوج بھیج دی تو الزام متحدہ ہم پر یہ الزام عائد نہیں کر سکتی کہ ہم نے پاکستان پر حملہ کیا ہے۔ اس سے ہم دونوں مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پاکستان کی جنگی اہلیت اور لڑنے کے جذبے کا پتہ چل جائے گا اور دوسرا یہ کہ پاکستان کی توجہ کشمیر سے ہٹ جائے گی۔"

اس کے بعد کانفرنس میں رن کچھ پر فوج کشی اور اس کے ممکنہ نتائج کے بعد کے منصوبے پر بحث مباحثہ ہونے لگا۔

☆

آزادی (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) سے پہلے رن کچھ کے علاقے کا شمالی حصہ سندھ اور بیٹ کے درمیان متنازعہ علاقہ آرا تھا۔ یہ علاقہ ڈیڑھ سو میل لمبا اور کہیں کہیں سو میل چوڑا ہے۔ اس کا بالائی حصہ جو ۴۰ عرض بلد کے اوپر ہے بہرحال سندھ کا ہے۔ آزادی کے بعد یہ علاقہ صوبہ سندھ میں شامل کیا گیا لیکن ۱۹۵۶ء میں بھارت نے، اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت اس علاقے کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ اس دعوے میں بھارت کی یہ سندھانہ ذہنیت بھی کام کر رہی تھی کہ اس علاقے میں تیل کے ذخائر کے وجود ہیں۔

۱۹۵۰ء میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہوئی تھی جو ناکام رہی۔ ۱۹۵۶ء میں بھارت کے سفارتی اور صحافتی رویے میں شدت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء میں دونوں ملکوں کی ایک اور کانفرنس ہوئی جو ناکام رہی پھر ایک اور کانفرنس ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ اس میں آئی سی جے کا سہارا لینے کی بھارت اس پر رضامند ہو گیا کہ یہ علاقہ اس کی ملکیت نہیں بلکہ متنازعہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ طے ہوا کہ آخری فیصلہ تک نہ پاکستان اس علاقے میں چوکیاں قائم کرے نہ بھارت۔

پانچ سال یہ علاقہ متنازعہ کیفیت میں رہا۔

فروری ۱۹۶۵ء کی ایک صبح پاکستان کے اخباروں کے پہلے صفحوں پر یہ خبر شائع ہوئی ــــ بھارت نے رن کچھ میں اپنی فوج داخل کر دی ــــ ہم پاکستان کے چپتے چپتے کا دفاع کریں گے۔"

آل انڈیا ریڈیو سے خبریں نشر ہونے لگیں ــــ پاکستان نے رن کچھ میں ہمارے علاقے پر [illegible] جارحانہ حملہ کیا تھا ــــ بھارت کی بہادر فوج رن کچھ پر قابض ہو چکی ہے۔"

پاکستان کے لوگوں کو پہلی بار پتہ چلا کہ رن کچھ نام کا کوئی علاقہ بھی ہے، پھر یہ پتہ چلا کہ یہ علاقہ ریگستان ہے اور سادن بھادوں میں اس کا کچھ حصہ دلدل بن جاتا ہے لیکن لوگوں نے ایک دھچکا سا محسوس کیا جیسے وہ گہری نیند سوتے سوتے ہڑبڑا کے اٹھے اور کسی نے چلتے چلتے انہیں ٹھوکر ماری ہو۔ لوگوں نے انگڑائی لی لیکن ابھی وہ پوری طرح بیدار ہونے کے موڈ میں نہیں تھے۔

اخباروں میں خبریں آ رہی تھیں۔ بھارت کی فوج نے رن کچھ کی تین چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان میں ایک چوکی بیاربیٹ میں جو سب سے بڑی اور قلعہ نما چوکی تھی انڈین آرمی کی خاصی نفری جمع ہو گئی۔ اس سے آگے کھنجر کوٹ کا قلعہ تھا۔ بھارتی فوج اس پر قبضہ کر لینے کو بڑھ رہی تھی۔

"جوانو! ــــ بیاربیٹ قلعے میں بھارتی کمانڈو اپنے ٹروپس سے کہہ رہا تھا ــــ تم بھارت ماتا کے سپوت ہو۔ سینے پھیلا کر، نگاہیں اونچی کر کے آگے بڑھو۔ یہاں پاکستان کے رینجرز ہیں جو تمہارے سامنے چوٹیوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ان کے پاس رائفلیں اور لائٹ مشین گنیں ہیں۔ یہ فوج کے سپاہی نہیں۔ یہ لڑنا نہیں جانتے۔"

"یہ مت سوچنا کہ تم فوج کے سپاہی نہیں" ــــ پاکستانی رینجرز (انڈس رینجرز) کا کمانڈنگ آفیسر کھنجر کوٹ کے قلعے سے کچھ دور اپنے جوانوں سے کہہ رہا تھا ــــ آج تم سپاہی بن کر دکھاؤ گے۔ آج تمہارا مقابلہ اس دشمن سے ہے جو کھنجر کوٹ کے قلعے کو نہیں تمہارے پورے ملک کو فتح کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔ وہ تمہارے مذہب کا نام و نشان مٹانے کے لیے آیا ہے۔"

"اگر تم نے پاکستانی رینجرز کو بھگا دیا تو سمجھو کہ تم نے پاکستان کو فتح کر لیا" ــــ بھارتی کمانڈو کہہ رہا تھا۔

"جوانو! ــــ پاکستانی کمانڈو اپنے جوانوں سے کہہ رہا تھا ــــ اس لڑائی کو معمولی سی سرحدی جھڑپ نہ سمجھنا۔ اسے محدود علاقے کی بھی لڑائی نہ سمجھنا۔ یہ ہمارے اور ہندوؤں کے مذہبوں کی لڑائی ہے۔ تم سرحدوں کے محافظ ہو۔ قوم تمہارے بھروسے پر گہری نیند سوتی ہے۔ اگر ہمارا دشمن پاکستان میں داخل ہوتا ہے تو تمہاری لاشوں سے گزر کر آگے جائے گا۔"

فوج میں اس قسم کی جذباتی تقریریں نہیں کی جاتیں۔ جب دو فوجیں آمنے سامنے آتی ہیں تو انہیں احکام دیے جاتے ہیں۔ ہدایات دی جاتی ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ دشمن کدھر ہے، کتنی دور ہے اور اس کا مقابلہ کس طرح کرنا ہے۔ لیکن پاکستان اور بھارت کی جنگ کا پس منظر کچھ اور تھا۔ بھارت اسلام کو نیست و نابود کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ ہندو اور مسلمان کی عداوت ساری دنیا میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ پاکستان کو ۱۹۴۷ء کے قتل عام کا حساب بھی چکانا تھا۔ بھارت کی طرف سے کسی نہ کسی ہندو لیڈر کی جانی پاکستان کو دھمکیاں ملتی رہتی تھیں۔ اس لیے جوانوں کو جذباتی اور مذہبی لحاظ سے ابھارنا ضروری تھا۔

بھارتی فوج کے کمانڈروں کو پاکستانی فوج کے مورال اور عسکری اہلیت کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ پہلے دھماکے سے ہی بھاگ اٹھے گی اگر بھاگی نہ تو اس میں بھگدڑ اور افراتفری کی کیفیت ضرور پیدا ہو جائے گی۔

☆

بھارتی فوج کی دو انفنٹری کمپنیاں کھنجر کوٹ کے قلعے پر قابض ہونے کے لیے بڑھی آ رہی تھیں۔ یہ قلعہ دونوں ملکوں کے معاہدے کے مطابق خالی رکھا گیا تھا مگر بھارت کی دو کمپنیاں اس میں داخل ہونے کے لیے آ رہی تھیں۔ پاکستانی کمانڈر نے پاکستان کے وقار پر آنچ اور اپنے رینجرز کی جانیں داؤ پر لگا دیں۔ اس نے بھارتی کمپنیوں کی نفری اور فائر پاور دیکھ لی تھی اور اسے اپنی نفری اور فائر پاور کا بھی علم تھا۔ اس نے اپنے مٹھی بھر رینجرز کو حکم دیا کہ بھارتی کمپنیوں کے پہنچنے سے پہلے کھنجر کوٹ کے قلعے میں داخل ہو جاؤ۔

رینجرز نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور کھنجر کوٹ کے قلعے میں داخل ہو کر مورچے سنبھال لیے۔ بھارتی فوج کی کمپنیوں نے انہیں قلعہ خالی کرنے کو للکارا اور دھمکیاں دیں۔ رینجرز کے کمانڈر نے جواب دیا کہ آگے بڑھو اور قلعہ لے لو۔ چنانچہ کمپنیاں رائفلوں، مشین گنوں اور مارٹر گنوں سے آگ برساتی آئیں لیکن رینجرز کی اندھا دھند اور لائٹ مشین گنوں نے انہیں قلعے کے قریب نہ آنے دیا۔

iqbalmt@olepublishers.com scanned by

اس کے بعد بھارتی فوج جدھر سے بھی آگے بڑھی اسے رینجرز کے سمال آرمز نے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ بھارت سرکار نے جو فوج زن کچھ میں بھیجی تھی اس کے وائرلیس سیٹوں پر واویلا سنا جا رہا تھا۔ اوپر والے چلا رہے تھے کہ پیش قدمی کرنے والے کہتے تھے کہ ان کے آگے صرف رینجرز نہیں، پاکستان آرمی کی کچھ یونٹیں آ گئی ہیں۔ اوپر والے نیچے والوں کو کوستے تھے کہ انہیں ایک کے دو دو نظر آ رہے ہیں۔ پاکستان آرمی کا ابھی دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ ابھی انڈس رینجرز نے ہی بھارت کی فوج کا راستہ روک رکھا تھا۔ پاک فوج ابھی رینجرز کی مدد کو نہیں آئی تھی۔ بھارتی فوج نے فروری اور مارچ ۱۹۶۵ء کے دوران زن کچھ کے پاکستانی علاقے پر کہیں قدم جمانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے اپنی انسیلی جنس نے جو رپورٹیں دی تھیں وہ غلط ثابت ہو رہی تھیں۔

☆

اپریل ۱۹۶۵ء —

سابق ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی کی کوٹھی میں کہرام مچا تھا۔ سلمٰی تو بہت ہی خوش تھی۔ اس کا بیٹا کیپٹن اصغر تین روز کی چھٹی آیا تھا۔ ارشہ کا تبادلہ راولپنڈی سے لاہور ہو چکا تھا۔ سلمٰی نے اسے اور طاہرہ کو اصغر کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ دونوں اصغر سے ملنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ارشد اور عفت کا بیٹا طاہر پرویز بھی تھا۔ اس کی عمر سولہ برس ہو چکی تھی۔ اس وقت تک اسے بتایا گیا تھا کہ اس کی ماں علت تھی جو اسے جنم دے کر مر گئی تھی لیکن وہ طاہرہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں وہ خوبصورت جوان لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی تھی لیکن لڑکپن کی معصومیت ابھی باقی تھی۔

اصغر تو خاص طور پر خوبصورت جوان نکلا۔ اسے اپنی ماں کا حسن اور اپنے باپ عبدالجلیل خان کی سراٹھا کی ملی تھی۔ فوجی ٹریننگ نے اس کے جسم کو نکھرا تیلا اور دل کش بنا دیا تھا۔ اس میں خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بولنے کے انداز میں پختگی اور خود اعتمادی آ گئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کمانڈ کر سکتا ہے۔ اسے ایک عام فوجی افسر کی ٹریننگ کے بعد کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اور اب وہ کمانڈو فورس میں تھا۔

"اصغر!" — ارشہ نے اس سے پوچھا — "زن کچھ میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہمارے جوانوں نے کافی علاقے پر قبضہ کر لیا ہے یا ہمارے اخباروں نے کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر رائی کا پہاڑ بنا رکھا ہے؟"

"اخباروں میں جو خبریں آ رہی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں" — اصغر نے کہا — "پاکستان اور بھارت کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ سندھ والوں نے اس کی ابتدا زن کچھ سے کی ہے۔ فوج میں افسروں کو بتایا گیا ہے کہ کیا ہونے والا ہے:"

"کیا ہونے والا ہے بیٹا!" — سلمٰی نے کہا — "کچھ ہمیں بھی بتاؤ نا!"

"امی جان!" — اصغر نے بڑے پیار سے بچے کی طرح مسکرا کر کہا — "میں آپ کو صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ پہاڑ ٹوٹ پڑیں، آسمان سے آگ برسے... وہ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "آپ کا کلیجہ نہیں ٹھنڈا کریں گے۔ آپ کا حوصلہ قائم رہنا چاہیئے۔"

سلمٰی کا منہ کھل گیا۔ رجب علی کے ساتھ شادی کے سات برس گزر گئے تھے۔ اس نے ایک

بیٹی اور ایک بیٹے کو جنم دیا تھا لیکن اُسے اصغر کے ساتھ دیوانہ وار پیار تھا۔ اس بیٹے کے مُنہ سے کٹ مرنے کے الفاظ سن کر اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"امی جان!" — اصغر نے کہا — "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ جو سبق مجھے دیتی رہی ہیں وہ آپ خود بھول گئی ہیں؟ ابا جان کی کہانیاں مجھے آپ ہی نے سُنائی تھیں۔ مجھے آپ ہی نے بتایا تھا کہ پاکستان کو جیسے نوجوانوں نے بنایا تھا اور اُسے دشمن سے نوجوان ہی بچا سکیں گے۔ میں فوج میں افسری کے لیے تو بھرتی نہیں ہوا تھا..... اب وقت آ گیا ہے کہ مائیں اپنے بیٹوں کو پاکستان کی آن پر قربان کر دیں۔"

سلمٰی بیہوش ہو گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"اصغر بیٹا!" — طاہرہ نے کہا — "سلمٰی آپا تمہاری ماں ہے..... اصغر کی ماں — یہ ماں پھر برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے بیٹے کو گرم ہوا بھی لگے۔ اب جو ماں مسکرا رہی ہے وہ کیپٹن اصغر کی ماں ہے جس نے اپنے بیٹے کو اس لیے فوج میں بھیجا ہے کہ اپنے اُس ملک کی آن پر جان کی بازی لگا دے جو اُس کے ماں باپ نے بنایا اور اس کی خا[illegible] اور اپنی جائیداد چھوڑ کر ہجرت کی تھی۔"

"اور تمہارا باپ پاکستان کے نام پر قربان ہو گیا ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اُس نے کس طرح اپنی جان کی قربانی دی تھی۔"

"ابا جان!" — اصغر نے رجب علی سے کہا — "آپ گڑے مُردے کیوں اکھاڑا کرتے ہیں۔ کیا میں نے آپ کو باپ نہیں سمجھا؟ آپ اُس واقعہ کو بھول کیوں نہیں جاتے؟"

"آہ، میرے عزیز بیٹے!" — ملک رجب علی نے آہ سے کر کہا — "میرا ضمیر ابھی مطمئن نہیں ہوا۔ میرا کفارہ ابھی ادا نہیں ہوا۔ اب شاید وقت آ گیا ہے:"

"اصغر سے پوچھ رہی تھی کہ کیا ہونے والا ہے" — سلمٰی نے کہا — "آپ اپنی بے بیٹھتے ہیں: "کیا آپ کو بتا نہیں سکتا امی جان!" — اصغر نے کہا — "یہ فوجی راز ہیں۔ ہندو حکومت ہمیں للکار رہی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہندو ہمیں کمزور سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے چین کے ساتھ جنگ کو بہانہ بنا کر بے انداز جنگی طاقت بنا لی ہے لیکن ہمارے حکمران سیاست بازیوں میں لگے رہے اور دفاعی طاقت نہ بنائی۔ اس کمی کو ہمیں جذبے اور ٹیکنیکس کی خوبیوں سے پُورا کرنا ہو گا۔"

طاہر پرویز اصغر کو دیکھتا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔

"اصغر بھائی جان!" — طاہر پرویز نے کہا — "مجھے بھی فوج میں بھرتی کرا دیں نا!"

"لیکن تمہاری عمر ابھی کم ہے" — اصغر نے کہا — "ایک سال انتظار کرو..... کیوں خالہ طاہرہ! اسے آپ فوج میں ہی بھیجیں گے نا؟"

"پالا کس لیے ہے؟" — طاہرہ نے کہا — "پاکستان ان سیاسی گدھوں کا تو نہیں۔ پاکستان ہمارا ہے، ہم نے بنایا ہے۔"

☆

ارشہ، طاہرہ اور طاہر پرویز جا چکے تھے۔ سلمٰی باورچی خانے میں تھی۔ اصغر ملک رجب علی کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔

iqbalmt@onedrive.com scanned by

"ابا جان!" — اصغر نے کہا — "میں آپ کو بھی نہیں بتا سکتا کہ کیا ہونے والا ہے، سوائے اس کے کہ دشمن ہمیں کمزور سمجھ رہا ہے اور ہم دشمن کو بہت جلد ہی سمجھائیں گے کہ اس کا فیصلہ کہ کون کمزور اور کون طاقتور ہے، توپیں، ٹینک اور طیارے اور فوجوں کی افراط نہیں کر سکتی۔ یہ فیصلہ جرأت اور جذبہ کیا کرتا ہے۔ ہمارا دشمن ریکیل کا نشے سے لیس ہو چکا ہے اور اس نے رن کچھ کے تنازعہ کو بہانہ بنایا ہے میں جس فورس میں ہوں اس کا میدان کوئی اور ہے۔ میں کمانڈو ہوں۔ کمانڈو دشمن کے ملک میں جا کر، یا دشمن کے عقب میں لڑا کرتا ہے۔ کمانڈو واپس آنے کے لیے نہیں جایا کرتا۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ امی جان کے دل کو مضبوط رکھنا آپ کا کام ہے۔"

"وہ تمہیں جانے سے روک نہیں سکتی" — رجب علی نے کہا — "لیکن وہ ماں ہے۔ بہرحال میں اسے سنبھالے رکھوں گا۔"

"ابھی مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کہاں بھیجا جائے گا" — اصغر نے کہا — "جہاں کہیں بھی بھیجا گیا میں اس کی اطلاع آپ کو نہیں دوں گا۔ مجھے تین روز کی چھٹی اس لیے دی گئی ہے کہ آپ سے اور امی جان سے مل لوں۔ شاید ہماری یہ ملاقات آخری ہو۔ میں ایسی باتیں امی جان کے ساتھ نہیں کر سکا۔ آپ بھی یہ نہ کریں۔"

"نہیں کروں گا" — رجب علی نے کہا — "میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنے باپ کی روح کو شرمسار نہ کرنا۔ کمانڈو کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن یہ نہ بھولنا کہ تمہیں خدا دیکھ رہا ہوگا۔ دل نہ ہارنا۔ اللہ تمہیں زندہ واپس لائے۔ کامیاب واپس لائے۔"

تین روز چھٹی گزار کر اصغر چلا گیا۔

☆

"پاکستانیوں میں بیداری شروع ہو چکی ہے" — رن کچھ میں تیسرے حملے بھی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکنے کے بعد بھارتی ہائی کمانڈ کی ایک اور کانفرنس میں بھارتی انٹیلی جنس کا سربراہ چیل کانفرنس کو بتا رہا تھا — "پاکستان سے جو رپورٹیں اب آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اخباروں میں یہ خبر چھپنے کی دیر تھی کہ بھارت نے رن کچھ میں پاکستانی علاقے میں فوج داخل کر دی ہے، پاکستان کا بچہ بچہ ہتھیند سے جاگ اٹھا ہے اور ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ رن کچھ میں کیا ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ پاکستان کے حکمران بھارت کے ساتھ پُرامن تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہو سکتے ہیں، پاکستانی قوم میں بھارت کی دوستی کم نہیں ہوئی....

"یہی کیفیت پاکستان آرمی میں پائی جاتی ہے۔ اس کے پاس ہتھیاروں اور نفری کی کمی ہے لیکن مورال اتنا مضبوط ہے کہ رن کچھ میں ہماری فوج کے داخلے کے ساتھ ہی بارکوں میں بے چینی شروع ہو گئی ہے اور یونٹوں کی نقل و حرکت بھی شروع ہو گئی ہے۔"

"وہ تو ہونی ہی تھی" — بری فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا — "سرحدوں پر ذرا سی گڑبڑ ہو تو قریبی چھاؤنی میں نقل و حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ آپ خود سینئر جنرل ہیں۔ آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ پاکستان پر حملہ محض پولیس ایکشن جیسا ہوگا۔ میں تین گھنٹوں کے اندر اندر تمام مزاحمت کو کچل کر لاہور میں داخل ہو جاؤں گا۔ رکاوٹ صرف بی۔ آر۔ بی نہر کی ہے۔ وہ میرے ٹروپس ایک یا

سمجھ کر پھلانگ جائیں گے۔"

"محترم جنرل!" — انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر نے کمانڈر انچیف سے کہا — "میں مسلح افواج کی آنکھیں اور کان ہوں۔ آنکھیں اور کان جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ جھوٹ انسان بولا کرتے ہے۔ اپنے آپ کو فریب اور خوش فہمیوں میں انسان مبتلا کیا کرتا ہے۔ سچ آنکھیں جو دیکھتی ہیں اور کان جو سنتے ہیں اس سے آپ فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ پاکستانیوں کو ہم نے امن اور غربت میں دیکھا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ اس قوم کا جذبہ مر گیا ہے۔ پاکستانی اب بھی غربت میں ہیں لیکن قومی جذبے اور حُبّ الوطنی کے جذبے سے وہ مالا مال ہیں۔ پاکستان کے معاملے میں وہ اتنے حساس ہیں کہ اپنے بچے قربان کرنے پر آ گئے ہیں۔ رن کچھ میں صرف رینجرز نے ہماری بٹالینوں کو روکا ہوا ہے۔ ہم نے فروری کے پہلے ہفتے میں وہاں اپریشن شروع کیا تھا۔ اب اپریل کا پہلا ہفتہ ہے۔ ہمارے ٹروپس نے فروری میں جن خالی چوکیوں پر قبضہ کیا تھا ان سے آگے وہ ایک قدم نہیں بڑھ سکے۔"

"اور پاکستان ایک چال اور چل گیا ہے" — ڈیفنس سیکرٹری نے کہا — "پاکستان اور آزاد کشمیر فوج کی کور کی پوری کمانڈو بٹالین مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو چکی ہے اور اس نے وہاں اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا ہے۔"

"میرے پاس رپورٹیں آ چکی ہیں" — بری فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا — "اور میں نے اس کے سدباب احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ ہم انہیں جلد ہی صاف کر دیں گے۔"

"کیا خیال رکھیں کہ انٹیلی جنس کی رپورٹیں کیا کہتی ہیں" — انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر نے کہا — "آزاد کشمیر اور کشمیر کے اس حصے کے لوگ جو ہمارے پاس ہے کمانڈو پارٹیوں کو مدد اور پناہ دے رہے ہیں۔ آپ کس کس کو صاف کریں گے؟ ابھی تو ایک بٹالین ہے جو ہمارے (مقبوضہ کشمیر) علاقے میں داخل ہو کر کسی دور دراز علاقے میں چھپ گئی ہے۔ ہمیں ان کمانڈو پارٹیوں کا بھی کچھ بندوبست کرنا ہے جو آزاد کشمیر سے آ رہی ہیں اور سن پورا کر کے واپس چلی جاتی ہیں۔ میری رپورٹوں کے مطابق پاکستان کی اس کمانڈو فورس کی نفری چھ ہزار ہے اور کشمیر میں کمانڈو اور گوریلا اپریشن کو انہوں نے 'اپریشن جبرالٹر' کا نام دیا ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ جبرالٹر کو مسلمان جبل الطارق کہتے ہیں۔ ان کے جنرل طارق نے جب سپین پر چڑھائی کی تھی تو اسی مقام پر اس نے اُتر کر کشتیاں جلا ڈالی تھیں کہ واپسی کا خیال ہی ذہن سے نکل جائے۔ اب پاکستان کے مسلمانوں نے طارق کی روایت کو زندہ کرنے کے لیے بڑا دلیرانہ اپریشن شروع کیا ہے۔"

"یہ تو آپ کا کام ہے کہ کشمیر سے پاکستانی کمانڈو فورس کو نکالنا ہے" — بھارتی وزیراعظم نے کہا — "غور اس پر کریں کہ جس پاکستان کو آپ کمزور سمجھتے تھے اس نے کتنا دلیرانہ اقدام کیا ہے، اور جس قوم کو ہم جذبے سے خالی سمجھتے تھے وہ بیدار ہو گئی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ پاکستان کے لوگ اپنی فوج کی مدد کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں آپ کو سوچنا ہے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ میں ذاتی طور پر اسے اپنی شکست سمجھوں گا کہ رن کچھ سے اپنے ٹروپس کو واپس بلا لیا جائے۔"

"ہم رن کچھ میں مزید فوج بھیجیں گے" — بری فوج کے کمانڈر انچیف نے کہا — "آپ اُن محاذوں کو بھول جائیں جو آپ نے پاکستان کے ساتھ بھی کیے تھے۔ ہم رن کچھ کے متنازعہ علاقے میں داخل ہوئے ہیں، اور پاکستان نے کشمیر کو متنازعہ علاقہ سمجھ کر وہاں اپنی کمانڈو فورس داخل کر دی ہے۔ یہ جنگ

iqbalmt@gmail.com Scanned by

ہے، اس کے لیے ہم تیار ہیں۔ رن کچھ سے ٹروپس واپس نہیں آئیں گے۔ وہاں اور ٹروپس جائیں گے۔ پاکستان اپنے انجام کے راستے پر چل پڑا ہے۔ ہم اسے بہت جلدی انجام تک پہنچا دیں گے۔ آپ نقشے سے پاکستان کو مٹا دیں۔"

★

رن کچھ میں بھارت نے اچانک صورتِ حال سنگین کر دی۔ ۱۹۶۲ء میں بھارت نے چین کے دشمن ممالک سے اسلحہ بارود اکٹھا کرنے کے لیے نیفا کے محاذ پر چین سے جو لڑائی مول لی تھی اس میں اس نے اپنا نمبر ۶۴ پیرا بریگیڈ لڑایا تھا۔ اسے انڈین آرمی کا بہترین لڑاکا بریگیڈ تسلیم کیا جاتا تھا۔ بھارت نے اپریل ۱۹۶۵ء میں اس بریگیڈ کو طیاروں کے ذریعے رن کچھ میں ۲۴ عرض بلد کے قریب کھاوڑا کے مقام پر اتار دیا۔ بھارت کا دوسرا بریگیڈ انفنٹری تھا۔ اسے احمد آباد سے تھوڑے سے ٹرکس پر رن کچھ لا کر ۲۴ عرض بلد سے بھی آگے کریم شاہی اور وجوکوٹ کے علاقے میں ڈپلائے کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ مشرقی علاقے میں بھارت نے اپنا نمبر ۶۷ بریگیڈ پھیلا دیا۔ ۲۴ عرض بلد کے اوپر پاکستان تھا۔ بھارت نے پاکستانی علاقے میں یہ دو بریگیڈ ڈپلائے کیے تھے۔ اس سے بھی بڑی غلطی کو بھارت پاکستان کو بہت ہی کمزور ملک سمجھتا تھا۔

ان تینوں بریگیڈوں کی مجموعی نفری بیس ہزار تھی۔ ان کی پشت پناہی کے لیے توپ خانہ اور بڑی توپوں کی رجمنٹیں اور ٹینک بھی تھے۔ یہ مکمل جنگی اہتمام تھا اور اس سے سندھ و سرحد کے عزائم کا پتہ چلتا تھا۔ یہ اہتمام رن کچھ کی چند ایک ممتاز چوکیوں کی خاطر نہیں تھا۔ سندھ دھیڑ یا پاکستان کو سبق سکھا کر اسٹارہ برسوں کی تیاریوں سے چھڑانے اور اسے مفلوج کرنے آیا تھا۔

پاکستان کے حکمران نے جب دیکھا کہ معاملہ سنگین نظر آتا ہے تو انہوں نے اپنی ہوائی کمان کو فوری کارروائی کا حکم دیا۔ فوری طور پر جو فوج بھیجی گئی اس کا دشمن سے تناسب دیکھا ہی جا چکا ہے۔ ایک جوگوار کے مقابلے میں ایک تہائی توانائی دیا گیا ہو۔ بھارتیوں کے پاس نفری کی افراط کے علاوہ جدید اسلحہ اور ٹرانسپورٹ کی فراوانی تھی۔

بھارت نے ساری دنیا کو گواہ بنانے کے لیے کہ اس نے اپنے علاقے میں فوج رکھی ہے اور پاکستان نے اس پر حملہ کر دیا ہے، خوب واویلا مچایا جسے سن کر دوسرے ممالک کے بہت سے اخباری نامہ نگار اور جنگی مبصرین رن کچھ میں اکٹھے ہو گئے۔ ان سب نے جب دونوں فوجوں کا تناسب دیکھا تو انہوں نے فیصلہ دے دیا کہ پاک فوج ایک دن بھی میدان میں نہیں ٹھہر سکے گی۔

پاکستانی قوم نے اپنی فوج کو ابھی میدانِ جنگ میں نہیں دیکھا تھا۔ اپنی فوج کی چوکس دیکھی تھی اور اس کے متعلق کچھ اور ہی رائے قائم کی تھی۔ قوم دم بخود تھی۔ وہ ہندو سے شکست کھانے کے تصور کو بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔ یہ پہلی کھلی جنگ تھی۔ دشمن نہ صرف طاقتور اور تعداد میں چھ گنا تھا بلکہ اس نے مورچے بھی کھود لیے تھے اور نہایت تیزی سے بکتر بند بھی بنا لیے تھے۔

★

۱۰ اپریل ۱۹۶۵ء —— پاکستان کی تاریخ کا ایک یادگار دن!

سندھ دل کی فوج نے وجوکوٹ کے مقام پر پاک فوج پر فائر کھول دیا۔ یہ دونوں فوجوں کا پہلا تصادم تھا۔ یہ قیامت کا فائر تھا۔ درمیانہ اور بڑی توپوں کی گولہ باری کے دھماکوں سے زمین اور آسمان پھٹے جا رہے تھے۔ وہاں کسی انسان کا ٹھہرنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ سندھ دل کو نفری اور اسلحہ کی افراط پر بھروسا اور اس کا غرور تھا۔ پاکستانیوں کے پاس اللہ اور رسولؐ کا نام، پاکستان زندہ باد اور یا علی کے نعرے تھے۔

غیر ملکی نامہ نگار یہ تماشہ دیکھ رہے تھے اور وہ اب یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ پاکستانی جیالے نفسا نفسی کے عالم میں بھاگیں گے یا ان کی لاشوں کے پرخچے اڑ رہے ہوں گے۔ یہ معجزہ سب نے دیکھا اور بعد میں اپنے اپنے اخباروں کے ذریعے ساری دنیا کو دکھایا کہ پاک فوج کے جوان اپنے افسروں کی قیادت میں اور ٹینکوں کے دوش بدوش گولہ باری کے گرد و غبار میں گولیوں کے مینہ میں پیچھے کو بھاگنے کی بجائے آگے کو ہل گئے۔

انہوں نے تکبیر کے نعرے لگا کر بھارتی مورچوں پر ہلہ (چارج) بول دیا۔ بھارتی مورچوں سے نکل آنے پر مجبور ہو گئے۔ جب اسلام اور ہندو مت کھلے میدان میں پنجہ آزما ہوتے تو ہندو بے انداز اسلحہ اور ایک ٹینک اور بہت سے مرے ہوئے اور زخمی ساتھیوں کو چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔

۹ سے ۲۰ اپریل تک انڈین آرمی کے یہ چنے ہوئے بریگیڈ ٹیکٹکس اور پوزیشنیں بدل بدل کر حملہ آور ہوتے رہے۔ انہیں تازہ دم کمک بھی پہنچائی گئی لیکن پاک فوج، ٹوپچیز نے انہیں کہیں بھی پاؤں جمانے نہ دیے۔ بھارتی کمانڈر نے کہا تھا کہ پاکستانی وسیع پیمانے کی کمانڈو طرز کی لڑائی لڑتے ہیں۔ ان قلیل تعداد پلاٹونوں کے حملے شب خون کی طرز کے تھے۔ یہ جنگ وہی سپاہی لڑ سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے ملک، اپنے مذہب اور اپنی قوم کی محبت جنون کی صورت اختیار کر گئی ہو۔

[illegible] نے پاکستان کی تاریخ کے پہلے ہیرو پیدا کر دیے۔

[illegible] سب سے زیادہ خونریز معرکہ بیاربھیٹ کے مقام پر لڑا گیا جو پاکستانی مجاہدوں کے لیے نہیں بلکہ بھارتی سورماؤں کے لیے خونریز تھا۔ بیاربھیٹ تلعہ نما ٹوچی تھی جس میں بھارتیوں کی بہت سی نفری تھی اور یہ ان کا ایک سفٹ ہولڈ مورچہ تھا۔ پاک فوج نے اس پوزیشن پر حملہ کیا۔ توقع نہیں تھی کہ بھارتی یہ مورچہ چھوڑ دیں گے لیکن تین دنوں کی ناکامیوں اور جانی نقصان نے ان کے حوصلے توڑ دیے تھے۔ انہوں نے مقابلہ تو کیا لیکن وہ کامیاب پسپائی کے لیے لڑ رہے تھے۔ وہ قلعے سے نکلنے لگے اور پاکستانیوں کی گولیوں اور شیلوں کا نشانہ بننے لگے۔

آخر بھارت کے دو بریگیڈ کھلے آگے بڑھنے لگے۔ پاکستانی کمانڈ نے یہ چال چلی کہ اپنے ٹروپس کو ان دونوں بریگیڈوں کے درمیان لے جائے اور ان کا آپس میں رابطہ توڑنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ بھارتی کمانڈ اس کی یہ چال بھانپ گئے۔ تب تیر چلا کر بھارتی ایک ڈویژن کو بھی لائے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک پاک فوج کی نفری ایک بریگیڈ ہو گئی تھی۔ اس بریگیڈ نے دیکھا کہ انڈین آرمی کا ڈویژن آگے بڑھ رہا ہے تو کمانڈر نے ایسی چال چلی کہ اس ڈویژن کو گھیرے میں لے لیا۔

قریب تھا کہ بھارت کا پورا ڈویژن پاکستانیوں کے ہاتھوں صاف ہو جاتا، بھارتی حکمرانوں نے اپنی عصر میں چال چلی۔ انہوں نے پاکستان کے حکمرانوں کو پیغام بھیجا ہے ہم فائر بندی کے لیے تیار ہیں۔ رن کچھ

iqbalmt@onelrn.com Scanned by

تمہارا مرحلہ ہے۔ ہم پھر ملیں گے۔ پھر بات کریں گے۔"

پاکستانی حکمرانوں نے کشمیر مذاکرات کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے دشمن کے ڈویژن کو چھوڑ دیا۔

میدانِ جنگ میں ہندوؤں کے فوجی ٹرک، بیشمار اسلحہ، ایمونیشن کے ٹرکس، لاشیں اور جنگی ساز و سامان بکھرا ہوا تھا۔ بھارتی اپنی فوج نکال لے گئے۔

بھارت کے وزیرِ اعظم نے فائر بندی کی بھیک مانگ کر فائر بندی کرالی اور کشمیر کرن کے ڈاک بنگلے میں اخباری نمائندوں سے کہا — "اب ہم پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان میں گھسیٹ کر لڑائیں گے۔"

بھارت کا مشہور بکتر بند ڈویژن جو ہمیشہ جھانسی میں رہتا تھا، جالندھر میں آگیا۔ انڈین آرمی کے دوسرے ڈویژن بھی سرحد کے قریب آنے لگے۔

پاکستان میں کہیں ایک لیفٹیننٹ کرنل نے سلمیٰ کے بیٹے کیپٹن اصغر سے ہاتھ ملایا پھر اُسے گلے لگایا۔ رات اندھیری تھی چند ایک جوان ذرا پرے کھڑے تھے۔

"سب کچھ تمہیں بتا دیا گیا ہے" — لیفٹیننٹ کرنل نے کیپٹن اصغر سے کہا — "تم جا رہے ہو۔ کیوں جا رہے ہو..... اور یہ بھی کہ تمہاری واپسی کا امکان کم ہے لیکن میرے عزیز افسر! ہمارے لیے نوجوانوں کے لہو اور جان کے نذرانوں سے زندہ اور باوقار رہا کرتی ہیں..... جاؤ، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

"خدا حافظ!"

"فی امان اللہ!"

رات تاریک تھی۔ پہاڑیوں نے اور پہاڑیوں پر دامن سے چوٹی تک، کھڑے چیل اور دیودار کے لمبے لمبے درختوں نے رات کو سیاہ کالا کر رکھا تھا۔

رات سرد تھی۔ برف پوش چوٹیوں اور وادیوں میں سے گزر کر آنے والی ہوا کے تھپیڑے سخت تھے۔ سادن کی گھٹائیں رات سے زیادہ کالی تھیں۔ انہیں برسنا تھا۔ کبھی بھی لمحے برسنا تھا۔

آنی تاریک اور آنی یخ رات کو مسافر سفر پر نہیں نکلا کرتے۔ تاریکی راستہ نہیں دکھاتی اور سرد ہوائیں چلنے نہیں دیتیں لیکن کچھ آدمی کشمیر کی ان وادیوں میں سفر پر نکل گئے تھے اور وہ ایک قطار میں چلے جا رہے تھے۔ جہاں وادی ٹوٹتی تھی، سب سے آگے والا آدمی رک جاتا اور اپنے پیچھے آنے والے ہر آدمی کو دیکھتا۔ سب سے آخر والا آدمی جب اُس کے سامنے سے گزر جاتا تو وہ بے پاؤں تیز تیز چلتا سب سے آگے چلا جاتا۔

مسافر گپ شپ لگاتے جایا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اس طرح سفر جلدی کٹ جاتا ہے اور تھکن نہیں ہوتی مگر یہ کچھ آدمی آپس میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ کبھی کوئی کسی سے کوئی بہت ضروری بات کہتا ہوتی تو وہ اُس کے کان میں سرگوشی میں کہتا تھا۔ کبھی وہ اتنی تیز چلنے لگتے جیسے ان کی منزل چند قدم دور رہ گئی ہو اور کبھی وہ اتنی آہستہ چلنے لگتے جیسے انہیں کوئی جلدی نہ ہو۔

وہ سب سے آگے تھا وہ رک گیا۔ سب رک گئے۔

"نائب صوبیدار صاحب!" — اُس نے کہا — "دس منٹ آرام کر لیں؟" — اُس نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا — "گومٹیری کتنی دور ہے؟"

"پندرہ منٹ اور....." — اُسے جواب ملا — "آرام کر لیں۔"

وہ جو سب سے آگے تھا وہ میجر داں تھا — وہ کیپٹن اصغر تھا — انسپکٹر عبدالجلیل خان مرحوم اور سلمیٰ کا بیٹا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔ اُس نے ملیشیا کی شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری چپل تھی جس کے تلوے ٹائر کے تھے۔ چلنے سے آواز نہیں دیتے تھے۔ اُس کے کندھوں پر کپتانی کے تین ستارے بھی نہیں تھے۔ وہ کیپٹن لگتا نہیں تھا۔

اُس کے ساتھ اُس کی کمانڈو ٹیم کا نائب صوبیدار محمد اسلم خان اور سترہ جوان تھے۔ ان میں ایک حوالدار دو نائک، دو لانس نائک اور باقی سب سپاہی تھے اور دو سویلین تھے۔ یہ دونوں آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ یہ سب ایک ہی لباس میں ملبوس تھے۔ اُنہوں نے ایک ہی جیسے ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔ ان کی منزل ایک، عزم ایک اور اُن کا دشمن ایک ہی تھا۔

وہ مقبوضہ کشمیر کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے اور ذرا سستانے بیٹھ گئے تھے۔ وہ موت کے مسافر تھے۔ انہیں مارنا تھا، مرنا تھا، تباہ کرنا تھا۔ انہیں واپس آنے کی کوشش کرنی تھی لیکن واپسی ضروری نہیں تھی۔

iqbalmt@oneurdu.com scanned by

کیپٹن اصغر اپنی بیس آدمیوں کی کمانڈو پارٹی سے ذرا الگ ہو کر چلا گیا۔ اُس نے اپنی پارٹی کو ٹھہرانے کے لیے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں ایک چٹان نے ہوا کو روک رکھا تھا۔

آسمان چمک کر بجھ گیا اور دُور ہلکی ہلکی گرج سنائی دی۔ کیپٹن اصغر نے تاریک آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ آج رات مینہ نہ برسے۔ مگر اُسے اُمید نہیں تھی کہ اُس کی یہ دعا قبول ہوگی۔ پھر بھی اُس کے دل میں خوف نہیں تھا۔ ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ موت کے خطرے کو قبول کر لینے والے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والے بادشکش سے نہیں ڈرا کرتے۔

"اصغر!" — اُس کے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو — "یہ بھی بھلا مرنے کی عمر ہے؟ یہ تو جینے کھیلنے کی عمر تھی۔"

اُس نے سر کو یوں ہلکا سا جھٹکا دیا جیسے کسی نے اُس کے ساتھ بے مزہ سا مذاق کیا ہو۔ جیسے اُس سرگوشی کو وہ سننا نہ چاہتا ہو۔

"اصغر بیٹا!" — چھٹی کے آخری روز وقتِ رخصت ماں نے اُس سے پُوچھا تھا — "یہ کب آؤ گے، راولپنڈی دُور تو نہیں۔ ہفتے کی شام آ سکتے ہو۔ اتوار کی شام چلے جانا۔"

مقبوضہ کشمیر کی سرد ہواؤں میں اُسے ماں کی یہ آواز سنائی دی تو اُس نے اپنے جسم پر ہلکا سا لرزہ محسوس کیا جیسے زلزلے کے ہلکے سے جھٹکے سے زمین ہلی ہو، مگر ایک اور آواز نے اُسے سنبھال لیا:

"میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنے باپ کی روح کو شرمسار نہ کرنا" — کسی نے اُسے کہا تھا۔

"کمانڈو کو ایکشن میں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن یہ نہ بھولنا کہ تمہیں خدا دیکھ رہا ہوگا۔ بزدل نہ بن جانا۔ اللہ تمہیں زندہ واپس لائے۔ کامیاب واپس لائے۔"

"آمین" — مقبوضہ کشمیر کی ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھے اصغر کے ہونٹوں سے آمین ایک سرگوشی کی طرح نکلا۔

کشمیر کے سادان کی ہوا جھکڑ بنتی جا رہی تھی۔ کبھی تو اس کی آواز بڑی لمبی "شاں شاں" بن جاتی اور کبھی یہ آواز سیٹیوں میں بدل جاتی۔ اس کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دُور کی گرج سنائی دیتی اور آسمان آنچھ جھپکنے کی طرح چمک کر تاریک ہو جاتا۔ اصغر کو بتایا گیا تھا کہ کشمیر کی بادشکش برسلا دھار ہوتی ہے۔ اس کے سامنے ٹھہرنا آسان نہیں ہوتا لیکن بارش سے اپنے ارادے کو متاثر نہ ہونے دینا۔

اصغر اُس موسلا دھار بارش کے آثار دیکھ رہا تھا لیکن اس میں سے اُس نے ایک امید افزا اور کارآمد پہلو نکال لیا۔ یہ تھی گھٹاؤں کی چمک۔ یہ چمک اُسے راستہ دکھا سکتی تھی۔ تاریکیٹ دکھا سکتی تھی۔ روشنی راؤنڈ کا کام دے سکتی تھی۔

○

تیز و تند ہواؤں کی شاں شاں اور سیٹیوں میں اُسے کبھی اپنی ماں کی، کبھی اپنے سوتیلے باپ ملک رجب علی کی اور کبھی اپنے کمانڈنگ آفیسر کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ماں کی آواز سب سے پیاری تھی مگر وہ نہیں سننا چاہتا تھا کیونکہ یہ آواز اُسے پیچھے کھینچتی تھی۔ ملک رجب علی کی آواز اُسے اچھی لگتی تھی کیونکہ یہ آواز اُس کی پیٹھ ٹھونکتی تھی، پھر بھی اُس نے کوشش کی کہ یہ آواز بھی نہ سنے۔ اس وقت جب وہ ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں

کی چوٹیوں پر دشمن مورچہ بند تھا اور وادیوں میں دشمن کی گشتی پارٹیوں سے تصادم کا ڈر تھا اور جہاں ٹارگیٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی زخمی یا شہید ہونے کا امکان روشن تھا اُسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی آواز اچھی لگ رہی تھی:

"وکشن ایک اعزاز ہے جو قوم اپنے نوجوان افسروں کو دیا کرتی ہے" — اُس کے کمانڈنگ آفیسر نے اصغر جیسے آٹھ نوجوان افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ان میں پانچ نئے نئے کیپٹن بنے تھے اور تین لیفٹیننٹ تھے۔ "تمہیں ثابت کرنا ہے کہ تم اس اعزاز کے قابل ہو مگر یہ ثبوت باتوں سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تمہیں اپنے خون کی قربانی دینی ہوگی۔ اپنے آپ کو ناگہاں سے بازوؤں یا آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے محروم کرنا ہوگا۔ جان قربان کرنی ہوگی۔"

اصغر نے مقبوضہ کشمیر کی ٹھنڈی زمین پر ٹانگیں لمبی کر دیں اور اُس نے انگڑائی لی۔ اس انگڑائی میں تھکن نہیں تھی، نئی زندگی تھی۔ اُس نے نئی توانائی کی ایک لہر اپنے جسم میں محسوس کی۔ اُسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی آواز اور زیادہ صاف سنائی دینے لگی:

"تم اخبار ہر روز دیکھتے ہو" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا تھا — "اپنے دشمن کے عزائم سے تم واقف ہو گے۔ اخبار ادھوری اور جھوٹی سچائی سنایا کرتے ہیں۔ میں تمہیں اندرونی خبریں سناتا ہوں۔ رن کچھ میں دشمن کو بہت بڑی شکست ہوئی ہے۔ ہمارے صدر کو فائر بندی قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہمارا صدر جنرل ہے۔ اُسے جنگ کی نزاکت حال کا علم تھا۔ بہرصورت حال ہمارے حق میں تھی لیکن ایک شخص کی حماقت میں یہی خرابی ہوتی ہے کہ وہ ہیرو بن جاتا ہے۔ ڈکٹیٹرشپ کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے....

"تم نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ بھارت کے وزیراعظم نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہمیں اپنی مرضی اور اپنی پسند کے میدان میں لڑائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مرضی کا محاذ کھول لیا ہے۔ یہ ہے کشمیر کا جنوبی سیکٹر جو بڑا ہی دشوار گذار اور لڑنے کے لیے مشکل علاقہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انڈین آرمی نے اس سیکٹر میں ہماری بعض چوکیوں پر بے خبری میں حملے کر کے ان پوسٹوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ بلند پوسٹیں فوج کے لیے بڑی کارآمد ہیں۔ چونکہ یہ چوٹیوں پر ہیں اس لیے یہ جس کے قبضے میں آ جائیں وہ اس علاقے کا حاکم ہوتا ہے مگر ہم انڈین آرمی کو وہاں کا حاکم نہیں بننے دیں گے....

"دشمن نے اتنے مشکل محاذ کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ اُس کے پاس موٹین (مہاڑی) ڈویژن ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ تم سب فوجی افسر ہو۔ تم جانتے ہو کہ موٹین ڈویژن کیا ہوتا ہے اور اسے کہاں استعمال کیا جاتا ہے۔ تم سٹرلفن نہیں ہو۔ فوجی ہر قسم کی ٹریننگ میں سب کچھ بتایا اور سکھایا گیا ہے۔ میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ تم یہ نہیں سوچو گے کہ موٹین ڈویژن کا مقابلہ موٹین ڈویژن ہی کر سکتا ہے۔ میرے نوجوان دوستو! صرف ایک انفنٹری بریگیڈ، صرف ایک انفنٹری بٹالین...." کمانڈنگ آفیسر چپ ہو گیا۔ اُس نے آٹھوں افسروں کو باری باری دیکھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر بولا — "صرف ایک سیکشن پورے موٹین ڈویژن کا مُنہ پھیر سکتی ہے۔ یہ پہاڑی علاقے کی لڑائی ہے۔ تم جانتے ہو پہاڑی علاقے کی لڑائی کیسے لڑی جاتی ہے؟"

کمانڈنگ آفیسر نے اپنے سامنے بیٹھے پانچ نوجوان افسروں میں سے سب سے چھوٹی عمر کے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا اور بیٹھے ہوئے استاد اور تجربہ کار باپ کی طرح مسکرا کر بولا — "بتاؤ تو، تم پہاڑی لڑائی

iqbalmt@onedu.com scanned by

کس طرح لڑا گئے۔ تمھارے علاقے میں صرف ایک بٹالین چوٹیوں پر مورچہ بند ہے۔ حملہ کرنے والا پورا ڈویژن ہے۔"

"سر!" — لیفٹیننٹ امجد جسے سب ٹُو کہتے تھے، بولا — "میں کمانڈو ہوں۔ میں کمانڈو اپریشن تجویز کروں گا۔"

"کیوں؟" — کمانڈنگ آفیسر نے پوچھا — "تمھارے ٹارگیٹ کیا ہوں گے؟"

"ندی نالوں کے پُل" — ٹُو نے جواب دیا — "پوزیشن فیچرز ایک ہی بار یعنی اکٹھا ہماری بٹالین اور اُوپر کی پوسٹوں پر حملہ نہیں کرے گا۔ وہ بے تحاشہ گولہ باری کرے گا اور ایک ایک یا دو دو پلاٹونوں سے یا ایک ایک کمپنی سے ہماری پوسٹوں پر حملہ کرے گا۔ ان حملہ آور ٹروپس کو دو لنک اپ پوزیشن اور دیگر مدد دے گا۔ میں کمانڈو اپریشن سے اُس کی یہ سپلائی لائن کاٹ دوں گا۔ گوریلا اپریشن اور سنائپنگ بھی کی جائے گی۔"

"مطلب یہ کہ پہاڑی علاقے میں تم دشمن کا بے دھڑک چلتا پھرتا بند کر دو گے۔" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا — "اور دشمن کے سر پر ہر وقت خطرہ بن کر منڈلاتے رہو گے۔"

"یس سر!"

"ہاں ٹو! تم اب کمانڈو اپریشن کے لیے جاؤ گے۔" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا — "دشمن کے لیے ایک مصیبت ہو کر۔ ہمیں کشمیر کے انتہائی دشوار علاقے میں للکارا ہے۔ ہم کمانڈو اپریشن سے اس پر ثابت کریں گے کہ اُس کے مورٹین ڈویژن اور اُس کے توپ خانے کی افراط اور اُس کے ایوی ایشن کے انبار ایک خوش فہمی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔"

○

"اصغر بیٹا!" — کشمیر کی ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے اصغر کو اپنے کمانڈنگ آفیسر کے لہجے کے ساتھ اپنی ماں کی آواز سنائی دی — "ران کچھ کی جنگ پھیل تو نہیں جائے گی۔ تمھاری یونٹ ران کچھ میں تو نہیں جا رہی؟"

اصغر تین روز کی چھٹی آیا ہوا تھا۔ وہ ہنس پڑا اور اپنی ماں کو اُس نے اپنے بازوؤں میں بھر کے سینے سے لگایا اور اُسے زور سے بھینچا۔ سلمٰی نے پیلی پارا اپنے اصغر بیٹے کے جسم کی سختی اور اس کے مضبوط کی طاقت محسوس کی۔ اُسے خیال آیا کہ اُس کا بیٹا اب ویسا نہیں رہا کہ لپک کر اسے اٹھائے گی اور گود میں لٹائے گی یا چھپا لے گی۔ اب اصغر بیٹا اُس کا محافظ تھا۔ پاکستان کی ہر ماں کا اور پاکستان کی عصمت کا محافظ تھا — اور اب اصغر صرف اُس کا بیٹا نہیں رہ گیا تھا۔

"میں فوج میں لڑنے کی اور کرنیلی کی خاطر تو بھرتی نہیں ہوا تھا امی جان!" — اصغر نے ہنستے ہوئے کہا تھا — "آپ کیوں کی کرتے تھے کہ میں تم کو پاکستان ورثے میں دوں گا؟ آپ نے اپنی جوانی میں پاکستان بنایا تھا۔ اب میں جوان ہو گیا ہوں۔ اگر اپنے ماں باپ کے مقدس ورثے کو دشمن سے بچانے کے لیے مجھے کسی بھی محاذ پر جانا پڑا تو کیا آپ کو دکھ ہو گا؟"

ماں اپنی جان قربان کر دیا کرتی ہے اپنے بیٹے کو گرم ہوا بھی نہیں لگنے دیتی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ سب سے بڑی قربانی شہید کی ماں کی ہوتی ہے بیٹے کے ہاتھ میں گرنیڈ دیکھ کر ماں کے دل میں یہ خواہش بڑی زور سے تڑپتی ہے کہ اُس کا بیٹا پھر چھوٹا سا ہو جائے اور ماں اُس کے ہاتھ سے گرنیڈ لے کر اُسے گیند

دے دے۔

اب اصغر گیند کی عمر سے نکل کر گرنیڈوں کی دنیا میں چلا گیا تھا۔ سلمٰی نے اُسے پاکستان کی ساری کہانی سنا دی تھی۔ ہجرت اور مہاجروں کے قتلِ عام کے ہولناک قصے بھی سنا دیے تھے اور یوں پاکستان کا تقدس اُس کے خون اور اُس کی روح میں شامل کر دیا تھا، مگر آج جب اُس کا بیٹا محافظِ وطن کے روپ میں اُس کے سامنے کھڑا تھا تو وہ اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے دکھ نہیں ہو گا بیٹا!" — سلمٰی نے اصغر سے کہا تھا — "لیکن میں ماں ہوں۔۔۔ میں نے تمھیں پاکستان پر قربان کر دیا ہے لیکن ایک ماں کو اپنے بیٹے کے ساتھ وہ ساری باتیں کر لینے دو جو وہ ماں سنا کی مادری کرتے دور ہے۔"

اصغر کو کشمیر کی گھاٹیوں کی گرج اور چمک میں ماں کی ساری باتیں یاد آنے لگی اور وہ محسوس کرنے لگا جیسے اُس کی سرحدیں، اُس کے خیال اور اُس کا عزم ڈگمگانے لگا ہے اور اُسے افسوس سا ہونے لگا کہ وہ شہید ہو گیا تو اُس کی ماں اُس کے غم میں مر جائے گی۔

○

اصغر نے ذہن کا رخ بدل دیا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ کچھ بھی نہ سوچے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا جوش و خروش ماند پڑ جائے اور وہ ٹارگیٹ پر آ کر جذبہ لڑکھڑا جائے۔

اُسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کا لیکچر یاد آنے لگا اور اُسے اچانک خیال آیا کہ اس لیکچر کے بعد اُس کا ایک ساتھی لیفٹیننٹ نثار مقبوضہ کشمیر میں دو پُل تباہ کر کے اپنی جان پر کھیل چکا ہے۔ ایک صوبیدار اور ایک نائب صوبیدار اپنے اپنے ٹارگیٹ پر شہید ہو چکے ہیں۔ بڑے خوبرو جوان دشمن کے مورٹین ڈویژن کا منہ پھیرنے کے لیے اپنی ماؤں کے جگر چاک کر چکے ہیں اور وہ مائیں اب شہیدوں کی مائیں کہلاتی ہیں۔

اصغر کی آنکھوں کے سامنے افسروں اور جوانوں سے جو مشن پورا کر کے واپس آتے تھے پوچھا کرتا تھا کہ شہید کس طرح شہید ہوئے ہیں اور اُنھوں نے اپنا مشن کس طرح پورا کیا ہے۔ وہ اسے تفصیلات سنایا کرتے تھے۔ یہ تفصیلات اُس کے خون میں جوش پیدا کرتی تھیں۔ ایک ساتھی کی موت دوسروں کے جذبوں کو نئی زندگی دے جاتی تھی۔

"ٹُو نے ٹھیک جواب دیا ہے کہ وہ پہاڑی علاقے میں اپنی جنگی طاقت کی کمی کو گوریلا اور کمانڈو اپریشن سے پورا کرے گا۔" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا تھا — "ٹُو نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ تم سب کچھ سمجھتے ہو۔ تمھیں کمانڈو ٹریننگ میں جو سبق دیے گئے تھے میں انہیں دہرا رہا ہوں۔ تمھیں بتایا جا چکا ہے کہ کشمیر میں ندی نالوں پر چھوٹے چھوٹے پُل ہیں جنھیں تباہ کر دیا جائے تو فوجوں کا آپس میں رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ سپلائی وین کٹ جاتی ہے۔ پُل دیسی اہم نہیں ہوتے جو میدانی علاقوں میں دریاؤں پر تعمیر کیے ہوتے ہوتے ہیں۔ ایسے پُلوں کو طیاروں سے آسانی سے تباہ کیا جا سکتا ہے لیکن پہاڑی علاقے کے چھوٹے چھوٹے پُل سوا بازوں کے لیے اتنا چھوٹا ٹارگیٹ ہوتے ہیں جن پر گرانے کی بمباری اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی ہوتا ہے کہ طیارے کو اتنے چھوٹے ٹارگیٹ کو بمباری سے تباہ کرنے کے لیے بہت کم بلندی پر لانا پڑتا ہے سنگر بندی کے دونوں طرف کی پہاڑیوں پر طیارہ شکن گنیں موجود ہوتی ہیں جو کم بلندی پر آتے ہوئے طیارے کو آسانی سے نشانہ بنا سکتی ہیں۔ اگر گنیں نہ بھی ہوں تو تیز رفتار

iqbalmt@onenurdu.com Scanned by

جھلے سے اُٹھتے اور گھومتے وقت طیارہ پہاڑیوں سے ٹکرا سکتا ہے....

ندی کے دونوں طرف اونچی پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ درمیان دور نیچے ہیں۔ اِدھر اُدھر آنے جانے کے لیے چھوٹے چھوٹے پل ہیں۔ ایک پُل کو توڑ دینے سے آمد و رفت لمبے عرصے کے لیے رُک جاتی ہے ... یہیں چند ایک پُل اڑا کر دشمن کی سپلائی لائن توڑنی ہے۔ پُلوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ٹارگیٹ ہیں۔ مثلاً کیس ایمونیشن کا ذخیرہ ہے۔ دشمن کی کوئی اہم پوسٹ وغیرہ۔"

○

اچانک کیپٹن اصغر کو دھچکا سا لگا۔ اُسے ایک اور آواز سنائی دی۔ اس آواز پر وہ چونک اٹھا۔ اُس نے تاریکی میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں جیسے شمیم اُس کے قریب کہیں موجود ہو۔

"واپس آجاؤ گے نا اصغر؟" — یہ شمیم کی التجا تھی جیسے اصغر کی زندگی اور موت اُس کے اپنے ہاتھ میں ہو۔

اصغر پر اُس وقت بھی رقت طاری ہو گئی تھی جب شمیم نے اُسے واپس آجانے کے لیے کہا تھا اور آج رات شمیم سے بہت دور مقبوضہ کشمیر کی ایک وادی میں بیٹھے ہوئے بھی اُس پر رقت طاری ہو گئی۔

شمیم اُسے چار پانچ مہینے پہلے راولپنڈی میں ملی تھی۔ شمیم اٹھارہ انیس برس کی لڑکی تھی اور کسی اونچے گھرانے کی لڑکی تھی۔ ان کی پہلی ملاقات نیشنل پارک میں ہوئی تھی۔ اصغر اُن کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اُس نے کشتی لی اور اکیلا ہی چپو مارنے لگا۔ اُس کے قریب سے ایک کشتی گزری۔ اس میں دو لڑکیاں تھیں اور کشتی کھینے والا پارک کا ملازم تھا۔ کشتی میں بیٹھی ایک لڑکی نے اصغر کی طرف سر کر دیکھا۔ اصغر نے اُسے دیکھا۔ نظروں نے نظروں کو گرفتار کر لیا۔

اصغر ایسا تو نہ تھا لیکن اُس نے اپنی کشتی کا رخ موڑ دیا اور چپو تیزی سے چلانے لگا۔ اس لڑکی کی کشتی کے قریب چلی گئی۔ اُس لڑکی نے نظریں اصغر پر جما دیں اور اصغر اُسے دیکھتا رہا۔ دونو لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔ اصغر جھینپ گیا اور وہ اپنی کشتی کنارے پر لے گیا۔

لڑکیوں کی کشتی بھی کنارے سے جا لگی۔ اصغر کشتی سے نکل کر جا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں اس کے قریب سے گزریں۔ اصغر نے انہیں دیکھا۔

"تم ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟" — اُس لڑکی نے اصغر سے کہا جو اُسے اپنی طرف دیکھ رہی تھی۔ "ہمیں گھور گھور کر کیوں دیکھتے ہو؟"

اصغر سمجھ گیا کہ لڑکی شوخ اور شرارتی ہے۔ وہ مُسکرایا اور بولا کچھ بھی نہیں۔

"اگر ہمارا پیچھا کیا تو پولیس کو بلا لوں گی" — لڑکی نے غصّے سے کہا — "جانتے نہیں ہو حکومت کس کی ہے؟"

اصغر کی ہنسی نکل گئی۔

"ہنستے کیوں ہو؟" — لڑکی نے پوچھا — "کسی کالج میں پڑھتے ہو یا آوارہ پھرتے رہتے ہو؟"

"کالج کی کیڈٹی میں پڑھتا ہوں" — اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا — "آوارہ پھرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ فوج میں ہوں.... کیپٹن اصغر.... یہ میرا نام ہے۔"

اب وہ لڑکی ہنس پڑی — اور تھوڑی دیر بعد وہ پارک کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

اُس لڑکی نے اپنا نام شمیم بتایا۔

ان کی دوسری ملاقات بھی نیشنل پارک میں ہی ہوئی۔ اب شمیم اکیلی آئی تھی۔ وہ امیر باپ کی بیٹی تھی اپنی کار پر آئی تھی۔

"میں نے اُس روز تمہیں آوارہ کہا تھا" — شمیم نے کہا — "لیکن میری عادتیں دیکھو تم مجھے آوارہ کہو گے"

"میں ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتا" — اصغر نے کہا — "ابھی یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ پہلی بار تمہیں کشتی میں دیکھا تو ایسے لگا جیسے میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ ماں کے بعد تم پہلی عورت ہو جس نے مجھے معلوم نہیں کیسی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔"

"لگتا ہے جیسے میں بھی ایسی ہی زنجیروں میں جکڑی گئی ہوں" — شمیم ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی — "اصغر! ایک بات بڑی صاف بوجھ دیتی ہوں۔ مجھے کچھ اور نہ سمجھ لینا۔ تم فوجی ہو۔ تمہاری زندگی اور تمہارے خیالات کچھ اور ہوں گے۔ میں دقتی دوستی سے گھبراتی ہوں۔ تم جیسے نوجوانوں سے چھیڑ خانی کرنا میرا شغل ہے لیکن کسی کے ساتھ دوستی کی بات کرنے کو کبھی جی نہیں کیا۔ تم پہلے آدمی ہو جس کے پاس بیٹھی ہوئی ہوں۔ میں نے تو ان کے بھی مذاق اڑاتے ہیں جن کے ماں باپ میرا رشتہ لینے آتے ہیں۔ اپنی شوخی اور شرارت پسندی کی وجہ سے میں بدنام بھی ہو گئی ہوں مگر میں وہ کلی ہوں جس کی خوشبو ابھی کسی نے نہیں سونگھی.... اگر میرے ساتھ کھیلنا ہے تو ابھی بتا دو، پھر اس روز کی طرح ہم اپنی اپنی کشتیوں میں بیٹھ جائیں گے اور دُور دُور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے۔"

"میں نے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ بات نہیں کی تھی" — اصغر نے کہا — "تم پہلی لڑکی ہو جس کے پاس آنے سے مجھے مزا آیا ہے۔ میں بھٹکا ہوا ہوں.... اور تم آخری لڑکی ہو گی۔"

پھر وہ ہنستے رہے اور ایک دوسرے میں جذب ہو گئے۔ شمیم کی شوخیاں اور شرارتیں اصغر کی ذات تک محدود ہو گئیں۔ اب اُس کا شغل یہی رہ گیا کہ ایک ملاقات کے بعد اگلی ملاقات کا انتظار کرتی رہے۔

پھر اُن کی آخری ملاقات ہوئی جس نے شمیم کی رہی سہی شوخیاں بھی ختم کر دیں۔

"شمیم! تم نے کہا تھا کہ تم وقتی دوستی سے گھبراتی ہو۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تم فوجی ہو تمہاری زندگی اور تمہارے خیالات کچھ اور ہوں گے" — اصغر نے کہا — "میں تمہیں چھوڑ نہیں رہا لیکن تم اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لو کہ ہماری دوستی وقتی تھی۔"

شمیم نے گھبرا کر اُس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"زندہ رہا تو ثابت کروں گا کہ یہ دوستی وقتی نہیں تھی" — اصغر نے کہا — "میں فوجی ہوں۔ تم جانتی ہو کہ ان کچھ میں دشمن ہم سے بڑی طرح پٹ گیا تھا۔ اب اُس نے کشمیر میں ہماری پوسٹوں پر حملہ کر دیا ہے اور وہ مزید فوج نیشنل بسکٹر میں جمع کر رہا ہے۔"

"تم اُس محاذ پر جا رہے ہو؟" — شمیم نے بجھے بجھے سے لہجے میں پوچھا۔

اصغر نے اُسے یہ نہ بتایا کہ وہ کمانڈو ہے اور ایک بہت بڑے کمانڈو آپریشن میں شامل ہے۔ اُس نے شمیم کو اتنا ہی بتایا کہ وہ کشمیر کے محاذ پر جا رہا ہے۔ شمیم نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

iqbalmt@gmail.com scanned by khoobsurat log ki mehfil

سے لیے اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"مجھے آنسوؤں سے رخصت کرو گی یا دعاؤں سے؟" — اصغر نے کہا۔ "میں کراتے کا فوجی نہیں ہوں شمیم! اپنے ملک کا محافظ ہوں۔ تمہاری عصمت کا محافظ ہوں۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی اصغر!" — شمیم نے کہا اور رندھی ہوئی آواز میں پوچھا — "واپس آجاؤ گے نا اصغر!"

اصغر پر ایسی برقت طاری ہوئی کہ وہ بول نہ سکا۔

✪

"یہ قربانی بھی دینی ہوگی؟" — اصغر کو خیال آیا۔ "جان دینا آسان ہے" — سیاہ کالی رات میں اُسے شمیم کا چہرہ نظر آیا۔ شوخ اور شرارتی چہرہ اداس تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئیں اور ہونٹ بند۔ اصغر کو اُس کی آواز سنائی دی — "واپس آجاؤ گے نا اصغر!"

"سر!" — اُسے اپنے نائب صوبیدار کی آواز سنائی دی — "چلنا چاہیے۔ زیادہ آرام کیا تو ٹھنڈ سے جسم بیکار ہو جائیں گے۔"

"بارش آئے گی" — کیپٹن اصغر نے کہا۔

"آنے دو سر!" — نائب صوبیدار نے کہا — "ابھی تو گولیوں کا بھی مینہ برسے گا۔"

اصغر ہنس پڑا اور پھر اپنی ہنسی پر وہ حیران ہوا۔

"چلیے نائب صوبیدار صاحب!" — اصغر نے کہا — "اور آپ میرے ساتھ رہیں۔"

پارٹی پہلے کی طرح چل پڑی۔

"آپ کے بیوی بچے ہیں صاحب؟" — اصغر نے نائب صوبیدار سے پوچھا۔

"جی سر!" — نائب صوبیدار نے جواب دیا — "بیوی ہے۔ دو بچے ہیں۔ ایک پانچ سال کا لڑکا اور ڈیڑھ سال کی لڑکی۔"

"آپ روشن کر چکے ہیں" — اصغر نے کہا — "آپ کو اپنے بیوی بچے تو یاد آتے ہوں گے۔"

"سر! آپ کیپٹن ہیں میں نائب صوبیدار ہوں" — نائب صوبیدار نے کہا — "عہدے کے لحاظ سے بھی تعلیم کے لحاظ سے بھی آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ آپ میرے کمانڈر ہیں۔ سر! میں بات کرتے ڈرتا ہوں کہ آپ کی گستاخی نہ ہو جائے۔ آپ کی جوانی ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔ شاید آپ کے خیالات کچھ اور ہوں۔ میری عمر تیس سال ہو گئی ہے۔ سر! فوج میں ایک لفظ سکھایا جاتا ہے۔ مورال۔ ہم جنگلی اور دیہاتی لوگ مورال کا مطلب نہیں جانتے۔ ہم اسے غیرت کہا کرتے ہیں۔"

"اسلم صاحب!" — اصغر نے نائب صوبیدار سے کہا — "کیا آپ کو شک ہے کہ میری عمر کے جوان آدمی میں غیرت نہیں ہوتی؟"

"میں آدمی کی بات نہیں کر رہا سر!" — نائب صوبیدار نے کہا — "میں افسر کی بات کر رہا ہوں۔ افسر اور آدمی میں کچھ فرق ہوتا ہے۔"

اصغر کی ہنسی نکل گئی۔

"آپ ناراض نہ ہونا سر!" — نائب صوبیدار نے کہا — "آپ پہلی بار کمانڈو اپریشن کر رہے ہیں۔"

"اپریشن کر چکا ہوں۔ میں بھی افسر ہوں لیکن میں جب دشمن کے علاقے میں داخل ہوتا ہوں تو میں آدمی بن جاتا ہوں اور جب دشمن سامنے آتا ہے تو میں بڑا ستم آدمی بن جاتا ہوں..... صرف میں نہیں سر! میں نہیں کہ رہا کہ صرف میں شیر اور دلیر ہوں۔ کمانڈو مشن پر یا محاذ پر جو پاکستانی آتے گا وہ میری طرح کا آدمی بن جائے گا۔ لیکن شرط یہ ہے سر! کہ اُس میں غیرت ہو۔ اور جب غیرت جاگ اٹھتی ہے تو اپنے بیوی بچے دماغ سے اتر جاتے ہیں سر!..... معافی چاہتا ہوں سر! ایک بات پوچھوں گا..... آپ کو گھر کے لوگ..... میرا مطلب ہے ماں، ابا، بہن، بھائی یاد آ رہے ہیں؟"

اصغر بھول گیا کہ وہ کیپٹن ہے اور اسلم نائب صوبیدار ہے۔ اُسے اسلم کی باتیں اتنی اچھی لگیں کہ اُس نے اسلم کا بازو پکڑ لیا۔

"ہاں صاحب!" — اُس نے کہا — "تھوڑی سی دیر کے لیے امی یاد آئی تھی اور کوئی نہیں یاد آیا۔ میں اکیلا بیٹا ہوں..... اور اسلم صاحب! میں فوج میں افسری کے لیے بھرتی نہیں ہوا۔"

"میں اُس ماں کے پاؤں چوموں گا جس نے جگر کا جو ایک ہی ٹکڑا تھا وہ پاکستان کی فوج کو دے دیا ہے" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا — "اگر آپ..... اگر آپ..... میں آپ کے گھر ضرور جاؤں گا..... اگر ہم دونوں واپس آ گئے تو؟"

"ہاں اسلم صاحب!" — اصغر نے کہا — "اگر میں زندہ واپس نہ آ سکا تو میرے گھر ضرور جانا اور میری امی کو بتانا کہ میں نے تمہاری قربانی قبول کر لی ہے۔ اور میری امی کو بتانا کہ تمہارے جگر کا ٹکڑا کس طرح دشمن پر کالی بن کر گرا تھا..... نائب صوبیدار صاحب! میں صرف مرنا نہیں چاہتا۔ مارنا اور مرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس بیل کا دھبہ دیکھوں گا..... میں اب آدمی ہوں افسر نہیں۔"

"سر!" — نائب صوبیدار نے کہا — "وطن کی لاج آپ جیسے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے....."

اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اندھیرے میں ان کے پاس کوئی آیا۔

"آپ بہت اونچی بول رہے ہیں" — اُس نے انہیں کہا — "آگے دشمن کی چوکیاں آ رہی ہیں ہمیں ان کے درمیان سے اور نیچے سے گزرنا ہے۔ پٹرول (گشتی سنتری) بھی ہوگی۔ اب مجھے آگے ہو جانے دیں۔"

وہ کشمیر کا رہنے والا ایک سویلین عبدالرحمٰن تھا۔ مقبوضہ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں وہاں سے اس حال میں ہجرت کر کے آیا تھا کہ اُس کے سارے گاؤں کو ڈوگروں نے جلا دیا اور اُن سب مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا جو بھاگ نہیں سکے تھے۔ عبدالرحمٰن اپنے ایک دودھ پیتے بچے کو اٹھائے وہاں سے نکل آیا تھا۔ اُسے انتقام لینے کے لیے اٹھارہ برس انتظار کرنا پڑا تھا۔

اس پارٹی کے ساتھ دوسرا گائیڈ عطاء اللہ تھا۔ وہ بھی مقبوضہ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ وہ بھی وہاں سے خون کی ندی میں بہتا آزاد کشمیر میں آیا تھا اور یہ خون اس کے سینے پر جم گیا تھا۔

عبدالرحمٰن اور عطاء اللہ مقبوضہ کشمیر کی وادیوں کے بھیدی تھے۔ ۱۹۶۵ء کا کمانڈو اپریشن شروع ہوتے ہی وہ کمانڈو پارٹیوں کے گائیڈ بن گئے تھے۔ اس سے پہلے وہ مقبوضہ کشمیر سے ادھر آنے والوں کو سرحد پار کراتے تھے اور ادھر کے پیغام سرحد تک دے آتے تھے۔ وہ ہوا کو سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ موسم میں کیا تبدیلی آنے والی ہے۔ اب وہ کیپٹن اصغر کی پارٹی کو لے جا رہے تھے۔

iqbalmt@onenurdigital.com scanned by

کیپٹن اصغر کو یہ مشن دیا گیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے اندر وہ پہاڑیوں کے درمیان سے ایک ندی گزرتی تھی۔ ندی بہت نیچے تھی۔ پاٹ تنگ تھا اور اس کی کیفیت سیلابی رہتی تھی۔ اب تو ساون کا موسم تھا جو ہر سال برسا ہی رہتا تھا اس لیے تمام ندی نالے چڑھے رہتے تھے۔ اس ندی پر ایک پُل تھا۔ ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ پل کھاتا ہوا کشادہ راستہ تھا جو فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ راستہ ندی کے اس پُل سے گزر کر دوسری پہاڑی کے ایک درّے میں چلا جاتا اور آگے پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ ٹیٹوال سیکٹر کی اُن پوسٹوں تک جاتا تھا جو آزاد کشمیر کی فیس لیکن ان پر انڈین آرمی نے حملہ کر کے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہ ترنتیس ڈویژن کے ٹروپس تھے۔ انہیں اب کمک اور رسد دی جا رہی تھی۔ انہیں مستحکم کر کے دشمن کو آگے بڑھنا تھا۔ ندی کا صرف ایک پل تباہ کر دینے سے ان پوسٹوں کا اُن کے ڈویژن سے رشتہ توڑا جا سکتا تھا۔

کیپٹن اصغر کو یہ پُل نقشے پر دکھایا گیا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اُسے دو گائیڈ دیے گئے تھے اور ایک نائب صوبیدار ساتھ بھیجا گیا تھا جو دو کمانڈو مشن کر چکا تھا۔ اس پُل کے متعلق جو معلومات لی گئی تھیں ان میں اہم یہ تھی کہ پُل کے دونوں طرف پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر دو مشین گن پوسٹیں بنی ہوئی تھیں۔ ان پوسٹوں پر گولہ بار توپیں بھی تھیں۔ ان میں سے پُل پر نظر رکھی جاتی تھی۔

کیپٹن اصغر کے مشن سے پہلے کمانڈو اپریشن شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو جانباز مقبوضہ پُل تباہ کر چکے تھے۔ انہوں نے ملٹری کنوائیوں پر بھی شبخون مارے تھے اور جنگلوں پر بھی تباہی مچائی تھی۔ بھارتیوں کو توقع نہیں تھی کہ پاکستانی یوں بھی کریں گے۔ ایسا ہو گیا تھا کہ ان پر دہشت طاری ہو گئی۔ انہوں نے حفاظتی انتظامات زیادہ مضبوط کر لیے۔ رات کی گشتی پارٹیوں کی تعداد دگنا کر دیا اور پُلوں کے دونوں طرف مشین گن پوسٹیں بنا کر ان میں سرچ لائٹیں رکھ دیں۔ دن کے وقت ہیلی کاپٹر اُڑتے اور وادیوں کو دیکھتے تھے۔

یہ پُل جسے تباہ کرنے کے لیے کیپٹن اصغر جا رہا تھا چند ایک نہایت اہم پُلوں میں سے تھا۔ یہ تو شہ رگ تھی۔ اس کے دونوں طرف جو مشین گن پوسٹیں تھیں ان میں سرچ لائٹیں بھی تھیں۔ رات کو وقفے وقفے سے سرچ لائٹیں روشن ہوتیں اور ان کی روشنی پُل پر اور اردگرد گھومتی پھرتی اور ایک دو منٹ بعد گم ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پُل کے دونوں سروں پر ہر وقت دو سنتری کھڑے رہتے تھے۔

ان حفاظتی انتظامات میں پُل کو تباہ کرنا ناممکن تھا۔ نیچے سیلابی ندی تھی۔ پُل کی بلندی پچاس فٹ کے لگ بھگ تھی اور اس کی لمبائی کم و بیش چالیس گز تھی۔

○

کیپٹن اصغر اپنے پہلے مشن پر جا رہا تھا۔ اپنی پارٹی کے ساتھ وہ مقبوضہ کشمیر کے دشوار اور خطرناک علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ گھٹائیں جو زور دار جھڑی سنا رہی تھیں قریب آ گئی تھیں۔ ان کی چمک اب اور تیز ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ تیں تو گھاس بھی نظر آ جاتی تھی۔ یہ پارٹی اپنے آپ کو اس خطرے کے لیے تیار کر رہی تھی کہ آگے بلندیوں پر دشمن کی دو پوسٹیں تھیں اور اس پارٹی کو ان کے درمیان میں سے گزرنا تھا۔ یہ پارٹی اس وادی میں داخل ہو چکی تھی۔

گھٹائیں اتنی زور سے جھکیں کہ سارا ماحول پلک جھپکنے کی طرح روشن ہو کر تاریک ہو گیا۔ چیل اور دیودار کے پیڑ نیچے سے اوپر تک گئے ہوتے تھے۔ پوشیں اوپر تھیں۔ خطرہ پیٹرول کا تھا۔ اچانک گھٹائیں پھٹ پڑیں۔ اس قدر تیز بارش جیسے کنکروں کی بوچھاڑیں پڑ رہی ہوں۔

"سر!..... نائب صوبیدار اکرم نے کیپٹن اصغر سے کہا۔ "آپ بارش رکنے کا انتظار تو نہیں کریں گے؟..... اگر ہم رُک گئے تو ٹارگیٹ تک پہنچتے صبح ہو جائے گی۔ میں گائیڈوں کو آگے بھیج رہا ہوں۔ یہ پہاڑیوں کی مُشک سے لیا کرتے ہیں۔"

"نہ صاحب! ہم رکیں گے نہیں۔" کیپٹن اصغر نے کہا۔ "صرف ایک گائیڈ کو میں اپنے ساتھ آگے لے جاؤں گا۔"

"آپ خود آگے جائیں گے سر؟" نائب صوبیدار نے پوچھا۔ "یہ کام گائیڈوں کا ہے۔"

"یہ کام آپ کا یا میرا ہونا چاہیئے۔" اصغر نے کہا۔ "گائیڈ سویلین ہیں۔ بچڑے گئے تو اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں دھوکہ دے سکتے ہیں۔"

"پھر میں آگے جاؤں گا۔" نائب صوبیدار نے کہا۔

"نہیں۔" اصغر نے کہا۔ "میں جاؤں گا۔ اگر میں مارا گیا یا پکڑا گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر آپ ہمارے ساتھ رہے تو بہت فرق پڑے گا کیونکہ جو تجربہ آپ کا ہے وہ میرا نہیں۔"

کیپٹن اصغر نے عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر آگے چلا گیا۔ بارش چلنے نہیں دے رہی تھی۔ ہوا تیز تھی۔ بڑی اونچی بڑھ گئی کہ دانت بجتے محسوس ہوتے تھے۔ عبدالرحمٰن کشمیری تھا اور وہ انہی علاقوں اور انہی موسموں میں پلا بڑھا تھا اس لیے وہ اس بارش سے مانوس تھا۔ کیپٹن اصغر آرام اور آسائش میں جوان ہوا تھا۔ رجب علی سے اُس کی ماں نے سابق ڈی۔ ایس۔ پی ملک رجب علی کے ساتھ شادی کی تھی وہ عمل میں لائی گئی میں رہا تھا۔ رجب علی نے اُسے شہزادہ بنا کے رکھا تھا۔ ماں نے اُسے بیٹے سے بڑھ کر جوان کیا تھا۔

ماں کا یہ شہزادہ دشمن کے علاقے میں برسلا دھار بارش میں ٹھٹھر رہا تھا۔ پاؤں کیچڑ میں دھنس رہے تھے۔ وہ اپنے گھر کو نہیں بلکہ سیدھا موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ بارش اور جھکڑ کے تھپیڑوں اور ژالہ باری میں موت کی چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس بارش میں چلنا پُل کو تباہ کرنے جتنا دشوار اور خطرناک ہے۔ اُس نے اپنا دھیان بارش سے ہٹا لیا۔

اُسے اپنے کمانڈو گروپ آفیسر کی ایک اور موقعہ کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اصغر کا ایک ساتھی لیفٹیننٹ مقبوضہ کشمیر میں ایک مشن پر گیا اور وہیں شہید ہو گیا تھا۔ اس کی پارٹی کے چند جوان بھی شہید ہو گئے تھے۔ اس موقعہ پر کمانڈو گروپ آفیسر نے نوجوان افسروں کو ایک لیکچر دیا تھا:

"خدا کے سوا انہیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔" کمانڈو گروپ آفیسر نے کہا تھا۔ "وہ راستے سے ہی واپس آ جاتے اور کہہ دیتے کہ موسم اتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ آگے نہیں جا سکے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ مشن مکمل کر آئے ہیں لیکن انہوں نے اپنی جانیں قربان کر کے ثابت کر دیا ہے کہ انہیں جو حکم ملا تھا اس کی تعمیل کر آئے ہیں۔ اس حکم کو وہ خدا کا حکم سمجھے تھے۔ وہ اللہ کا نام لے کر آتش مزود میں کود گئے تھے۔"

iqbalmt@onlinecom scanned by

کیپٹن اصغر کا کمانڈنگ آفیسر کبھی جذباتی نہیں ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ نثار جیسے خوبرو اور جواں سال آدمی کی شہادت نے اُسے جذباتی بنا دیا تھا۔ اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔

"وہ" پنسے ہاتھوں لگائے ہر تے ڈاتا سیٹ سے پُل کے ساتھ ہی اُڑ گئے ہیں" — اس اُدھیڑ عمر لیفٹیننٹ کرنل کے جذبات کے تلاطم سے لرزتی آواز میں کہا تھا — "ان کی لاشیں نہ ملیں، جنازے نہ اٹھے اور قبریں نہ بنیں۔ ان کی ہڈیاں مقبوضہ کشمیر کی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گی۔۔۔ میرے نوجوان دوست وہ بڑے ہی دلیر تھے۔ بہت ہی غیور تھے جو وطن کی قربان گاہ پر قربان ہو گئے ہیں۔ وہ تمہارے لیے شجاعت کا ایک معیار قائم کر گئے ہیں۔ ایک نئی روایت چھوڑ گئے ہیں بہتیں اس معیار اور روایت کو زندہ رکھنا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں کی بارش اور وہاں کے ندی نالے اور وہاں کے دشوار گزار راستے تمہیں روک لیں"

✪

کیپٹن اصغر کو اپنا ساتھی لیفٹیننٹ نثار شہید اور دوسرا ساتھی لیفٹیننٹ احمد شہید یاد آ گئے۔ دل کا سینہ تن گیا۔ ٹھٹھرتا ہوا جسم گرم ہو گیا اور وہ گائیڈ عبدالرحمٰن کے ساتھ چلتا گیا۔ بارش اور تیز ہو گئی اور پہاڑوں سے ہر کر آنے والا پانی وادی کو ندی بنانے لگا۔ پانی اُس کے ٹخنوں سے اوپر آ گیا۔ عبدالرحمٰن نے اصغر کے کان میں کہا کہ ایک پوسٹ دائیں طرف اوپر ہے۔

بجلی بار بار چمکتی تھی مگر اب بارش کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ بادل گرج کڑک کے شور میں دور اوپر سے آواز آئی — "اُوپر آ جاؤ" اُنہوں نے پگڈنڈیوں اوپر آواز ٹھنڈ میں مر جاتے۔

کیپٹن اصغر اور عبدالرحمٰن ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ پوسٹ والے اپنے گشتی سنتری کو اوپر بلا رہے ہیں۔ اصغر انتظار کرتا رہا کہ سنتری کدھر سے آتے ہیں، بائیں طرف سے اوپر بلایا جا رہا ہے وہ کون ہے۔

چند منٹ انتظار کے بعد اُسے شٹراپ شٹراپ کی آواز سنائی دی۔ بجلی چمکی تو سامنے والی پہاڑی کے ساتھ ساتھ اُسے چار سپاہی جاتے نظر آئے۔ ایک جگہ رک کر وہ اُوپر چڑھنے لگے۔ انہوں نے کسی آواز سے کسی کو گالیاں دیں اور قہقہے بھی لگائے۔ کیپٹن اصغر نے خنجر نما چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا۔ گائیڈ کو گولی نہیں چلانا پڑتی۔ راستے میں دشمن کا کوئی جوان اکیلا دیکھ لے تو چاقو یا خنجر سے یا اُس کا گلا گھونٹ کر اُس کا کام تمام کیا کرتے ہیں۔

کیپٹن اصغر نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ وہ پیچھے جاتے اور سندی پارٹی کو ساتھ لے آئے۔ عبدالرحمٰن جانتا تھا کہ پارٹی کو کس طرف سے لانا ہے۔

پارٹی ایک قطار میں پہاڑی کے ساتھ ساتھ آ گئی اور سب آگے چل پڑے۔ بہت آگے گئے تو پہاڑیاں ایک دوسری سے دور ہٹ گئیں۔ یہ میدان تھا لیکن ہموار نہیں تھا۔ بارش کا زور ٹوٹتا نظر نہیں آتا تھا۔

کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار سے کہا کہ ہر ایک جوان سے معلوم کرو کہ وہ ٹھیک ہے؟

اسے رپورٹ ملی کہ سب ٹھیک ہیں۔ بارش نے جہاں مشکل پیدا کر دی تھی وہاں یہ فائدہ بھی دے رہی تھی کہ دشمن جہاں تھا وہیں دبکا ہوا تھا اور پٹرولیں نہیں تھیں۔ انہیں پوسٹوں میں بلا لیا گیا تھا، پھر بھی پارٹی

دبے پاؤں چل رہی تھی۔ چلتے چلتے عبدالرحمٰن نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ دوسری پوسٹ وہاں اوپر ہے۔

تمام پارٹی کو بتا دیا گیا کہ اوپر دشمن کی پوسٹ ہے۔ سب پہاڑی کے ساتھ ہو کر چلنے لگے اور دو تین فرلانگ آگے گئے تو اچانک بڑے تیز و تند پانی میں داخل ہو گئے۔ پانی گہرا تو نہیں تھا۔ گھٹنوں تک ہی تھا لیکن اتنا تیز کہ پاؤں نہیں جمتے تھے۔ نائب صوبیدار اسلم نے سمجھا کہ ایک دوسرے کے بازو میں بازو پرو لو اور اکٹھے پانی میں چلو۔ گائیڈوں نے بتایا کہ یہ کوئی ندی نالہ نہیں۔ بارش کا پانی گزرنے کا راستہ ہے۔ ایسا شور سنائی دے رہا تھا جیسے جیٹ ہوائی جہاز سر کے اوپر سے گزر رہا ہو۔

"قریب ہی بہت اونچی زمین ہے" — ایک گائیڈ نے بتایا — "اُوپر کا پانی آبشار کی طرح گر رہا ہے۔ بارش رک جائے گی تو کچھ دیر بعد آبشار بند ہو جائے گی۔ ہم جہاں سے گزر رہے ہیں، یہ جگہ گہرائی میں ہے" پوری پارٹی ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈالے زنجیر کی طرح بڑے تیز پانی میں سے گزر گئی۔ گائیڈوں نے بتایا کہ اب ٹارگیٹ تک دشمن کا کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ راستے کی دشواریاں بہت ہیں۔

✪

دشمن کا نوآبادیاتی ڈویژنوں کا غرور توڑنے کے لیے پاکستان اور آزاد کشمیر کی ماؤں کے بیٹے تمام دشواریاں عبور کر گئے۔ کسی دشوار نے بے رحم تھپیڑے نہ روک سکے۔ گھٹاؤں کا چکنا چور اعتاب اُن کے عزم کو ہلا نہ سکا۔ آبشاروں کا تھرتھراتا ہوا کوٹ نہ روک سکا۔ وہ دلدل میں دھنسے، پھسلے، گرے، ایک دوسرے کے سہارے اُٹھے اور یوں ہنستے مسکراتے چلتے چلے گئے جیسے پکنک پر جا رہے ہوں۔

اُن کے ارادے مضبوط اور ذہن صاف تھے۔ انہیں احساس تھا کہ قوم جو اُس وقت گہری نیند سوئی ہوئی ہے وہ اُن کی طرف سے پرسوئی ہوئی ہے۔ گائیڈوں نے جب انہیں بتایا کہ ٹارگیٹ قریب آ رہا ہے تو بارش سے جلے ہوئے سر جسم جیسے تندتازہ ہو گئے ہوں۔

بارش کا زور تھمنے لگا۔ گھٹاؤں کی چمک ابھی باقی تھی۔ بارش کا شور کم ہوا تو ایک قدرتی ہوا شور سنائی دینے لگا۔ یہ کہیں نیچے تھا۔ گائیڈوں نے بتایا کہ یہ ہے وہ ندی جس کے پُل کو ہم تباہ کرنے جا رہے ہیں۔

"بائیں طرف کوئی نہ جائے" — ایک گائیڈ نے کہا — "ذرا سا پاؤں پھسلا تو سیدھے ندی میں جا ؤ گے۔ اِس وقت ندی اتنی گہری اور اتنی تیز ہے کہ زندہ نہیں رہنے دے گی"

گائیڈ نے بات ابھی پوری ہی کی تھی کہ پارٹی میں کسی نے گھبرا کر کہا — "میرا ہاتھ پکڑ لو۔۔۔ اوہ۔۔۔۔ میں گیا" — اور کسی اور کی آواز آئی "وہ گیا۔ حیدر پیچھے چلا گیا ہے"

سپاہی حیدر کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ ذرا سی دیر اُس کی آواز سنائی دی۔ ندی کا شور اتنا بلند تھا کہ حیدر کے پانی میں گرنے کی آواز نہ آئی — فرض نے ایک قربانی لے لی تھی۔ کیپٹن اصغر نے گائیڈوں سے پوچھا کہ حیدر کو بچایا جا سکتا ہے؟

"جو گر پڑا ہے اُسے بھول جائیں" — عبدالرحمٰن نے کہا — "ندی کی طرف جھک کر بھی نہ دیکھنا۔ وہ بے چارا گیا۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے گیا"

"یہ اچھا شگون نہیں ہے سر!" — نائب صوبیدار نے کہا۔

"ہم ہندو نہیں ہیں نائب صوبیدار صاحب!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "ہم سب کو مرنا ہے۔ اپنے اُوپر

iqbalmt@yahoo.com scanned by

دہم طاری نہ کرو۔ پہلے سب حیدر کے لیے فائر پڑھو پھر اپنی کامیابی کے لیے دعا کرو۔"

نصف میل آگے گئے تو گائیڈوں نے بتایا کہ پُل کی حفاظت کے لیے اس طرف والی پوسٹ کہاں ہے۔ اصغر نے پارٹی کو وہیں روک لیا۔ اُسے جو بریفنگ دی گئی تھی اس کے مطابق اُسے پہلے مشین گن پوسٹ پر شوٹن مارنا تھا۔ مخبروں نے صحیح رپورٹ دی تھی کہ دونوں پوسٹوں میں کتنی کتنی نفری ہے اور اُن کی ساخت کیا ہے۔ ساخت یوں تھی کہ جیل اور دیوار کے تنوں سے دیواریں بنائی گئی تھیں۔ یہ تنے اتنے موٹے تھے کہ توپ کا گولہ بھی ان سے پار نہیں ہو سکتا تھا۔ موٹے اور لمبے تنے زمین کے متوازی اُوپر نیچے رکھے گئے تھے اور کچھ تنے عمودی رکھ کر انہیں لوہے کے لمبے کابلوں سے مضبوط کیا گیا تھا۔ ان میں سے دیکھنے کے لیے اور رائفلوں کے فائر کے لیے چوڑے سوراخ رکھے گئے تھے۔ چھتیں بھی دیوار کے تنوں کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ کنکریٹ جتنے مضبوط بنکر تھے۔ اُن کے اردگرد خاردار تار تھے۔

کیپٹن اصغر نے اپنی پارٹی کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ دس دس جوانوں کی پارٹی کو ادھر والی پوسٹ پر اس طرح حملہ کرنا تھا کہ دشمن قبل از وقت بیدار نہ ہو۔ نائب صوبیدار اس پارٹی کا کمانڈر تھا۔ چند جوانوں کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ ایسی پوزیشن لیں گے کہ ندی کے پار والی مشین گن پوسٹ سے فائرنگ شروع ہوگی تو یہ جوان اُدھر فائر کریں گے۔ اُن کے پاس دو لائٹ مشین گنیں تھیں اور گرینیڈ بھی۔

کیپٹن اصغر نے تین جوانوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے پاس ڈائنامیٹ کی سٹکیں تھیں اور گرینیڈ سب کے پاس تھے۔ دونوں گائیڈوں کو پیچھے بھیج دیا گیا۔ انہیں ایکشن میں شامل نہیں ہونا تھا۔ اُن کا فرض ادا ہو چکا تھا۔ اُن کے فرض کا دوسرا حصہ یعنی پارٹی کو واپس لے جانا، ایکشن کے بعد فرض ہونا تھا۔

کیپٹن اصغر نے پارٹیوں کو رخصت کرنے سے پہلے کہا ۔"میرے دوستو! یہ سرچ لائٹ تمہیں نظر آ رہی ہے۔ اپنے اپنے دل میں وہی حلف اُٹھاؤ جو تم ایک بار اُٹھا چکے ہو اور اپنے خدا سے وعدہ کرو کہ تم اُس کی ذات کو دھوکا نہیں دو گے۔ اپنی اُن ماؤں بہنوں کو یاد کرو جنہیں اٹھارہ سال پہلے کشمیر کے اس حصے پر اور مشرقی پنجاب میں ذلیل و خوار کیا گیا تھا۔ مسجدوں اور قرآن کی بے حرمتی کو یاد کرو۔ اپنے دشمن کو اپنے وطن میں لانچ کر پاکستان کو ہمیشہ کے لیے ختم کرکے اسلام کا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اپنے خون میں غیرت کا جوش پیدا کرو اور سوچو کہ تمہاری مائیں بہنیں اور بچے ہزاروں میل پرے پر سو رہے ہیں اور وہ تمہاری بسر کر رہے ہیں۔ اپنے دلوں میں یہ یقین پیدا کرو کہ خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم کسی انسان کے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔ اسی خدا کی کرم نوازی ہے کہ ہمیں دشمن کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے اتنی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ہے۔ جہد کرو، کامیابی یا موت!" — اُس نے آخر میں کہا " اور اپنے دوست حیدر کو یاد کرو جو تمہارے سامنے ندی میں شہید ہو گیا ہے۔ اُس کی رُوح تمہیں دیکھ رہی ہے۔"

بارش پھر تیز ہو گئی تھی۔ پارٹی کیپٹن اصغر کے اردگرد کھڑی تھی۔ سب کے جسم ٹھٹھر رہے تھے۔ تھکن سے پنڈلیاں دُکھ رہی تھیں۔ ہتھیاروں پر ہاتھ اکڑ گئے تھے لیکن جذبے تر و تازہ تھے۔ اصغر کے چند ایک الفاظ نے اُن کے خون کو گرمانا شروع کر دیا تھا۔

اُس رات پاکستان اور آزاد کشمیر کے لوگ بڑی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کے کھیت بیٹے تھکے ٹوٹے۔ ٹھٹھرتے جسموں کو نرم کی آن کی تربان گاہ کی طرف لے گئے۔ چلنے سے پہلے انہوں نے ہاتھ ملائے۔ کسی

کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جس طرح اکٹھے آئے ہیں اسی طرح اکٹھے واپس جا سکیں گے یا نہیں، یا اُن میں سے کون کون زندہ واپس جا سکے گا، اُن میں سے کون آناً زخمی ہو جائے گا جو چل نہیں سکے گا اور دشمن اُسے بڑی اذیت ناک موت مارے گا یا وہ دشمن سے بچنے کے لیے کیڑوں کی طرح جھاڑیوں میں رینگتا پھرے گا اور جانے کس طرح اپنی جان خدا کے حضور پیش کرے گا۔

لیکن وہ اپنی زندگی اور موت کے متعلق سوچ ہی نہیں رہے تھے۔ اُن کے سامنے وہ عہد تھا جو انہوں نے اپنے خدا سے کیا تھا اور اُن کے دل و دماغ پر اپنا جنون طاری تھا۔ پُل تباہ کرنا ہے۔ دشمن کے کسی ایک آدمی کو یہاں زندہ نہیں رہنے دینا۔

✪

گائیڈوں نے اچھی طرح بتا دیا تھا کہ ادھر والی پوسٹ کہاں ہے اور کدھر سے اُوپر جا سکتے ہیں۔ نائب صوبیدار اسلم اپنی پارٹی کو ساتھ لے کر اُدھر کو چل پڑا۔ مشین گن پوسٹ نے اپنی نشاندہی خود ہی کر دی۔ اس کی سرچ لائٹ جل اور اس کی روشنی ایک بڑی لمبی اور بہت موٹی لکیر کی طرح بارش میں اِدھر اُدھر حرکت کرنے لگی۔ اس سے نیچے پُل تھا۔ روشنی نے پُل بھی دکھا دیا۔

نائب صوبیدار کے اشارے پر اُس کی دس جوانوں کی پارٹی جیل کی سڑک سے بیٹھ گئی۔ روشنی اُن کے اوپر سے گزر گئی، پھر بجھ گئی۔ وہ اُٹھے اور چل پڑے۔ مگر یہ چلنا ایسا نہیں تھا جیسے سڑکوں اور راستوں پر چلا جاتا ہے۔ کشمیر کی پہاڑیاں پتھریلی نہیں مٹی کی ہیں۔ بارش میں پاؤں جما کر اُوپر جانا بڑا ہی مشکل ہوتا ہے۔ اُوپر سے پاؤں پھسل جائے تو کوئی درخت گرنے والے کو روک لے تو اتفاق کی بات ہے۔ ورنہ وہ شخص قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آ رہتا ہے۔

ان جانبازوں نے اختیار اور کچھ سامان بھی اُٹھا رکھا تھا جس کے ساتھ ایونیشن اور گرینیڈ بندھے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک مسئلہ تھا۔ تمام جوان ایک دوسرے کو سہارا دے رہے تھے اور درختوں کا سہارا بھی لیتے تھے۔ بارش پہلے کی طرح موسلا دھار ہو گئی۔ پاؤں پھسلتے تھے۔ نائب صوبیدار اسلم نے دھیمی آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ وہ سب ایک دیجور کی طرح چلے جا رہے تھے۔ سب نے اپنے نائب صوبیدار کے ساتھ آواز ملا لی اور لا الٰہ الا اللہ گنگنانے لگے۔ یہ مقدس گونج بارش اور تیز ہوا کے شور میں دشمن تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ان دس جانبازوں کو اس سے ایسی قوت دی کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے اب ان کے پاؤں پھسل نہیں رہے اور گھٹاؤں کا قہر اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

نائب صوبیدار اب اوپر نہیں بلکہ ڈھلان کے ساتھ ساتھ آگے کو چل پڑا۔ اُس کی پارٹی اُس کے ساتھ پردلی ہوئی تھی۔ کلمۂ طیبہ کی گونج جاری تھی۔ چلتے چلتے اُسے اپنے پیٹ اور سینے پر کانٹے سے چبھے۔ اس نے اپنی پارٹی کو خاموش کرا دیا اور ہاتھ آگے کر کے کانٹے محسوس کیے۔

"تار ہے" — اُس نے سرگوشی کی "کٹر نکالو۔"

دوسرے لمحے دو جوان آگے ہو کر کٹروں سے تار کاٹنے لگے۔ تار گھنے تھے۔ مشین گن پوسٹ تار سے بمشکل پندرہ قدم دُور تاروں میں گھری ہوئی تھی۔ اچانک سرچ لائٹ جل اُٹھی اور اس کی روشنی اِدھر آ گئی۔ نائب صوبیدار نے شین گن تیار رکھی ہوئی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی اِدھر آئی ہی تھی کہ نائب صوبیدار نے

iqbalmt@onaurdu.com Scanned by

اس پر مشین گن کی لمبی بوچھاڑ فائر کی۔ روشنی بجھ گئی۔ سرچ لائٹ ٹوٹ گئی تھی۔

پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی۔ جانبازوں میں سے کسی کی آہ سُنائی دی۔ کوئی زخمی ہو گیا تھا۔ باقی سب بجھ گئے اور لیٹ گئے۔ تاریں کاٹنے والے تاریں کاٹتے رہے۔ تمام جانبازوں نے مشین گن سے نکلتے ہوئے شرارے دیکھ کر ان پر مشین گنیں فائر کیں۔ دشمن کی پوسٹ سے ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ دشمن خاصا احمق تھا۔ روشنی راؤنڈ کی روشنی میں پوسٹ صاف نظر آ گئی۔ تار کٹ رہے تھے۔ راستہ بنتا جا رہا تھا۔

ندی کے پار والی پوسٹ کے ساتھ اِدھر والی پوسٹ کا رابطہ ٹیلیفون کے ذریعے تھا یا وائرلیس سیٹوں کے ذریعے۔ اُس پوسٹ کی سرچ لائٹ جل اُٹھی۔ روشنی کا رُخ اِس طرف تھا لیکن بارش اتنی زیادہ تھی کہ روشنی یہاں تک آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اِدھر والی پوسٹ نے اُس پوسٹ کو بتا دیا ہو گا کہ اِدھر پوسٹ کے اردگرد فائر کرے۔ چنانچہ اُدھر سے مشین گنوں کی بوچھاڑیں آنے لگیں۔ ایک اور جانباز کو گولی لگ گئی اور وہ گر پڑا۔

اُدھر والی پوسٹ پر فائرنگ کے لیے جن چار جانبازوں کو سوزیشن پر بھیجا گیا تھا انہوں نے سرچ لائٹ اور مشین گنوں کی نالیوں سے نکلنے والے شرارے دیکھے تو لائٹ مشین گنوں سے فائر کھول دیا۔

کیپٹن اصغر اپنے تین جوانوں کے ساتھ اسی صورتِ حال کا منتظر تھا۔ وہ ان چاروں کے ساتھ پُل کی طرف دوڑ پڑا۔ دو مرتبہ اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ گرا۔ وہ اُٹھا اور پُل کے قریب چلا گیا۔ وہ فضا میں اُڑتی گولیوں کے نیچے تھا۔ دونوں پوسٹوں سے ایک ایک روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ کیپٹن اصغر نے ان کی روشنی میں دیکھا کہ پُل کے دونوں سنتری پُل کے اِس طرف والے سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ کیپٹن اصغر نے اپنے ایک جوان کے کان میں کچھ کہا۔ وہ سنتریوں پر مشین گن فائر کر سکتے تھے لیکن اس لیے فائر نہ کیا کہ دشمن کی پوسٹوں کو پتہ چل جائے گا کہ پُل پر بھی کوئی ہے۔

کیپٹن اصغر اور اُس کے جوان نے چاقو نکال لیے جن کے بلیڈ خنجروں کی طرح تھے۔ دونوں پیٹ کے بل رینگتے ہوئے سنتریوں کے پہلو میں چلے گئے۔ سنتری وہیں بیٹھے رہے۔ بارش کا زور ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ کیپٹن اصغر اور اُس کا جوان اور آگے رینگ گئے۔ ان کے اُوپر سے گولیاں گزر رہی تھیں۔ انہیں سنتری اندھیرے میں دو ڈھیریوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اصغر اور جوان اُٹھے اور ایک ہی بار ایک نے ایک سنتری کی پیٹھ میں اور دوسرے نے دوسرے سنتری کی پیٹھ میں چاقو اُتار دیئے۔ دونوں سنتری اُٹھے۔ دونوں نے اتنی زور سے اور اتنی بلند آوازیں نکالیں جو ساری وادی میں سنائی دی ہوں گی۔ چاقو پیٹھوں سے نکل کر پیٹوں میں اُترے تو دونوں گر پڑے اور خاموش ہو گئے۔

سامنے والی پوسٹ سے روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ اس کی روشنی پُل کے عین اوپر آئی۔ سرچ لائٹ بھی جلی لیکن کیپٹن اصغر کی پارٹی کی ایک لائٹ مشین گن نے اس پر فائر کر کے اسے توڑ دیا۔ کیپٹن اصغر نے اپنے دوسرے دو جوانوں سے کہا کہ ڈائنامیٹ لاؤ۔

ڈائنامیٹ آ گیا لیکن سامنے والی پوسٹ کی ایک مشین گن نے پُل پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ڈائنامیٹ پُل کے درمیان میں لگانا تھا لیکن آگے جانا خودکشی کے برابر تھا۔ پھر بھی دونوں جوان بیٹھ کر اور پاؤں

پر سرکتے پُل کے وسط تک چلے گئے۔ اُوپر سے مشین گن کی بوچھاڑ آنی جُول کے درمیان کہیں لگی۔

کیپٹن اصغر نے دونوں جوانوں کو پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ایک بار پھر پکارنے کا بھی جواب نہ ملا تو اصغر دوڑتا گیا اور ان جوانوں تک پہنچ گیا۔ دیکھا کہ دونوں اوندھے پڑے ہیں۔ اُس نے دونوں کو ہلایا۔ دونوں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے تھے۔ اِدھر اُدھر ہاتھ سے ٹٹولا۔ اُسے ڈائنامیٹ ایک لاش کے نیچے پڑا ملا۔

کمانڈو پارٹی کی لائٹ مشین گنوں نے اکٹھے فائر کر کے سامنے والی مشین گن کو خاموش کر دیا مگر یہ مشین گن دو جانبازوں کو شہادت کی نیند سُلا چکی تھی۔ اصغر نے اپنے تیسرے جوان کو آواز دی۔ وہ آیا تو اصغر نے اُسے بتا کر وہ اُس کی ایک ٹانگ کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھے بیٹھے اپنے پاؤں پُل کے اُٹھے ہوئے کنارے پر جمانے لگا۔

وہ پیٹ کے بل لیٹ گیا اور ندی کی طرف پُل سے آگے کو سرکا۔ اُس کا دھڑ تا نیم پُل سے باہر جا لٹکا۔ نیچے سیلابی ندی کا شور بڑا ہی ہیبت ناک تھا۔ اوپر سے موسلا دھار بارش اور جھکڑ۔ اِدھر یہ پوسٹ پر تائب صوبیدار نے ہلّہ بولا تھا اور ہینڈ گرنیڈوں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ جانباز تار کاٹ کر آگے چلے گئے اور ایک جوان نے مشین گنوں کے چوڑے سوراخ سے گرنیڈ اندر پھینکا تھا۔ تائب صوبیدار بنکر کے دروازے کی طرف گیا اور ایک گرنیڈ اُس نے اندر پھینکا۔

کیپٹن اصغر کی ایک ٹانگ اُس کے جوان نے بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور اُس نے ٹانگیں لٹکا رکھی تھیں۔ پاؤں پُل کے کنارے جما رکھی تھیں۔ اصغر بہت نیچے جھک گیا تھا اور وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر ڈائنامیٹ رکھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔

ایک جگہ مل گئی جہاں اُس نے ڈائنامیٹ رکھ دیا۔ جیب سے سگریٹ لائٹر نکالا اور جتی کو آگ لگائی۔ بتی سے اوپر اُٹھا اور بولا ”پیچھے کھینچو۔“ اپنے جوان کی مدد سے وہ پیچھے آ گیا۔ قریب ہی اُس کے دو جوانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اُس نے دونوں کی مشین گنیں اُٹھا لیں اور دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”تم دونوں کے ساتھ کر دینا میں تمہیں دفن نہیں کر سکتا۔“ اور وہ اپنے جوان کو ساتھ لے کر دوڑ پڑا۔ اب ڈائنامیٹ کو پھٹنا تھا۔

دوڑتے دوڑتے وہ گرا۔ اُٹھا۔ اُس کا جوان بھی گرا۔ کیپٹن اصغر نے اُسے بھی اُٹھایا۔ اُس نے بلند آواز سے کہا ”خبردار..... آڑ لے لو۔“

سیکنڈ گزرنے لگے۔ اصغر نے ایک جگہ بیٹھ کر دیکھا۔ اُسے ڈائنامیٹ کی بتی کا شرارہ نظر آ رہا تھا ——— اور پھر موسلا دھار بارش اور جھکڑ سے ٹمٹماتی ہوئی سیاہ کالی رات ایک مہیب شعلے سے چمکی اور دہشت طاری کرنے والے دھماکے سے کانپ گئی ——— پُل کے پرخچے اُڑ گئے۔

پہلی کچھ دُور آ کر اکٹھی ہوئی مگر پوری نہیں تھی۔ دو تو پُل کے ساتھ اُڑ گئے تھے۔ ایک پہلے ہی ندی کی نذر ہو گیا تھا۔ چار جوان تائب صوبیدار کی پارٹی سے کم تھے۔ انہیں آوازیں دی گئیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ سات جوان قربان ہو گئے تھے۔ کیپٹن اصغر نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سب کے ہاتھ اُٹھ گئے۔ وہ لاشیں اُٹھا کر نہیں لا سکتے تھے۔ لاشوں کے بغیر واپس آنے کے لیے انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو تیار کیا۔ وہ وہاں رُک نہیں سکتے تھے۔ یہی ان جانبازوں کی زندگی تھی۔ یہی ان کے لیے حکم تھا کہ ساتھیوں کی لاشیں جہاں گریں وہیں پڑی رہنے دو۔

iqbalmt@onenurdu.com scanned

"وقت تھوڑا رہ گیا ہے صاحب!" — ایک گائیڈ نے کہا — "اب راستے میں دشمن بیلدر ہوگا۔"
پلٹن واپس چل پڑی۔

سادن کی اُس رات آسمان میں بڑی زور کا دھماکہ ہُوا۔ یہ ایک بھیانک کڑک تھی۔ بچہ پلٹن اصغر کی ماں سلمٰی ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ سلمٰی نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ کر بلند آواز سے کہا — "اصغر!"

سلمٰی کا خاوند رجب علی اُس سے دُور نہیں تھا۔ ایک ہی پلنگ تھا۔ رجب علی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے لیمپ کا بٹن دبا کر لیمپ جلایا۔ دیکھا سلمٰی دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے، آنکھیں پوری طرح کھولے، سخت گھبراہٹ اور خوفزدگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اُس کے منہ سے بے اختیار آوازیں نکل رہی تھیں — "یا اللہ۔ یا اللہ!"

"کیا ہُوا سلمٰی؟" — رجب علی نے اُسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہُوئے کہا — "خواب میں ڈر گئی ہو؟"

آسمان ایک بار پھر پھٹا۔ پہلے کی طرح ایک اور کڑک، ایک اور دھماکہ — سلمٰی رجب علی کے ساتھ لپٹ گئی اور چہرہ اُس کے سینے میں چھپا لیا۔

"تم تو کانپ رہی ہو سلمٰی!" — رجب علی نے اُسے اپنے ساتھ اور زیادہ بھینچتے ہُوئے کہا — "بجلی کڑکی ہے، برس رہا ہے۔"

"اصغر کہاں ہے؟" — سلمٰی نے سر اٹھا کر رجب علی سے کہا — "معلوم نہیں کہاں ہوگا۔ کہیں باہر برس رہا ہوگا۔ سایا اپنے کمرے میں ہی ہو۔ اکیلا ہوگا۔"

"وہ بہادر ہے" — ملک رجب علی نے اپنا گال اُس کے سر پر دبا کر بڑے پیار سے کہا — "وہ اکیلا بھی ہوگا لیکن تمہاری طرح ڈرتا نہیں ہوگا۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ایسی بزدل ماں تو نہ تھیں!"

"بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا ہے" — سلمٰی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا — "آسمان سے مینھ بھی برس رہا ہے، شرارے بھی برس رہے ہیں۔ اصغر اپنے سات آٹھ دوستوں کے ساتھ معلوم نہیں کہاں جا رہا ہے۔ ان سے چلا نہیں جاتا۔ معلوم نہیں کیچڑ ہے یا کیا ہے کہ اصغر اور اُس کے دوستوں کے پاؤں اٹھتے نہیں۔ قدم آگے نہیں بڑھتے.... پھر.... پھر" — سلمٰی کی آواز خوف سے دبنے لگی۔ اُس نے رُک رُک کر کہا — "پھر بڑی زور کا دھماکہ ہوتا ہے.... آسمان سے آگ کا بہت بڑا گولہ بڑی تیزی سے آتا ہے اور نیدھا.... سیدھا.... نہیں نہیں.... ایسا نہیں ہو سکتا" — اُس نے روتے ہُوئے کہا — "نہیں ہو سکتا ایسے!"

"صاف کہہ دو کہ آگ کا گولہ اصغر پر گرتا ہے" — رجب علی نے کہا — "ایسے کہو گی تو دل سے دہشت اُڑ جائے گی" — اُس نے سنبھل کر کہا — "دل اتنا کمزور نہ کرو سلمٰی! اصغر جہاں کہیں ہے خیریت سے ہے۔ خدا کو یاد کرو۔ اصغر کے لیے دعا کرو.... اور دیکھو، خواب میں کسی زندہ عزیز کو مرا ہُوا دیکھو یا

by iqbalmt@oneurdu.com scanned

اُسے کسی مصیبت میں پڑا ہُوا دیکھو تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اُس کی عزیلی ہے اور وہ جہاں کہیں ہے بڑے مزے میں ہے۔"

"آپ سو جائیں" ـــــ سلمٰی نے کہا ـــــ "میں نفل پڑھوں گی۔"

"ضرور پڑھو" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "لیکن میں سو نہیں سکوں گا۔"

"لیٹیے" ـــــ سلمٰی نے رجب علی کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اپنی طرف کرتے ہُوئے کہا ـــــ "اتنے دنوں سے اصغر کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ خط بھی نہیں آیا اُس کا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ ہفتے کی رات آجایا کرو اور اتوار کی شام چلے جایا کرو۔ دو اتوار گزر گئے ہیں۔ وہ نہیں آیا۔ آپ صبح راولپنڈی چلے جائیں۔"

"ہو سکتا ہے وہ راولپنڈی نہ ہو۔"

"یہ تو پتہ چل جائے گا۔ وہ کہاں ہے" ـــــ سلمٰی نے منت سماجت کے لہجے میں کہا ـــــ "اُس کی خیر خیریت تو معلوم ہو جائے گی۔"

ساون کی بارش نے چھت پر ایسا شور بپا کر رکھا تھا جیسے لوہے کے پُل سے بڑی ریل گاڑی گزر رہی ہو۔ اس کے ساتھ گھٹاؤں کی دھماکہ نما گرج اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے بجلی کی کڑک جیسے رجب علی کی کوٹھی کے لان میں توپیں داغی جا رہی ہوں۔ رجب علی کی باتوں سے سلمٰی کا دل ڈرا ہُوا تھا تو گرج اور کڑک اُس کا حوصلہ پھر توڑ دیتی تھی۔ کبھی تو وہ یوں تن جاتی جیسے ابھی نکل جائے گی اور اپنے بیٹے اصغر کو ڈھونڈتی پھرے گی۔

"آپ صبح راولپنڈی چلے جائیں" ـــــ اُس نے پھر التجا کی ـــــ "آپ نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا؟"

"میں ہی جاؤں گا سلمٰی۔ ہیں ہی جاؤں گا" ـــــ رجب علی نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ نہ بھولو کہ وہ فوج کا کیپٹن ہے اور تم جانتی ہو فوج کا کیا کام ہوتا ہے۔ اس کو ان کچھ کے محاذ پر نہیں بھیجا گیا۔ کل انڈیا حملہ کر دیتا ہے تو اصغر کو گھر سے آدھی رات کو کوئی فون آ جائے تو چلے جانا؟"

"نہیں ـــــ نہیں" ـــــ سلمٰی نے بڑی پختہ آواز میں کہا ـــــ "میں اُسے محاذ پر جانے سے نہیں روکوں گی۔ میں اُسے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کروں گی اور اُسے کہوں گی کہ اپنے باپ کی طرح وطن پر اپنی جان قربان کرنے سے نہ ڈرنا۔ میں اپنے سینے پر پتھر رکھ لوں گی مگر شہادی قبر کے پتھر پر شہید کا لفظ دیکھ کر مجھے سکون آ جائے گا۔"

"ایک طرف تمہارا یہ جذبہ دوسری طرف تمہاری یہ جذباتی حالت" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "اگر اصغر یہاں لاہور چھاؤنی میں ہوتا تو تم دوڑ کر اُس کے پاس جا پہنچتیں اور اُس کے جذبے کو تباہ کر دیتیں۔"

رجب علی کو معلوم تھا کہ اصغر کمانڈو ہے اور کشمیر میں کمانڈو ایکشن شروع ہو چکا ہے۔ رجب علی کو یقین تھا کہ اصغر نے اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا اور وہ اتوار آیا بھی نہیں تو وہ ضرور مقبوضہ کشمیر میں مشن پر چلا گیا ہے۔

"اور ہو سکتا ہے ـــ" اُس نے اپنے آپ سے کہا ـــــ "اور یہ امکان ہے کہ اصغر زخمی ہو کر پکڑا گیا ہو یا شہید ہو گیا ہو ـــ اگر ایسی سرکاری اطلاع آ گئی تو ـــ"

○

کیپٹن اصغر ملک رجب علی کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ یہ رشتہ کہیں تک تھا کہ رجب علی اصغر کی ماں کا خاوند تھا۔ خود اُن کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن رجب علی نے ماں بیٹے کے ساتھ روح کا رشتہ قائم کر لیا تھا۔ وہ اصغر کے باپ کا قائل تھا۔ وہ اس گناہ کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔ اصغر کو اپنا سگا بیٹا کہہ کر اور اُسے سگے باپ کا پیار اور شفقت دے کر رجب علی کو روحانی سکون ملتا تھا۔ سلمٰی کو تو اُس نے اپنی روح میں سمویا تھا۔ سلمٰی خوبصورت عورت تھی۔ رجب علی کو اُس کے جسمانی حُسن نے بھی ایسا متاثر کیا تھا کہ وہ اپنے قلبی کو اور اپنے گناہوں کو بھول گیا تھا۔ سلمٰی کے خاوند عبدالجلیل کے قتل نے رجب علی کو نیا انسان بنا دیا تھا۔ سلمٰی اور اصغر نے تو اُسے بہ خوشی معاف کر دیا تھا مگر رجب علی نے اپنے آپ کو معاف نہیں کیا تھا۔ وہ سلمٰی اور اصغر کے لیے جان تک قربان کرنے کا عہد کیے ہُوئے تھا۔

اب سلمٰی اُسے کہہ رہی تھی کہ وہ اصغر کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے راولپنڈی چلا جائے تو وہ اُسے ٹالنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ یوں سوچ رہا تھا کہ اصغر اُس کا سوتیلا بیٹا ہے۔ خیریت سے نہ ہُوا تو کیا ہو جائے گا۔ اُسے جب خیال آیا کہ اصغر کمانڈو مشن پر چلا گیا ہوگا اور اس پُرخطر مشن میں وہ زخمی بھی ہو سکتا ہے، شہید بھی اور وہ پکڑا بھی جا سکتا ہے تو اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔

"مجھے جذبے سے خالی نہ سمجھیں" ـــــ سلمٰی نے کہا ـــــ "میرے دس بیٹے ہوتے تو سب کو پاک سرزمین پر قربان کر دیتی۔ انڈیا، بھارت، ہندوستان، ہندو، یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے لیے میں اپنے کان بند کر دیتی ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی لفظ میرے کانوں میں پڑتا ہے تو میں اپنے خون میں اُبال محسوس کرتی ہوں۔ کبھی تو مجھے اور نفرت سے میرے دانت بجنے لگتے ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ میں نے خواب ایسا دیکھا ہے۔"

سلمٰی نے ایک اور توپ داغی۔ چھت پر کئی رائفلیں بڑی زور سے گرجیں۔ چھت پر کئی رائفلیں اور ڈنڈے بھی کڑک پیٹ پڑے۔

"آپ کل راولپنڈی چلے جائیں" ـــــ سلمٰی نے خوفزدہ آواز میں کہا ـــــ "معلوم نہیں اصغر کہاں ہے۔ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔ میں اُسے ایک بار دیکھ لوں۔ میں نہ دیکھ سکوں تو آپ دیکھ آئیں۔"

"اُٹھو" ـــــ رجب علی نے کہا ـــــ "تم نفل پڑھو اور دعا کرو کہ اصغر بیٹا جہاں کہیں بھی ہے خیریت سے ہو اور اللہ اسے کامیابی عطا فرمائے۔"

سلمٰی اٹھی۔ وضو کر کے آئی اور مصلّے بچھا کر نفل پڑھنے لگی۔ رجب علی پلنگ پر بیٹھا اُسے دیکھتا رہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس کے سامنے سلمٰی جیسی بے شمار مائیں آ گئی تھیں۔

"آج بات نہ جانے کتنی ماؤں کے بیٹے گھٹاؤں کی اس گرج میں، بجلی کی اس کڑک میں اور مقبوضہ کشمیر کی طوفانی بارش میں پھسلتے، گرتے، کیچڑ میں دھنستے اپنے وطن کے نام پر موت سے معرکہ آرا ہوں گے" ـــ رجب علی کو خیال آیا ـــــ "کون جانے ان میں سے کون آئے گا اور کون ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔"

وہ پلنگ پر بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر اپنے بازوؤں پر گئی۔ بازوؤں کے پٹھے مضبوط تھے۔ جوانی کے آخری دور نے ان بازوؤں کو جیسے اور زیادہ مضبوط بنا دیا تھا۔ سلمٰی کو دیکھ کر وہ اور زیادہ جوان ہو جایا کرتا تھا۔ اُس نے سلمٰی کو دیکھا جو رکوع و سجود میں مصروف تھی۔ اس دلکش جسم نے رجب علی کے ڈھلتے شباب میں نئی روح

iqbalmt@onenet.com.pk scanned by
خوبصورت لوگوں کی محبت

نئی تازگی اور نیا ولولہ پھونک دیا تھا۔

"کیا مرد کا جسم عورت کے لیے ہوتا ہے؟" — اُسے خیال آیا — "کیا جسم صرف اس لیے بنا ہے کہ لذت حاصل کرے اور لذت دیتا کرے؟ لوگ اسی لیے جسم کو تندرست و توانا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نادیدہ لذت کا سرچشمہ بنا رہے..... اور رکوع و سجود میں جھکتا اور اٹھتا یہ جسم..... سلمیٰ کا جسم..... ہاں بڑا دلکش ہے سنگ اس جسم نے ایک اور جسم کو جنم دیا ہے اور وہ جسم آج اپنی توانائی اپنے وطن پر صرف کر رہا ہے۔ وہ لذت سے، اعتکاف سے اور کسی دلکش جسم کے لمس اور وصال سے بے نیاز ہے۔"

ایک اور دھماکہ آسمان میں ہوا مگر رجب علی کو یوں لگا جیسے کلی کا دھماکہ اُس کے اپنے سینے میں ہوا ہو۔ اُس نے دونوں بازو اپنے آگے کیے۔ پھر ہاتھوں سے ان کی مضبوطی اور توانائی کو محسوس کیا۔

"کس کام کے ہیں یہ بازو؟" — اُس نے اپنے آپ سے کہا — "اصغر جیسے نوجوان اس وقت کہاں ہوں گے۔ میں اس وقت کہاں ہوں" — اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا — "میں قوم کے کس کام آیا؟ کیا حق ہے میرا کہ میں اس محل میں اس نرم بستر میں بیٹھا ہوں؟ کیا کیا ہے میں نے اس عزیز گنا ہگاروں کو بخشا اور بے گناہوں کی ہڈی پسلی ایک کر کے اقبال جرم کرائے" — اُسے مجید الجلیل یاد آگیا۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے خون میں جوش آگیا تھا۔ وہ بے چین ہوگیا۔ اُسے احساس تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر نے مقبوضہ کشمیر میں جو کمانڈو اپریشن شروع کیا ہے، یہ دونوں ملکوں کی جنگ کا باعث ضرور بنے گا۔ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بناتے ہوئے تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں کمانڈو اپریشن کی کامیابیوں کی تفصیلات پاکستان کے اخباروں میں شائع ہو رہی تھیں۔ ان میں مصلحتاً یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں نے بھارتی فوج کے خلاف گوریلا اپریشن شروع کر دیا ہے۔

ان خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ کمانڈو جانبازوں نے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کو مفلوج کر دیا ہے اور اُس کے لیے ذرائع آمد و رفت ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ فوجی اہمیت کے پل تباہ ہو چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ تباہ ہو رہے تھے۔ گولہ بارود کے ذخیرے اُڑا دیئے گئے تھے۔ حد یہ کہ کمانڈو ٹولیاں سرینگر تک پہنچ گئی تھیں اور اور دگرد کی فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ فضائی کمک کو اترنے سے روک دیا گیا تھا کیونکہ کمانڈو اپریشن سے محفوظ نہیں تھے۔ ان پر ڈرے دلیرانہ اور تباہ کن شب خون مارے گئے تھے۔

ملک رجب علی اتنی سی بات سمجھ سکتا تھا کہ بھارت مقبوضہ کشمیر کو بچانے کے لیے پاکستان پر پوری جنگی طاقت سے حملہ کرے گا اور بڑی سخت جنگ ہوگی۔

"ہونی چاہیئے" — رجب علی نے سوچا — "ہر نئی چاہیئے۔ ہندو کو اپنی جنگی طاقت پر ناز ہے۔ اُس کا یہ ناز اور یہ مان توڑنا ضروری ہے، لیکن میں کس کام آؤں گا؟ میرے بازو کیا تیر ماریں گے؟..... مجھے کچھ کرنا ہے۔ قوم کے ہر فرد کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

گھنٹیاں ایک بار پھر گرجیں۔ رجب علی نے اُوپر دیکھا۔ سلمیٰ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ اُس نے ہاتھ اور اوپر کر دیئے۔

○

گھنٹاؤں کی یہ گرج ایسی تھی جیسے تین چار مارٹر گنیں یکے بعد دیگرے فائر ہوئی ہوں۔ کیپٹن اصغر اور اُس کی پارٹی پک جھپکتے زمین پر لیٹ گئی۔

"سر! بادل گرجے ہیں" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا — "کشمیر کے بادل جب گرجنے پر آتے ہیں تو اسی طرح گرجا کرتے ہیں..... ہم رکیں گے نہیں۔ رات تھوڑی رہ گئی ہے۔"

"بارش چلنے نہیں دے رہی" — کیپٹن اصغر نے اٹھتے ہوئے کہا — "لیکن یہ صحیح معنوں میں بارانِ رحمت ہے۔ دشمن پوسٹوں میں دبکا ہوا ہے اور پٹرولیں بھی باہر نہیں آرہیں۔"

پھر بھی وہ علاقہ دشمن کا تھا۔ وہ تو جیسے بھیڑیوں کا جنگل تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہاں بھیڑیے بے خبری میں حملہ کر دیں۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی تھی اور گھٹائیں بڑے قہر سے گرجنے بھی لگی تھیں۔ کیپٹن اصغر بہت خوش تھا کہ وہ اپنے پہلے ہی مشن میں کامیاب رہا اور کامیابی سے واپس آرہا تھا۔ وہ مشن پر تیس آدمی لایا تھا اور تیرہ کو واپس لے جا رہا تھا۔ ان میں تین زخمی تھے۔ اُن کے بٹلوں میں سے گولیاں گزری تھیں۔ پٹیاں محفوظ تھیں۔ ان کے زخموں پر فیلڈ پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اور ان کے ساتھی انہیں سہارا دے کر اور کبھی کندھوں پر اٹھا کر لا رہے تھے۔

کیپٹن اصغر تینوں سے باری باری کئی بار پوچھ چکا تھا کہ وہ زیادہ تکلیف تو محسوس نہیں کر رہے؟

"اگر تکلیف اور درد زیادہ ہے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟" — ایک نے کہا تھا — "سر! آپ کیوں بار بار پوچھ رہے ہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں سر!"

"زخم ہے تو درد بھی ہوگا سر!" — دوسرے زخمی نے کہا تھا — "پل کا دھماکہ یاد آتا ہے تو درد ختم ہو جاتا ہے۔" — اور اُس نے درد کو دباتے ہوئے قہقہہ لگایا تھا۔

تیسرے زخمی کو ساتھی باری باری پیٹھ پر اٹھا کر لا رہے تھے۔ اُس کے کولہے میں سے گولی گزر گئی تھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے تین چار مرتبہ کہا تھا کہ وہ نکل جائیں اور اُسے پھینک دیں۔

"سر! میں اپنے دوستوں کے لیے اتنا بوجھ نہیں بننا چاہتا" — اُس نے کیپٹن اصغر سے کہا تھا — "میری وجہ سے آپ تیز نہیں چل رہے۔ آپ نکل جائیں سر! میرے سر میں گولی مار دیں۔ میں دشمن کا قیدی نہیں بنوں گا۔"

"ہم تمہیں زندہ واپس لے جائیں گے عابد!" — کیپٹن اصغر نے اُسے کہا تھا — "تم زندہ رہو گے اور پھر یہاں آؤ گے۔"

ابھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان تیرہ میں سے کون اپنے ہیں تک زندہ پہنچے گا۔ تنگ وادیاں سیلابی ندیاں بن گئی تھیں۔ پانی کہیں گھٹنوں تک تھا، کہیں ٹخنوں سے کچھ اوپر اور کہیں گھٹنوں سے بھی اوپر تھا۔ پانی تیز بھی تھا اور بہت ٹھنڈا بھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے موسلا دھار بارش میں جا رہے تھے۔ جسم اکڑنے لگے تھے۔ نائب صوبیدار اسلم نے کیپٹن اصغر کو ہنستے ہوئے کہا تھا — "سر! آپ کے بھی دانت بج رہے ہیں؟"

کیپٹن اصغر ہنس پڑا تھا۔ تب اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کے جبڑے اُس کے اپنے قابو میں نہیں ہیں۔ جبڑے جہاں کانوں کے ساتھ ملتے ہیں وہاں درد اٹھنے لگا تھا۔ کیپٹن اصغر جیسے جوان اور نائب صوبیدار اسلم جیسے سخت جان آدمی کی پسلیاں ڈکھنے لگی تھیں۔ چلنے کی رفتار بہت سست تھی۔

iqbalmt@onemuslim.com scanned by

اُس وقت سلمٰی نفل پڑھ رہی تھی اور چار نفل پڑھ کر دعا کرتی تھی۔ گھٹاؤں کے جو دھما کے اُس کے سر پر ہو رہے تھے ویسے ہی گرجدار دھماکوں میں اُس کا بیٹا دشمن کے علاقے سے زندہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس پر بجلیاں لپک رہی تھیں۔ بادوباراں کے تھپیڑے اُس کا راستہ روک رہے تھے۔ کیچڑ اور سیلابی وادیاں اُس کے قدم جکڑ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان اور زمین نے دشمن کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دشمن تو بلندیوں پر پوسٹوں میں دبکا ہوا تھا۔ کمانڈو پارٹی کو روکنے کا کام گھٹائیں اور آسمان کر رہا تھا۔

سلمٰی کے سر پر گھٹائیں گرجتی تھیں تو اس کے منہ سے اللہ کا نام بھرا اپنے بیٹے کا نام نکلتا تھا۔ بیٹے کی مدد یاں بھر... ے دکھنے لگی تھیں۔

ماں کے آنسو بہنے لگے تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھی وہی خدا تھا جو لاہور میں تھا۔

ماں کو معلوم نہیں تھا کہ بیٹا کہاں ہے۔ مامتا نے محسوس کر لیا تھا کہ بیٹا کسی مشکل میں ہے۔

بیٹے کے دل سے ماں نکل گئی تھی۔ اُسے رجب علی بھی یاد نہ رہا۔ شمیم بھی اُس کے دل سے نکل گئی تھی۔

نائب صوبیدار صاحب آ... کیپٹن اصغر نے پوچھا۔ "آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے ہم صبح سے پہلے دشمن کے علاقے سے نکل جائیں گے؟"

"اگر بہت ایسے ہی قائم رہی تو اللہ نکال لے جائے گا..." صوبیدار نے جواب دیا۔

"کمال یہ ہو کہ ان تین رکنیوں میں سے کسی کو پیچھے نہ چھوڑیں۔"

"نہیں چھوڑیں گے سر آ... - نائب صوبیدار نے کہا۔ "لیکن سر میں آپ کو بتا دوں کہ اس طوفان کا میرا پہلا تجربہ ہے۔ میں ایسے طوفان میں پہلے کبھی نہیں پھنسا تھا۔"

○

سلمٰی نے اپنے دل پر ایسا بوجھ پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ خواب میں یوں دوڑنے کا تجربہ اُسے پہلی بار ہوا تھا۔ اصغر کی آخری سرزنش میں سلمٰی نے اُسے خواب میں کبھی یوں نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ کا گولہ گر رہا ہو۔

"ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ لو..." پارٹی کے گائیڈ عبدالرحمٰن نے کہا۔ "آگے ندی ہے۔ پانی کم تک جائے گا۔ پاؤں اچھی طرح جمانا۔ دل مضبوط رکھنا۔ اللہ نکال دے گا۔"

ماں کی آنکھیں اشک بہا رہی تھیں۔ وہ رجب علی کی اس تسلی کو قبول نہیں کر رہی تھی کہ اصغر جہاں کہیں ہے خیریت سے ہے۔ اُس نے ہاتھ پھیلا رکھے تھے جو اُس نے جوڑ دیئے۔ اُس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ اب وہ زبان سے بول بھی نہیں سکتی تھی۔

کیپٹن اصغر کی پارٹی ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے ایک دیوار کی طرح سیلابی ندی سے گزر رہی تھی۔ زخمی عابد ایک جوان کے کندھے پر تھا۔ وہ سیلاب اور طوفان سے زیادہ بلند آواز سے بولا۔

"میرے دوستو! میرے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ۔ مجھے گنوا بیٹھو۔ مجھے سیلاب میں پھینک دو۔ تم سب نکل جاؤ۔ مجھے اللہ کے حوالے کر دو۔"

کیپٹن اصغر نے اس سے زیادہ بلند آواز میں کہا۔ "مجروح عابد! دعا کرو سب نکل جائیں۔ تمہاری مدد

بہت ہے۔ ہماری مدد کرو۔ دعا کرو۔"

اُدھر سلمٰی نے سسکی لے کے کہا۔ "میرے اللہ... میرا بیٹا!"

اِدھر زخمی عابد نے گا بیٹھا۔ (مخصوص فوجی نعرہ لگایا۔ - "بولو نعرۂ حیدری۔"

تیرہ آدمی گھٹاؤں کی طرف گرجے۔ "یا علیؑ۔"

ندی نے آخری بار بولا اور انسانوں کی اس زنجیر کو توڑنے کی کوشش کی مگر اُدھر اللہ اور اِدھر علیؑ کے نام سے زنجیر کے پہلے دو آدمی ندی سے نکل گئے۔ انہوں نے کنارے پر پاؤں جما لیے مُڑ کر اپنے ساتھی آگے ہی آگے ہوتے گئے۔ سیلاب کا زور بہت تند تھا۔ کچھ آگے جا کر تمام پارٹی نکل گئی۔

"خطرے سے نکل آئے ہیں۔" گائیڈ نے کہا۔ "اب دشمن کی دو پوسٹیں رہ گئی ہیں جو ہمیں اندھیرے میں نہیں دیکھ سکیں گی۔"

فلک رجب علی نے دیکھا کہ سلمٰی مصلے سے اٹھ نہیں رہی اور وہ روئے چلی جا رہی ہے تو اُس نے اٹھ کر سلمٰی کو مصلے سے اٹھایا۔

"اپنے آپ کو سنبھالو سلمٰی!"

"بیٹا سکون آ گیا ہے۔" - سلمٰی نے کہا۔ "خدا نے میری سُن لی ہے۔"

ایک ماں کی آہوں نے طوفان بادوباراں کا زور توڑ دیا۔

"میں ابھی راولپنڈی جا رہا ہوں۔" - رجب علی نے کہا۔ "اصغر کی خبر لے آؤں گا۔"

○

رجب علی ریل گاڑی سے راولپنڈی چلا گیا۔ وہاں اُسے کسی ہوٹل میں ٹھہرنا تھا لیکن پنڈی کے ریلوے سٹیشن پر اُسے اپنا ایک پرانا دوست مکتا مل گیا۔ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا تھا۔ وہاں اس کا وسیع آبائی زمینداری کاروبار تھا۔ اُس کے باپ دادا کو انگریزوں نے رئیس تھی اس لیے وہ انگریزوں کو مائی باپ سمجھتا تھا۔ اُس نے اپنے باپ دادا سے یہی سبق لیا تھا کہ انگریز قوم عبادت کے قابل ہے اور انگریز ہار اُن والے تحریکِ پاکستان کا وہ دشمن تھا۔ "لے کے رہیں گے پاکستان" کا وہ مذاق اُڑایا کرتا تھا۔

اُس وقت وہ جوان تھا۔ اُس نے اپنے مزارعوں اور نوکروں چاکروں سے کہہ رکھا تھا کہ کسی نے پاکستان کا نام بھی لیا تو اُسے ٹھوکے مار دوں گا۔ وہ عیاشیوں کا جوان تھا۔ رجب علی اُس وقت سب انسپکٹر تھا اور وہ ضلع کے اعزازی علاقے کے تھانے کا ایس۔ آئی۔ او تھا۔ رجب علی بھی کم عیاش نہیں تھا۔ فلک ہمدرد زندانی روایت اور رواج میں اپنے علاقے کے تھانیدار کی فاطر تواضع اور خوشامد بھی شامل تھی۔ فلک ہمدرد نے رجب علی کو دوست بنا لیا تھا۔ وہ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ فلک ہمدرد جیسے چاہتا تھا تھانے والا اُسے ویسے چاہتا تھا۔ حوالات میں بند کرا دیتا تھا۔

جس پاکستان کا وہ مذاق اُڑایا کرتا تھا وہ اُس کا مذاق اُڑانے کے لیے معرضِ وجود میں آ گیا۔ اُس کے خاندان کے مالی باپ بوریا بستر لپیٹ کر چلے گئے اور اُس کے خاندان کو ہندوؤں اور سکھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ اُس کے باپ اور دوسرے بزرگوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے کہا کہ ہم تو شروع سے پاکستان کے خلاف تھے۔ ہم ہندوستان میں رہیں گے مگر ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمان کو انسان نہیں سمجھا تھا۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ کون مسلمان پاکستان کے حق میں تھا یا مخالف۔ ان کفار نے جب مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا تھا تو انہوں نے کسی بھی مسلمان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کانگرسی ہے۔ یونینسٹ ہے۔ نیشنلسٹ ہے یا مسلم لیگی ہے۔

iqbalmt@onenurdu.com Scanned by

ملک نامر کے ساتھ اُس کے گاؤں کے سب کے سب نمبردار نے سکیورٹی کی تھی اور اُس کے سارے خاندان کو اپنی حفاظت میں ریوے سٹیشن تک پہنچا کر ریل گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ اُس سکھ نمبردار پر ملک نامر کے باپ کے کچھ احسانات تھے۔ اُس نے نمبردار کے بیٹے اور بھانجے کو چوڑیکہ کی واردات میں پکڑے سے گئے تھے۔ تھانے سے ہی چھڑا لیا تھا۔ جب ملک رجب علی وہاں کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او لگا تھا تو ملک نامر نے اس سکھ نمبردار کی کچھ واردا توں پر پردہ ڈالا تھا۔

سکھ نمبردار نے ملک نامر کے خاندان کو ریل گاڑی پر تو بٹھا دیا تھا لیکن وہ پاکستان تک ریل گاڑی کی حفاظت کا اہتمام نہیں کر سکتا تھا۔ ریل گاڑی مہاجرین سے اٹی ہوئی تھی۔ چھت پر بھی مسلمان اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ راستے میں گاڑی پر دو مرتبہ سکھوں نے ہلہ بولا تھا۔ فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ کئی مہاجرین شہید ہو گئے تھے۔

ملک نامر اپنے خاندان کے ساتھ ہراساں، بھوکا اور پیاسا پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ یہ خاندان اپنے تمام تر زیورات ساتھ لے آیا تھا۔ نقدی بھی خاصی تھی۔ پاکستان میں آ کر اس خاندان کو لاکھوں مسلمانوں کا ذرہ بھر غم نہیں تھا جو شرقی پنجاب میں شہید کر دیے گئے تھے۔ ملک نامر پر ہجرت کے سفر کا بھی کچھ اثر نہ تھا۔ اُسے اور اُس کے خاندان کو صرف یہ غم تھا کہ اُن کی بے اندازہ اراضی اور جائیداد سرحد پار رہ گئی تھی۔

اُدھر سے کئی مسلمان ایسے آئے تھے جو اثر و رسوخ والے تھے۔ ان میں ملک رجب علی بھی تھے۔ ملک نامر کے پاس زیورات اور دولت بھی تھی۔ کچھ اثر و رسوخ اور کچھ دولت نے یہ ہوا کہ ملک نامر کے خاندان کو پاکستان میں اُس سے زیادہ اراضی مل گئی جو یہ لوگ مشرقی پنجاب میں چھوڑ آئے تھے۔ ہندو سکھ تو اپنی بہت سے سامان اور دکانیں لوٹ کر لائے۔ یہ خاندان سرکار نوازی میں مہارت رکھتا تھا۔ یہی اس خاندان کی روایت تھی۔ انہوں نے اپنی روایت کو پاکستان میں بھی زندہ رکھا اور پاکستان سرکار کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اور پھر یہ خاندان پاکستان سرکار بن گیا۔

پاکستان کچھ اور چیز ہے، پاکستان سرکار بالکل ہی مختلف چیز ہے۔ پاکستان کی حکومت جس کے بھی ہاتھ آئی وہ سرکار بن گیا اور اُس نے اپنی پسند کے ملک نامروں کا ایک گروہ اپنے اردگرد جمع کر لیا۔

○

یہ تھا ملک نامر جو ملک رجب علی کا دوست تھا۔ رجب علی راولپنڈی ریوے سٹیشن پر اترا تو وہاں اُسے ملک نامر مل گیا۔ دو دوست برسوں بعد ملے تھے۔ ملک نامر کی کوٹھی اسلام آباد میں تھی۔ اُس نے رجب علی سے کہا کہ وہ اُسے کہیں اور نہیں ٹھہرنے دے گا۔ اپنے پاس رکھے گا۔ اُس نے رجب علی کو اپنی کار میں بٹھایا اور اسلام آباد اپنے گھر لے چلا۔ راستے میں ملک نامر نے اُسے بتایا کہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ رجب علی نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ رجب علی نے اُسے کہا کہ نوکری سے اُس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

"تمہیں نوکری کی ضرورت ہی کیا ہے یار!" — ملک نامر نے کہا — "تم سرحدوں اور کوٹھیوں کے مالک ہو۔ آرام سے گھر بیٹھ کے کھاؤ..... کہو، یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"یار! میرا بیٹا فوج میں کیپٹن ہے۔ اُسے....."

"تمہارا بیٹا؟" — ملک نامر نے حیرت سے پوچھا — "کیا کہہ رہے ہو ملک؟"

"میرا ہی کھوپا ہے" — رجب علی نے کہا — "ایک بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ یہ اُس کا بیٹا ہے۔"

ملک نامر نے قہقہہ لگا کر کہا — "معلوم ہوتا ہے بھلے وقتوں میں ہو گئے ہو۔ شادی کی کیا ضرورت تھی؟"

ملک رجب علی نے اسے صحیح بات نہ بتائی کہ اُس نے اس بیوہ کے ساتھ کن حالات میں شادی کی ہے۔ قسمت و قسمت کی ایک وجہ بنا دی۔

"یہ بیوہ خوبصورت ہو گی؟" — ملک نامر نے کہا۔

"بہت۔"

"اور زمین جائیداد والی بھی ہو گی۔"

"نہیں" — رجب علی نے کہا — "اُس کا ایک ہی مکان تھا جو میں نے بیچ ڈالا تھا۔ غریب تھی۔"

"تم نے پیسہ لوٹنا بھی شروع کر دیا ہے یار!" — ملک نامر نے پوچھا۔

ملک رجب علی ہنس پڑا اور اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

ملک نامر نے اُسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ایک بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی ڈرائنگ روم میں آئی۔ اُس نے کتابیں اٹھا رکھی تھیں۔

"آ گئے بیٹی!" — ملک نامر نے اُس سے پوچھا — "انہیں پہچانا نہیں؟"

"کیوں نہیں پہچانا" — لڑکی نے کہا — "ملک رجب علی ہیں نا؟"

"اوئے شیطان!" — ملک رجب علی نے حیران ہو کے کہا — "تم اتنی بڑی ہو گئی ہو؟"

"اب شیطان نہیں ہے" — ملک نامر نے کہا — "پڑھنے میں تو دلچسپی ہے شرارتیں جتنی چاہو کر لو۔" اُس نے شفقت سے کہا — "پیار کھا رکھو! تم بھی ہمارے ساتھ کھایا کرو!"

تب ملک نامر نے رجب علی سے کہا — "خدا نے مجھے بادشاہی دی ہے، دولت دی ہے لیکن اس ایک اللہ سوا کوئی اور اولاد نہیں دی۔ اس کی ماں کا بہت علاج کرایا ہے۔ ڈاکٹروں نے مایوس کر دیا ہے۔ میں اور اس کی اکلوتی بیٹی کو دیکھ کر جیتا ہوں۔ یہ شاید اسی کا اثر ہے کہ یہ پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتی۔ سیر سپاٹے اور شاپنگ میں خوش رہتی ہے۔ اسے پڑھا کر کیا بھی کیا ہے۔ کالج جانے کا اسے شوق ہے جو میں پورا کر رہا ہوں۔"

○

کھانے پر شمیم کے علاوہ اس کی ماں بھی تھی۔

"تم یار اپنے سوتیلے بیٹے کی بات کر رہے تھے" — ملک نامر نے رجب علی سے کہا — "کیا کہنے لگے تھے اُس کے متعلق؟"

"وہ فوج میں کیپٹن ہے" — رجب علی نے کہا — "اُس کی خیر خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔"

"اُس کی یونٹ راولپنڈی میں ہے؟"

"یہی تو مشکل ہے کہ اُس کی یونٹ کا کچھ پتہ نہیں کہاں ہے" — ملک رجب علی نے جواب دیا — "وہ کمانڈو ہے اور اُس کا کمانڈو اپریشن میں شامل ہے جو مقبوضہ کشمیر میں شروع کیا گیا ہے۔ بہت دنوں سے اُس کا خط نہیں آیا۔ اُس کی ماں بہت پریشان ہے۔ لڑکے سیدھے خواب دیکھتی رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس لڑکے سے ملاقات نہیں ہو سکتی لیکن اُس کی ماں نے مجھے مجبور کر کے بھیجا ہے کہ اُس کی خیر خیریت معلوم

by iqbalmt@gmail.com Scanned

کرنے کے لیے راولپنڈی جاؤں۔"

"تم آپریشن جبرالٹر کی بات کر رہے ہو" — ملک ناصر نے کہا۔ "مقبوضہ کشمیر میں جو کمانڈو اور گوریلا آپریشن شروع کیا گیا ہے اُسے آپریشن جبرالٹر کا نام دیا گیا ہے۔"

"بڑا کامیاب جا رہا ہے" — رجب علی نے کہا۔

"آخر ناکام ہو گا" — ملک ناصر نے کہا۔ "پاکستان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا..... ملک! تم جانتے ہو انڈیا کے مقابلے میں پاکستان کی حیثیت ہی کیا ہے؟"

"ہمارے پاس جذبہ ہے" — رجب علی نے کہا۔

"تم جذبے سے انڈیا کے ٹینکوں کو توڑ دو گے؟" — ملک ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا جذبہ انڈیا کے لڑاکا بمبار طیاروں کو گرا لے گا؟..... پاکستان کو چاہئے کہ انڈیا سے ڈیل کر رہے۔"

معلوم ہوتا ہے تمہارے دل سے انگریزوں کے دشمنوں والی کدورت نکلی نہیں" — رجب علی نے کہا۔ "تم کسی وقت بھی پاکستان کے مفاد کے خلاف بھی ہو۔"

"جمالی جان!" — ملک ناصر کی بیوی نے کہا۔ "یہ تو دن رات انڈیا کے گُن گاتے ہیں۔"

"جانے دو یار!" — ملک ناصر نے کہا۔ "تم اپنے بیٹے کی بات کرو..... میں جانتا ہوں کہ [illegible] میں لیکن تم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں تمہیں معلوم کرا دوں گا۔ جی۔ ایچ۔ کیو سے پتہ چل جائے گا..... کیا نام ہے لڑکے کا؟"

"کیپٹن اصغر!"

ملک ناصر کی بیٹی شمیم نے چونک کر ملک رجب علی کی طرف دیکھا اور اُس کے چہرے سے بے اختیار نکلا —

"کیپٹن اصغر۔"

"پتہ چل جائے گا" — ملک ناصر نے کہا۔ "لیکن پاکستان آرمی بڑے خوبصورت جوان ضائع کر رہی ہے۔ پاکستان کو کشمیر سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔"

ملک رجب علی نے اُسے سنجیدہ کرنا چاہا۔ وہ ملک ناصر اور اُس کے سارے خاندان کو جانتا تھا۔ وہ اس شخص کے ساتھ سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہتا تھا لیکن ملک ناصر پاکستان کے خلاف باتیں کر رہا تھا۔

○

اگلے روز ملک ناصر رجب علی کو بتا کر چلا گیا کہ وہ کیپٹن اصغر کے متعلق صحیح اطلاع لینے جا رہا ہے۔ شمیم کالج نہ گئی۔ ملک ناصر چلا گیا تو شمیم ملک رجب علی کے پاس آ بیٹھی۔

"کیپٹن اصغر آپ کا بیٹا ہے؟" — شمیم نے پوچھا۔

"ہاں" — رجب علی نے کہا۔ "وہ میرا بیٹا ہے۔"

شمیم نے اصغر کا قد بُت اور حلیہ بتایا تو رجب علی نے کہا کہ وہی ہو سکتا ہے۔ اُس نے شمیم سے پوچھا کہ وہ اُسے کس طرح جانتی ہے؟ شمیم نے تھوڑا بولا کہ راولپنڈی میں ایک تقریب میں اُس سے تعارف ہوا تھا۔

"میں نے کل آپ کی بھی باتیں سُنی ہیں اور اپنے ابّو کی بھی" — شمیم نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ سچے پاکستانی ہیں۔ آپ جذبے کی بات کرتے ہیں لیکن میرے ابّو انڈیا کے دوست اور پاکستان کے دشمن ہیں۔ حیرت والی بات

یہ ہے کہ ابّو کا حکومت پر بھی اثر و رسوخ ہے اور فوج کے جرنیلوں پر بھی۔ مجھے شک ہے کہ میرے ابّو انڈیا کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں..... آپ حیران ہو رہے ہیں کہ میں اپنے باپ کے خلاف کتنی خطرناک اور توہین آمیز بات کہہ رہی ہوں۔"

"تمہارے ابّو کہتے ہیں کہ تم بہت شرارتی ہو" — رجب علی نے کہا۔ "کیا تم میرے ساتھ بھی شرارت تو نہیں کر رہیں؟ تمہارے ابّو میرے بڑے گہرے دوست ہیں۔"

"ابّو آپ کے دوست ہو سکتے ہیں پاکستان کے نہیں۔" شمیم نے کہا۔ "میں بُری طرح سنجیدہ ہوں۔"

ملک رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکا تھا۔ وہ ہر اجنبی کو اور ہر نئی اور انوکھی بات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا عادی تھا۔ وہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ملک ناصر کی شہزادی جیسی بیٹی اور انگریزوں کے پروردہ خاندان کی یہ لڑکی پاکستان کی اتنی خیرخواہ ہو سکتی ہے کہ اپنے باپ کے خلاف اتنی سنگین بات کر گزرے، اور وہ بھی ایک ایسے آدمی کے ساتھ جس کے متعلق وہ نہیں جانتی کہ وہ بھی پاکستان کے خلاف جاسوسی میں ملک ناصر کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ رجب علی کو شک ہوا کہ یہ لڑکی اُس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہے۔ اس خاندان کی شہزادی میں قومی جذبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"تم نے مجھ پر اعتماد کیسے کر لیا ہے شمیم!" — رجب علی نے کہا۔ "تم نے مجھ پر بھی انڈیا کا جاسوس ہونے کا شک کیوں نہیں کیا؟"

"اگر میں انڈیا کے جاسوس ہوتے تو آپ اپنے بیٹے کو فوج میں نہ جانے دیتے" — شمیم نے کہا۔ "میں جانتی ہوں آپ بہت بڑے رسوخ والے ہیں۔ اپنے بیٹے کو لوکر کرا لے کی آپ کو ضرورت نہیں تھی۔ آپ اصغر جیسے دس بیٹوں کی کمیشن کرا سکتے ہیں۔ اصغر نے مجھے کہا تھا..... وہ چونک کر چُپ ہو گئی اور اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"[illegible] اصغر نے کیا کہا تھا؟"

"میں آپ کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اصغر کے ساتھ میرا کچھ تعلق ہے۔"

"کیسا تعلق؟"

"ایسا تعلق جس نے مجھ جیسی لڑکی کو سنجیدہ بنا دیا ہے" — شمیم نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے کہا۔ "اُس کے ساتھ میری پہلی ملاقات میری شرارت تھی۔ فیصل پارک میں اُسے دیکھا۔ پھر ہم ملتے رہے۔ آپ کسی شک میں نہ پڑ جائیں..... اُس نے آخری ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ وہ کشمیر کے محاذ پر جا رہا ہے۔ میرے آنسو اُسے روک نہیں سکتے تھے۔ اُس نے کہا تھا۔ 'میں اپنے ملک کا ہی نہیں فضاؤں تمہاری عصمت کا محافظ ہوں'۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ اُسے میں اپنا اور صرف اپنا سمجھتی ہوں اور اپنے ابّو کو اصغر کا اور اپنی عصمت کا دشمن سمجھنے لگی ہوں۔"

"اصغر پاکستان کی عصمت کا محافظ ہے" — رجب علی نے کہا۔ "اور تمہیں میں اصغر سے کم نہیں سمجھتا..... مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ابّو کا میل ملاقات کس قسم کے لوگوں کے ساتھ ہے کہ تمہیں اس پر جاسوسی کا شک ہوا ہے۔"

"میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکتی" — شمیم نے کہا۔ "ان کے پاس جو لوگ آتے ہیں ان میں دو تین مجھے ہندو لگتے ہیں اور جو مسلمان آتے ہیں وہ ہندوؤں سے زیادہ خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی فوج کے متعلق کوئی مجھ سے راز کی بات

iqbalmt@oneurdu.com scanned by

معلوم کرنی ہو تو میرے ابّو سے معلوم کر سکتے ہیں..... آپ ان سے تو نہیں کہیں گے کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے؟"

"بیٹی!"۔ ملک رجب علی نے کہا "تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے تمہیں اس کا صلہ نہیں دے سکتا، خدا دے گا..... تم نے میرا ایک مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں پریشان تھا کہ خدا نے مجھے جسمانی قوت دی ہے، سوچنے والا دماغ دیا ہے لیکن میں اپنی قوم کے لیے اور پاکستان کے لیے محض بیکار ہوں۔ ہسپتال میں جا کر خون دینا اور دفاعی فنڈ میں چندہ دینا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں کسی محاذ پر جا کر خون دینا چاہتا ہوں..... ایک بڑی جیپ طرح فورکر کو تسلیم اکرم ابھی چھوٹی ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ جذباتی ہو۔ خدا کرے اپنے ابّو کے متعلق تمہارا شک صحیح نہ ہو۔ اگر صحیح ہے تو ہو سکتا ہے دوسرے ہاتھوں کسی شکل میں پھنس جائیں۔ گرفتار ہو جائیں۔ معلوم نہیں کیا ہو جائے۔ پھر تمہارے جذبات کا رُخ اپنے ابّو کی طرف ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے تم ہی ان کی خفیہ سرگرمیوں پر پردہ ڈال دو۔"

"مجھے اپنے ابّو سے پیار ہے"۔ تسلیم نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "یہ باپ بیٹی کا پیار ہے لیکن اصغر مجھے جو جذبہ دے گیا ہے وہ اس پیار پر غالب آ گیا ہے۔ مجھے جاننے والے اور میری سہیلیاں کبھی یقین نہیں کریں گی کہ میں پاکستان کے معاملے میں اتنی جذباتی ہو سکتی ہوں۔ میں کہ کڑے اور قہقہے لگانے والی کھلنڈری لڑکی ہوں۔ میں کبھی بھی شرارت سے نہیں ڈرتی جہاں کالج کا کوئی شیطان لڑکا بھی شرارت کی جرأت نہیں کرتا۔ میں ایسی ہی ہوں۔ مجھے اپنے ایک کو زندہ رکھنا ہے لیکن میرے خیالوں میں جو انقلاب آ گیا ہے اسے میں دبا نہیں سکتی۔ یہ خود آیا ہے۔ اسے اصغر کی محبت لائی ہے۔ اس پر میرا اختیار نہیں کسی قوت نے مجھے اس انقلاب کے حوالے کر دیا ہے..... میرا اختیار کریں۔"

"ایسے انقلاب کا تجربہ مجھے بھی ہو چکا ہے"۔ رجب علی نے کہا۔ "مسلمان کی زندگی میں کوئی ایسا وصف یا کوئی ایسا عنصر ہے جو اُسے مجرم سے مجاہد بنا دیتا ہے۔ اکثر لوگ خصوصاً ہمارا نوجوان طبقہ اس جہاد کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر ذرا سا جھٹکا یا اپنی کوشش مجاہد کو مرنے سے بچا لیتی ہے۔"

باہر کار کی آواز آئی۔

"ابّو آ گئے ہیں"۔ تسلیم نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

○

ملک نامر کیپٹن اصغر کی اطلاع لے آیا تھا۔ اُس نے رجب علی کو بتایا کہ کیپٹن اصغر کی کمانڈو رجمنٹ [illegible] ہے اور وہاں ملک رجب علی نہیں جا سکتا۔ اُس نے بتایا کہ کیپٹن اصغر پیلے کمانڈو سٹن پر گیا ہوا ہے۔ ایک دو دن تک اس کی واپسی متوقع ہے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ خیریت سے ہے یا نہیں۔ اُسے گزشتہ رات اپنے ڈریس پر سہرنا چاہیے تھا۔ جنوبی کشمیر کے اس علاقے میں آج کل بہت خراب ہے۔ معلوم نہیں اصغر نے ڈریس کیا بھی ہے یا نہیں۔

"کمانڈو آپریشن کی خبریں تمہیں کون دیتا ہے نامر؟"۔ ملک رجب علی نے کہا۔ "یہ تو انتہائی خفیہ رکھنے والا آپریشن ہے۔"

"خفیہ"۔ ملک نامر نے طنزیہ کہا۔ "مجھ سے کیا خفیہ رہ سکتا ہے؟"

"کبھی مجھ سے بھی کوئی بات خفیہ نہیں ہوتی تھی"۔ رجب علی نے کہا۔ "نامر یار! میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ کوئی کام بتاؤ۔"

"کام بہت ہیں"۔ ملک نامر نے کہا۔ "کچھ دن میرے پاس ٹھہرو۔"

"وہ تو ٹھہرنا ہی ہے"۔ رجب علی نے کہا۔ "اصغر کی خبر لے کے جاؤں گا۔ تم دو چار دنوں میں معلوم کرا دو گے نا؟"

"کیوں نہیں کرا دوں گا"۔ ملک نامر نے کہا۔ "اسی بہانے یہیں رہو۔"

ملک رجب علی نے اُسے پولیس کی گہری نظروں سے دیکھا اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چند دن یہیں رہے گا اور اس شخص کی خفیہ دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ملک نامر بھارت کا جاسوس ہے۔

صرف اصغر ہی نہیں، جولائی اگست ۱۹۶۵ء میں ہزاروں ماؤں کے اصغر جیسے مقبوضہ کشمیر کی اُن وادیوں میں موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے جن وادیوں کے پھولوں میں گھاس کی پتی پتی میں مٹی اور پتھروں میں کشمیری مسلمانوں کے خون کی بُو بس رچی بسی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ صدی گزر گئی تھی کشمیر کی رگوں سے خون رِس رہا تھا۔ گھٹائیں گرجتی برستی آتی رہیں۔ وادیوں کو بھی ندیاں بناتی رہیں لیکن شہیدوں کے لہو کی بُو کو اس مٹی سے اور اس فضا سے نہ دھو سکیں۔

شہیدوں کے لہو کی مہک برف کی تہوں میں بھی نہیں دب سکی تھی۔

شہیدوں کے لہو کی مہک کو زمین اور پیڑ پودے اپنے آپ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ شہیدوں کی روحوں سے زمین نہیں انسان بے وفائی کیا کرتے ہیں۔

قومیں وہی زندہ رہتی ہیں جو اپنے سینوں میں اپنے شہیدوں کو زندہ رکھتی ہیں۔ قومیں وہ بھی زندہ رہتی ہیں جو اپنے وطن کی ناموس پر ذبح ہونے والوں اور زندہ جلا دیئے جانے والوں کو ذہن اور دل سے اُتار دیتی ہیں مگر وہ اپنے دشمن کے قدموں تلے زندہ رہتی ہیں۔ اُن کی عصمت و عفت کا مالک ان کا دشمن ہوتا ہے۔ کشمیر کی وادیوں میں سے گزر و تو چیل اور دیودار کے لانبے لانبے پیڑوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں اور جب سورج کی کرنیں تیز و تند ہو جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کشمیر کی وہ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جو اغوا کی درندگی کا شکار ہو گئی تھیں ہچکیاں لے رہی ہوں، بَین کر رہی ہوں۔

شہیدوں کے لہو کی مہک نے، اُن کی رُوحوں کی سسکیوں اور ہچکیوں نے اپنے سوتے ہوئے دشمن کو بیدار کر دیا تھا۔ روایات نے اپنے مجاہدین کو جگا لیا تھا۔ رَن کچھ میں کچھار کی للکار نے لڑکھڑاتے ہوئے مردانِ حُر کو اُٹھا دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اب وہ پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان میں کھینچ کر لے آئے گا جہاں اُس کی فتح آسان ہو گی لیکن اللہ کے سپاہیوں نے اُسے اُس میدان میں گھسیٹا جو اُس کی مرضی کے خلاف بھی تھا اور جو کبھی اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔

یہ تھا آزاد کشمیر فوج اور پاک فوج کا مشترکہ کمانڈو آپریشن، جسے "آپریشن جبرالٹر" کا نام دیا گیا تھا۔

☼

سلمیٰ کے اصغر جیسے پانچ ہزار بیٹوں نے مقبوضہ کشمیر میں وہ قیامت بپا کر دی تھی کہ اگست ۱۹۶۵ء کے وسط تک وہاں بھارت کی فوج کی دو لاکھ سے زیادہ نفری اور اس کا جدید اسلحہ جو ہندوؤں نے چین سے جنگی غنیمت کی چھینا جھپٹی کر کے چین کے دشمنوں سے اکٹھا کیا تھا، بیکار ہو کے رہ گیا تھا۔ پاکستان کے اخباروں میں کمانڈو آپریشن کی تباہ کاری کی خبریں اس طرح آتی تھیں کہ کشمیر کے مجاہدین نے ایک پُل اڑا دیا ہے یا بھارتی فوج کے کمزاتے پر شب خون مارا ہے۔

بھارت کے اخباروں میں جو اُس وقت پاکستان میں بھی آیا کرتے تھے، اس کے بالکل برعکس

www.iqbalmehmood.com scanned by iqbalmehmood@yahoo.com

خبریں چھپتی تھیں۔ وہ کمانڈو جانبازوں کو گھس بیٹھئے" کہتے تھے۔ یعنی غیر قانونی طور پر متصوصہ کشمیر کی سرحد میں گھس آنے والے۔ بھارتی اخبار اپنی قوم کی آنکھوں میں یوں دھول جھونک رہے تھے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر سے کچھ گھس بیٹھئے" بھارتی کشمیر میں گھس آتے تھے۔ کہیں بھی کامیاب نہیں ہو سکے اور ان میں سے کئی ایک کو پکڑ لیا گیا ہے۔

لیکن بھارت کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں وزیراعظم کی منعقدہ کی ہوئی کانفرنس میں وہ خبریں سُنی اور سنائی جا رہی تھیں جو عوام سے چھپائی جا رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ متصوصہ کشمیر کا اتنا بڑا فوجی نقشہ لگا ہوا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے گاؤں، ذرا ذرا سی ندیاں اور ان پر پُل بھی دکھائے گئے تھے۔ پہاڑیوں پر بھارتی فوج کی جو چھوٹی بڑی پوسٹیں اور چیکیں تھیں وہ بھی دکھائی گئی تھیں۔ نقشے پر پگڈنڈیاں اور ان سے بھی چھوٹے چھوٹے راستے نظر آتے تھے۔

اس نقشے پر بہت سی جگہوں پر کاسنی اور ہرے کے ساتھ اس کے سائز کے مطابق لال کاغذ کی جھنڈی لگی ہوئی تھی۔

"یہ جھنڈیاں کیا ظاہر کرتی ہیں؟" — وزیراعظم نے پوچھا۔

"پاکستانی کمانڈو پارٹیوں نے یہ جگہیں تباہ کر دی ہیں" — چیف آف سٹاف نے جواب دیا۔

"کہاں تھا یہاں؟"

"زیادہ تر پُل تھے" — چیف آف سٹاف نے جواب دیا اور لمبا سوٹا نقشے پر رکھ رکھ کر بتانے لگا — "یہ ایک عارضی کیمپ تھا جہاں ہماری ایک بٹالین تھی کمانڈو پارٹی نے پہلی سب خون (ریڈ) مار کر بٹالین کو بہت زیادہ جانی نقصان پہنچایا ہے۔"

"بہت زیادہ کتنا زیادہ ہے بتاؤ" — وزیراعظم نے پوچھا۔

"سات سو نفری کی بٹالین میں سے صرف ایک سو گیارہ جوان بچے ہیں" — چیف آف سٹاف نے نقشے پر انگلی جلدی سے ایک اور جگہ پر رکھ کر کہا — "یہاں ہماری ایک کمپنی کو پاکستان کی ایک کمانڈو پارٹی نے گھیر لیا اور ان میں سے چار کو زندہ پکڑ لیا، سات کو ہلاک کیا اور باقی..."

"میں کسی اخبار کا رپورٹر نہیں ہوں" — وزیراعظم نے کہا — "میں وہ حقیقت سننا چاہتا ہوں جو ہم عوام سے چھپا رہے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کشمیر میں ہماری صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ان لال جھنڈیوں سے تو میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ پاکستان نے ہمارے کشمیر میں فوجی اہمیت کا کوئی ٹھکانا سلامت نہیں رہنے دیا۔ کوئی پُل کھڑا نظر نہیں آتا۔ یہ جھنڈیاں بتاتی ہیں کہ ہمارے کشمیر پر پاکستان اور پاک کشمیر کی کمانڈو فورس کا قبضہ ہے۔"

"پوزیشن کچھ ایسی ہی ہے" — چیف آف سٹاف نے کہا — "کشمیر میں ہماری آرمی کی نقل و حرکت بند ہو چکی ہے۔ دشمن کے کمانڈو سرحد پر ٹینک بھی پہنچے ہیں۔ مضافات میں دو پوسٹیں تھیں جن میں کچاس پچاس جوان تھے۔ دشمن کے گوریلوں نے ایک ہی رات میں ان دونوں پوسٹوں پر شب خون مارا اور بہت تباہی مچائی ہے۔"

"کیا انہیں سرحد پر روکنے کا کوئی انتظام نہیں ہے؟" — وزیراعظم نے پوچھا — "انڈین آرمی

اتنی بے بس کیوں ہو گئی ہے کہ آزاد کشمیر سے کمانڈو پارٹیاں آتی اور تباہی مچا کر چلی بھی جاتی ہیں؟"

"ہر ایک کمانڈو پارٹی واپس نہیں جاتی" — چیف آف سٹاف نے جواب دیا — "زیادہ تر نفری ہمارے کشمیر میں داخل ہوئی تھی اور وہ ابھی تک وہیں چھپی ہوئی ہے۔ یہ پوری بٹالین ہے جس کی نفری چھ سے سات سو تک ہو سکتی ہے۔ بعض پارٹیاں واپس جانے کے لیے آتی ہیں۔ وہ اپنا مشن پورا کر کے چھپتی چھپاتی واپس چلی جاتی ہیں۔ انہیں وہاں سے نکلتے کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔"

"اور انہیں ہماری دو لاکھ نفری کی فوج روک نہیں سکتی، پکڑ نہیں سکتی" — وزیراعظم نے طنزیہ کہا — "پاکستانی اور کشمیری جن بھوت ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتے..... اور وہ پوری کی پوری کمانڈو بٹالین جو آپ کے علاقے میں بلکہ آپ کے ملک میں آ کر براجمان ہو گئی ہے وہ کیا مدھو بن کا ٹولہ ہے جسے انڈین آرمی ڈھونڈ نہیں سکتی؟"

چیف آف سٹاف نے ایک جرنیل کی طرف دیکھا جس کا تعلق کشمیر کے ساتھ تھا۔

"ہم چونکہ پاکستان پر حملے کا پلان بنا چکے ہیں اس لیے ہمیں ہر حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے خواہ وہ ہماری اپنی ذات اور ہمارے مذہب ہی کے خلاف کیوں نہ ہو" — جرنیل نے کہا۔

"اس کانفرنس میں ہمارا مذہب صرف یہ ہے کہ پاکستان کو ختم کرنا ہے" — وزیراعظم نے کہا — "اگر ختم نہ ہو سکے تو جنگی طاقت سے پاکستان کو ایسی پوزیشن میں لانا ہے جہاں ہم اس پر اپنی سپریم اتھارٹی مسلط کر سکیں۔"

جرنیل نے کہا — "ہم اپنا یہ مذہبی فریضہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ جب تک پاکستان قائم ہے ہمارے باپو مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو جی کی روحیں بے چین رہیں گی لیکن دشمن کو شکست دینے کے لیے جس جذبے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہماری فوج میں بہت کم ہے۔ ہمارے پاس زیادہ اسلحہ اور اتنا زیادہ ایمونیشن، اتنے زیادہ ٹینک، توپیں اور مشینوں سے جمع کیے ہوئے سامان کا انبار لگا رہے ہوتے بھوتے بھی جذبے کی ضرورت ہے؟" — وزیراعظم نے پوچھا — "پاکستان کے پاس کیا ہے؟ آپ ہی نے مجھے بتایا ہے کہ پاکستان آرمی کے پاس پورے پانچ ڈویژن فوج نہیں۔ آپ ہی نے بتایا ہے کہ اس کی ایئر فورس میں ڈیڑھ سو سے کم لڑاکا طیارے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں پاکستان کے پاس نیوی نہ ہونے کے برابر ہے..... اور پھر آپ کی انٹیلی جنس مجھے بتاتی رہی ہے کہ پاکستان کے لوگ اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں اتنے تنگ ہیں کہ پاکستان پر کوئی بھی افتاد پڑی وہ خاموش اور مُردہ رہیں گے؟"

"سر!" — چیف آف سٹاف نے کہا — "اس سے پہلے ایک کانفرنس میں بات ہو چکی ہے کہ پاکستان کے عوام کے متعلق ہماری انٹیلی جنس کی رپورٹیں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ زن، زر اور اب اُن کے کمانڈو اپریشن نے پاکستانیوں کو جگا دیا ہے لیکن جس قوم کی فوج اتنی کم ہو تو اس کے اُس کے جاگنے نہ جاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" — اس نے کشمیر کے جرنیل کی طرف دیکھ کر کہا — "آپ کشمیر کی بات کر رہے تھے۔"

"کشمیر میں پاکستان کے کمانڈو اپریشن کی کامیابی کی ایک وجہ یہ ہے" — جرنیل نے کہا —

iqbalmt@onenurdigital.com scanned by iqbalmt@onenurdigital.com

ہمارے ٹروپس میں وہ جذبہ نہیں جو پاکستان اور آزاد کشمیر کی آرمی میں ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ ہلاکت خیز ہتھیاروں سے جذبے کی کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ایسا ہی ہو لیکن کمانڈو اور گوریلا جوانوں کے خلاف کارروائی کے لیے ذاتی بہادری کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بہادری ہمارے جوانوں میں کم ہے۔ ہمارے ٹروپس بٹالین کی صورت میں اچھے لڑتے ہیں۔ انفرادی لڑائی میں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ فرق دیکھیں۔ ایک وہ ہیں جو اپنے وطن سے ڈور ہمارے علاقے میں روپوش ہیں اور تباہی پھیلا رہے ہیں اور ایک ہمارے ٹروپس ہیں جو اپنے علاقے میں تمام سہولتیں اور حفاظت میسر ہونے کے باوجود انہیں پکڑ نہیں سکتے۔۔۔۔"

"پاکستانیوں کی کامیابی کی دوسری وجہ کشمیر کے دیہاتی ہیں۔ وہ کمانڈو پارٹیوں کی راہنمائی بھی کرتے ہیں اور انہیں پناہ بھی دیتے ہیں۔ ان کے زخمیوں کو کہیں نہ کہیں چھپا لیتے ہیں اور جب زخمی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو انہیں ان کے ڈھکے چھپے ہیں تک پہنچا دیتے ہیں یا سرحد پار کرا دیتے ہیں۔ کمانڈو جہاں چھپتے ہیں وہاں یہ دیہاتی انہیں کھانا وغیرہ پہنچاتے ہیں۔"

"میں اس وجہ کو تسلیم کرتا ہوں"۔۔۔ وزیراعظم نے کہا۔ "دشمن کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ہماری فوج میں جذبے کی کمی نہیں۔"

"بالکل نہیں سر!"۔۔۔ چیف آف سٹاف نے کہا۔۔۔ "جذبے کی کوئی کمی نہیں۔ کشمیریوں کی یہ معاشی ہے۔ وہ ہمیں دھوکہ دے رہے ہیں۔"

"لیکن سر!"۔۔۔ جرنیل نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے رہا۔"

"کیا آپ ان دیہاتی مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہے؟"۔۔۔ وزیراعظم نے پوچھا۔

"میں وہاں جو کارروائی کر رہا ہوں اس کی خبریں پاکستان کے اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں"۔۔۔ جرنیل نے کہا۔۔۔ "میں نے وہاں گاؤں کے گاؤں جلا دیئے ہیں۔ گرفتاریاں اس لیے نہیں کی جاتیں کہ انہیں رکھنے کو جگہ نہیں رہی۔ ان کے ساتھ ہم اتنا بُرا سلوک کرتے ہیں جو کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ جس گاؤں کے متعلق شک ہوتا ہے کہ کمانڈو اس کے قریب سے صرف گزرے تھے اس گاؤں کے ہمارے جوان باقاعدہ حملہ کر دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ فوجی جب کسی پر حملہ کر دیتے ہیں تو وہاں کیا ہوتا ہے۔"

"ہم نے وہاں ۱۹۴۷ء کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اسی طرح کشمیریوں کے قافلے آزاد کشمیر میں اور پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ سب زخمی ہوتے ہیں۔ ان کی عورتیں ہماری فوج کے ہاتھوں جس حالت میں جاتی ہیں وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہم نے سرحد پر کیمپ کے دو محلے جلا کر راکھ کر دیئے ہیں۔"

"یہ بہترین کارروائی ہے جو کمانڈو اور گوریلا آپریشن کو ناکام کر سکتی ہے"۔۔۔ چیف آف سٹاف نے کہا۔۔۔ "دنیا میں جہاں کہیں بھی اس قسم کا آپریشن ہوا ہے وہاں ان دیہاتیوں کو جو گوریلوں کی مدد کرتے تھے ایسی ہی تشدد سے رام کیا گیا ہے۔"

"ایسا ظلم جائز ہوتا ہے"۔۔۔ وزیراعظم نے کہا۔ "لیکن ہمیں کامیابی کتنی ہوتی ہے؟"

"اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیئے تھی"۔۔۔ جرنیل نے کہا۔ "تباہ کاری جاری ہے۔۔۔ مسلمان سخت جان قوم ہے۔ ہم نے چوکمانڈو پکڑے ہیں۔ ان میں ایک کیپٹن ہے۔ وہ اپنے ناموں کے سوا اور کچھ نہیں بتاتے۔ انہیں اذیتیں دی گئیں، بڑے دل کش لالچ بھی دیئے مگر وہ اپنے بیس کی نشاندہی نہیں کرتے جو انہوں نے کشمیر میں کہیں بنا رکھا ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ ایسی خوفناک اذیتیں کس طرح برداشت کرتے ہیں جو ہم انہیں دیتے ہیں۔"

*

اس جرنیل نے کانفرنس کو کچھ رپورٹیں پڑھ کر سنائیں۔ کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ انڈین آرمی کی کس یونٹ کا کتنا جانی نقصان ہوا ہے۔ ہتھیار کتنے ضائع ہوئے ہیں۔ گولہ بارود کے کتنے سٹور اور میگزین تباہ ہو چکے ہیں۔ اس میں ایک عارضی چھاؤنی کی رپورٹ بھی تھی جس پر پاکستان کی ایک کمانڈو پارٹی نے شب خون مارا تھا۔ چار پانچ بارکوں میں فوجی سوتے ہوئے تھے۔ چھاپہ ماروں نے بارکوں کے اندر گرینیڈ بھی پھینکے اور سٹین گنوں سے اس طرح بوچھاڑیں فائر کیں جس طرح پانی چھڑکا جاتا ہے۔ اس بٹالین میں سے کچھ خوش قسمت ہی زندہ بچے تھے۔ صبح تک شب خون مارنے والے غائب ہو چکے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ اس کمانڈو پارٹی کی نفری کتنی تھی۔ کتنے آدمی تھے۔

ہوائی حملوں پر فائرنگ کی رپورٹیں بھی تھیں اور کئی افسر جو محفوظ جگہوں پر تھے یا محفوظ سڑکوں پر جا رہے تھے اکا دکا گولیوں سے مارے گئے تھے۔ یہ سناٹا بھی جرنیل نے بتایا کہ اب مقبوضہ کشمیر میں کوئی بھی سڑک، راستہ اور جنگل میں سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی میں سے محفوظ نہیں رہی۔

جارحانہ وزیراعظم کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا جیسے اس میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں رہی تھی۔

"تو کیا ہمیں پاکستان پر فوراً حملہ نہیں کر دینا چاہیئے؟"۔۔۔ وزیراعظم نے کہا۔

"نہیں سر!"۔۔۔ چیف آف سٹاف نے کہا۔۔۔ "کمانڈو آپریشن کی کامیابی سے کوئی یہ سمجھ لے کہ اس علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا ہے تو یہ غلط ہوگا۔ کمانڈو اور گوریلے اپنی فوج کی پیشقدمی کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں۔ وہ کسی ملک کے چھوٹے سے خطے پر بھی قبضہ نہیں کر سکتے۔ قبضہ فوج آ کر کیا کرتی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر آرمی نے کسی بھی طرف ایڈوانس نہیں کیا۔ اگر ہم نے اس صورت حال میں پاکستان پر حملہ کر دیا تو پاکستان آرمی ہمیں تیار ملے گی۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ پاکستان آرمی کشمیر کی طرف ایڈوانس کرے اور اپنے کمانڈو آپریشن سے فائدہ اٹھانے آئے۔ اُس وقت ہم پاکستان پر بغیر اعلانِ جنگ کے حملہ کر دیں گے۔ ہم نے پلان تیار کر لیا ہے۔ آپ کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ اصولی طور پر ہم بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کر سکتے۔"

"دشمن کا سر کچلنے کے لیے ہمیں اپنے اصولوں پر عمل کرنا ہے"۔۔۔ وزیراعظم نے کہا۔۔۔ "بین الاقوامی اصولوں کی پابندی کرنے والے شکست کھایا کرتے ہیں۔ دشمن کے ساتھ معاہدہ اُس وقت کرو جب اپنی پوزیشن کمزور ہو اور جب دیکھو کہ اپنی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے تو دشمن کو اطلاع دیئے بغیر معاہدے سے منحرف ہو جاؤ۔۔۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ہم سرکاری طور پر اخباروں کو یہی بیان دے رہے ہیں کہ کشمیر میں پاکستان بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور اگر پاکستان نے ہمیں

بڑائی کارروائی پر مجبور کر دیا تو ہم کشمیر میں پاکستان کے خلاف لڑیں گے اور اس جنگ کو کشمیر تک محدود نہیں رکھیں گے۔ کیا آپ نے کبھی دہنار ڈیڈ یو نہیں سنا؟ ہم پاکستان کے عوام کو پیار کے سندیس دے رہے ہیں... آپ مجھے پاکستان پر حملے کے متعلق کچھ بتا رہے تھے:"

"میں یہ بتا رہا تھا"۔ چیف آف سٹاف نے کہا۔ "کہ جب پاکستان آرمی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر کشمیر میں اُلجھ جائے گی تو ہم پاکستان پر دو سیکٹروں سے حملہ کریں گے۔ ایک حملہ لاہور پر ہو گا جیسا کہ ہمیں توقع ہے کہ لاہور کا دفاع خاصا کمزور ہو گا۔ میں پُورے وثوق سے آپ کو بتا رہا ہُوں کہ ہم پہلے روز ہی لاہور پر قبضہ کر لیں گے۔ اگلا دن ہمیں اپنی پوزیشنیں مستحکم اور قبضے کو مکمل کرنے میں لگے گا۔ اس دوران ہم سیالکوٹ سیکٹر میں جسٹر کے مقام پر پاکستانیوں کو بڑے حملے کا دھوکہ دے کر اُن کی توجہ اِدھر کر دیں گے اور لاہور کے حملے کے دو روز بعد آرمرڈ ڈویژن سے ساہسا کی طرف سے سیالکوٹ کی طرف تیز برق رفتار قسم کا ایڈوانس کریں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم پاکستان کے دفاعی مورچوں کو ٹڈی دل کی طرح روندتے ہوئے وزیر آباد تک پہنچ جائیں گے اور جی۔ ٹی روڈ کو اپنی تحویل میں لے کر پاکستان کو دو حصّوں میں کاٹ دیں گے۔ وہاں سے ہمارے ٹرُوپس لاہور کے دفاع پر عقب سے حملہ کر کے اُن کی شکست کو مکمل کر دیں گے....

"سندھ کو پاکستان سے کاٹنے کے لیے ہم راجستھان سیکٹر سے ایڈوانس کریں گے اور حیدر آباد تک پہنچ جائیں گے۔ کراچی کو ہماری نیوی اور ہمارا طیارہ بردار بحری جہاز "وکرانت" سنبھال لے گا۔ اس پلان کو ہم ایک ہفتے تک مکمل کر لیں گے:"

"کیا پاکستانی دوستوں پر آپ کو بھروسہ ہے؟" ــــ وزیر اعظم نے پوچھا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اُن کے بھروسے پر پاکستان میں داخل ہو جائیں اور وہ آپ کو دھوکہ دے جائیں:"

پاکستان کے دوستوں سے وزیر اعظم کی مراد بھارت کے پاکستانی ایجنٹ تھے جن کی پاکستان میں کوئی کمی نہیں تھی۔

"سر! آپ کو پہلے بھی ملٹری انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر جنرل اور سنٹرل انٹیلی جنس بیورو کا ڈائریکٹر جنرل سیکرٹس کا ڈائریکٹر اپنی اپنی مکمل رپورٹیں دے چکے ہیں۔ ان رپورٹوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا میں آپ کو ان کا خلاصہ ایک بار پھر سنا دیتا ہوں۔ پہلے آپ کو بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے عوام اپنے سیاستدانوں کی حکومتوں سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ اُن میں قومی کردار اور پاکستان کی محبت ختم ہو چکی ہے سیاستدانوں کا دور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان نے ختم کر دیا مگر عوام کا گلا گھونٹ دیا اور ان کی زبانیں بند کر دیں۔ عوام پہلے کی طرح مہنگائی اور بے انصافی اور جرائم کی بھرمار کے مارے ہُوئے ہی رہے لیکن اب یہ کہنا بھی جرم قرار دے دیا گیا کہ عوام غربت اور بے انصافی کا شکار ہیں۔ اب ان کے ذہنوں میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے زبردستی ٹھونسا جانے لگا کہ وہ خوشحال ہیں اور ملک ترقی کر رہا ہے۔ چونکہ حکومت جرنیلوں کی تھی اس لیے عوام فوج سے بدظن ہو گئے...

"یہ صورت حال ہمارے حق میں تھی۔ کسی بھی ملک کی فوج اپنی قوم کی پشت پناہی کے بغیر نہیں لڑ سکتی۔ دشمن ملک اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے عوام اور اُن کی فوج کے درمیان منافرت پیدا کی جائے۔ اس کے لیے کئی طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جو پاکستان میں ہم

نے بھی استعمال کیے ہیں اور کامیابی حاصل کی ہے۔ اس مہم میں ہماری سیکرٹ سروس نے خاصی حد تک کامیابی حاصل کی ہے:"

"میرا خیال ہے کہ یہ مجھے نہیں بتایا گیا"۔ وزیر اعظم نے کہا۔ "مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں لوگ ذہنی، سیاسی اور معاشرتی افتراء اور خلفشار کا شکار ہو چکے ہیں اور اس کیفیت نے ان میں بے عملی پیدا کر دی ہے اور اُن کی ذہنیت مجرمانہ ہو گئی ہے۔ ایسے حالات عوام کو اسی مقام پر لے آیا کرتے ہیں:"

"پاکستانی عوام کو اس مقام پر لانے میں ہماری انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروس کا بھی ہاتھ ہے" ــــ چیف آف سٹاف نے کہا۔ "وہاں کے جرائم پیشہ لوگوں سے لے کر اونچے سے اونچے سیاسی لیڈروں تک میں اور ایوب خان کے درباری خوشامدیوں میں کچھ لوگ ہمارے بھی ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے فٹ پاتھی ہوٹلوں سے لے کر وہاں کے سیاسی اور سرکاری حلقوں تک فوجی حکومت کے خلاف بے بنیاد افواہیں پھیلاتے اور لوگوں کا خون گرماتے رہتے ہیں۔ تخریب کاری ہم اپنے آدمیوں سے کرا کے پاکستان کے دو چار بڑے لوگوں کے سر ڈال دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پاکستان کے عوام میں ہم نے اُن کی حکومت اور فوج کے خلاف بے اطمینانی اور عدم اعتماد پھیلانے میں بہت کامیابی حاصل کر لی ہے....

"پاکستان کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں بھی اپنا اثر کام کر رہا ہے جنگ کی صورت میں ہمیں پاکستان کی آرمز اور ایمونیشن، تیل، پٹرول اور فوجی سامان لے جانے والی ریل گاڑیوں کے نام تک پتہ چلتے رہیں گے۔ کسی بھی سٹیشن سے کوئی ریل گاڑی چلے گی تو ہمیں اطلاع مل جائے گی پھر یہ گاڑی منزل تک نہیں پہنچے گی۔ پاکستانی فوج کی نقل و حرکت کا بھی ہمیں پتہ چلتا رہے گا:"

"کہا جا رہا ہے کہ پاکستان کے لوگ زن، زر کی جنگ اور کشمیر میں کمانڈو ایکشن کی وجہ سے بیدار ہو گئے ہیں اس کا ہمارے پلان پر کیا اثر پڑے گا؟" ــــ وزیر اعظم نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں"۔ چیف آف سٹاف نے جواب دیا۔ "اگر کچھ اثر پڑا بھی تو اس کا بند و بست ہم اوپر سے کرا دیں گے۔ ہمارے ہاتھ بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں ہر شعبے میں ہمارے دوست موجود ہیں۔ ریڑھوں کے ڈھیر اور عورت بل کر جادو کے کرتب دکھا سکتے ہیں اور دکھا رہے ہیں.... میں آپ کو بتا سکتا ہُوں کہ پاکستان اور آزاد کشمیر آرمی کشمیر میں کدھر سے داخل ہوں گی۔ وہ کہاں سیکٹر پر حملہ کریں گی:"

"آپ نے اُدھر کا ڈیفنس مضبوط کر لیا ہے؟"

"اُدھر کا ڈیفنس ہم نے اتنا مضبوط کر لیا ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی اگر ساری کی ساری فوجیں ایک ہی بار آ جائیں تو چھمب اور جوڑیاں کی دفاعی مورچہ بندیوں میں اس طرح پھنس کے ختم ہو جائیں گی جس طرح دلدل میں پھنس کر انسان دھنستا چلا جاتا اور نکلنے سے اور الجھ جاتا ہے" ــــ چیف آف سٹاف نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "پاکستانیوں کے پاس نعرہ حیدری اور جذبے کے سوا کچھ بھی نہیں نعروں اور جذبوں سے ٹینک ریت کے بنکر نہیں ٹوٹ سکتے۔ پاکستانی جب ہمارے اس ڈیفنس میں پھنس جائیں گے تو مزید ٹروپس اِدھر بھیجیں گے۔ اُن کی طاقت یہیں صرف ہوتی جائے گی پھر ان میں سیالکوٹ لاہور اور راجستھان کی طرف سے ہمارے حملے روکنے اور پاکستان کو بچانے کی نہ ہمت رہے گی نہ ہوش:"

"ہمارا مقصد پاکستان کو ختم کرنا ہے" ــــ وزیر اعظم نے کہا۔ "خواہ لڑ کر کریں خواہ پیار اور محبت کا

iqbalmt@onenet.com.pk Scanned by

دھوئیں دے کر کریں..... آپ چونکہ فوجی نقطۂ نگاہ سے حالات کو دیکھتے ہیں اس لیے آپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں جس فوجی افسر کو نہیں سمجھتا اس لیے کشمیر میں پاکستانی کمانڈو اپریشن کی خبریں بھیجے پلیٹان کرتی ہیں۔ اگر ہمارے کشمیر کے بیاتی ان کی مدد کر رہے ہیں تو ان کے خلاف اپنی کارروائی جاری رکھیں۔ اگر آپ کشمیر کے تمام مسلمانوں کو ختم کر دیں گے اور ان کی بستیاں جلا ڈالیں گے تو ہمارے لیے اچھا ہی ہوگا۔ ہمیں وہاں کے مسلمانوں کی نہیں اس زمین کی ضرورت ہے۔ ہمیں کشمیری نہیں کشمیر چاہیئے۔ ان میں سے جو ہمارے نہیں جا سکتے انہیں خوفزدہ اور ہراساں کر کے پاکستان کی طرف بھگا دو۔ اپنی فوج کے جوانوں سے کہو وہ کشمیر مسلمان پر رحم کرنے کو پاپ سمجھیں۔

*

اگست ۱۹۶۵ء کے وسط تک مقبوضہ کشمیر میدانِ حشر بن چکا تھا۔ ایک طرف پاکستان اور آزاد کشمیر کی کمانڈو پارٹیوں کے دھماکے تھے جن میں مذیوں کے بڑے اہم پل، گولہ بارود کے ذخیرے پہاڑیوں پر چوکیاں اور پوسٹیں اور جنگی ٹھکانے اُڑ رہے تھے، جل رہے تھے، اور دوسری طرف بھارت کی فوج تھی جو اپنی تباہی اور بربادی کا انتقام مقبوضہ کشمیر کے نہتے دیہاتیوں سے لے رہی تھی۔ ان لوگوں پر الزام یہ تھا کہ پاکستانی چھاپہ ماروں کو مدد اور پناہ دیتے ہیں۔

بھارتی فوج جب کسی گاؤں پر حملہ کرتی تھی تو دن سے کوئی خوش قسمت ہی زندہ بچ سکتا تھا۔ ان کے مکان لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور جو پتھروں اور مٹی کے تھے ان کی چھتیں لکڑی اور گھاس پھونس کی تھیں۔ انہیں آگ کا اشارہ کافی ہوتا تھا۔ کشمیر کی تیز ہوائیں تھوڑی سی دیر میں آگ کو پھیلا کر پورے گاؤں کا صفایا کر دیتی تھیں۔ اکثر بچے زندہ جل جاتے یا جلا دیئے جاتے تھے۔ کسی گاؤں میں فوج کی آمد کی خبر قبل از وقت پہنچ جاتی تو وہاں کے لوگ بھاگ اٹھتے اور آزاد کشمیر کا ایبٹ آباد کی طرف پاکستان کا رُخ کر لیتے تھے۔ اس طرح پاکستان میں پناہ گزینوں کے لٹے پٹے قافلے (کی شکل میں) آ رہے تھے جس طرح ۱۹۴۷ء میں آئے تھے۔

ان قافلوں میں جو جوان آدمی تھے اُن کے بازو اُن کے جسموں کے ساتھ نہیں تھے۔ بھارتی فوج نے کاٹ پھینکے تھے۔ کئی نوعمر لڑکوں کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ عورتوں کے پستان کٹے ہوئے تھے۔ بعض ادھیڑ عمر آدمیوں کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ یہ سب پاکستان اور آزاد کشمیر میں مرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کے جسم خون سے خالی تھے — اور جن خواتین کو ہندوؤں نے کچھ دن اپنے پاس رکھ کے چھوڑا تھا وہ چپ چاپ، آنکھیں پھاڑے بکری کو دیکھتی تھیں کبھی خلاؤں میں ٹکٹکی باندھ لیتی تھیں جیسے وہ کوئی بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔

پاکستان اپنی تاریخ کے بڑے ہی نازک اور پُرخطر دور میں داخل ہو چکا تھا۔ بھارت کی سیاسی اور فوجی قیادت خوش تھی کہ پاکستان نے اپنی تباہی کا سامان خود ہی پیدا کر لیا ہے اور اُس نے چالیس ہزار ڈویژن فوج کے بل بوتے پر اُس بھارت سے ٹکر لے لی ہے جو جنگی طاقت کے لحاظ سے دنیا کے

پاکستان نے اپنے آپ کو بھارت کے خطرے کے علاوہ بڑے سخت امتحان میں ڈال لیا تھا۔ اس کے فوجی لیڈروں نے مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے بڑا ہی دلیرانہ اقدام کیا تھا جو "اپریشن جبرالٹر" کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن یہ اقدام ایسا تھا جس کی تکمیل لازمی تھی۔ اس دلیرانہ اور حیران کن اپریشن میں پاکستان اور آزاد کشمیر افواج کے بڑے خوبرو، نوجوان اور قیمتی افسر اور تجربہ کار جوان جو فوج کی بالائی سمجھے جاتے تھے، شہید ہو رہے تھے، عُمر بھر کے لیے معذور ہو رہے تھے، تار گیٹ کے علاقے میں گرفتار ہو کر دشمن کی قید میں غیر انسانی اذیتیں سہہ رہے تھے۔

اس کے علاوہ ساری دنیا کے جنگی وقائع نگاروں اور سفیروں کی نظریں اس کمانڈو اپریشن پر لگ گئی تھیں۔ ساری دنیا کو پتہ چل گیا تھا کہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے تسلط سے چھڑانے کے لیے یہ جنگی اقدام کیا ہے اور چونکہ کشمیر کو بھارت اپنی ملکیت سمجھتا ہے اس لیے بھارت پاکستان پر جوابی حملہ کرے گا۔ اس صورتِ حال میں غیر ممالک کے اخبار لکھ رہے تھے کہ پاکستان نے مقبوضہ کشمیر میں یہ اپریشن شروع کیا ہے تو اُس نے اپنے آپ کو بھارت سے لڑنے کے قابل سمجھ کر بھارت کو چیلنج کیا ہے۔ لہٰذا یہ اب پاکستان کے وقار کا مسئلہ بن گیا تھا کہ وہ اپنے اقدام کو انتہا تک پہنچائے اور اس کے نتائج کو بھی قبول کر کے ان سے نمٹے۔

اس کمانڈو اپریشن کی جو سزا مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو مل رہی تھی اس کی ذمہ داری بھی پاکستان پر عائد ہوتی تھی۔ پاکستان کے پیچھے ہٹ آنے کی صورت میں پاکستان کو پاکستان کے نام پر تباہ اور خانماں برباد ہونے والوں کی پھٹکار کا سامنا تھا۔ ان مظلوم کشمیریوں کو اب اپنی آزادی صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس لیے یہ جانتے ہوئے کہ انہیں بڑی بھیانک سزا ملے گی وہ کمانڈو پارٹیوں کی مدد کرتے تھے۔

پاکستان تاریخ کے دوراہے پر آ رہا تھا۔ ایک راستہ ذلت و رسوائی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا عزت و وقار کی طرف۔

پاکستان میں بھارت کے جاسوسوں اور اُن کے ایجنٹوں کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئی تھیں۔ فوجی راز بھارت پہنچا رہے تھے۔

*

اسلام آباد میں ملک ناصر ملک رجب علی خان کو بتا رہا تھا کہ کمیشن اصغر ایک مشن پر مقبوضہ کشمیر گیا ہوا ہے اور وہاں کا موسم اتنا خراب ہے کہ اصغر کی پارٹی کو شاید اپنا مشن پورا کیے بغیر واپس آنا پڑے گا۔ اس خبر سے ملک رجب علی کی پریشانی بڑھ گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ مقبوضہ کشمیر سے واپس آنا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا وہاں داخل ہونا۔ وہ تو سلمیٰ کو یہ خبر سنانا چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا بالکل خیریت سے ہے اور وہ اُسے دیکھ آیا ہے۔

اُس نے ملک ناصر کے ٹیلیفون سے لاہور اپنے گھر کا نمبر ڈائریکٹ ڈائل کیا۔ اُدھر سلمیٰ نے ریسیور اُٹھایا۔ رجب علی نے اُسے بتایا کہ وہ اصغر سے مل تو نہیں سکا، اس کے دو ساتھی مل گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ ایبٹ آباد کے کسی پہاڑی علاقے میں ٹریننگ کیمپ میں ہیں جہاں کیمپ کا ماحول ہے، اُس کیمپ تک باہر کا کوئی آدمی نہیں جا سکتا۔ فوجی احکام ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"اب اپنے دل کو مضبوط رکھو سلمیٰ آ — رجب علی نے کہا — میں چند دن اسلام آباد میں رکوں گا اور کوشش کروں گا کہ اصغر سے ملاقات ہو جائے۔ یہ ٹیلیفون نمبر نوٹ کر لو — اُس نے ملک ناصر کا فون نمبر بتا کر کہا — یہ میرے ایک پرانے دوست ملک ناصر کا نمبر ہے۔ یہ اصغر کے ساتھ میری

iqbalmt@yahoo.com scanned by iqbalmt

ملاقات کا انتظام کرا دے گا۔ بہر حال تم مطمئن رہو۔ اصغر ڈرے سہمے ہیں ہے۔"

"جلدی آجانا"۔۔۔ سلمیٰ نے کہا۔۔۔ "تنہائی سے میرا دل گھبرا جائے گا۔"

"یہ تنہائی کیسی ہو سکتی ہے سلمیٰ آپا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "دل گھبرائے تو طاہرہ کے ہاں چلی جایا کرنا یا اُسے اپنے ہاں بلا لینا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔۔۔۔ اصغر سے ملے بغیر واپس نہیں آؤں گا۔۔۔۔ اچھا خدا حافظ"۔۔۔ اور اُس نے فون بند کر دیا۔

"کیپٹن اصغر کہاں ملے گا تمہیں؟"۔۔۔ ملک ناصر نے ملک رجب علی سے پوچھا۔۔۔ "وہ آبھی گیا تو تم اُسے نہیں مل سکو گے۔ معلوم نہیں اُس کا بیس کہاں ہے۔"

"سلمیٰ کو تسلی دے رہا ہوں یار"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "میں اسی بہانے کچھ دن تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ ایک ہی جگہ کی قید اور فراغت نے مجھے مُردہ کر دیا ہے۔"

"میں تمہیں زندگی دے سکتا ہوں"۔۔۔ ملک ناصر نے اُسے معنی خیز نظروں اور شرارتی سی مسکراہٹ سے کہا۔۔۔ "اور میں تمہیں ایسی مصروفیت دے سکتا ہوں جو تمہیں جنت میں پہنچا دے گی۔۔۔ ۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "جو کام بتاؤ گے کروں گا لیکن مجھے اصغر کے متعلق اطلاع ملتی چاہیئے۔ میں اُس کے لیے پریشان ہوں۔"

"صحیح اطلاع لا دوں گا"۔۔۔ ملک ناصر نے کہا۔۔۔ "تم ایک کیپٹن کی اطلاع چاہتے ہو، کہو تو پاکستان آرمی کی پوری پوری رجمنٹوں کی اطلاع لا دوں کہ کساں کساں ہیں اور کہاں کہاں جائیں گی۔"

"تم صرف میرے کیپٹن کی اطلاع لا دو"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔

*

کیپٹن اصغر کی اطلاع ابھی محذوف تھی۔ اُسے امید تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی پارٹی کو سُتلج تک دشمن کے علاقے سے نکال لائے گا مگر صبح کا اُجالا نکھرنے تک وہ دشمن کے علاقے میں تھا۔ وہ لوہے کے بنے ہوئے نہیں گوشت پوست کے انسان تھے، وہ گذشتہ دن اور ساری رات کو سلاوہ بارش میں بھیگتے رہے اور تیز و تند جھکڑ میں چلتے رہے تھے۔ دو کیچڑ میں دھنسے گئے اور چڑھے ہوئے ندی نالوں میں سے گزرے تھے۔ اُن کے جسم اکڑ گئے تھے، ہتھیاروں پر ان کی انگلیاں جم کے اکڑ گئی تھیں۔

مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر تار گیٹ تک پہنچتے انہیں ایک دن اور ایک رات لگی تھی۔ دن کو وہ چھپے رہے یا چھپ چھپ کر چلتے رہے تھے۔ شام گہری ہوتے ہی گھاٹیاں برسنے لگی تھیں۔ واپسی کی مسافت چند گھنٹوں کی تھی لیکن اُن کے جسم جواب دے گئے تھے۔ اُن کے اعصاب پر بہر لمحے بیہوشی کیفیت کا یلغار سے جانے، مار سے جانے اور تھکن کی ناکامی کا بوجھ پڑ رہا تھا۔ اس کیفیت کا بھی جسموں پر سخت بُرا اثر تھا۔ وہ اب رُوح اور جذبے کی قوت سے چل رہے تھے۔ وہ اب اس لیے قدم گھسیٹ رہے تھے کہ انہیں چلنا تھا اور اس علاقے سے نکلنا تھا۔ گزشتہ روز جو نالے خشک تھے وہ بارش سے سیلابی ندیاں بن گئے تھے۔ وہ ان کے تیز اور یخ پانی میں سے گزر رہے تھے۔

ان کے ساتھ تین زخمی جوان بھی تھے جن میں سے دو تر چل رہے تھے لیکن انہیں سہارے کی ضرورت تھی، اور تیسرے سے چلا نہیں جاتا تھا۔ جوان اُسے باری باری پیٹھ پر اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اس سے پارٹی کی رفتار اور زیادہ سُست ہو گئی تھی۔ دونوں پریشان تھے صبح صاف ہو گئی تھی۔

"صاحب!"۔۔۔ ایک گائیڈ نے کہا۔۔۔ "اب آپ اس طرح بے فکر ہو کر نہیں چل سکیں گے جس طرح رات کو چلتے آئے تھے۔ سرحد سے ہم ابھی دُور ہیں۔۔۔ آپ نے ایک غلطی کی ہے صاحب!"۔۔۔ گائیڈ نے ذرا دبی دبی آواز میں کہا۔۔۔ "میں پہلے چار پارٹیوں کو اندر لے جا چکا ہوں۔ ان کے افسر ایسے زخمیوں کو ساتھ نہیں لاتے تھے جو چل نہیں سکتے تھے۔ آپ زخمی جوانوں کو ساتھ لے آئے ہیں۔ اس طرح آپ باہر نہیں نکل سکیں گے۔"

کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار اسلم کی طرف دیکھا۔

"سر! حکم تو یہی ہے"۔۔۔ نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔۔۔ "آپ جو حکم دیں گے۔"

"میں جانتا ہوں حکم کیا ہے صاحب!"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔۔۔ "ان زخمیوں کو واپس لے جاتے ہماری پارٹی پکڑی جا سکتی ہے لیکن یہ زندہ ہیں۔ یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ انہوں نے موت کی منزل تک ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میں انہیں پھینک نہیں سکتا۔"

جو زخمی چلنے کے قابل نہیں تھا وہ کئی بار اپنے ساتھیوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اُسے چھوڑ جائیں۔ وہ انہیں بار بار یہ یاد دلا رہا تھا کہ اُس کے ساتھی باری باری اُسے اٹھانے ہونے لے جا رہے تھے۔ اس لیے آخر کیپٹن اصغر نے کہا تھا کہ وہ نکل جائیں اور اُس کے بوجھ سے آزاد ہو جائیں ورنہ اُس کی خاطر سب مارے جائیں گے۔ لیکن کیپٹن اصغر نے اسے ڈانٹ کر چُپ کرا دیا تھا۔

سورج کی تمازت کے اس جذبے کا جو صبح کی روشنی کے ساتھ ہی سامنے آگیا تھا۔ رفتار سُست ہو گئی تھی۔ وہ سرحد سے نہیں نکل سکے تھے۔ گائیڈ کیپٹن اصغر سے کہہ چکے تھے کہ اب وہ پکڑے جانے کے بعد ہی سرحد سے نکل سکتے ہیں۔ جسم اب تیز حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ انہیں اب بہت سا آرام اور دھوپ کی تپش حرکت کے قابل بنا سکتی تھی۔ بادل اُڑے جا رہے تھے۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔

*

وہ تنگ سی ایک وادی میں چلے جا رہے تھے جو عام راہوں سے دُور افتادہ تھی۔ سادون کی وجہ سے جھاڑ پات اور گھاس اتنی اونچی ہو گئی تھی کہ جھک کر اس کی اوٹ سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ درختوں کی بھی بہتات تھی۔ پارٹی ایک قطار میں چل رہی تھی۔

انہیں سامنے والی ٹیکری کے اُوپر سے جس کے ساتھ ساتھ وہ چلے جا رہے تھے ایک آواز سُنائی دینے لگی۔۔۔ "اُوہ۔۔۔۔ اُوہ۔۔۔۔ اُوہ"۔۔۔ یہ کوئی پرندہ ہو سکتا تھا۔ کسی نے بھی اُدھر نہ دیکھا۔

اب تالی کی آواز آئی اور اس کے ساتھ یہ آواز۔۔۔ "اے۔ اے۔ اے۔"

سب نے اوپر دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکا سا، کشمیر کے گڈریوں کے روائتی لباس میں کھڑا ایسے انداز سے اشارے کر رہا تھا جیسے سخت گھبراہٹ میں ہو۔ وہ ٹیکری کے دوسری طرف بھی دیکھتا اور پھر

iqbalmt@onedrive.com scanned by

کمانڈو پارٹی کو اشارے سے کرتا تھا۔ اس نے ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ بیٹھ جاؤ۔ کیپٹن اصغر نے پارٹی سے کہا کہ چھپ جاؤ اور ایک گائیڈ سے کہا کہ وہ اوپر جا کر اُس سے پوچھے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ دونوں گائیڈ اوپر چلے گئے۔

"نائب صوبیدار صاحب!" — کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار اسلم سے کہا۔ "میں پہلی بار آیا ہوں۔ کیا ان لوگوں پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کشمیری لڑکا ہمیں دھوکہ دے رہا ہو؟"

"کیا نہیں ہو سکتا صاحب!" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔ "پاکستان میں اتنے اسیر کشمیر لوگ جو ایک ملک کو تقدیر و قیمت دے کر خرید سکتے ہیں اپنے ملک اور اپنے مذہب کے دشمن کے ہاتھوں ہو سکتے ہیں تو یہ بے چارہ تو اتنا غریب لگتا ہے کہ اس نے کبھی دس روپے کا نوٹ اپنے ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھا ہوگا۔ ان لوگوں پر دشمن کی سزا کا بھی خوف ہوتا ہے۔ کمانڈو پارٹیوں کو مدد دینے کی جو سزا انہیں ملتی ہے وہ آپ اپنی آنکھوں دیکھیں تو بے ہوش ہو جائیں۔"

"پھر اس لڑکے کے ساتھ ہم کیا سلوک کریں گے؟"

"پہلے معلوم ہو جاتے کہ یہ کیا کہتا ہے" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔ "پھر دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔۔۔۔ ایک بات آپ کو بتا دوں۔ میں نے آپ کے سوال کا پورا جواب نہیں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لڑکا بہت غریب ہے اور یہ دھوکہ دے سکتا ہے لیکن صاحب! یہ لوگ وفا اور مذہب کے معاملے میں غریب نہیں۔ اللہ کا جو ڈر اور وطن کی جو محبت اور ایمان کا جو خیال غریبوں میں ہوتا ہے وہ امیروں میں کم ہی نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کو اب پیلی ہار اپنے وطن کی آزادی نظر آنے لگی ہے۔ یہ ہمیں اپنی جانیں دہندہ کر رہے ہیں۔ یہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ کرنا ضرور چاہتے ہیں۔ ان کے کرنے کا کام ہے کہ کمانڈو پارٹیوں کو جس قسم کی بھی مدد کی ضرورت پڑے یہ دیں، اور یہ مدد دیتے ہیں۔ ان میں کوئی ایک ایسا نکل آتا ہے جو دھوکہ دیتا ہے۔"

اوپر سے ایک گائیڈ دوڑتا ہوا نیچے آیا۔

"صاحب!" — اُس نے کہا۔ "بندوق والی آ رہے ہیں۔ اس لڑکے نے دیکھے ہیں۔ نیچے چھوٹا سا گاؤں ہے۔ لڑکا کہتا ہے کہ اوپر آ جاؤ اور پیچھے اُتر جاؤ۔ وہ اوپر کھڑا دیکھتا رہے گا۔"

"اس پر بھروسا کریں؟" — نائب صوبیدار اسلم نے پوچھا۔

"ضرور کریں" — گائیڈ نے جواب دیا۔ "میں انہیں جانتا ہوں۔ دھوکہ دینے والے لوگ نہیں۔"

*

پہلے نائب صوبیدار اسلم اوپر گیا۔ اُس نے درختوں کی اوٹ میں ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر دُوربین سے دیکھا، پھر اُس نے کیپٹن اصغر کو اشارہ کیا کہ سب اُوپر آ جاؤ۔ ٹیکری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ سب ایک دوسرے کے پیچھے اوپر چڑھنے لگے۔ رات کی بارش سے پھسلن تھی۔ زخمیوں کو اُٹھا کر وہ بڑی مشکل سے اوپر گئے۔ کشمیری لڑکا ایک طرف نیچے اُترنے لگا۔ اُس کے اشارے پر سب اُدھر کو اُترنے لگے۔

یہ ٹیکریوں کا علاقہ تھا۔ ان کے درمیان بڑی تنگ جگہ تھی۔ ان کے عقب میں اونچی پہاڑی تھی۔ بادل کے تین چار ٹکڑے اُس پہاڑی سے نیچے آ گئے تھے۔ لڑکا انہیں نیچے لے گیا۔ سب زخمیوں کو دو دو جوان مل

کر اُٹھاتے تھے۔ پارٹی دو اونچی ٹیکریوں کے درمیان چلی جا رہی تھی۔ درختوں اور بڑی گھنی جھاڑیوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔

چلتے چلتے آگے راستہ بند نظر آیا۔ لڑکا ٹیکری پر چڑھنے لگا۔ اس ڈھلان پر پھسلن اتنی زیادہ تھی کہ ہاتھ بھی نیچے لگانے پڑتے تھے۔ زخمیوں کو ایک ایک جوان نے پیٹھ پر ڈال لیا اور وہ جانوروں کی طرح اوپر چڑھنے لگے۔ جسموں میں جان تو رہی نہیں تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ اس سے جسم اور زیادہ بے کار ہوتے جا رہے تھے۔

اوپر جا کر لڑکا بیٹھ گیا اور اُس نے سب کو اشارہ کیا کہ بیٹھ جائیں۔ سبھی پارٹی ڈھلان پر ہی رُک گئی۔ کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اسلم اُوپر گئے لیکن پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ انہیں دس بارہ جھونپڑے نظر آئے جن میں کچھ لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور کچھ پتھروں پر لیپ کی ہوئی دیواروں والے تھے۔ یہ اکٹھے نہیں تھے۔ ایک دو ایک پہاڑی کے دامن میں تھے۔ ایک دو اور پر ڈھلان پر تھے۔ دو تین اور اوپر تھے اور ایک دو اُن سے بھی اُوپر تھے۔ اُن کے سامنے ایک میدان تھا جہاں بکریاں اور مویشی چر رہے تھے۔ چند ایک بچے کھیل رہے تھے۔ دو چار عورتیں بھی تھیں۔ یہ سب آباد گاؤں کی نشانیاں تھیں۔

نائب صوبیدار اسلم نے اپنا سر نیچے کر لیا اور بولا — "اوٹ میں ہو جاؤ میں سر!" — اُس نے دُوربین کیپٹن اصغر کو دے کر کہا — "سامنے دیکھیں۔"

کیپٹن اصغر دُوربین میں چیل اور دیودار کے درختوں میں سے گزرتے ہوئے بھدتی فوجی نظر آئے۔ ان کی تعداد پچاس ساٹھ کے درمیان تھی۔ ان کے پیچھے چھ خچریں تھیں۔

"پلاٹون ہے" — کیپٹن اصغر نے کہا۔

"ان کی پلاٹون کی نفری ایک ہزار سے زیادہ ہوتی ہے" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا — "پلاٹون کی ہر گن

بچے جو باہر کھیل رہے تھے اور چند عورتیں جو اِدھر اُدھر کچھ کام کر رہی تھیں بچوں کے ساتھ اپنے گھروں کو دوڑ پڑیں۔ پلاٹون ان سے ڈیڑھ دو سو گز دُور سے گزر رہی تھی۔ اس کے آگے آگے ایک افسر جا رہا تھا۔ اُس نے اِدھر دیکھا تو پلاٹون کو رُوک کر خود گاؤں کی طرف آ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک سکینڈ لیفٹیننٹ اور ایک صوبیدار بھی آیا۔ میدان میں آ کر اس میجر نے گاؤں والوں کو پکارا تو گاؤں کے تیس چالیس مرد دوڑتے ہوئے اُوپر سے نیچے آئے۔

کشمیری لڑکا جو کیپٹن اصغر کے ساتھ تھا وہ کہنے لگا کہ وہ جا کے دیکھتا ہے کہ ہندو افسر گاؤں والوں سے کیا کہہ رہے ہیں لیکن کیپٹن اصغر نے اُسے رُوک کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ خطرہ تھا کہ لڑکا بھدتی فوجیوں کو بتا دے گا کہ یہاں پاکستان کے فوجی چھپے ہوئے ہیں۔

ایک گائیڈ نے کشمیری زبان میں لڑکے سے کچھ کہا تو لڑکے کا چہرہ فق ہو گیا۔

"صاحب بہادر جی!" — لڑکے نے کیپٹن اصغر سے کہا۔ "تم ہم کو بے ایمان کافر سمجھتے ہو؟۔۔۔۔ یہ کہتا ہے کہ اِدھر بیٹھے رہو۔ تم ہندو فوج کو بتا دو گے۔"

"یہ کھوا س کرتا ہے" — کیپٹن اصغر نے کہا۔ "میں نے تمہیں اس لیے روک کر اپنے پاس بٹھایا ہے

iqbalmt@gmail.com scanned by

کہ وہ ہندو فوجی تم پر شک کریں گے اور پوچھیں گے کہ کہاں تھے۔ تم نہیں بتاؤ گے تو تمہیں ماریں گے۔"
اُس نے لڑکے کو اپنے ساتھ لگا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"نائب صوبیدار صاحب!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "ہم کتنی آسانی سے اس پوری پلاٹون کو ختم کر سکتے ہیں .... کیا خیال ہے؟"

"خیال بہت اچھا ہے صاحب!" — نائب صوبیدار اسلم نے کہا — "لیکن اس کا نتیجہ بہت خوفناک ہوگا۔ ہمارے لیے بھی اور اس گاؤں کے معصوم لوگوں کے لیے بھی۔ ہو سکتا ہے یہ پلاٹون اپنی بٹالین کی ایڈوانس گارڈ ہو۔ واہ کے پیچھے پوری بٹالین آ رہی ہو۔ اگر نہ بھی ہو تو اس پلاٹون کو مشین گنوں سے ختم کر کے ہم تو چلے جائیں گے مگر سزا اس گاؤں کو ملے گی۔ گاؤں کا بچہ بچہ انڈین آرمی کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا اور سب سے زیادہ گندی سزا ان کی عورتوں کو ملے گی۔ گاؤں جل جائے گا۔"

"کیا زندگی ہے ان معصوم لوگوں کی" — کیپٹن اصغر نے کہا — "یہ کبھی ختم ہونے والے خوف و ہراس میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ بھی انسان ہیں۔"

"انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا صاحب!" — گائیڈ عبدالرحمٰن نے کہا — "یہ ہندو افسر ہمیں دور سے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے کہ یہاں جوان عورتیں کتنی ہیں۔ اس کے علاوہ گاؤں سے کیا مل سکتا ہے اور یہ لوگ کیسے ہیں .... یہ لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ اذانیں دیتے ہیں لیکن ان ہندوؤں نے گاؤں کے قریب اپنی پوسٹ بنالی تو گاؤں میں سے اذان کی آواز نہیں اٹھے گی۔"

"اور اگر ہم نے کشمیر کو آزاد نہ کرایا تو وہ وقت بھی آجائے گا کہ اس خطے میں اذان جرم قرار دے دی جائے گی" — کیپٹن اصغر نے کہا — "یہ لوگ ہماری مدد کے محتاج ہیں۔ اگر ہم نے ان سے [illegible] تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔ خدا ہمیں معاف نہیں کرے گا۔"

"صاحب بہادر جی!" — کشمیری لڑکے نے کہا — "ہندو، سکھ اور گورکھے فوجی یہاں سے گزرتے ہیں تو ہم کو باہر بلا کر بہت ڈراتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے پاکستان کا ساتھ دیا تو سب کو جان سے مار دیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب کوئی فوجی ادھر سے گزرے تو اس کو سلام کیا کرو اور وہ جو حکم دے وہ فوراً پورا کیا کرو۔"

"تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا کہ ہم پاکستان کے فوجی ہیں؟" — نائب صوبیدار اسلم نے پوچھا۔

"میں پہلے بھی پاکستان کے فوجی دیکھ چکا ہوں" — لڑکے نے کشمیری اردو اور اپنے لب و لہجے میں کہا — "ہمارے گاؤں کا دلاسا ہے نا، اس لیے سب لڑکوں کو پتا ہوتا ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی اس رنگ کی شلوار قمیصوں میں ادھر آتے ہیں اور ہندو فوجیوں کو مار کر چلے جاتے ہیں۔ دادا نے بتایا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی بڑے بہادر ہیں۔ وہ پُل تباہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی فوجیں دریاؤں اور ندیوں سے نہ گزر سکیں۔ دادا نے ہمیں بہت سی باتیں بتائی تھیں اور اس نے کہا تھا کہ ادھر اُدھر گھومتے پھرتے، ہو سکتا ہے کہیں پاکستان اور آزاد کشمیر کا کوئی فوجی راستہ بھولا ہوا یا زخمی نظر آتے اسے اس طرح چھپا کر گاؤں میں لے آیا کرو کہ کوئی ہندو فوجی نہ دیکھ سکے ....

"دس گیارہ دن گزرے ہیں اور میرے دوست نے چار مسلمان فوجیوں کو گاؤں میں لائے تھے۔ دو کی

ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں۔ دادا نے اور دوسرے لوگوں نے ان کے زخموں پر پٹیاں باندھی تھیں۔ وہ چار پانچ دن ہمارے پاس رہے تھے پھر ایک رات چلے گئے تھے۔ میں تو ویسے ہی آج ادھر اوپر کھڑا تھا۔ میں نے دُور سے ہندو فوجیوں کو دیکھ لیا تھا۔ ادھر دیکھا تو تم لوگ چھپ چھپ کر آ رہے تھے .... تم کو کچھ پرا اعتبار نہیں آیا۔ ہم لوگ غریب ہیں نا، اس لیے تم سوچتے ہو کہ ہم لوگ ہندوؤں سے پیسے لے کر تم کو پکڑوا دیں گے۔ ہم لوگ خدا سے بہت ڈرتے ہیں۔"

"ہم بھی اُسی خدا سے ڈرتے ہیں میرے بھائی!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "ہمارا خدا ایک ہے۔"

*

ایک گائیڈ نے بتایا کہ ہندو افسر جا رہے ہیں۔ کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اسلم نے اُدھر دیکھا۔ ہندو افسر اپنی پلاٹون سے جا ملے اور پلاٹون آگے چل دی۔ نائب صوبیدار اسلم یہ کہہ کر ٹیکری سے اُترنے لگا کہ وہ کہیں سے دیکھے گا کہ یہ پلاٹون کہاں جا رہی ہے۔ ایک گائیڈ جس کا نام عطاء اللہ تھا کیپٹن اصغر سے کہنے لگا کہ وہ ٹیکریوں کے پیچھے پیچھے سے گاؤں میں جائے گا اور معلوم کرے گا کہ یہ فوجی کہاں جا رہے تھے۔

"فوجی گاؤں والوں کو نہیں بتایا کرتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں" — کیپٹن اصغر نے کہا — "اس لڑکے کو جانے دو" — اُس نے لڑکے سے کہا — "تم جاؤ اور اپنے دادا کو بتاؤ کہ پاکستان کے فوجی آئے ہیں۔"

لڑکا دوڑتا پھلانگتا ٹیکری سے اُتر گیا۔ گاؤں کے آدمی اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے، عورتیں اور بچے باہر نکل آئے تھے۔ لڑکا دوڑتا چلا گیا اور کہیں غائب ہو گیا۔

بہت دُور میدان میں اور ادھر اُدھر جتنی بھیڑ بکریاں، چار پانچ گائیں اور دو تین بھینسیں بکھری ہوئی تھیں، وہ سب اس ٹیکری کی طرف آنے لگیں جس پر کمانڈو پارٹی چھپی ہوئی تھی۔ وہ قریب آئیں تو دیکھا کہ ان کے پیچھے تین عورتیں آ رہی تھیں۔ وہی انہیں ہانک کر لا رہی تھیں۔ مویشی تو نیچے چرنے لگے، عورتیں ایک ایک کر کے اوپر آگئیں۔ ایک نے ایک گٹھڑی سی اٹھا رکھی تھی اور دو کے پاس مٹی کی ڈولیاں اور مٹی کے پیالے تھے۔ انہوں نے اوپر آ کر گٹھڑی رکھی۔ دوسریوں نے ڈولیاں اور پیالے رکھے اور سبھوں کچھ کہے بغیر ٹیکری سے اُتر گئیں۔

گائیڈ عبدالرحمٰن اور عطاء اللہ پیٹ کے بل آگے بڑھے۔ انہوں نے گٹھڑی، ڈولیاں اور پیالے کمسیٹ لیے۔ گٹھڑی میں مکئی کی روٹیاں اور مکھن تھا اور ڈولیوں میں لسی تھی۔

*

سورج غروب ہوا تو ساری پارٹی ایک جھونپڑے میں فرش پر بیٹھی تھی۔ فرش پر میزبانوں نے کھیس اور چادریں بچھا دی تھیں۔ گاؤں والوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی اپنے انداز اور اپنی دوائیوں سے کر دی تھی۔ کمانڈو مہمان کھانا کھا کر قہوہ پی رہے تھے۔ انہیں مستند اطلاع مل گئی تھی کہ انڈین آرمی کی جو بٹالین دن کو یہاں سے گزری تھی وہ کم و بیش دس میل آگے چلی گئی ہے۔

گاؤں کا دلاسا بڑی صاف اُردو بول رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ دن کو ہندو فوجی افسروں نے انہیں باہر بلا کر کہا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی چوری چھپے سرحد کے اندر آجاتے ہیں اور نقصان کر کے

www.iqbalmt@gmail.com scanned by iqbalmt@gmail.com

چلے جاتے ہیں۔ ان ہندو افسروں نے انہیں ڈرا تے ہوئے کہا تھا کہ جن کشمیریوں نے اُن کی مدد کی ہے ان کے گھروں کو آگ لگا کر انہیں اس آگ میں زندہ جلا دیا گیا ہے۔ ہندو افسروں نے انہیں یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی جو شلواریں اور قمیضیں پہن کر اِدھر آتے ہیں وہ گاؤں کو بھی لوٹتے ہیں اور جو لڑکی انہیں اچھی لگے اُسے اُٹھا لے جاتے ہیں، اس لیے کوئی دیہاتی ان کی مدد نہ کرے بلکہ انہیں گرفتار کرایا جائے اور گرفتار کرانے والے کو نقد انعام ملے گا۔

"میں جانتا ہوں انہوں نے کشمیر میں کئی گاؤں جلا ڈالے ہیں"۔ بوڑھے دلوا نے کہا۔ "لیکن ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کی راہ میں گھر جلوانے کا جو انعام اللہ دیتا ہے وہ کوئی بندہ نہیں دے سکتا۔ لیکن میرے عزیزو! پاکستان اور آزاد کشمیر پر حکومت کرنے والوں تک میری یہ بات پہنچا دینا کہ ہمیں آزاد کرانے یا اعلان کردو کشمیر کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ اگر آج ہم ہندوؤں کی حکومت سے کہہ دیں کہ ہم پاکستان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں تو ہماری ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں۔ مگر ہم تمہاری مدد کی طرف دیکھ رہے ہیں..... ہر کوئی کہتا ہے کہ انسان مرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ کشمیر کے لوگ ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں....

"ہم مرنے سے نہیں ڈرتے۔ اگر ہم ڈرنے والے ہوتے تو تم سب اگر وقت پہ نہ پہنچتے تو اب تک ہندو فوج کے پاس اُلٹے لٹکے ہوتے ہوتے۔ تم نہیں جانتے کہ کتنی بار یہاں بھاگ کر ہم نے وہ جرم کیا ہے جس کی سزا گاؤں کے بچے سے بوڑھے تک کی موت ہے۔ لیکن تمہیں پناہ دینے اور سرحد سے صحیح سلامت نکالنے کے لیے سارا گاؤں جاگ رہا ہے۔ گاؤں کے لڑکے گاؤں سے دور تک پہرے پر گھوم پھر رہے ہیں خطرہ آتا نظر آئے تو وہ گیدڑوں کی طرح بولیں گے اور تمہیں ان پہاڑوں میں غائب کر دیں گے۔ ہم تم سے کوئی قیمت نہیں مانگتے۔ ہم ہندو سے آزادی مانگتے ہیں۔ اس کے لیے ہم سے جو بھی قیمت مانگے ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ جانوں تک ہم دیں گے۔"

"اب کشمیر آزاد ہو کے رہے گا"۔ کیپٹن اصغر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہم یہاں تمہاری آزادی کے لیے جانیں قربان کرنے آئے ہیں۔"

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو بیٹا"۔ دادا نے کہا۔ "میں نے کچھ اور دیکھا ہے۔ اب بھی ایسے ہی نہ ہو۔"

کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اسلم نے جذباتی باتیں شروع کر دیں لیکن گاؤں کا دادا جو سارے کشمیر کا دادا لگتا تھا مسکراتا رہا، پھر تھکے ماندے کمانڈو اونگھنے لگے اور سو گئے۔

*

ملک رجب علی خان اور ملک ناصر آدھی رات کے وقت ایک عورت سے واپس آ رہے تھے۔ ملک ناصر ولائتی وہسکی کے نشے میں کچھ نہ کچھ بولتا آ رہا تھا۔ ملک رجب علی نے بھی دو چار گھونٹ پی لی تھی۔ وہ ہوش میں رہنا چاہتا تھا۔ اُسے کچھ سننا تھا، کچھ دیکھنا تھا، چہرے پہچاننے تھے۔ ان چہروں پر نظر آنے والے نقاب تھے۔ اُسے یہ نقاب پہچاننے تھے۔

دعوت کا اہتمام محل جیسی ایک کوٹھی میں کیا گیا تھا۔ مہمان صرف چھ تھے۔ ساتواں میزبان تھا۔ ان سات

میں تین بڑی ہی شوخ اور بہت ہی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ملک ناصر نے رجب علی کا تعارف کرایا تو سب سے پہلے لڑکیوں نے آگے ہو کر باری باری اُس سے ہاتھ ملائے۔ پھر ایک لڑکی نے اُسے تھپتھپا چھوڑا۔ تمام وقت اُس کے ساتھ رہی۔ دوسرے مہمانوں نے بھی رجب علی میں زیادہ دلچسپی لی۔ رجب علی نے اس لڑکی سے نام پتہ پوچھا۔

"شاذی کہہ لیا کریں"۔ لڑکی نے کہا۔ "اتا پتہ پوچھ کے آپ کیا کریں گے..... ملک ناصر نے بتایا تھا کہ آپ بڑے زندہ دل انسان ہیں۔ آئیں، باہر لان میں ذرا ٹہلتے ہیں۔ گلاس اور بوتل وہیں لے چلتے ہیں۔ ملک ناصر نے بتایا تھا کہ آپ بلا نوشی ہیں۔"

"کبھی تھا"۔ رجب علی نے کہا۔ "اب نہیں۔"

"میرے ہاتھ سے بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"میں شاید آپ کو اچھی نہیں لگی"۔ شاذی نے کہا۔ "مجھ میں کیا خامی دیکھی ہے آپ نے؟"

"صرف یہ کہ تم میری بیوی نہیں ہو"۔ رجب علی نے کہا۔ "میری بیوی تم جیسی جوان نہیں لیکن تم سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

"آپ نے دوسری شادی کی ہے نا؟"۔ لڑکی نے کہا۔ "آپ مُردہ دل ہو گئے ہیں..... سُنا ہے آپ بہت سے زمیندار ہیں۔"

"ہوں۔ میری کوٹھی اس کوٹھی سے زیادہ بڑی اور اس سے زیادہ خوبصورت ہے"۔ رجب علی نے کہا۔ "لیکن آتی ہے جو مجھے کاغذوں میں دیکھنا پڑتا ہے کہ کتنی ہے۔"

وہسکی کے اور قریب ہونے لگی۔ رجب علی پولیس آفیسر رہ چکا تھا۔ اُس نے ایسی باتیں کیں کہ لڑکی اُس کی آنکھوں، اُس کے حسن و جوانی، اس کے انداز اور اس کی شوخیوں کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ لڑکی اُسے اپنے کسی اور جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ آخر عورت تھی۔ عورت ایسی چوٹ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ اُسے کوئی مرد کہے کہ لاکھوں عورت کے مقابلے میں تم کچھ بھی نہیں ہو۔

کچھ وقت گزرا تو شاذی ملک رجب علی خان کے جال میں آ گئی اور وہ اُسے لان میں لے گیا۔

"تمہیں ابھی مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے"۔ رجب علی نے کہا۔

"کیسی ٹریننگ؟"

"شاذی!"۔ رجب علی نے کہا۔ "میں تمہارا ساتھی ہوں۔ اگر ملک ناصر نے تمہیں میرے متعلق کچھ اور بتایا ہے تو وہ غلط ہے۔ میری فیلڈ کچھ اور ہے۔ وہ تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ میں تمہارا امتحان لیتا رہا ہوں۔ تم نے مجھے مایوس کیا ہے۔"

"میں کہیں بھی ناکام نہیں ہوئی"۔ لڑکی نے کہا۔ "ملک ناصر سے پوچھ لیں۔"

"تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

"شاذیہ ہی اصلی نام ہے"۔ لڑکی نے کہا۔ "اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گے یا اپنی فیلڈ میں چلے جائیں گے؟"

iqbalmt@gmail.com scanned by

"کچھ دن یہیں رہونگا۔۔۔۔ ملک نامر نے تمہیں میرے متعلق کیا بتایا تھا؟"

"کہتا تھا کہ یہ شخص کام کا ہے" — لڑکی نے کہا۔ "لیکن پاکستانی ہوگیا ہے۔ اسے اپنے رنگ میں لینا ہے"

رجب علی نے قہقہہ لگایا اور بولا — "نامر شیطان چیز ہے۔"

"آپ پہلے آدمی ہیں جو میرے دل کو اچھے لگے ہیں" — شاذی نے کہا — "یہ بات میرے دل سے نکلی ہے۔ اسے پیشہ ور بات نہ سمجھئے گا۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کوئی ہو جس کے ساتھ دل کی باتیں کیا کروں۔"

"اگر مجھے سُنانا چاہتی ہو تو سنوں گا" — رجب علی نے کہا — "لیکن آج نہیں۔"

کیا آپ واقعی بہت بڑے زمیندار ہیں؟"

"میں نے اپنے متعلق تمہیں کوئی بات غلط نہیں بتائی" — رجب علی نے کہا — "میری بیوی بھی ہے لیکن تم مجھے اپنا ہمدرد اور غمگسار سمجھ سکتی ہو۔"

رجب علی اور ملک نامر صبح بہت دیر سے جاگے۔ رجب علی نے نامر سے پہلی بات یہ کہی — "یار! اتنا فکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے جس طرح بھی استعمال کرنا چاہو کرو۔ میں کہاں کا سچا پاکستانی ہوں۔"

ملک نامر نے لپک کر اُسے گلے لگالیا۔

طاہرہ پرویز بے چین تھا۔ طاہرہ جو اُس کی بے چینی پر خوش ہوا کرتی تھی اب کچھ پریشان سی ہونے لگی تھی۔ اُس نے اور ارشد نے طاہر پرویز کو کچھ سال پہلے بتا دیا تھا کہ وہ عفت کا بیٹا ہے اور عفت اُس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ اس انکشاف پر طاہر پرویز کا ردِ عمل یہ تھا کہ اُس پر شکستہ سا طاری ہو گیا تھا اور اُس کی نظریں خلاء میں کسی نقطے پر جم گئی تھیں جیسے تصور میں اپنی ماں کو دیکھ رہا ہو۔ اُس کی آنکھیں خشک رہیں اور ہونٹ آدھ کھلے رہے۔

طاہرہ کے آنسو اُمڈ آتے تھے۔ ارشد کی آنکھیں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں سرخ ہو گئی تھیں۔ ارشد نے لپک کر طاہر پرویز کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طاہر پرویز طاہرہ کے آنسو دیکھ لے۔ طاہر پرویز کی پیدائش پر تو بنی طاہرہ نے بڑی تیزی سے اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کر لیے تھے۔

طاہر پرویز کی عمر اُس وقت نو دس سال تھی۔ اُس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ابھی اتنا نہیں تھا کہ اُس انکشاف پر جو رنج و الم سے بھرپور تھا، وہ اپنے ردِ عمل کا اظہار کر سکتا مگر وہ بچہ اتنا شدید تھا کہ اُس کی زبان پر الفاظ آ گئے۔

"مال! اپنی زندگی مجھے دے گئی ہے" — اُس نے کہا تھا۔

"ہم سب نے اپنی اپنی زندگی تمہیں دے دی ہے طاہری!" — طاہرہ نے کہا — "ہم سب میں تمہارے ابو، دادا جان، دادی جان، تمہارے لیے زندہ ہیں۔"

طاہر پرویز ارشد کے بازوؤں سے نکل کر طاہرہ کے سینے سے جا لگا جیسے اُس کی مری ہوئی ماں اپنا پیار اِس سینے میں رکھ گئی ہو۔ یہ محض خیال ہی نہیں تھا۔ اُس کی ماں اپنی تمام تر ممتا طاہرہ کے سینے میں چھوڑ گئی تھی۔ اُس کی موت کے وقت طاہرہ اُس کے پاس نہیں تھی۔ صرف یہ نہیں کہ طاہرہ اتنی دور تھی کہ عفت کے آخری وقت پہنچ نہ سکی بلکہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

عفت نے ہسپتال کے پرائیویٹ روم میں ارشد سے کہا تھا — "میں زندہ نہیں رہوں گی ارشد! طاہرہ جہاں کہیں ہے اُسے ڈھونڈ لانا اور میرا بچہ اُسے دے دینا۔"

طاہرہ اُس وقت آئی تھی جب بچہ چھ سات سال کا ہو گیا تھا۔ ارشد اِس عرصے میں اُس کے ذہن میں یہی ڈالتا رہا تھا کہ طاہرہ اُس کی امّی ہے اور وہ آجائے گی۔ پھر طاہرہ آ گئی اور اُس نے طاہر پرویز کو ایسا دیوانہ وار پیار دیا کہ بچے کو یہ پوچھنے کی بھی ہوش نہ رہی کہ امّی! آپ اتنا عرصہ کہاں رہی ہیں؟

ارشد ہوشمند تھا۔ ارشد کا باپ بھی عقلمند تھا۔ اُنہوں نے طاہر پرویز پر پیار کا نشہ طاری کیے رکھا۔ اتنا زیادہ پیار بچوں کو بگاڑ دیا کرتا ہے۔ ان کی شخصیت کمزور رہ جاتی ہے۔ بڑے ہو کر بھی وہ پھیپھے سے دستبردار نہیں ہوتے۔ ارشد نے اس خطرے کو بھانپتے ہوئے طاہر پرویز کو اُسی عمر میں پاکستان کی کہانیاں سنانی شروع کر دی تھیں جب اُس کی توتلی زبان پاکستان کو پتان کہا کرتی تھی۔ بچہ جُوں جُوں بڑا

iqbalmt@oneurdu.com Scanned

ہوتا گیا "پاکستان" اور "مسلمان" اُس کے خون میں شامل ہوتے گئے۔ پھر اُس نے خود پوچھنا شروع کر دیا کہ یہ کیسے ہُوا، وہ کیونکر ہُوا۔ پھر اُس کے ذہن میں دشمن کا تصور واضح ہو کر آگیا مگر اُس کی ایک فرمائش ایسی تھی جو پوری نہ کی جا سکی۔ اُس نے کہا تھا کہ ابّو! مجھے ہندو دکھلائیں۔

"بیٹا!" — ارشد نے یہ جانتے ہُوئے کہ بچہ اُس کی بات نہیں سمجھ سکے گا، کہا تھا — "ہندو اپنا آپ کبھی خود ہی دکھائے گا" — پھر اُس نے کہا تھا — "ہندو یہاں نہیں ہوتے طاہری!"

"چڑیا گھر میں بھی نہیں؟"

ارشد ہنس ہنس کے دوہرا ہو گیا تھا۔

اور اب طاہر پرویز دانت پیس پیس کر کہنے لگا تھا — "میں ہندو کو بہت قریب سے دیکھوں گا۔"

▽

طاہر پرویز کی بے چینی کا سبب یہی تھا۔ وہ عمر کے سولہویں سال میں داخل ہو چکا تھا۔ رن کچھ کا معرکہ لڑا جا چکا تھا۔ ہندو پاکستان کو اپنی مرضی کے میدان میں لانے کی دھمکی دے چکا تھا۔ اصغر کیپٹن بن کر طاہر پرویز پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اُس نے ارشد کا اور دادا جان کا ناک میں دم کر رکھا تھا کہ اُسے فوج میں بھرتی کرا دیا جائے۔ سب اُسے کہہ چکے تھے کہ اُس کی عمر ابھی پُوری نہیں ہُوئی۔

کشمیر کے مجاہدوں اور کشمیریوں کی کہانیاں بھی طاہر پرویز کے کانوں میں پڑ چکی تھیں۔ کچھ بڑی جذباتی کہانیاں سناتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں ہمارے مجاہدوں نے جانبازی، شجاعت اور جذبۂ حب الوطنی کے حیران کن مظاہرے کر رہے تھے لیکن لوگوں نے اپنی کہانیاں گھڑ لی تھیں کہ چھاپہ ماروں کو جنات اور اسی قسم کی مافوق الفطرت مخلوق بنا دیا تھا۔ کشمیری عورتوں اور بچوں کے کارنامے بھی سُنے اور سنائے جاتے تھے جو اس قدر جذباتی تھے کہ سننے والوں کے آنسو نکل آتے اور خون کھولنے لگتا تھا۔

طاہر پرویز مٹھیاں بھینچتا، دانت پیستا اور اپنی ہتھیلی پر مُکّے مار کر بات کرتا تھا۔

"امّی!" — ایک روز اُس نے طاہرہ سے کہا — "دادا جان مجھے فوج میں بھرتی کرا سکتے ہیں، آپ کہیں مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ نہ لے گئے تو میں خود کشمیر چلا جاؤں گا۔"

طاہرہ نے ارشد کو بتایا۔ دونوں نے مِل کر اُسے ٹھنڈا کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور اُسے بتایا کہ پاکستان کے لیے اُسی کو اور اُسی جیسے نوجوانوں کو لڑنا ہے لیکن جذبات سے نہیں عقل سے۔

"آپ نے میری عقل میں جو کچھ ڈالا تھا وہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا۔" — طاہر پرویز نے کہا — "مجھے آوارہ چھوڑ دیتے۔ میں گلیوں میں ان لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہتا جو سگریٹ پیتے ہیں، جُوا کھیلتے ہیں، فلمیں دیکھتے ہیں، گالیوں کی زبان میں بات کرتے ہیں، سکول سے آزاد ہیں۔"

ارشد اور طاہرہ کے پاس مثبتی دلیلیں تھیں انہوں نے دے ڈالیں۔ ان سے طاہر پرویز ٹھنڈا تو ہو گیا لیکن اُس کی بے قراری نہ گئی۔ اُس رات طاہرہ نے اُسے جاگتے اور کروٹیں بدلتے دیکھا تو وہ پریشان ہو گئی۔ اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ لڑکا ابنارمل ہو گیا ہے۔ طاہرہ کو تڑاقع خیال آیا کہ طاہر پرویز کو یہ سوچ تنگ نہ کر رہی ہو کہ اُس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ ایسی محرومی بعض بچوں کے ذہن لاشعور میں اُتر کر انہیں ابنارمل بنا دیا کرتی ہے۔

طاہرہ نے ماضی میں کوئی کمی تو نہیں رہنے دی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے زیادہ طاہر پرویز سے پیار کرتی تھی گھر میں اہمیت طاہر پرویز کو ہی دیتی تھی مگر اُس کی یہ بے چینی غیر معمولی سی تھی۔ طاہرہ کا باپ جمال بیگ اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرے دن اُس نے باپ کو بتایا کہ طاہر پرویز پاکستان کے معاملے میں جذباتی ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اُس کی ذہنی حالت یہی رہی تو وہ فوج میں افسر نہیں بن سکے گا۔ طاہرہ نے اپنے باپ کو یہ خطرہ بھی بتایا کہ لڑکا شاید اپنی ماں کے خیال میں اُلجھا رہتا ہے۔

"میں سنبھال لوں گا۔" — جمال بیگ نے کہا — "خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ پاکستان کے معاملے میں جذباتی ہے۔ کسی کی محبت کے معاملے میں نہیں۔ اس عمر میں لڑکے ظلّوں کے ہیرو بن جایا کرتے اور تصوّروں کی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔"

▽

جمال بیگ بھی طاہرہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اُسے ہر بچے سے پیار تھا لیکن طاہر پرویز کے ساتھ اور طاہرہ کے دوسرے بچوں کے ساتھ تو اُسے والہانہ پیار تھا۔ چھوٹے بچوں کے لیے وہ کوٹھی کے لان میں گھوڑا ہی بنا رہتا تھا۔ ایک روز طاہر پرویز اپنے تین چار دوستوں کو ساتھ لے آیا۔ یہ اُس کے ہم جماعت تھے اور اُسی کی طرح جوشیلے اور جذباتی۔ طاہر پرویز جمال بیگ سے متاثر تھا۔ جمال بیگ نے کتابیں تو نہیں پڑھی تھیں۔ انسان اور حالات پڑھے اور اپنی ذات کا مطالعہ کیا تھا۔ اُس کی باتوں میں علمیت کم اور حقائق زیادہ ہوتے تھے۔

"نانا!" — طاہر پرویز نے جمال بیگ سے کہا — "میں انہیں آپ کے پاس لایا ہوں۔ یہ بھی میری طرح پاکستان پر قربان ہونا چاہتے ہیں۔"

جمال بیگ کو طاہرہ بتا چکی تھی کہ طاہر پرویز ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو گیا ہے اور پاکستان کے علاوہ شاید اپنی ماں کے خیال میں اُلجھا رہتا ہے۔ جمال بیگ نے اسی کے پیشِ نظر ان لڑکوں سے بات کی۔

"جذبات کو عقل کی راہنمائی کی ضرورت ہے میرے بچو!" — جمال بیگ نے کہا — "تاریخِ اسلام نے ایسے جرنیل پیدا کیے ہیں جنہیں اسلام کے دشمن بھی یاد کرتے ہیں۔ طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی کے نام تمہاری زبان پر چڑھے ہُوئے ہوں گے۔"

"ہمیں ان کے کارنامے زبانی یاد ہیں۔" — ایک لڑکے نے کہا۔

"ایسے کارنامے تم بھی دکھا سکتے ہو۔" — جمال بیگ نے کہا — "لیکن تمہیں اپنے اندر اُن جیسے اوصاف پیدا کرنے ہوں گے۔ پہلا وصف یہ کہ وہ جذباتی نہیں تھے اور دوسرا یہ کہ وہ قربان نہیں ہونا چاہتے تھے۔"

لڑکوں نے جمال بیگ کو چونک کر دیکھا۔

"ہاں... میں جانتا تھا تم حیران ہو گئے۔" — جمال بیگ نے کہا — "قربان ہونے کا مطلب ہے جان دے دینا... جان دینا کوئی مشکل نہیں مشکل کام جان لینا ہے۔ مورچے کے باہر کھڑے ہو جاؤ، دشمن کی گولی آئے گی اور لوگ کہیں گے کہ یہ لڑکا اپنے وطن پر قربان ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لڑکا ضائع ہو گیا ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ یہ لڑکا دشمن کو ڈھونڈتا اور وہ کوشش کرتا کہ مرنے سے پہلے دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مار ڈالتا۔ اگر محمد بن قاسم کو جان قربان کرنے کی جلدی ہوتی تو وہ ہندوستان تک نہ پہنچتا۔

iqbalmt@gmail.com Scanned by

میدان میں اترنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ تم نے اپنے وطن اور اپنے مذہب پر جان کی بازی لگادی ہے۔ صرف یہ دیکھو کہ تم جان لے کر بھاگ نہ آؤ بلکہ کوشش کرو کہ بازی جیت لو۔ جان جاتے تو دشمن کی جاتے تمھاری نہ جائے۔ فتح حاصل کرنے کے لیے جان دینے کی ضرورت پڑے تو دے دو۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کٹ مرنے کی باتیں کرتے ہو۔ کاٹنے اور مارنے کی بات کرو ..... طارق بن زیاد، محمد بن قاسم وغیرہ دشمن کا صفایا کرنے کا عزم لے کر نکلے تھے۔ انہوں نے راہنمائی اپنے جذبات سے نہیں اپنی عقل سے لی تھی۔ جذبات میں گرمی ہونی چاہیئے جیسے چنگاری۔ اسے بھک سے اڑ جانے والا بارود نہ بننے دو۔"

"اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کو لیڈر بازو دبنا دیتے ہیں۔" ایک لڑکے نے کہا۔

"سیاسی لیڈر تمھاری اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں جسے جذباتیت کہتے ہیں۔" جمال بیگ نے کہا۔ "وہ گھاگ ہیں۔ منجھے ہوئے استاد ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تم کچھ کرنے کے لیے، کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب ہو اور تم جذباتی ہو۔ وہ تمھارے جذبات کو بھڑکا دیتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے تمہیں منزل دکھا دی ہے، یا دشمن کا وہ قلعہ دکھا دیا ہے جسے سر کرنا ہے۔ تم جذبات سے اندھے ہو کر ٹوٹ پڑتے ہو۔ ہنگامہ خیز جلوس نکالتے اور توڑ پھوڑ کرتے ہو۔ دو چار روز یہ سلسلہ چلتا ہے پھر تمہیں پتہ چلتا ہے کہ تم کسی منزل پر نہیں پہنچے اور تم نے کوئی قلعہ سر نہیں کیا۔ یہ تو سیاست دانوں کا اپنا ایک کھیل تھا جو وہ کھیل کر ایک طرف ہو گئے ہیں۔ یہ ان کی سیاسی مفاد پرستی تھی۔"

"جذبات پھر بھی لازمی ہیں۔" طاہر پرویز نے کہا۔ "حیدر لڑکے جو سکولوں جاتے گلیوں میں آوارہ پھرتے، رہتے ہیں آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، گالی گلوچ کرتے ہیں، لوگوں کے گھروں سے نکالیاں اور چوریاں کرتے ہیں، ان میں سرائیت ہوتی ہے۔ ان سے آپ توقع نہیں کر سکتے کہ یہ پاکستان کے لیے کچھ کریں گے۔ قصور ان کی زیادہ ہے۔ ان کے ماں باپ غریب ہیں۔ ان کا ایمان ان کے پیٹ کا پابند ہے۔ یہ جو غلیظ محلوں اور جھگیوں میں رہتے ہیں۔ یہ پاکستان کے لیے کیا کریں گے۔ ہمیں پریشانی یہ ہے کہ جو کچھ کرنا ہے وہ ہمیں ہی کرنا ہوگا۔ ہمارے پاس تعلیم ہے۔ ہم اتنے اچھے مکانوں میں رہتے ہیں۔"

"تم ابھی بچے ہو زاہد بیٹا!" — جمال بیگ نے کہا — "کیا طاہر وانی نے اور تو نے نہیں بتایا کہ پاکستان بنانے والوں میں انہی جیسے لڑکے شامل تھے جو گلیوں میں آوارہ پھرتے، گالی گلوچ کرتے ہیں اور جن کے ماں باپ غریب تھے اور وہ جھگیوں میں رہتے تھے؟ آج ان کے بچے گلیوں میں گالی گلوچ کرتے پھرتے ہیں۔ پہلے وہ ہندوستان کی جھگیوں میں رہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان بنایا اور ہندوستان سے آکر پاکستان کی جھگیوں میں رہنے لگے۔ ملک و ملت کی خاطر قربانی کے جذبے کے لیے امیر یا غریب ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ ہنوالیوں تھا کہ آزادی کی جنگ میں غریب اور آوارہ لوگ سب سے آگے تھے۔ اب بھی وہی آگے ہوں گے۔ ادھر اُدھر سے ہتھیائی ہوئی دولت والوں اور جاگیروں کے مالکوں کے بیٹے نہ اس وقت میدان میں نظر آتے تھے نہ اب نظر آئیں گے... کسی کو آوارہ اور بیکار نہ سمجھو۔ وقت آیا تو سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں گے۔ میں نے ایسا ہوتے دیکھا ہے۔"

"ایسا کیونکر ہوتا ہے نانا جی" — طاہر پرویز نے پوچھا۔

"یہ نصب العین کا کمال ہے بیٹا!" جمال بیگ نے کہا — "اُس وقت ہمارے سامنے یہ نصب العین تھا کہ انگریزی راج سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ ہندو کی عیاری اور فریب کاری سے بچنا ہے اور اپنی ایک آزاد اسلامی مملکت بنانی ہے۔ یہ ایک محاذ تھا جس پر ہر کوئی جمع ہو گیا تھا۔ ران کچھ کی لڑائی نے ہمیں ایک اور نصب العین دے دیا ہے۔ تم دیکھنا کہ یہی آوارہ بدمعاش لڑکے ساتھ ہوں گے۔ کسی کو حقیر نہ سمجھو میرے بچو! اپنی قوم کو تم گمراہ اور بھٹکا ہوا نہ سمجھو۔ جس قوم سے منزل چھپالی جائے اور جس سے نصب العین اور قومی مقصد چھین لیا جائے وہ اسی طرح بھٹک جایا کرتی ہے۔"

جمال بیگ نے بڑے پیار سے باتیں کر کے طاہر پرویز اور اُس کے دوستوں کو جذباتی قسم کے جوشیلے پن سے نکال لیا۔

▼

اصغر کی تیرہ جوانوں کی کمانڈو پارٹی مقبوضہ کشمیر کے اُس گاؤں میں جہاں انہیں ایک گڈریا لڑکا ملا گیا تھا، گہری نیند سو گئی تھی۔ گاؤں کے جوان آدمی جاگ رہے تھے۔ انہوں نے ساری رات گاؤں کے ارد گرد گھومتے، بلندی پر جاتے، اترتے، گاؤں کے قریب سے گزرنے والے راستے پر کبھی اِدھر کبھی اُدھر جاتے اور بھارتی فوجیوں کی مشک لیتے گزار دی۔

گاؤں کی عورتوں نے دادا کے کہنے پر آدھی رات کے بعد اصغر کی پارٹی کے لیے کھانا تیار کر دیا تھا۔ کھانا کھا کر اصغر نے کہا تھا کہ وہ سحر کی تاریکی میں روانہ ہو جائیں گے۔ پارٹی کو کچھ وقت کے آرام کی ضرورت تھی۔ سحر سحر کی تاریکی چھٹ گئی۔ صبح کی سپیدی نکھر آئی۔ پارٹی کے کسی جوان کو ہوش نہیں تھی۔ صبح پہاڑیوں پر آگیا تو بھی وہ سوتے رہے۔ وہ لاشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔

دادا انہیں جگانے کے لیے وقت پر آگیا تھا لیکن اُن کے خراٹے سُن کر دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ ان کے جسم بارش میں اتنی دیر رہنے سے اکڑ گئے ہوں گے اور کیچڑ اور پانی میں رات بھر چل چل کر ان کی ٹانگیں بھی دُکھ رہی ہوں گی۔ دادا نے بڑی آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور دروازے کے باہر بیٹھ گیا۔ وہ سورج کے اجالے کو تکتا تھا اور ستاروں کو آسمان میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ جب صبح کی روشنی صاف ہو گئی تو وہ اُٹھا اور کواڈ بڑے آرام سے کھولا۔ اندر کسی کو ہوش نہیں تھی کہ اُن کی روانگی کا وقت گزر گیا ہے اور دن اپنے پورے خطوں کے ساتھ روشن ہو گیا ہے۔ دادا کواڈ بند کر کے اندر کواڈ کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور اُس کی نگاہیں سوئے ہوئے جوانوں پر گھومنے لگیں۔

بوڑھے دادا کے مرجھائے ہوئے گلابی چہرے پر کشمیر کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ اُسے اپنے سامنے سوتے ہوئے جوان لاشیں لگ رہے تھے۔ اگر اُس کے سامنے یہ تیرہ جوان لاشیں ہی ہوتے تو بھی وہ حیران نہ ہوتا۔ کشمیر ڈیڑھ سو برسوں سے لاشوں کا دیس بنا ہوا تھا۔ چلتے پھرتے انسان بھی لاشیں ہی لگتے تھے۔ دادا کو ۱۹۴۷ء کی لاشیں یاد آنے لگیں پھر اُسے ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کی جنگ آزادی یاد آئی۔ اٹھارہ سال پہلے وہ اتنا بوڑھا نہیں تھا۔ اُس کے پاس رائفل نہیں تھی جو اُس کے

iqbalmt@onelibrary.com scanned by iqbalmt

پاس کبھی بھی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ اس جنگ میں شریک تھا مگر اس جنگ نے بھی اُسے لاشوں کے سوا کچھ نہ دیا — لاشیں مجاہدین کی لاشیں بچوں کی، لاشیں بوڑھوں کی، لاشیں عورتوں کی — انسس کا خطہ غلام ہی رہا۔

"آج تم آئے ہو" — اُس نے دل ہی دل میں اصغر کی سوئی ہوئی پارٹی سے کہا "کہاں سے آئے ہو تم؟ کہاں کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔ تم مجھے نہیں جانتے مگر دل دلوں کو جانتے ہیں۔ خون کے رشتوں کو پہچانتے ہیں۔ تم سینوں میں ہمارا درد لے کر آئے ہو۔ ہم تمہارے سینے پر آنے والی گولی اپنے سینے میں لے لیں گے..... سوئے رہو میرے بچو! تمہارے جسم ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ آج تم سانس لے رہے ہو۔ جانے کب تمہارا سانس رک جائے اور تمہارے لہولہان جسم، خون سے خالی ہو کر جانے کہاں کہاں پڑے ہوں..... تم ستارے ہو۔ ایک ایک کر کے ٹوٹ جاؤ گے اور آخری بار چمک کر اندھیرے آسمان میں گم ہو جاؤ گے..... سوئے رہو۔ گہری نیند سوئے رہو۔ دن کو تم پر آنے والے ہر خطرے کو ہم اپنے اوپر لیں گے۔ تم میرے بچے ہو۔ میں تمہیں لوریاں گا کر نہیں سلا سکتا مگر تمہارے چہروں کو اپنی آنکھوں میں سمو لوں گا۔ چلے جاؤ گے جب تک کب آؤ گے، تمہیں شاید پھر کوئی ادھر نہیں آنے دے گا۔ دشمن تمہیں راستے سے ہٹا دے گا۔ تمہارے اپنے بادشاہ مختار راستہ روک لیں گے، اور تمہارے وہ ساتھی جن کی لاشیں تم پیچھے چھوڑ چلے ہو اُن کے ناموں پر لکیریں پھر جائیں گی۔ انہیں اُن کے گھر والوں کے سوا کوئی یاد بھی نہیں رکھے گا۔"

دادا کی نگاہیں ان پر گھومتی رہیں اور وہ سب اُس کے آنسوؤں میں جل تھل جل تھل کرنے لگے جیسے جھیل میں کسی نے کنکری پھینک دی ہو۔

کیپٹن اصغر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھبرائی دیکھی اور دادا کی طرف دیکھا تو اسے دادا بیٹھا نظر آیا۔

"ہمیں جگایا کیوں نہیں؟" — اُس نے دادا سے پوچھا۔

"مت گھبراؤ بیٹا!" — دادا نے التجا کے لہجے میں کہا "تم پھر یہاں کبھی نہیں آؤ گے۔ آنے کی بات بعد میں کرنا پہلا مسئلہ تو یہاں سے جانے کا ہے" — اصغر نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ کہنے لگا — "اس وقت تک ہم بہت دور نکل گئے ہوتے۔"

اصغر نے نائب صوبیدار اسلم کو جگایا۔ وہ بھی گھبرایا ہوا اٹھا اور معافی طلب نگاہوں سے پہلے کیپٹن کو دیکھنے لگا۔ اصغر نے اُسے بھی کہا کہ دادا نے انہیں جگایا نہیں۔ نائب صوبیدار اسلم نے دادا کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا" — دادا نے ملتجی لہجے میں کہا "تمہیں اتنی ظالم تھکن میں سوتا پڑے دیکھ کر جگانا مناسب نہ سمجھا۔ گھبراؤ نہیں۔ یہاں سے تم سب کو نکالنا ہمارا فرض ہے..... اگر میں نے تمہارا نقصان کیا ہے تو مجھے معاف کر دینا" — وہ اٹھا — "میں کھانا لے آؤں" — اور وہ باہر نکل گیا۔

اصغر نے اور اسلم نے سب کو جگا دیا۔ اتنے میں تین چار آدمی لکڑی کی روٹیاں جن پر مکھن رکھا تھا اٹھائے ہوئے کمرے میں آئے۔ دودھ آیا پھر قہوہ آیا۔

"کیا تم رات کو ہی جا سکتے ہو؟" — دادا نے پوچھا۔

"دن کو مروانا ہے ہمیں؟" — اصغر نے کہا۔

"ہم تمہیں دن کو بھی نکال سکتے ہیں" — دادا نے کہا — "یہ ہمارا کام ہے۔ ہم گاؤں کے بچے بچے کو تمہاری خاطر مروا دیں گے۔ رات کو ہی جانا ہے تو دن بھر یہیں رہو۔"

"میں تم لوگوں کو خطرے میں نہیں ڈالوں گا" — کیپٹن اصغر نے کہا — "جس طرح کل فوجی افسر یہاں آ گئے تھے آج بھی آ سکتے ہیں۔ ہم اُن کا بہت نقصان کر کے آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں کی فوج گاؤں گاؤں تلاشی لیتی یہاں آ جائے۔ ہم لڑیں گے مگر سنا ہے تمہیں بھی ملے گی۔ اس گاؤں میں عورتیں ہیں۔ جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ ہمیں کسی ایسے مصیبت پر ڈال دو جو ہمارے فوج نہ ہو۔"

"دونوں زخمیوں کو یہیں چھوڑ جاؤ" — دادا نے کہا — "انہیں اٹھا کے چلو گے تو تیز نہیں چل سکو گے۔ ہم ان کے زخم ٹھیک کر کے آزاد کشمیر میں پہنچا دیں گے۔"

"نہیں دادا!" — اصغر نے کہا — "جس روز یہ پکڑے گئے اُس روز اس گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ ہمیں جانا ہے۔ ہم سب کو جانا ہے۔"

▼

اور وہ چلے جا رہے تھے۔ گاؤں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دادا نے دونوں گائیڈوں کو ایک راستہ بتایا تھا۔ پارٹی اس راستے پر چلی جا رہی تھی۔ وہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ درختوں، جھاڑیوں اور اونچی گھاس سے لدی ہوئی اونچی نیچی پہاڑیوں اور ٹیکریوں کے درمیان جہاں گھاس میں ڈھکی ہوئی دلدل بھی تھی، وہ گذرتے جا رہے تھے۔ دونوں زخمی جوانوں کو وہ باری باری پیٹھ پر اٹھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ دونوں گائیڈ کہتے تھے کہ راستہ مشکل ہے لیکن محفوظ ہے اور سرحد دور نہیں مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کے تعاقب میں بھارتی فوج کی پوری پلاٹون آ رہی ہے اور یہ کمانڈو پلاٹون ہے۔

اگر صرف پُل ہی اُڑانا تو بھارتی برداشت کر لیتے۔ مقبوضہ کشمیر میں کئی پُل اڑ چکے تھے۔ یہاں تو پُل کے ساتھ اصغر کی پارٹی پُل کی دونوں پوسٹوں کو بھی تباہ کر آئی تھی۔ تباہی کی کہانی سنانے کے لیے صرف تین سپاہی زندہ رہ گئے تھے۔ وہ علاقہ جس بریگیڈ کی ذمہ داری میں تھا اُس کے کمانڈر نے غصے سے تھوک اُڑاتے ہوئے حکم دیا تھا کہ پاکستانی ہیلی کاپٹروں پر نہیں آئے ہوں گے۔ وہ پیدل آئے تھے راستے میں ندی نالے بھی ہیں اور ساری رات بارش برستی رہی ہے۔ وہ اتنی تیز نہیں چل سکے ہوں گے کہ یہاں سے نکل گئے ہوں۔

وہ بھی آخر فوجی تھے۔ انہوں نے اندازہ کر لیا کہ کمانڈو پارٹی کے آنے اور واپس جانے کا سب سے مختصر راستہ کون سا ہو سکتا ہے۔ بریگیڈ کمانڈر نے پینتالیس جوانوں کی کمانڈو پلاٹون تعاقب میں روانہ کر دی۔ یہ تازہ دم پلاٹون تھی۔ کمانڈو پھٹے ہوئے پھرتیلے، طاقتور اور تیز دوڑنے والے جوان ہوتے ہیں بھارتی فوج کے یہ پینتالیس جوان کودتے پھلانگتے آ رہے تھے۔ وہ دادا کے گاؤں کے قریب سے گزرنے

scanned by iqbalmt@hotmail.com

لگے تو ان کے کمانڈر نے جو کیپٹن تھا پلاٹون کو روک لیا اور حکم دیا کہ اس گاؤں کے ہر فرد کو باہر نکال لاؤ۔ بچوں کو بھی لے آؤ۔

فوجی دوڑتے گئے اور گھروں میں گھس کر مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی دھکیلتے گھسیٹتے، لاتیں اور گھونسے مارتے باہر لے آتے۔

"جھوٹ بولو گے تو کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔۔ کیپٹن نے کہا۔ "گاؤں کو آگ لگا کر سب کو زندہ آگ میں پھینک دیں گے..... رات کو یا ابھی ابھی یہاں سے پاکستان کے فوجی گزرے تھے۔ وہ کس راستے سے گئے ہیں؟"

دادا آگے آگیا اور بولا۔۔ "یہاں سے پاکستان یا آزاد کشمیر کا کوئی فوجی نہیں گزرا۔ کل آپ کی فوج کے بہت سے آدمی یہاں سے گزرے تھے۔ رات کو گزر گئے ہوں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے"۔

"تم سب جہنم رسید ہو"۔۔ ہندو کیپٹن نے کہا۔۔ "تم غدار ہو۔ تمہاری سزا صرف یہ ہے کہ تم سب کو گولی مار دی جائے"۔۔ اس نے آگے بڑھ کر سات آٹھ سال کی عمر کے ایک بچے کو پکڑ لیا اور ریوالور نکال کر گاؤں والوں سے مخاطب ہوا۔ "خود آجاؤ، ورنہ اس بچے کے سر کے پرخچے اڑا دوں گا"۔۔ اس نے ریوالور کی نالی بچے کے سر کے ساتھ لگا دی۔

بچے کی ماں چیختی چلاتی بچے کی طرف دوڑی۔ بچہ رونے لگا۔ دادا نے بچے کی ماں کا راستہ روک لیا اور ہندو کیپٹن کی طرف گھوما۔

"کیا تم لوگوں میں یہی مردانگی رہ گئی ہے کہ معصوم بچوں کو گولیاں مارتے پھرتے ہو؟"۔۔ دادا نے ہندو کیپٹن سے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ پاکستان اور آزاد کشمیر سے کوئی یہاں آتے ہیں اور نقصان کر کے چلے جاتے ہیں۔ تم چھ چھ فٹ کے جوان اُن کے سامنے آنے سے ڈرتے ہو اور جب وہ واپس چلے جاتے ہیں تو ہمارے بچوں کو گولیاں مارنے آجاتے ہو۔ تم میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے ہتھیار ہمیں دے دو۔ ہم تمہیں پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجیوں کی لاشیں دکھائیں گے جنہیں یہاں ہم پر رعب جمانے کے لیے اس لیے رکنا پڑا کہ پاکستانی سرحد پار کر جائیں تو پھر آگے جا کر ان کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے ہو"۔

ہندو کیپٹن جوانی کے جوش میں آگیا۔ اس نے بڑے غصے سے بچے کے سر سے ریوالور کی نالی ہٹائی اور اُسے ایسا دھکا دیا کہ بچہ دُور جا پڑا۔

"ہم تمہیں بتائیں گے کہ پاکستانی کتنے بہادر ہیں"۔۔ کیپٹن نے کہا۔۔ "اگر ہمیں پتہ چل گیا کہ تم نے ان کی مدد کی تھی تو اپنے گاؤں کو بچا نہیں سکو گے"۔

اس نے اپنی کمانڈو پلاٹون کو آگے چلنے کا حکم دیا اور بوڑھے دادا کو گھورتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔

▼

کیپٹن اصغر کی پارٹی کی رفتار معمولی تھی۔ گائیڈ بکواس کر رہے تھے کہ اب سمجھو کہ گئے۔ بھارتی فوج کی کمانڈو پلاٹون بہت تیز جا رہی تھی لیکن کسی اور راستے سے۔ پلاٹون کے صوبیدار نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے ایک کشمیری لڑکے کو دیکھا۔ وہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر نیچے یا اُوپر جانے کی بجائے

آگے ہی آگے دوڑا جا رہا تھا۔ ہندو صوبیدار نے اُسے رکنے کو پکارا۔ لڑکے نے اُدھر دیکھا مگر رکا نہیں۔ وہ درختوں کے تنوں کا سہارا لے کر آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ وہ بلندی پر تھا اور دُور بھی تھا۔

"کیوں بلاتے ہیں اُسے؟"۔۔ کیپٹن نے صوبیدار سے پُوچھا۔

"سر!"۔۔ صوبیدار نے جواب دیا۔۔ "یہ نہ کہیں کہ وہ ہمارے ڈر سے بھاگا جا رہا ہے۔ مجھے کچھ شک ہو رہا ہے"۔

صوبیدار نے اُسے پھر آواز دی مگر وہ نہ رُکا۔ دوڑتا ہی گیا۔ صوبیدار نے ایک جوان سے رائفل لی اور لڑکے کو نشست میں لے کر گولی چلا دی۔ لڑکا گھٹنوں کے بل گرا لیکن فوراً اُٹھ کر آگے کو چل پڑا۔ اب اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔

اُس وقت کیپٹن اصغر کی پارٹی اسی پہاڑی کے دامن میں جا رہی تھی۔ ان جانبازوں نے گولی کی آواز سُنی تو وہ ایک دوسرے سے ذرا دُور ہو کر جھاڑیوں اور گھاس کی اوٹ میں ہو گئے۔ اُن کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ہر طرف دیکھتے جا رہے تھے کہ کسی بھی طرف سے دشمن کے آجانے کا خطرہ تھا۔ کسی نے اوپر دیکھا۔ ایک لڑکا اُترتا آ رہا تھا۔

"صوبیدار صاحب!"۔۔ ہندو کیپٹن نے کہا۔۔ "کیا حاصل ہُوا اس لڑکے کو گولی مار کر؟ اب اگر دشمن کے قریب ہُوا بھی تو چھپ گیا ہو گا یا رفتار تیز کر کے نکل گیا ہو گا"۔

صوبیدار اس لڑکے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کسی پاکستانی فوجی کو دیکھا ہو گا۔۔۔ صوبیدار نے کہا۔۔ "پھر اس کی دلیری دیکھیں سر! ہم نے پکارا اور اُس نے حکم عدولی کی۔ ایک مسلمان نے کہا ہے کہ ہم ایسی بدتمیزی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ انہیں راستوں کی نالیوں کے آگے گئے تو یہ ٹھیک رہیں گے، نہیں تو پاکستان کے ساتھی بن جائیں گے"۔

"وہ نظر سے غائب ہو گیا ہے"۔ کیپٹن نے کہا۔۔ "اُسے گولی لگی تھی لیکن آپ نے خود دیکھا ہے کہ"

"چل کے دیکھتے ہیں"۔۔۔ صوبیدار نے کہا۔

▼

لڑکا اوپر سے نیچے آگیا تھا لیکن بالکل نیچے نہیں آیا تھا۔ ذرا اُوپر ہی گر پڑا تھا۔ بھارتی کمانڈو پلاٹون اُسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لڑکا بلند آواز سے کچھ کہہ رہا تھا، کیپٹن اصغر نے اپنے ایک گائیڈ عطاءاللہ سے کہا کہ وہ لڑکے کے پاس جائے۔ شاید ہمیں کچھ بتا رہا ہو۔ عطاءاللہ دوڑا گیا۔ پارٹی آگے چلتی گئی۔

عطاءاللہ کچھ وقت بعد تیز دوڑتا آیا۔

"کیپٹن صاحب!"۔ اُس نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔۔ "راستہ بدلنا پڑے گا۔ دشمن کی شاید پوری پلاٹون آ رہی ہے۔ لڑکا کہتا ہے چالیس پچاس آدمی ہیں"۔۔۔ اُس نے وہ سمت بتائی جدھر سے بھارتی آ رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا۔۔ "لڑکا زندہ نہیں رہے گا۔ اُس کے کندھے میں سے گولی گزر گئی ہے۔ ہندوؤں نے اُسے دیکھ لیا تھا اور اُسے

iqbalmt@onenurdigital.com scanned by

گل مارد ی۔ یہ اُسی گاؤں کا لڑکا ہے جہاں ہم رات گذار آئے ہیں۔ اُس نے بڑی تیزی سے بول کر بتلایا ہے کہ ہندو فوجیوں نے گاؤں کے سب آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو باہر اکٹھا کر کے کچھ کہا تھا۔ اُس وقت یہ لڑکا گاؤں سے دُور ایک ٹیکری پر تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم اِدھر آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے پیچھے دوڑا اور اُوپر ہی اُوپر آتا گیا تاکہ ہم اُسے کہیں نظر آ جائیں۔ یہاں آ کر اسے گولی لگی۔ یہ پھر بھی دوڑتا رہا اور نیچے آتے ہوتے گر پڑا..... دیکھا کیپٹن صاحب! کشمیر کے لوگ کیسے ہیں! یہ لوگ دھوکا کھا لیتے ہیں دھوکہ دیتے نہیں۔"

اب کیپٹن اصغر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نائب صوبیدار صاحب!"— کیپٹن اصغر نے اسلم سے کہا۔ "اگر میرا حکم چل سکتا ہے تو میں اس لڑکے کو اُٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ایسا سوچیں بھی نہیں سَر!"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔ "کشمیر کا یہ پہلا بچہ نہیں جو ہندوؤں کی گولیوں کا نشانہ بنا ہو۔ اب تک ہزارہا بچے کشمیر کی زمین پر قربان ہو چکے ہیں..... باتوں کا وقت نہیں ہے سَر! آگے کی زمین ٹھیک نہیں۔ دشمن اگر آ ہی گیا تو اُسے بلندیاں مل جائیں گی اور ہم کھلے میدان میں ہوں گے۔ آڑ تاک ہے آڑ ست چھوڑیں..... اور دعا کریں کہ دشمن ادھر نہ آئے۔ ورنہ اُسے نظر آئیں۔"

کیپٹن اصغر پر جذباتیت طاری ہو چکی تھی۔ اُس کے تھکے تھکے چہرے پر غصّے کی سُرخی آ گئی تھی۔ وہ جیسے اس تجربہ کار نائب صوبیدار کی بات سُن ہی نہیں رہا تھا۔

"میں اس لڑکے کے خون کا انتقام لوں گا"— اُس نے کہا۔ "آنے دو دشمن کو!"

"کیپٹن اصغر صاحب!"— نائب صوبیدار اپنے عہدے کو جیسے بھول گیا ہو۔ "ہوش میں آئیں۔ اگر آپ ہمیں غلط حکم دیں گے تو کمانڈ میں خود لے لوں گا..... ہمیں دشمن پر ایک ادھ ضرب لگانے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ ہم کسی اور مشن پر پھر یہاں آئیں گے۔ ہمارا مارگریٹ (اِلاقہ جیدا ایک ہندوؤں سے زیادہ بڑا ہوگا۔ اور صاحب! میں آپ جیسے نوجوان کیپٹن کو فضول ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ وہ کشمیری لڑکا جو گولی کھا کر بھی ہمیں خبردار کرنے یہاں تک آ گیا ہے وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ ہم سب کا بیٹا ہے۔ میرے سینے میں بھی اس کا درد ہے۔"

کیپٹن اصغر کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو بہہ نکلے پھر وہ ایک ثانیے میں کمانڈو کیپٹن بن گیا، مگر بڑا قیمتی وقت ضائع ہو گیا تھا۔

بھارتی فوج کی کمانڈو پلاٹون اپنے صوبیدار کی راہنمائی میں اِدھر ہی آ گئی تھی۔ انہیں کشمیری لڑکا نظر آ گیا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ صوبیدار نے اُسے ٹھوکر ماری تو وہ لڑھکتا ہوا نیچے جا پڑا۔ صوبیدار نے نیچے اُتر کر اُسے پاؤں سے سیدھا کیا۔

"پاکستان کے فوجی اِدھر سے گزرے ہیں؟"— صوبیدار نے لڑکے سے پُوچھا۔

"صوبیدار صاحب! یہ مر گیا ہے"— ہندو کیپٹن نے کہا۔

اِس پلاٹون کا ایک جوان دوڑتا آیا۔ اُس نے رپورٹ دی۔ "دشمن نظر آ گیا ہے۔"

وہ کمانڈو پلاٹون تھی جو تلاشں کرنے کی ترتیب میں جا رہی تھی۔ کچھ جوان آگے تھے۔ کچھ ٹیکریاں پر ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کیپٹن اور صوبیدار نیچے اور درمیان تھے۔ آگے اور اُوپر اُوپر جانے والوں نے کیپٹن اصغر کی پارٹی کے کسی ایک جوان کو دیکھ لیا تھا۔

▼

کیپٹن اصغر اور نائب صوبیدار اپنی پارٹی کو چھپا رہے تھے۔ لائٹ مشین گن یا ٹین گن کا برسٹ فائر ہُوا۔ سپاہی عابد جو اِس قدر زخمی تھا کہ چل نہیں سکتا تھا ایک سپاہی کی پیٹھ پر تھا۔ وہ ابھی آڑ میں نہیں ہوئے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ دونوں کے جسموں سے پار ہو گئی۔ دونوں کبھی نہ اُٹھنے کے لیے گر پڑے۔

یہ پارٹی بھی کمانڈو تھی۔ اب وہ چُھپ بھی رہے تھے اور دیکھ بھی رہے تھے کہ دُشمن کدھر سے آتا ہے۔

"دشمن نظر آئے تو حکم کا انتظار مت کرو"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔ "ایمونیشن بچا کر فائر کرنا۔"

"دشمن کے ایک ایک قطرے کا انتقام لینا ہے سَر!"— کیپٹن اصغر نے کہا۔

"جذباتی نہ بنیں!"— نائب صوبیدار نے کہا۔ "اتنا اونچا نہ بولیں۔"

چار بھارتی کمانڈو ایک ٹیکری پر پوزیشن لے رہے تھے۔ ایک پاکستانی کمانڈو نے جس کے پاس لائٹ مشین گن تھی، ایک لمبا برسٹ فائر کیا اور چاروں ہندوؤں کو ختم کر دیا۔ دونوں طرف تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ وہ ایک پوزیشن میں نہیں رہتے تھے۔ بندروں کی طرح کُودتے پھلانگتے پوزیشن بدلتے اور فائر کرتے تھے۔ بھارتی تعداد میں زیادہ تھے۔ وہ کیپٹن اصغر کی پارٹی کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاکستانیوں کی طرف سے فائر کم آتا تھا کیونکہ ایمونیشن تھوڑا تھا۔ نکلنے کی بھی کوشش کرو سَر!"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔

"سب سے کہہ دو۔"

"سب جانتے ہیں"— نائب صوبیدار اسلم نے کہا۔ "میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ ہم جم کر نہیں لڑ سکتے، نہ جم کر لڑنا چاہیئے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

وادی گرنیڈوں کے دھماکوں سے گونجنے لگی۔ کیپٹن اصغر کی پارٹی کے دو اور آدمی شہید ہو گئے۔ یہ دوسرا زخمی جوان تھا جو پوزیشن بدلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو جوان تھا وہ بھی شہید ہو گیا۔ پھر پارٹی بکھر گئی۔ ان کا اکٹھا رہنا فرض ہی نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ کمانڈو اپریشن میں ایسی صورت حال پیدا ہو جایا کرتی ہے، پھر ہر جوان اپنا کمانڈر خود ہوتا ہے۔

یہ صورت حال پیدا ہو چکی تھی اور جوان اپنے کیپٹن اور نائب صوبیدار کی کمان سے آزاد ہو گئے تھے۔ وہ اُس وقت فائر کرتے تھے جب انہیں دشمن کا کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ بھارتیوں کے پاس ایمونیشن کی افراط تھی اس لیے وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے اور گرنیڈ بھی پھینک رہے تھے۔ یہ ایمونیشن کا پینہ تھا جو بڑے وسیع علاقے کو زد میں لیے ہوئے تھے۔ اس پر

iqbalmt@onenet.com.pk scanned by

سے زندہ نکلنا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

"یا علیؓ" کے نعرے سنائی دینے لگے۔ نائک غلام عباس کی سٹین گن کی آخری میگزین بھی خالی ہوگئی۔ اس کے پاس ایک لمبا چاقو رہ گیا تھا جو ہر کمانڈو کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ایک ٹیکری پر تھا۔ ایک گرنیڈ اُس سے کچھ فاصلے پر گرا۔ اُس کے تین چار ٹکڑے اُس کے ایک پہلو میں اُتر گئے اور دو اُس کے منہ پر لگے۔ اُس کے کپڑے خون سے لال ہوگئے اور جسم بڑی تیزی سے خون سے خالی ہونے لگا۔ وہ ایک طرف کو رینگتا گیا۔

وہ ٹیکری کی چوٹی تھی۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ سات آٹھ گز نیچے اُسے ہندو کیپٹن پیٹ کے بل لیٹا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ دو جوان تھے۔ نائک غلام عباس خون کی کمی کی نقاہت اور چہرے پر درد کی شدید ٹیسیں محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے چاقو کھول لیا۔ اُٹھا اور چھلانگ لگا دی۔ وہ ہندو کیپٹن کی پیٹھ پر گرا۔ کیپٹن تو اسی سے ہی اُٹھنے کے قابل نہ رہا۔ اُس کے ساتھ کے دونوں جوان ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے کہ غلام عباس کا چاقو ایک ہندو سپاہی کی پیٹھ میں [illegible] پر اُتر گیا۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔

دوسرے ہندو کمانڈو کے پاس لائٹ مشین گن تھی جسے اُٹھا کر وہ نائک غلام عباس کی طرف گھوما لیکن غلام عباس نے یا علیؓ کا نعرہ لگا کر اُس پر اس طرح حملہ کیا کہ ہاتھ مشین گن پر مار کر اُسے پرے کیا اور دوسرے لمحے اُس کا چاقو اس ہندو جوان کے سینے [illegible] تک چلا گیا۔

اُس نے چاقو ہندو کے سینے سے نکالا۔ ہندو کیپٹن لے کر دوڑ چکا تھا۔ رائفل اُس کے ہاتھ میں تھا۔ فاصلہ ایک گز بھی نہ تھا۔ کیپٹن نے رائفل کی دو گولیاں چلائیں۔ وہ ابھی اُٹھا نہیں تھا۔ نائک غلام عباس اُس کے اُوپر گرا۔ ابھی ہوش میں تھا۔ چاقو پر اُس کی گرفت ابھی مضبوط تھی۔ اُس کی زندگی کے دو چار منٹ ہی باقی تھے۔ اُس نے کیپٹن کے پیٹ میں اِس طرح چاقو مارنا شروع کر دیا جیسے اُس کا قیمہ کر دینا چاہتا ہو۔ آخری بار اُس نے چاقو کیپٹن کے سینے میں مارا اور اُس میں چاقو نکالنے کی طاقت نہ رہی۔ اُس کا سر آگے کو جھکا پھر وہ کیپٹن کے اُوپر گر پڑا — وہ آخری [illegible] لڑا کر اپنے خدا کے حضور جا چکا تھا۔

▼

نائب صوبیدار اسلم کیپٹن اصغر کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بچ نکلنے کے لیے ایک دوسرے سے الگ الگ ہو سکتے تھے لیکن اسلم اصغر کو اکیلا چھوڑنے میں خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اصغر نے اسلم سے کہا کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اپنے جوان کہاں کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔

"آپ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے سر!" — نائب صوبیدار اسلم نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا — "میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہماری آدھی نفری شہید ہو چکی ہوگی، اور مجھے یقین ہے کہ دشمن کی بھی آدھی نفری ختم ہو چکی ہوگی۔ میں اپنے جوانوں کو جانتا ہوں.... میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ جوش میں نہ آئیں۔ ہوش سے کام لیں۔"

"ٹھہرو صاحب!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "وہ دیکھو.... گرنیڈ نکالو.... مجھے دے دو۔"

وہ دونوں بلندی پر بڑی اچھی آڑ میں پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ نیچے تین بھارتی کمانڈو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے جا رہے تھے۔ کیپٹن اصغر نے نائب صوبیدار اسلم سے گرنیڈ لے لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سر! اُٹھو سر!" — اسلم نے چلا کر کہا — "لیٹ کر گرنیڈ پھینک دو۔ وہ دور نہیں پہنچے ہیں۔"

اصغر کھڑا رہا۔ جذبات کے جوش میں اُس نے پن نکالی اور گرنیڈ پیچھے پھینک دیا۔ وہ پھر بھی نہ لیٹا۔ وہ ان تین ہندوؤں کو تڑپتے اور مرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسلم نے اُس کی ٹانگ کھینچی مگر وہ نہ بیٹھا۔

گرنیڈ اُن تینوں کے درمیان پھٹا۔ تینوں اِدھر اُدھر گرے۔ تینوں تڑپنے لگے۔ ایک کو اُس نے دیکھا۔ اُس کی ایک ٹانگ جسم سے الگ ہوگئی تھی۔ اصغر نے یا علیؓ کا نعرہ لگایا اور جوش سے بازو اُوپر اُٹھائے۔ وہ ایک اور نعرہ لگانے لگا تو نعرہ منہ میں ہی رہا۔ وہ دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ خون اُبل کر نکلنے لگا — اُسے کسی بھارتی کمانڈو نے دیکھ لیا اور اُس پر گولی چلا دی تھی۔ اصغر خوش قسمت تھا کہ دشمن کے اس کمانڈو کے پاس سٹین گن یا لائٹ مشین گن نہیں تھی۔

"آپ نے میری بات نہیں سنی" — اسلم نے کہا اور اُسے وہاں سے گھسیٹنے لگا۔

"یہاں گانہیں صاحب!" — اصغر نے کہا — "سلسلی ٹوٹ گئی ہے۔"

وہاں دوسری گولی آنا لازمی تھا لیکن اُن کے پیچھے بڑے سائز کے پتھر اور درخت تھے۔ اسلم اصغر کو گھسیٹ کر پتھروں کے پیچھے لے گیا اور اوٹ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کے پاس رائفل کے علاوہ مشین گن تھی جو ایک شہید کی تھی۔ تین میگزینیں باقی تھیں۔ اصغر کے زخم پر فیلڈ پٹی [illegible] ضروری تھی اور دشمن پر نظر رکھنی اور زیادہ ضروری تھی۔ اصغر حوصلے میں تھا۔ نائب صوبیدار اسلم کو سامنے کی ڈھلان سے ایک بھارتی حوالدار بڑی تیزی سے اترتا نظر آیا۔ اسلم نے دیکھتا رہا۔ ہندو حوالدار اُسے نہ دیکھ سکا۔ وہ نیچے گیا اور اس ٹیکری پر چڑھنے لگا جس پر اصغر اور اسلم تھے۔ اُس نے شاید اسلم کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ اصغر اکیلا ہی تھا جسے اُس نے مار لیا ہے۔ ٹیکری زیادہ بلند نہیں تھی۔ حوالدار چڑھتا آیا۔ آٹھ دس قدم کا فاصلہ رہ گیا ہوگا کہ نائب صوبیدار اسلم اُٹھا اور سٹین گن کا برسٹ فائر کیا۔ ہندو حوالدار گرا اور قلابازیاں کھاتا نیچے چلا گیا۔

اسلم نے اپنی فیلڈ پٹی نکالی اور اصغر کے زخم پر رکھ دی۔ گولی پیچھے سے آئی اور [illegible] (کالر بون) کے ذرا اُوپر سے نکل گئی تھی۔ نائب صوبیدار اسلم نے آگے اور پیچھے کے زخموں میں فیلڈ پٹی بھر دی اور کیپٹن اصغر کی فیلڈ پٹی لے کر اس پر لپیٹ دی۔

"نائب صوبیدار صاحب!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "آپ جا سکتے ہیں۔ کمانڈو آپریشن سے زخمی کو نہیں اُٹھانا چاہئے۔ آپ نکل جائیں" — اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

نائب صوبیدار اسلم پر رقت طاری ہوگئی۔

"آپ اُٹھ سکتے ہیں سر!" — اسلم نے کہا — "آپ چل سکتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

"آپ مجھ سے زیادہ قیمتی ہیں صاحب!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "میں بھی زخمی ہوں۔"

iqbalmt@onelibrary.com scanned by iqbalmt

گولیاں چل رہی تھیں مگر پہلے جتنی نہیں۔ اصغر اور اسلم نے دھماکوں سے اندازہ لگایا کہ فائر کھرا در کتنی دُور ہو رہا ہے۔ اسلم کو تجربہ تھا۔ وہ اُس بھارتی کو مار چکا تھا جس نے اصغر کو زخمی کیا تھا۔ اسلم نے اصغر کو اُٹھایا اور دونوں پیکری سے اُترنے لگے۔

کیپٹن اصغر تیز چلنے کی کوشش کرتا تو زخم درد کرتے اور خون زیادہ بہنے لگتا تھا۔ آہستہ چلنا خطرناک تھا لیکن وہاں چلنا کم اور اترنا اور چڑھنا زیادہ تھا۔ وہ درد کو برداشت کرتا رہا۔ نائب صوبیدار اسلم اُس سے بار بار کہتا تھا کہ وہ چل نہ سکتا ہو تو وہ اُسے اُٹھا لے لیکن کیپٹن اصغر ہر بار مسکرا کر کہتا کہ وہ چل سکتا ہے اور چلتا ہی رہے گا۔

اُس نے اُس وقت بھی یہی کہا کہ وہ چلتا ہی رہے گا جب کوشش کے باوجود وہ مسکرا نہ سکا اور نائب صوبیدار اسلم اُسے اس شکل میں نظر آیا جیسے گہری دُھند میں چیل کے درخت کا صرف تنا دکھائی دے رہا ہو۔ اُس نے آنکھیں ملیں تو چیل اور دیودار کے بے شمار درخت ایک دوسرے کے پیچھے اور ایک دوسرے کے اُوپر کھڑے یوں ہلتے نظر آئے جیسے بڑی زور کا زلزلہ آیا ہو۔ اُس نے اپنی سرگوشی سُنی۔ "نائب صوبیدار صاحب!" پھر وہ اپنی اور پرائی سرگوشیوں اور گولیوں اور گرنیڈوں کی دُنیا سے لاتعلق ہو گیا۔

▼

اُس نے بڑی اونچی آواز میں کہا۔ "نہیں نائب صوبیدار صاحب! میں کسی زخمی کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔"

اُسے آواز سُنائی دی۔ "کیا ہُوا صاحب!..... سر الیٹ جائیں۔"

اُس نے دھکا دے کر کہا۔ "آپ مجھے حکم نہیں دے سکتے نائب صوبیدار صاحب! میں اُس کشمیری لڑکے کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اُسے میں اپنے کندھے پر....."

اُسے کوئی بڑی زور سے جھنجھوڑ رہا تھا پھر کسی نے اُسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ چُپ ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، اُسے حقیقت دکھائی دینے لگی۔ وہ ایک کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ ایک لڑکی اودی خاکی وردی میں ملبوس اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اصغر اپنی گردن کے پچھلے حصے پر کسی کے سانسوں کی تپش محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے پیچھے دیکھا تو دائیں کندھے میں اُسے درد محسوس ہُوا۔ اُسے ایک چہرہ نظر آیا۔ وہ ایک جواں سال عورت کا چہرہ تھا۔

"امّی!" — کیپٹن اصغر کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسل گئی۔ "آپ یہاں؟..... اوہ!" — اُس نے ہنسنے کی بڑی کوشش کی لیکن ہنس نہ سکا۔

اُسے ایسی ہنسی سُنائی دی جس میں موسیقی تھی۔ عورت کا چہرہ اُس کے سامنے آ گیا۔

"پیچھے نہ دیکھیں" — عورت نے کہا۔ "یُوں..... سامنے دیکھیں۔ گردن گھمانے سے ٹانکے کھُل جائیں گے..... مجھے امّی کہہ کر آپ حیران اور شرمسار سے کیوں ہو گئے ہیں؟"

"ہاں سسٹر!" — کیپٹن اصغر نے کہا۔ "میں تمھیں امّی سمجھا تھا۔ شاید تم نے بُرا مانا ہو۔ تم میری عمر کے آدمی کی امّی نہیں ہو سکتیں لیکن..... سسٹر! میں تمھیں اپنی امّی سمجھتا ہوں۔"

"میرا اچھا کپتان!" — جواں سال اور خوبرو نرس نے اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ماں کے سے پیار سے لہجے میں کہا۔ "تم پر مجھ جیسی سینکڑوں مائیں قربان ہو جائیں۔ نائب صوبیدار اسلم تمھاری شجاعت کی کہانی سُنا چکا ہے..... تم تیسرے روز ہوش میں آئے ہو۔ گزشتہ رات تمھیں خون دیا جاتا رہا ہے..... تم واپس اپنے مشن پر چلے گئے تھے؟"

"ہاں سسٹر!" — کیپٹن اصغر نے کہا۔ "یہ کونسی جگہ ہے؟"

"مظفر آباد" — نرس نے جواب دیا۔ "ایک دو دنوں میں آپ کو راولپنڈی سی ایم ایچ میں بھیج دیں گے۔ یہاں افسروں کے کمرے کم ہیں..... آپ کی کالر بون پچ گئی ہے۔ اس پر گولی کی ذرا سی رگڑ لگی ہے۔"

"نائب صوبیدار اسلم کہاں ہے؟"

"انھیں کل صبح ڈسچارج کر دیا گیا تھا" — نرس نے کہا۔ "وہ جس طرح آپ کو آزاد کشمیر میں لائے ہیں وہ کبھی انہی سے سُننا۔ اپنی ایک بارڈر پوسٹ پر آ کر وہ گر پڑے تھے۔ آپ ان کی پیٹھ پر تھے۔ آپ بے ہوش تھے۔ آپ کو اور نائب صوبیدار صاحب کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا۔ آپ کے جسم میں خون ختم ہو چکا تھا۔ آپ کی نبض اتنی آہستہ چل رہی تھی کہ ڈاکٹر مایوس ہو گئے تھے۔ نائب صوبیدار صاحب کی جسمانی حالت تشنگی، بھوک اور پیاس کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی۔ وہ آپ کو بہت جلدی ہسپتال تک پہنچانے کی کوشش میں تھے۔ آپ کا بوجھ اٹھائے ہوئے وہ کہیں رُکے نہیں۔ اُن کے پاؤں ٹخنوں سے اُوپر تک سُوج گئے تھے۔ خدا کا شُکر ہے کہ وہ ایک دن اور رات میں ہی سنبھل گئے۔"

کیپٹن اصغر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

iqbalmt@onenurdu.com scanned by
ون اردو
خوبصورت لوگوں کی خوبصورت اردو

بھارت کے اخباروں اور ریڈیو نے واویلا مچا رکھا تھا۔ اخباروں کے پہلے صفحوں پر پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو اپریشن کی خبریں سنسنی خیز سرخیوں سے شائع ہوتی تھیں لیکن خبروں کے متن بتاتے تھے کہ مقبوضہ کشمیر میں یہ اپریشن بُری طرح ناکام ہو رہا ہے۔ بھارتی فوج نے ہمارے چند ایک کمانڈو جوانوں کو زندہ پکڑ لیا تھا۔ ان کی تصویریں بھارتی اخباروں میں چھپتی ہی رہتی تھیں۔ ان خبروں میں بھارت کے اُن فوجیوں کا ذکر نہیں ہوتا تھا جنہیں کمانڈو پکڑ کے لے آئے تھے۔

یہ خبریں جو بھارت کے اخباروں میں چھپتی تھیں، بھارت سرکار کی اپنی گھڑی ہوئی ہوتی تھیں۔ بھارتی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی تھی۔ اگست ۱۹۶۵ء کے آخر تک مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج عملاً مفلوج ہو چکی تھی۔ لیفٹوں کی نقل و حرکت بند ہو گئی تھی۔ کشمیر بھارت کے ہاتھ سے پھسل رہا تھا۔

بھارت کے سرکاری حلقوں میں خصوصاً دارالدفاع کے ایوان میں، بھونچال کے جھٹکے محسوس کیے جا رہے تھے۔ پاکستان کو اپنی پسند کے میدان میں لڑانے والوں کے حواس کمانڈو جانبازوں کے گرینیڈوں سے مقبوضہ کشمیر کی وادیوں میں تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ دہلی میں بھارت کے ایوانوں میں کوئی خوف اور کوئی مایوسی نہیں تھی۔ فوجی لیڈر اطمینان اور تحمل سے دیکھ اور سوچ رہے تھے اور اپنی فوجوں کو پاکستان کی سرحد پر بہت تھوڑے وقت پر پہنچنے اور حملہ کرنے کے لیے سرحد کے ساتھ ساتھ جمع کر رہے تھے۔

"پاکستان کے حکمران خودکشی کی کوشش کر رہے ہیں" — یہ ایک آواز تھی جو بھارت کی وزارت دفاع اور افواج کے ہیڈکوارٹروں میں سنائی دیتی تھی اور امیدوں اور خوابوں کو سرشار کرتی تھی۔ تینوں افواج کے کمانڈر انچیف بھارتی وزیراعظم کو یقین دلا چکے تھے — "جس دن ہم نے پاکستان پر حملہ کیا اس شام پاکستان آپ کا ہو گا۔"

ان حلقوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کی رائے مختلف تھی۔ اُن کی نظر اُس تباہی کی ایک ایک تفصیل پر تھی جو پاکستان اور آزاد کشمیر کے سٹھی بھر کمانڈو جانبازوں نے بپا کی تھی اور مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی عملداری ختم کر دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جس فوج کے کمانڈو اس حیران کُن حد تک بے خوف، ذہین اور پھرتیلے ہیں وہ فوج قلیل تعداد میں بھی اپنے ملک کو بچا لے گی۔

★

"ہم اپنے ملک کو بچا لیں گے" — کیپٹن اصغر نرس سے کہہ رہا تھا — "تم ٹھیک کہتی ہو سسٹر! مقبوضہ کشمیر کو بچانے کے لیے بھارت یہ چال ضرور چلے گا کہ پاکستان پر حملہ کر دے لیکن ہم تیار ہیں" — وہ جذباتی لہجے میں بولا — "تم نے انہیں نہیں دیکھا سسٹر! وہ جو مقبوضہ کشمیر میں جاتے ہیں انہیں خدا کے سوا کوئی نہیں دیکھتا۔ تم نے میرے زخمیوں کو نہیں دیکھا۔ تم تصور میں نہیں لا سکتیں سسٹر! زخمی دشمن کی زمین پر پڑا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے کہ مجھے یہیں چھوڑو اور تم نکل جاؤ۔"

"میں نے وہاں جا کے نہیں دیکھا؟" — جواں سال نرس نے کہا — "تم جیسے جانبازوں کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔ میرے پاس آنے والے تم پہلے زخمی نہیں ہو۔ وہ ہوش میں ہوتے ہیں تو کوئی بات نہیں سناتے۔ بیہوشی میں وہ اپنے تاریخ میٹ پر ہوتے ہیں۔ گرینیڈ پھینکتے ہیں۔ فائر کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ وہ جس طرح اپنے جسم کو اکڑاتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے تاریخ میٹ پر تھرن کر ٹوٹے ہوں گے" — نرس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے کہا — "میرے ہاتھوں سے اُن کا خون مل گیا ہے لیکن ایسے لگتا ہے جیسے ان کا خون میرے خون میں شامل ہو گیا ہے۔ باہر لان میں دیکھنا کیسے کیسے پھول ہیں۔ میں جس پھول کو سونگھتی ہوں مجھے اس میں اپنے وطن کے سرفروشوں کے خون کی بُو محسوس ہوتی ہے۔"

"کیا ہمارے بعد آنے والے اس بُو کو زندہ رکھیں گے؟" — کیپٹن اصغر نے کہا۔

"تمہارے بعد آنے والے؟"

"ہاں سسٹر!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "تم حیران کیوں ہو گئی ہو؟ ایک روز اس کمرے میں اسی پلنگ پر کوئی اور زخمی لیٹا ہوا ہو گا اور وہ تمہیں بتاتے گا کہ ایک نوجوان کیپٹن کمانڈو جن پر شہید ہو گیا ہے وہ پہلے مشن پر زخمی ہوا تھا..... ہم اپنے وطن کی قربان گاہ پر کھڑے ہیں سسٹر! میں سوچتا ہوں کہ ہمارے بعد یہ قربان گاہ ویران تو نہیں ہو جائے گی؟"

نرس خاموش تھی۔ وہ چپ چاپ اصغر کو دیکھتی رہی پھر اُس کی آہ نکل گئی۔

"ابھی تک کوئی نہیں آیا" — نرس نے پوچھا — "دوسرے زخمیوں کے رشتہ دار اور دوست اطلاع ملتے ہی آ جاتے ہیں۔ راولپنڈی میں تمہارا کوئی عزیز نہیں؟"

"اوہ!" — جیسے کیپٹن اصغر کو کچھ یاد آ گیا ہو کہنے لگا — "سسٹر! ٹیلیفون پر کسی کو میری اطلاع دے سکتی ہو؟"

"کس کو؟" — سسٹر نے پوچھا — "میں فون کر دوں گی؟"

"ٹیلیفون ڈائریکٹری مل جائے گی؟"

"میں لاتی ہوں۔"

★

اسلام آباد میں ملک ناصر کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو شمیم دوڑی گئی اور ریسیور اٹھایا۔

"ہاں ہاں" — اُس نے کہا — "میں ہی شمیم ہوں..... میں جانتی ہوں اُسے" — اُس کی آواز کانپنے لگی — "کیوں..... کہاں ہے وہ..... خدا کے لیے جلدی بتائیں وہ کہاں ہے....." اُس کے ہاتھ سے ریسیور گرنے لگا تھا۔ اُس نے کہا — "اُس کی حالت کیسی ہے؟..... کمرہ نمبر سولہ؟..... وہ ہوش میں ہے نا؟..... میں ابھی آئی۔"

ملک ناصر اور ملک رجب علی کہیں باہر نکل گئے تھے۔ شمیم نے ماں کو بتایا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں جا رہی ہے۔ وہ دوڑتی باہر نکلی۔ اپنی کار میں بیٹھی اور کار کو گھٹی سے نکل گئی۔

سی۔ ایم۔ ایچ کے کمرہ نمبر سولہ کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ کیپٹن اصغر کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اُس نے اپنے ماتھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا اور جاگ اٹھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور

iqbalmt@gmail.com scanned by iqbalmt@gmail.com

شمیم اُس سے لپٹ گئی، پھر اُس کے سر سے پاؤں تک یوں ہاتھ پھیرنے اور ٹٹولنے لگی جیسے کوئی بچہ گر پڑے تو ماں اُسے اٹھا کر دیکھتی ہے کہ بچے کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

"خدا کا شکر ہے شمیم!" — کیپٹن اصغر نے کہا — "صرف ایک زخم ہے۔ موت کے مُنہ سے نکل آیا ہوں۔"

"کشمیر گئے تھے؟"

اصغر نے مُسکرا کر سر ہلایا۔ شمیم اور زیادہ جذباتی ہو گئی — اور پھر وہ جذبات میں ہی ڈوبتے چلے گئے۔ شمیم کی لانبی لانبی انگلیاں اصغر کے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ ان انگلیوں کے لمس نے اصغر کو تھکن کا ایسا احساس دلوایا جیسے اس کی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں اور وہ بڑی ٹھنڈی اور پُرسکون منزل میں آ کر گر پڑا ہو۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ شمیم کی سانسوں کی تپش نے اسے گرما دیا۔

یہ احساس نہیں تھا، یہ حقیقت تھی کہ وہ بہت تھک گیا تھا۔ وہ دو قدم چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

شمیم نے اُس کی پیشانی کو ذرا سا سہلایا اور اُس کی انگلیاں اصغر کے بالوں میں آہستہ آہستہ رینگنے لگیں اور شمیم کا ریشمی دوپٹہ اصغر کے گالوں کو چھونے لگا تو اُسے اونگھ آئی اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔

"امّی جان!" — وہ دھیمے دھیمے بڑبڑانے لگا — "میں کشمیر کے اس حصے سے اپنے گھر لے آؤں گا..... امّی جان! ..... بادل گرجتے ہیں ... وادیاں ہیں امّی جان! وہ ... ہرا نہیں ہوگا ..... میں اُسے یہاں لے آؤں گا..... آپ ..... آپ اُسے کہا کرنا یہ میرا اصغر بیٹا ہے ..... یہاں کسی رنگی کو دیکھے نہیں .....!"

اُس نے سر زور زور سے ہلایا — "نہیں چھوڑ سکتا" — اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اُس نے سب سے پہلے شمیم کی آنکھیں دیکھیں جو آنسوؤں سے لبریز تھیں جھیلیں بن گئی تھیں۔

"میں سو گیا تھا شمیم؟"

"سو جاؤ" — شمیم نے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "تم سو جاؤ۔ میں ساری رات تمہارے پاس بیٹھی رہوں گی۔"

"میں سو گیا تو وہیں چلا جاؤں گا جہاں گھٹا میں گرجتی اور گولیوں کا ہیضہ برستا ہے" — اصغر نے مُسکراتے ہوئے کہا — "تم یہاں بیٹھی کیا کرو گی؟ ..... باتیں کرو۔ کوئی بات سناؤ۔"

"تم نیند میں امّی کو یاد کر رہے تھے" — شمیم نے کہا — "کشمیری لڑکا کون ہے جسے تم اپنے گھر لانا چاہتے ہو؟ ... کیا تم اپنے دادا کو یاد کر رہے تھے؟"

اصغر نے اُسے تفصیل سے سنایا کہ دادا کون اور کشمیر کا لڑکا کون ہے۔

"دادا وہ نسل ہے جو ایک روایت پیچھے چھوڑ کر جا رہی ہے" — اصغر نے کہا — "اور لڑکا وہ نسل ہے جو اس روایت کو زندہ رکھنے کے لیے خون کے نذرانے دے رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکا جو ہندوؤں کی گولیوں سے شہید ہو گیا تھا اسی دادا کا پوتا ہو۔ ان میں خون کا رشتہ نہ ہو لیکن شمیم! دشمن جب وطن کی ناموس پر ہاتھ ڈالتا ہے تو ہم وطن خون کے ایک ہی رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ میں نے اس لڑکے کو دیکھا بھی نہیں لیکن ایک اٹل حقیقت کی طرح محسوس کرتا ہوں کہ اُس نے میری ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔"

"اور خون کے اُن رشتوں کو کیا کہو گے جو وطن کے دشمنوں کے ماں جائے بن جاتے ہیں؟" — شمیم نے کہا — "میں جانتی ہوں تم میری بات نہیں سمجھے۔ حیران نہ ہونا اصغر! میں تمہیں دو خبریں سنانا چاہتی تھی لیکن تمہاری جذباتی حالت دیکھ کر چپ رہی۔"

"میری جذباتی حالت کی پرواہ نہ کرو شمیم!" — اصغر نے کہا — "اس حالت نے مجھے ایک عظیم حقیقت دکھا دی ہے۔ میں بالکل نارمل ہوں۔ کہو، کیا خبر ہے۔ فوراً سناؤ۔"

"تمہارے ابّا جان میرے گھر میں ہیں" — شمیم نے کہا — "اور میرے ابّا جان ہندوستان کے جاسوس ہیں۔"

کیپٹن اصغر یوں پلنگ کے سہارے سے ہٹ کر آگے ہو گیا جیسے کسی نے اُس کی پیٹھ میں خنجر اتار دیا ہو۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"میں جانتی تھی تمہارا ردِعمل یہی ہوگا" — شمیم نے اپنے آنچل سے اصغر کے ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا — "اب پوری بات سنو۔"

"وہ میرا باپ نہیں ہے" — اصغر نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا — "تمہیں شاید معلوم نہیں؟"

"معلوم ہے" — شمیم نے کہا — "وہ مجھے بتا چکے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے میری ماں بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو گئی ہے" — اصغر نے دبے دبے عتاب سے کہا — "اگر ایسی بات ہے تو ملک رجب علی میرے ہاتھوں ختم ہوگا۔"

"اوہ ..... پاگل!" — شمیم نے کہا — "تم کیا سمجھ بیٹھے ہو۔ میری بات تو سن لو۔"

اصغر خلا سے نکل کر شمیم کی طرف متوجہ ہوا۔ شمیم نے اُسے ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے بتایا کہ ملک رجب علی شمیم کے باپ ملک ناصر کا پرانا دوست ہے۔ اتفاق سے ریلوے سٹیشن پر ان کی ملاقات ہو گئی اور ملک ناصر رجب علی کو اپنے گھر لے آیا۔ شمیم نے اصغر کو تفصیل سے سنایا کہ کس طرح ملک رجب علی کو بتایا تھا کہ ملک ناصر ہندوستان کا جاسوس ہے۔

"تمہارے ابّا جان ہمارے گھر میں صرف اس لیے رُکے ہوئے ہیں کہ وہ میرے ابّو کو ان کے گروہ کے ساتھ ملانا چاہتے ہیں" — شمیم نے کہا — "میں تمہارے ابّو کو بتاؤں گی کہ تم کسی ایم۔ ایم۔ اے کی ہو۔ اپنے ابّو کو بتایا تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارا اصغر کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"کیا تم اپنے ابّو کو بتا نہیں سکتیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں؟"

"نہیں" — شمیم نے جواب دیا — "میرے ابّو ہمیں اس سوسائٹی میں لے گئے ہیں، یا یوں کہو کہ ہمیں اس سوشل مقام تک لے گئے ہیں جہاں محبت اور چاہت کے معنی بدل جاتے ہیں۔"

"کیا تم نے اس معنی کو قبول نہیں کیا؟"

"قبول کر لیا تھا" — شمیم نے کہا — "لیکن میں محبت کے معنی نہیں سمجھی تھی..... اب تم اپنے ابّو کی طرح کہو گے کہ میں کس طرح تسلیم کروں کہ ایک بیٹی اپنے باپ کے خلاف ہو سکتی ہے..... میں اس کا یہی جواب دے سکتی ہوں کہ تمہاری محبت نے مجھے اپنے باپ کا دشمن بنا دیا ہے۔ میں اور کچھ نہیں جانتی۔ میری ذات میں ایک انقلاب آیا ہے جسے میں نے قبول کر لیا، یا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔"

by iqbalmt@gmail.com scanned by

میں کھلنڈری لڑکی تھی جسے لوگ مغرب زدہ اور آوارہ کہا کرتے ہیں.... میں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ وصف مسلمان کے خون میں ہے" — اصغر نے کہا — "منزل نہ ہو تو مسافر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ میں نے تمہیں ایک منزل کے نشان دکھا دیے ہیں... لیکن شمیم! میں سپاہی ہوں فلاسفر نہیں۔ اصل بات مجھے میرے ابّو بتائیں گے۔ انہیں بتا دو کہ میں یہاں ہوں۔ اپنے ابّو کو تم نہ بتانا، میرے ابّو بتا دیں گے۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہے کہ ہم دونوں کے ابّو دوست ہیں؟" — شمیم نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

"نہیں" — اصغر نے کہا — "شمیم! اگر تمہارے دل میں واقعی میری محبت ہے تو اپنے ابّو کو دل سے اُتار دو اور میرے ابّو کو بھی۔ میں جس مقام پر آ پہنچا ہوں وہاں محبت کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر میرے فرض نے مطالبہ کیا تو میں محبت کی قربانی دینے سے گریز نہیں کروں گا۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ میں یہ قربانی کس طرح دے سکوں گا لیکن دینی ہو گی" — اُس نے شمیم کا ہاتھ پکڑ لیا اور جذباتی لہجے میں بولا — "ہر حال میں میرا ساتھ دو گی؟"

شمیم نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور یہ ہاتھ پہلے اپنی آنکھوں سے لگایا، پھر اس ہاتھ کو چوما اور پھر اُس کی نشیلی آنکھیں جن میں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نوجوانی کی چمک تھی، اصغر کی آنکھوں کی طرف بڑھنے لگیں۔ اصغر نے ان آنکھوں کو دیکھا۔ آنکھیں جھیل بن رہی تھیں۔ پھیلتی چلی گئیں۔ پھر جیسے وہ جھیل میں جھانک رہا ہو۔ جھیل کی سی چیز بھی آنکھوں کے ساتھ لگ کر ساری اونچائی پر چھا گئی ہے۔ اصغر کو یوں لگا جیسے وہ ڈوب گیا ہو — اُس نے اپنے ماتھے پر گالوں پر اور اپنے ہونٹوں پر تپتی ہوئی سانس کی لپٹیں محسوس کیں۔

"تم ابھی تک شک میں ہو؟" — اصغر کو ساز کے تار کی طرح تھرتھراتی ہوئی سرگوشی سنائی دی — "میری جان کی قربانی لو گے تو بہت معمولی ہو گی۔"

★

شمیم جب کوٹھی میں داخل ہوئی تو ملک رجب علی کے کمرے میں گئی۔ رجب علی کے پاس شمیم کا باپ ملک ناصر بیٹھا ہوا تھا۔

"ہیلو ڈیڈی!" — ملک ناصر نے کہا — "جو کچھ آج تمہارا انکل کہتا خوش ہے۔ اس کا بیٹا کشمیر سے واپس آ گیا ہے۔"

"مبارک ہو انکل!" — شمیم نے انجان بن کر کہا — "کہاں ہے؟ آپ اُسے مل آئے ہیں؟"

"سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے" — رجب علی نے کہا — "کچھ زخمی ہے... تمہارے ابّو نے معلوم کرایا ہے۔ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی۔ صبح جاؤں گا۔"

"اُس کی اطلاع کو آپ نے اطلاع دے دی ہے انکل؟"

"ابھی نہیں" — رجب علی نے کہا — "سوچ رہا ہوں اُسے اطلاع دوں یا نہ دوں۔ اُس نے اپنے بیٹے کو ہسپتال میں دیکھا تو اس پر بہت بُرا اثر ہو گا۔"

"تم یہیں رہو ملک!" — ملک ناصر نے کہا — "اپنی بیوی کو فون کر دو کہ اصغر کی اطلاع مل گئی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ دو چار دنوں میں راولپنڈی آ رہا ہے۔ بیوی سے کہو کہ اصغر کے آنے پر تم اُسے

لاہور سے بلا لو گے۔"

"ابّو!" — شمیم نے ملک ناصر سے پوچھا — "آپ کو کس نے بتایا ہے کہ کیپٹن اصغر سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے؟"

"اُس کی یونٹ کے کسی اور افسر کا نام لو" — ملک ناصر نے کہا — "میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہے۔"

شمیم نے ملک رجب علی کی طرف دیکھا۔ رجب علی کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ ملک ناصر کمرے سے نکل گیا۔ شمیم رجب علی کے پاس بیٹھی رہی۔

"میرا خیال تھا کہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ اصغر سی۔ ایم۔ ایچ میں زخمی پڑا ہے" — شمیم نے رجب علی سے کہا — "لیکن میرے ابّو کو پہلے ہی پتہ چل گیا ہے۔"

"تمہیں کس طرح معلوم ہوا تھا؟"

"اصغر نے نرس سے فون کرایا تھا" — شمیم نے کہا — "آپ اور ابّو گھر نہیں تھے۔ میں وہیں سے آ رہی ہوں۔ میں ابّو کو نہیں بتا سکتی۔"

ملک رجب علی نے بیتاب ہو کر پوچھا کہ اصغر کیسا ہے اور زخموں کی حالت کیا ہے۔ شمیم نے اُسے اصغر کی جسمانی اور ذہنی حالت بتائی اور اُسے تسلی دی کہ اصغر جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ شمیم نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اُس نے اصغر کو بتا دیا ہے کہ رجب علی یہیں ہے اور یہ بھی کہ ملک ناصر پاکستان کا جاسوس ہے۔

"آپ نے دیکھا کہ میرے ابّو کہاں کی خبر لے آتے ہیں؟" — شمیم نے کہا۔

"اگر تمہارا باپ کمانڈو آپریشن کے پردوں کے پیچھے جھانک سکتا ہے تو یہ بہت خطرناک آدمی ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "میں اس کے پورے گروہ کو پکڑوا دوں گا۔"

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں انڈیا کا جاسوس بن گیا ہوں" — رجب علی نے کہا — "مجھ سے اور کچھ نہ پوچھنا۔"

★

جب سورج طلوع ہوا ملک رجب علی کیپٹن اصغر کے پاس بیٹھا تھا۔ ملک ناصر اور شمیم کے متعلق باتیں ہو چکی تھیں۔ اصغر رجب علی کو اپنے مشن کی روئیداد سنا چکا تھا۔

"اصغر!" — رجب علی نے کہا — "کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ شمیم تمہارے راستے کی چٹان بن جائے؟"

"میں شمیم کو بتا چکا ہوں کہ میرے فرض نے مطالبہ کیا تو میں اس کی محبت قربان کر دوں گا" — اصغر نے کہا — "ابّا جان! میں اپنی پارٹی کے ان شہیدوں کو نہیں بھول سکتا جنہیں میں وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ میں ان شہیدوں کا قیدی ہوں۔ میں اُن کے حکم کا پابند ہوں۔ اپنے شہیدوں کو بھول جانے کو میں بہت بڑی غداری سمجھتا ہوں۔"

"شمیم کی باتوں سے مجھے یقین آتا ہے کہ وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے" — ملک رجب علی نے کہا — "لیکن اصغر بیٹا! تم ابھی کمسن اور نادان ہو۔ تم پر جذبات کا غلبہ ہے۔ میں نے پولیس کی سروس کی ہے۔ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ جو میں سوچ سکتا ہوں وہ تم نہیں سوچ سکتے۔ ایک بات کہتا ہوں جو شاید تمہیں اچھی نہ لگے لیکن دل میں پاکستان کی اور اپنی پارٹی کے شہیدوں کی محبت

iqbalmt@yahoo.com Scanned by

کی قندیل جلا کر میری بات پر غور کرنا..... شمیم تمہارے دل میں اُتر گئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بڑی گہری اُتری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ خیر نہ ہو جو تم نے اپنے ہاتھوں اپنے دل میں اتار لیا ہو۔ شمیم ایڈیا کے جاسوس کی بیٹی ہے۔ اس گھرانے میں مجھے کسی بھی چیز میں پاکستانیت نظر نہیں آتی۔ ملک ناصر بڑی خوشی اور فخر سے کہتا ہے کہ اُس کی بیٹی شوخ اور شرارتی ہے۔ تمہارے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات اُس کی شرارت تھی۔ تم نے اُسے بتایا کہ تم پاک فوج کے کیپٹن ہو تو وہ تمہاری ہو کے رہ گئی۔"

"شمیم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی۔" — اصغر نے کہا۔

"وہ قوم سراپا دھوکہ ہے جس کا ملک ناصر جاسوس اور ایجنٹ ہے۔" — رجب علی نے کہا۔ "ملک ناصر نام کا مسلمان ہے۔ اس کی ذہنیت ہندوؤں جیسی ہے۔ ہندو اُوں کی طرح وہ اپنی بیٹی کو استعمال کرنے میں عار محسوس نہیں کرے گا۔"

"آپ یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے ابا جان!" — کیپٹن اصغر نے کہا۔

"مجھے شک ہے۔" — رجب علی نے کہا۔ "یقین صرف ملک ناصر کے متعلق ہے کہ وہ ہمارے دشمن کا بڑا خطرناک ایجنٹ ہے۔ معلوم نہیں کس ذریعے سے اُسے پتہ چلا تھا کہ تم فوج سے واپس آ گئے ہو اور سی۔ ایم۔ ایچ میں ہو..... بہرحال میں اُس کے گروہ میں شامل ہو گیا ہوں اور ایک بڑی خوبصورت لڑکی کے ساتھ میرا دوستانہ ہو گیا ہے۔ اُسے یقین آ گیا ہے کہ میں اُس کے گروہ کا آدمی ہوں..... تم یہ خیال رکھنا کہ ملک ناصر سے ملاقات ہو تو جذباتی نہ ہو جانا۔ اپنا شاطرانہ تک نہ بدلے جس سے ظاہر ہو کہ تمہیں کچھ شک ہے۔"

"میں ہسپتال سے فارغ ہو لوں تو اتنی سے میں خود فون پر بات کروں گا۔" — اصغر نے کہا۔ "انہیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں زخمی ہو گیا تھا۔"

☆

ملک رجب علی کو اپنے رنگ میں شامل کرنے کے لیے ملک ناصر نے ایک بڑی خوبصورت لڑکی شازی کو استعمال کیا تھا مگر شازی رجب علی کو اپنے طلسم میں گرفتار کرنے کی بجائے خود اس کے طلسم میں گرفتار ہو گئی۔ رجب علی نے اُسے کہا تھا کہ وہ بھارت کا جاسوس ہے اور اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ رجب علی گھاگ آدمی تھا۔ اُس نے شازی سے اگلوا لیا تھا کہ وہ ملک ناصر کے رنگ کی رکن ہے۔ شازی کچھ کم چالاک نہیں تھی لیکن رجب علی نے اُس پر ایسا تاثر طاری کر دیا تھا کہ شازی بے ساختہ کہہ اٹھی تھی۔ "آپ پہلے آدمی ہیں جو میرے دل کو اچھے لگے ہیں۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کوئی ہو جس کے ساتھ دل کی باتیں کیا کروں۔"

جس روز رجب علی اصغر سے مل کر آیا اُسی روز اُسے شازی کا پیغام ملا کہ وہ اُسے ملنے کو بیتاب ہے اور وہ تنہائی میں ملنا چاہتی ہے۔ اُس نے ملاقات کی جگہ بھی بتائی۔ شام گہری ہوئی تو رجب علی شمیم کی کار لے کر وہاں چلا گیا۔ شازی اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُسے کار میں بٹھایا اور شکر پڑیاں جانے کے بعد شازی کے کہنے پر وہ اُوپر چلے گئے۔ بلندی پر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ساون کی بھیگی بھیگی جاذبی روما ں جگا رہی تھی۔

"تنہائی کی ملاقات کا کوئی خاص مقصد ہے؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"اپنے اس کام سے ہٹ کر باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔" — شازی نے کہا۔ "آپ کو بُرا تو نہیں لگا؟"

"نہیں شازی!" — رجب علی نے اپنائیت سے کہا۔ "میں ایک بات کہہ دوں۔ تم کچھ جذباتی معلوم ہوتی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ جذباتیت تمہیں پکڑوا دے گی۔"

"میں جذباتی نہیں تھی۔" — شازی نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"میں اُس عمر سے بہت دُور نکل آیا ہوں جہاں مجھے بھی کسی کو دیکھ کر کچھ ہو جایا کرتا تھا۔" — رجب علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تو بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔"

"عمر کے اتنے زیادہ فرق کے باوجود میرا دل آپ سے ملنے کو بیتاب رہتا ہے۔" — شازی نے کہا۔ "ایسے لگتا ہے جیسے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے..... آپ مجھے کیوں اچھے لگتے ہیں؟ اس لیے کہ میں بہت بڑا ذمہ دار ہوں۔" — رجب علی نے کہا۔ "پہلی ملاقات میں تم نے مجھ سے تین مرتبہ پوچھا تھا کہ میں واقعی بڑا ذمہ دار ہوں؟"

"نہیں۔" — شازی نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے بڑے بڑے دولتمندوں کے پیغام مل چکے ہیں۔ میں نے آپ میں معلوم نہیں کیا دیکھا ہے۔"

"تم نے مجھ میں انڈیا کا جاسوس دیکھا ہے۔" — رجب علی نے ہنسی مذاق کے انداز سے کہا۔

اس کے بعد وہ ہنسی مذاق کے موڈ میں ہی رہا اور شازی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ جسم فروش عورتوں کو اور اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کرنے والی شازی جیسی لڑکیوں کو صرف پیسے اور عیش و عشرت کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے۔ شازی کو پتہ چل گیا تھا کہ رجب علی سونے کے انڈے دینے والی مُرغی ہے۔ وہ جوانی ڈھل جانے کے بعد بھی خوبرو اور پُرکشش تھا اور وہ شگفتہ مزاج تھا۔

"شازی!" — رجب علی نے اُس کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے اپنی جذباتیت پر قابو حاصل نہ کیا تو پکڑی جاؤ گی۔ تم جوان ہو اور بہت خوبصورت ہو شازی! اگر تم پکڑی گئیں تو بہت بُرا ہو گا۔"

"میرے ساتھ اور بُرا کیا ہو گا؟" — شازی نے کہا۔ "میں اچھی تو نہیں۔ آپ مجھے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہے ہیں۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"بٹالہ۔" — شازی نے کہا۔ "میں بٹالہ میں پیدا ہوئی تھی۔"

"ماں باپ ہیں؟"

"امی ہیں۔" — شازی نے جواب دیا۔ "ابو مر گئے تھے میرے بچپن میں ہی مر گئے تھے۔"

"کیا نام تھا؟"

"چوہدری شاکر علی۔"

ملک رجب علی کو دھچکا سا لگا اور شازی سے اُس کی ماں کا نام پوچھا۔

www.iqbalmt@yahoo.com scanned by iqbalmt@yahoo.com

"یہاں وہ بیگم اور یس کہلاتی ہے"۔ شازی نے کہا۔ "اُس کا نام آسیہ ہے"۔

ملک رجب علی چونک پڑا۔ اُس نے شازی سے اُس کی عمر پُوچھی۔

"میری عمر....."۔ شازی نے سوچ کر کہا۔ "تیئس سال ہو چکی ہے"۔

اُس وقت رجب علی کا ایک بازو شازی کی کمر کے گرد لپٹا ہُوا تھا اور شازی کا سر رجب علی کے کندھے پر تھا۔ اُس کے نرم دلائم بالوں کو ہوا کے تیز جھونکے رجب علی کے گالوں پر بکھیر رہے تھے اور رجب علی عمر رفتہ میں چلا گیا تھا۔ یاسمین نام۔ بٹالہ، چوہدری شاکر علی اور آسیہ، دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اُس کے جسم کے ساتھ لگے اور وہ تڑپ کر شازی سے الگ ہو گیا۔

"کیوں؟"۔ شازی نے گھبرا کر پُوچھا۔ "کچھ نہیں شازی! کچھ نہیں..... تم باتیں کرو۔ دل کی ساری باتیں کرو۔ میں نہیں سُنوں گا تو اور کون سُنے گا!"

☆

شازی بولتی رہی اور رجب علی ہُوں، ہاں کرتا رہا۔ وہ اب شکر پڑیاں پر نہیں، سرحد پار بٹالہ کے ایک بڑے گاؤں میں پہنچ گیا جب وہ جوان تھا اور اس گاؤں کے تھانے کا سب انسپکٹر انچارج تھا۔ اپنے باپ کے اثر و رسوخ سے وہ اسے ایس۔ آئی بھرتی ہُوا اور تھوڑے ہی عرصے میں سب انسپکٹر بنا دیا گیا تھا۔ آگے اُس کی قابلیت تھی اور زبان کا جادو جس نے اُسے شہر اور گاؤں میں محبوبیت دی تھی۔ اُس زمانے میں دیہاتی علاقے کے تھانیدار کو علاقے کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار تھانیدار کو خوش رکھنے کا ہر طریقہ اختیار کرتے تھے۔

ملک رجب علی کے علاقے میں چوہدری شاکر علی بہت بڑا زمیندار تھا۔ اُس نے رجب علی کو دوست بنا لیا تھا۔ اُسے علاقے کے تھانیدار کی دوستی کی کچھ زیادہ ہی ضرورت تھی کیونکہ وہ نوجوانی کی شرابی کبابی ہی نہیں تھا بلکہ اُس کے گھر سے تعلقات ناجائز گرانی، چوری اور بردہ فروشوں کے ساتھ تھے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکی اغوا ہو کر اُس کے ہاں کچھ دنوں کے لیے چھپائی جاتی تھی۔ چوہدری شاکر علی بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اپنے آپ کو جوان سمجھتا تھا۔

اُن دنوں ملک رجب علی بھی عیش و عشرت کو ہی جینے کا مقصد سمجھ کر تا تھا۔ چوہدری شاکر علی اُسے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرتا رہتا تھا۔ چوہدری شاکر کی ایک ہی بیوی تھی جس کی جوانی ڈھل گئی تھی۔ اُس نے دو بچوں کو جنم دیا اور دونوں ایک ایک سال زندہ رہ کر مر گئے تھے۔ پھر اُس کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

بٹالہ میں انگریزوں کا پروردہ اور انگریزوں کے گُن گانے والا ایک اور خاندان تھا۔ انگریزوں کی خوشامد اور خوشنودی کو یہ خاندان مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس خاندان کی ایک لڑکی جس کا نام آسیہ تھا اتنی خوبصورت نکلی کہ رشتے کے امیدواروں کی قطار لگ گئی لیکن بولی جو چوہدری شاکر علی نے دی وہ کوئی اور امیدوار نہ دے سکا۔

آسیہ صرف خوبصورت نہیں تھی، وہ شوخ اور شرارتی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں اُس نے شغل کے طور پر تین چار چاہنے والوں سے اظہارِ محبت کیا اور اُن سب کے لیے سراب بن کر انہیں خوب چکر دیئے۔ دو کو آپس میں ٹکرا دیا اور یہ تماشہ اُس نے خود بھی دیکھا اور اپنی سہیلیوں

کو بھی دکھایا۔ وہ ملتی ملاتی کسی ایک سے بھی نہیں تھی۔ ایسا تو اُس نے کئی بار کیا کہ اپنے دو چاہنے والوں کو کوئی جگہ اور وقت بتا کر کہا کہ وہ آ جائے گی۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ پہنچ گئے۔ دوسرے دن آسیہ نے دونوں کو الگ الگ کہا کہ وہ وہاں گئی تھی لیکن اُس نے دُور سے دیکھا کہ وہاں فلاں بھی کھڑا تھا۔

قدرت اُسے تماشہ بنانے پر آئی تو چوہدری شاکر علی کو سامنے لے آئی جس کی عمر پچاس کے قریب پہنچ رہی تھی اور اُس کی پہلی بیوی زندہ تھی۔ ماں باپ نے آسیہ سے کہا کہ وہ اُسے چوہدری شاکر علی سے بیاہ رہے ہیں۔ آسیہ سُن ہو کے رہ گئی پھر وہم کی طرح پھٹی اور ماں باپ کو وہ سنائیں کہ وہ دہک گئے۔ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو ماں اُسے الگ لے گئی۔

"بیٹی! چند برسوں کی بات ہے"۔ ماں نے اُسے کہا۔ "اُس کی جائیداد دیکھو، پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔ ساری جائیداد تمہاری ہے..... چوہدری شاکر بوڑھا نہیں ہو گیا۔ مرد اور گھوڑا مرتے دم تک جوان رہتے ہیں۔ تم خود ہوشیار ہو، عقل والی ہو۔ جائیداد پر قبضہ کر کے پھر اپنی پسند کی شادی کر لینا۔ چند برسوں میں تم بُوڑھی تو نہیں ہو جاؤ گی۔ اٹھارہ انیس سال تو تمہاری عمر ہے"۔

آسیہ پھر بھی نہ مانی۔ وہ جذبات کو جائیداد پر قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو سکی۔ اُس کا باپ جابر قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے آسیہ کو قتل کی دھمکی دی اور ماں اُسے سبز باغ دکھاتی رہی۔ آسیہ کو پتہ چل گیا تھا کہ اُس کے باپ نے چوہدری شاکر سے نقد رقم طے کر لی ہے۔

آسیہ نے اپنے آپ کو ایسے جال میں اُلجھا ہُوا پایا جس سے نکلنا ممکن نہ تھا۔ اُس نے رضامندی کا اظہار بھی کیا اور انکار بھی کر دیا۔ اور اُسے ڈولی میں بٹھا کر چوہدری شاکر علی کے حوالے کر دیا گیا۔

☆

ملک رجب علی کو یہ شادی اچھی طرح یاد تھی۔ وہ بھی بارات کے ساتھ گیا تھا۔ شب عروسی سے اگلی رات چوہدری شاکر نے اپنے خاص دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ اس ضیافت میں کھانا کم اور شراب زیادہ پی چلی تھی۔ انبالہ سے دو گانے والیاں بلائی گئی تھیں۔ ملک رجب علی بھی مدعو تھا۔

رجب علی نے آسیہ کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ اب اُس نے چوہدری شاکر کے ہاں زیادہ ہی جانا شروع کر دیا تھا۔ آسیہ اُس کے سامنے آ جاتی اور ہنستے مسکراتے ایک دو باتیں کر جاتی تھی۔ رجب علی نے معلوم کرایا تھا کہ بوڑھے چوہدری اور نوجوان آسیہ کی کیسے گزر رہی ہے۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ چوہدری شاکر تو دیوانہ ہو ہی گیا ہے، آسیہ چوہدری کے اُن خاص اور خفیہ آدمیوں پر بھی چھا گئی ہے جن کی بدولت چوہدری کا رعب داب قائم ہے۔

پھر آسیہ اس علاقے کی خبر لوی بھلانے لگی۔ اس دوران اُس کی ملاقات رجب علی سے ہوئی۔ اُس نے بے تکلفی اور بے باکی سے رجب علی کے ساتھ باتیں کیں۔ رجب علی بھانپ گیا کہ یہ عام قسم کے ذہن کی لڑکی نہیں۔

ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ ایک روز اطلاع ملی کہ چوہدری شاکر علی کی پہلی بیوی مر گئی ہے۔ وہ صرف تین دن بیمار رہی تھی۔ معدے اور سینے میں جلن بتاتی تھی۔ تین دنوں میں تین ڈاکٹروں نے باری باری دیکھا اور دوائیاں دیں مگر وہ جانبر نہ ہو سکی۔

by iqbalmehmood@gmail.com Scanned

ملک رجب علی جنازے پر گیا تو وہاں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ مرنے والے کے بھائی اور بھتیجے تائے کو لاٹھیاں اور گھاٹیاں اُٹھائے کھڑے تھے۔ کہتے تھے کہ اسے زہر دے کر مارا گیا ہے اور زہر آسیہ نے دیا ہے۔ رجب علی نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے کہا کہ وہ تھانے رپورٹ درج کرانے آ رہے ہیں۔ چوہدری شاکر سے کہیں کہ میت جنڈ سے کے بیلے نہ اٹھائے ورنہ ہم اُوپر جا کر درخواست دیں گے اور قبر سے لاش نکلوا کر پوسٹمارٹم کرائیں گے۔

ان لوگوں نے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائی۔ وہ تک میں آسیہ، چوہدری شاکر اور ان کے دو خاص آدمیوں کے نام لکھوا دیئے۔ ملک رجب علی مجبور ہو گیا۔ وہ ان لوگوں کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ چوہدری شاکر بہت پریشان تھا۔ اُس نے رجب علی کو پیغام بھیجا کہ وہ ان لوگوں کی نہ سُنے، یہ لوگ شرارت کر رہے ہیں۔ اُس کی بیوی بیماری سے مری ہے۔ چوہدری شاکر نے پیغام کے ساتھ منہ مانگا نذرانہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ رجب علی کو شک تھا کہ اگر اس عورت کو زہر ہی دیا گیا ہے تو یہ چوہدری نے دیا ہو گا۔ آسیہ کے حسن و جوانی کا جادو ہی ایسا تھا۔

رجب علی نے لاش قبضے میں لے کر پوسٹمارٹم کے لیے بٹالہ بھیج دی لیکن رپورٹ میں تین مہینے لگ جانے کی توقع تھی کیونکہ معدہ سے، جگر وغیرہ کے اجزا کا معائنہ لاہور ہونا تھا۔ اس دوران رجب علی نے چوہدری شاکر، آسیہ اور دو ملازموں کو شاملِ تفتیش کر لیا لیکن ایف۔ آئی۔ آر نہ بنائی۔ اس دوران آسیہ کو تھانے بلایا۔ ابھی ایسی کوئی ضرورت تو نہیں تھی لیکن اُس دور میں رجب علی شریف نہیں بدمعاش تھا۔ وہ آسیہ کو اپنے قریب لانا چاہتا تھا۔ آسیہ بگڑ ہو کر آئی جیسے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں نہیں رجب علی سے دوستانہ ملاقات کے لیے آئی ہو۔ اُس وقت رجب علی کی عمر تیئس چوبیس سال تھی۔

★

"دیکھو آسیہ!" — رجب علی نے اُسے کہا — "کوئی گڑبڑ ہے تو مجھے بتا دو۔ چوہدری شاکر کے مجھ پر کچھ احسان ہیں۔ مجھے اندر اندر بتا دو۔"

"دیکھو ملک جی!" — آسیہ نے ایسے بات کی جیسے رجب علی اُس کا ملازم ہو — "اس نے کہا تھا کہ میں غلط پڑ رہی ہے۔ چوہدری بے قصور ہے۔ اُسے کچھ پتہ نہیں۔ چوہدرائی زہر سے مری ہے..... اور ملک جی! مجھے اُس نے زہر دیا تھا، زہر دینے والے نے کہا تھا کہ پوتھی، پانچویں، ساتویں روز مر جائے گی۔ کوئی ڈاکٹر اس کی بیماری کو نہیں سمجھ سکے گا۔ اگر مرنے کے بعد اس کے پیٹ کی چیر پھاڑ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو پتہ نہیں چلے گا کہ اسے زہر دے کر مارا گیا ہے۔"

آسیہ نے ملک رجب علی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور انگلیاں اُس کی انگلیوں میں اُلجھا لیں۔ آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر شیطانی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ہونٹ نیم وا ہو گئے۔

رجب علی کی زندگی میں نہ جانے کتنی آئیں اور گزر گئی تھیں مگر ایک بھی ایسی نہ تھی جس نے اُسے یوں سُن کر لیا ہو جس طرح آسیہ نے کر لیا تھا۔

"تقدیر بھی دوں گی" — آسیہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو — "میں جانتی ہوں میں تمہارے دل کو بہت اچھی لگتی ہوں۔ میں اُن نظروں کو پہچانتی ہوں جن سے تم دیکھا کرتے تھے...

جس آدمی پر تم میں شک ہو کہ میرے، اُس کے ساتھ تعلقات ہیں اُسے میرے سامنے لے آؤ۔ میں بدنام ہوں۔ میرے جسم کو صرف میرا خاوند جانتا ہے۔ کوئی اور مائی کا لال یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ خلوت بڑھاپے تک کیا ہوا، غیر مردوں کو میں بندروں کی طرح اپنے شانوں پر بٹھایا کرتی ہوں۔ تمہارے پاس خود آ گئی ہوں۔"

آسیہ رجب علی پر ایک نشے کی طرح طاری ہو گئی۔ آسیہ ایک نایاب ہیرا تھی جو صرف رجب علی کو ملا۔

پھر ایسے ہی ہوا جیسے آسیہ کہتی تھی کہ زہر دینے والے نے کہا تھا کہ کسی ڈاکٹر کو پتہ نہیں چلے گا کہ یہ عورت زہر سے مری ہے۔ لاہور سے ماہرین کی رپورٹ آئی جس میں انہوں نے کسی بیماری کا نام لکھ دیا۔ انہوں نے لکھا کہ کوئی ناموافق چیز کھانے سے معدے سے زہر اُٹھتا ہے۔ اگر اس کا فوری طور پر صحیح علاج کیا جائے تو تین چار دنوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔

رجب علی نے چوہدری شاکر اور آسیہ کو بتایا کہ پوسٹ مارٹم میں زہر ثابت ہو گیا ہے۔ چوہدرائی کے لواحقین کو اُس نے بتا دیا کہ رپورٹ کیا آئی ہے اور یہ قتل کا کیس نہیں۔ اُدھر آسیہ کو وہ اشاروں پر سمجھا رہا اور بتا رہا تھا کہ اُس نے اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال کر پوسٹمارٹم رپورٹ دبا کر رکھی ہوئی ہے۔ آسیہ بہت ہوشیار تھی لیکن پولیس کی بھول بھلیاں اور تاریک غاروں سے واقف نہیں تھی۔

"میں تو ملک رجب علی کے مجبور ہو کر تمہاری داشتہ بن گئی ہوں" — ایک روز آسیہ نے اُسے کہا — "تم میرے دل کو اچھے لگتے ہو..... میرا خیال تھا کہ میرے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہو گا لیکن میں اب تمہارے بچے کو جنم دوں گی۔"

اس کے چار پانچ ماہ بعد رجب علی کو اس تھانے سے ہٹا کر دوآبے کے کسی تھانے میں بھیج دیا گیا۔

★

رجب علی شازی کے پاس بیٹھ آسیہ کے تصور میں گم ہو گیا تھا۔ شازی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی اور رجب علی کا ایک ہاتھ کبھی اُس کے بالوں پر دیا جاتا کبھی اُس کی پیٹھ پر پھرنے لگتا۔ ساون کی نمی لیے چاندنی کو پوری طرح شفاف کر رکھا تھا۔ رجب علی نے شازی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ آسیہ کا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں آسیہ کی جوانی والا طلسماتی تاثر تھا۔

بدوزئی تھانے میں جا کر وہ آسیہ کے تصوروں میں کھویا رہتا۔ اُس نے آسیہ کے گاؤں جانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ آسیہ کا یہ علاقہ ڈکیتی، رہزنی اور قتل کے لیے مشہور تھا۔ اتنے کیس آتے تھے کہ رجب علی کو سونے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

دو اڑھائی سال بعد رجب علی کا تبادلہ مزید دُور ہو گیا، پھر وہ سب انسپکٹر سے انسپکٹر ہو گیا اور اسے اور دُور بھیج دیا گیا۔ پانچ چھ سال بعد اُسے بٹالہ کے علاقے کا ایک سب انسپکٹر ملا۔ اُس نے بتایا کہ چوہدری شاکر کو مرے دو سال ہو گئے ہیں۔ آسیہ نے اُس کی تمام جائیداد اُس کے مرنے سے پہلے اپنے نام لکھوا لی تھی اور اب آسیہ اُس علاقے پر حکمرانی کرتی ہے۔

iqbalmt@onenurdigital.com scanned by iqbalmt

دو اور سال گزر گئے۔ رجب علی کو کسی سرکاری کام سے دو چار دنوں کے لیے امرتسر جانا پڑا اور اُسے اتفاق سے آسیہ تانگے میں جاتی نظر آگئی۔ وہ رنگ گنی اور تانگے سے اُتر آئی۔ اُس کے ساتھ سات سال کے لگ بھگ عمر کی ایک بچی تھی جس کے زرد رو کے دانت گرے ہوئے تھے۔ بڑی پیاری بچی تھی۔

"اپنی بیٹی کو نہیں پہچانا؟" — آسیہ نے کہا۔ "یہ تمہاری نشانی ہے۔ بڑے پیار سے پال رہی ہوں۔"

"کیسے گزر رہی ہے؟"

"اکیلے!" — آسیہ نے کہا۔ "کبھی آ کے دیکھو۔ نوکر چاکر غلاموں کی طرح سجدے کرتے ہیں۔" — اُس نے تین ایسے آدمیوں کے نام لیے جو اُس علاقے کے بدمعاش اور جرائم پیشہ تھے۔ "اُس نے کہا۔" وہ میرے باڈی گارڈ ہیں۔ ۔۔۔ علاقہ سمجھتا ملک اُن کا وظیفہ لگا رکھا ہے۔ وہ بھی میرے غلام ہیں۔ تم انہیں جانتے ہو۔ سارا علاقہ اُن سے ڈرتا ہے۔"

رجب علی جلدی میں تھا۔ زیادہ باتیں نہ ہو سکیں پھر ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔

"آپ کھوئے کھوئے کیوں ہیں؟" — شازی نے اُس سے پوچھا اور جیسے اُسے اچانک یاد آگیا۔ اُس نے کہا۔ "آپ ہمارے آدمی ہیں۔ میری امی کو آپ جانتے ہوں گے۔"

"جانتا ہوں۔" — رجب علی نے کہا۔ "لیکن میری فیلڈ تم لوگوں سے مختلف ہے اس لیے عرصے سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں اُسے ملنا چاہوں گا۔"

"ابھی چلے چلیں۔"

اور رجب علی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شکر پڑیاں سے اُترے اور کار میں بیٹھ کر ایک نئی کوٹھی کے پورچ میں جا رکے۔ شازی رجب علی کو ایک کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک عورت بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔

"امی!" — شازی نے کہا۔ "یہ ہیں ملک رجب علی۔"

عورت نے سر اٹھایا اور اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھی۔ رجب علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"اس عمر میں بھی تم اُسی طرح حسین ہو۔" — رجب علی نے کہا۔ "یہاں میں تمہیں بیگم اور یہ نہیں کہوں گا آسیہ! ۔۔۔ مجھے آسیہ ہی کہنے دو۔"

آسیہ نے شازی کی طرف دیکھا اور بولی — "تم جاؤ شازی! میں تمہیں بُلا لوں گی۔" — شازی چلی گئی تو آسیہ نے رجب علی سے کہا۔ "بیٹھو ملک!" اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ بولی — "اپنی بیٹی کو پہچانا ہے یا نہیں؟"

"اب پہچان لیا ہے۔" — رجب علی نے کہا۔

"کیا ہوا ہے؟" — آسیہ نے پوچھا۔ "ڈی۔ ایس۔ پی یا ایس۔ پی؟"

"کچھ بھی نہیں۔" — رجب علی نے کہا۔ "تمہارا ساتھی ہوں لیکن تمہیں معلوم نہیں۔ میری فیلڈ دوسری اور رنگ دوسرا ہے۔"

"ملک!" — آسیہ نے سنجیدگی اور تمدد سے رجب سے کہا۔ "اگر دھوکہ کرنے آئے ہو تو بہت بڑا دھوکہ کھاؤ گے۔ ۔۔۔ اور یاد رکھنا کہ شازی تمہاری اپنی بیٹی ہے۔"

"اوہ آسیہ!" — ملک رجب علی نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "آئی سمجھ گی؟ (اتنا شک؟) ۔۔۔ میں پولیس کا نہیں تمہارا آدمی ہوں۔ تمہارا ساتھی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔"

"ملک اللہ یار خان کے بیٹے کو میں اپنا وفادار ساتھی سمجھ ہی نہیں سکتی۔" — آسیہ نے کہا۔

"تم میرے والد صاحب کو جانتی ہو؟" — ملک رجب علی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں کسے نہیں جانتی!" — آسیہ نے کہا۔

"تم مجھے جانتے ہوئے بھی نہیں جانتیں۔" — ملک رجب علی نے کہا۔ "تم بھول گئی ہو کہ میں اپنے باپ سے کس قدر مختلف ہوا کرتا تھا۔ ۔۔۔ لیکن آسیہ! آؤ پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ یہ دیکھو کہ میں آج کیا ہوں۔ ہم دونوں تم اور میں دریا کے ایک ہی پن پر کھڑے ہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ اکٹھے تیریں گے۔ اکٹھے ڈوبیں گے۔"

آسیہ کو دیکھ کر رجب علی کو وہ آسیہ یاد آگئی جس نے اپنے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کیا تھا۔ رجب علی کو وہ وقت یاد آگیا تھا جب آسیہ نے اپنے آپ کو اُس کی ملکیت میں دے دیا تھا۔ ۔۔۔ لڑھے خاوند کی نوجوان بیوی تھی۔ وہ اپنی سوکن کی قاتل تھی۔ اُس کے سامنے عرقیہ تھی — اور وہ رجب علی کے رحم و کرم پر تھی مگر اب وہ آسیہ یوں بات کر رہی تھی جیسے رجب علی اُس کے رحم و کرم پر ہو۔

"میری ایک بات غور سے سن لو ملک!" — آسیہ نے کہا۔ "مجھے تم سے کوئی ڈر نہیں ہے میں اپنے آپ کو اور اپنی بیٹی کو گرفتاری سے بچانے کی کوشش نہیں کروں گی۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گی ہوں۔ جس راستے سے یہاں تک پہنچے ہو اُسی راستے سے واپس چلے جاؤ۔"

"تمہیں یہ ملک کیوں ہو رہا ہے کہ میں تمہیں گرفتار کرنے ۔۔۔"

"ملک رجب علی خان!" — آسیہ نے اُسے یوں ٹوک دیا جیسے رجب علی ملزم یا مشتبہ ہو — "تمہاری بات بعد میں سنوں گی۔ پہلے میری سن لو۔ میں تمہارے دل سے وہ ساری خوش فہمیاں اور وہ سارے شکوک نکال دینا ضروری سمجھتی ہوں جو تمہیں یہاں لے آئے ہیں۔"

"آئی خود اعتمادی؟ آئی جرأت ہے۔" — رجب علی کو یوں لگا جیسے آسیہ کے نقش و نگار بدل گئے ہوں۔ اس عمر میں بھی اُس کے چہرے پر جوانی کے آثار، اس حد تک موجود تھے کہ اُس کی عمر دھوکہ دیتی تھی لیکن اب اُس کا یہ انداز دیکھ کر رجب علی کو وہ نوجوانی سے بھی زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ وہ دبک سا گیا۔ وہ اس گروہ کو جسے رنگ کہا جاتا ہے بگڑنے کے لیے ہی ملک ناصر کے ذریعے اس گروہ میں شامل ہو گیا تھا مگر آسیہ کی باتیں اور اُس کا یہ بے خوف اور نڈر انداز دیکھ کر اُس نے محسوس کیا کہ وہ آسیہ کو نہیں بگڑ سکے گا اور اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ جاسوس اُن مجرموں جیسے نہیں ہوتے جن کے ساتھ رجب علی کا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ آسیہ کی خود اعتمادی اور جرأت نے اُسے ہلا کے رکھ دیا۔

"میں تمہاری جرأت کی تعریف کروں گا آسیہ!" — رجب علی نے اُسے کہا۔ "لیکن مجھ پر اعتبار کرو۔ میں نے پولیس سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اب ۔۔۔"

آسیہ نے عجیب سی ہنسی سے کہا۔ "جرأت ۔۔۔ کوئی بزدل ایسے لوگوں میں جا بیٹھے جو اپنی

iqbalmt@onedrive.com scanned by iqbalmt@onedrive.com

کمزوریوں پر ناز اور فخر کرتے ہوں تو وہ بزدل بہادر ہو جاتے گا۔ اُس میں جرأت آجائے گی..... تم بزدل اُسے کہتے ہو جس میں دلیری نہ ہو۔ میں بزدل اُسے کہتی ہوں جسے اپنی کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے۔ میں اتنی دلیر نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ایک عورت میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی جتنی تم مجھ میں دیکھ رہے ہو۔ عورت اپنا گھر برباد کر سکتی ہے۔ میری طرح چوری چھپے اپنے خاوند اور اپنی سوکن کو زہر دے سکتی ہے لیکن وہ ایک ملک کی جڑیں نہیں کاٹ سکتی جس طرح میں تمہارے ملک کی کاٹ رہی ہوں۔"

"خاوند کو بھی زہر دے سکتی ہے؟" — رجب علی نے کہا۔ "تم نے تو اپنی سوکن کو زہر دیا تھا؟"

"اپنے خاوند کو بھی میں نے زہر دے کر مارا تھا۔" — آسیہ نے یوں کہا جیسے اُس نے انسان کی بجائے دو مکھیاں ماری ہوں۔ "تم اُس وقت کبھی اور تھانے میں چلے گئے تھے۔ خاوند کو میں نے کبھی احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اُسے بوڑھا سمجھتی ہوں۔ میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر اُسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ جوان ہے اور میں اُس پر دل و جان سے فدا ہوں..... ملک رجب علی! اس حقیقت سے تم انکار نہیں کرو گے کہ عورت اور شراب جب اکٹھے ہو جاتے ہیں تو تریاق جیسے زہر ناگوں کا بھی زہر بے اثر ہو جاتا ہے اور ناگ پھن پھیلا کر جھومنے لگتے ہیں۔ میرے خاوند جیسے بوڑھے آدمی تو اس نشے کو فوراً قبول کرتے اور اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ پی لیتے ہیں۔"

آسیہ بول رہی تھی اور رجب علی پر جیسے نشہ طاری ہو گیا تھا۔ آسیہ نے اُسے ہپناٹائز کر لیا تھا۔

"اُس بوڑھے پر جس نے مجھے میرے ماں باپ سے خرید کر بیوی بنایا تھا، میں نے ایک رات اپنا اور شراب کا ایسا نشہ طاری کیا کہ اُس نے چھوٹے بڑے لاکھوں زمانوں میں کمانیوں والے بادشاہوں کی طرح کہا — 'مانگ کیا مانگتی ہے' — میں نے کہا — 'ساری جاگیر دے' — اور دو روز بعد تمام جاگیر، زمین، مکان وغیرہ کی ملکیت بدل گئی۔ اب مالک آسیہ تھی — سیاہ کار آسیہ تھی — میں نے اپنی روح کے لیے اپنے جذبات کو تنور میں ڈالا تھا۔ ان کی راکھ سے جس آسیہ نے جنم لیا وہ ایک خوبصورت ڈائن تھی۔ میں نے خاوند کی شراب میں وہی زہر ڈال دیا جو اُس کی پہلی بیوی کو دیا تھا۔ دو روز بعد اس کا اثر شروع ہو گیا۔ میں تیسرے روز پیالہ سے ڈاکٹر گرد ھاری لعل کو یہ بتا کر گھر لائی کہ میرا خاوند دیسی شراب پی پی کر تباہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اُسے اچھی طرح دیکھا اور مجھے الگ کر کے کہا کہ اس شخص نے شراب سے اپنا جگر جلا لیا ہے اور اس کا بچنا مشکل ہے....

"ڈاکٹر نے میرے خاوند کی تسلی کے لیے دوائیاں دے دیں جو میں نے خاوند کو تھوڑی تھوڑی دیں تاکہ وہ صحت یاب نہ ہو جائے۔ وہ چار روز بعد مر گیا۔ میں نے جس دلجمعی سے اس کی تیمارداری کی اس کے چرچے سارے گاؤں میں ہوتے۔ لوگ کہتے تھے کہ بے چاری رات رات خاوند کے ساتھ جاگتی ہے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے سو گیا؟"

"اُس کے رشتہ داروں نے شور نہیں مچایا تھا کہ مرنے والے کو زہر دیا گیا ہے؟"

"نہیں" — آسیہ نے کہا — "سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ زیادہ شراب پینے سے جگر جل گیا ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟" — رجب علی نے پوچھا — "تم نے اکیلے زندگی کس طرح گزاری؟

"میں تمہیں بیان نہیں دے رہی ملک!" — آسیہ نے کہا — "میں دلیری اور بزدلی کی بات کر رہی تھی اور میں تمہیں بتا رہی تھی کہ میں تم سے کیوں نہیں ڈرتی..... مجھ میں اتنی جرأت نہیں جتنی تم سمجھتے ہو۔ میری جرأت یہ ہے کہ پاکستان کے حاکموں کی رگیں کمزور ہیں۔ تم پولیس آفیسر رہ چکے ہو۔ تم نے ایک وقت مجھ پر احسان کیا تھا۔ میں نے احسان کی قیمت ادا کر دی تھی پھر بھی تمہیں کام کی ایک بات بتا دیتی ہوں۔ تم چھوٹے چھوٹے جاسوسوں کو گرفتار کر سکتے ہو جو دراصل سمگلر ہوتے ہیں۔ وہ سرحد کے قریب قریب کی اطلاعیں حاصل کرتے ہیں مگر تم میری سطح کے جاسوسوں کو ہاتھ نہیں ڈال سکتے کیونکہ تمہیں تمہارے اوپر والوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ میری کوٹھی کی تلاشی لے سکتے ہو لیکن کچھ نہیں پاؤ گے۔ میرے سینے میں جو کچھ ہے اسے تمہارا قانون دیکھ نہیں سکتا، پکڑ نہیں سکتا۔"

"تم نے مجھے بچہ سمجھ لیا ہے" — رجب علی نے کہا — "میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ذرا میری بھی سن لو۔"

"سنوں گی ملک!" — آسیہ نے کہا — "تمہاری سن کر تمہیں یہاں سے رخصت کروں گی..... میں کہہ رہی تھی کہ اپنے ملک کو جاسوسوں سے پاک کرنا چاہتے ہو تو اپنے حاکموں اور وزیروں سے کہو کہ اپنا دھیان رکھا کریں۔ تم شاید نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے اور اٹھارہ سال پہلے کے باپوں اور ان کے بیٹوں اور بیٹیوں نے پاکستان تو بنا لیا ہے لیکن اس کی حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئی وہ پاک ملک کی بجائے صرف حاکم بنے۔ وہ بادشاہ بن گئے۔ چونکہ بادشاہ عیش و عشرت کیا کرتے ہیں اس لیے وہ عیش و عشرت میں پڑ گئے۔"

"اور وہ عورت اور شراب کے رسیا ہو گئے" — ملک رجب علی نے اُس کی بات مکمل کر دی۔

"دولت" — آسیہ نے کہا — "اصل چیز دولت ہے۔ دولت ہے تو سب کچھ ہے۔ ہر نشہ دولت سے خریدا جا سکتا ہے..... تم مجھے گرفتار کر کے اپنا فرض ادا کر دو گے لیکن اوپر جا کر تمہاری ایمانداری اور فرض شناسی کو دولت بیکار کر دے گی..... تم بڑی طاقتوں کے اشاروں پر ناچنے والے بھکاری جنگ کی باتیں کرتے ہو۔ تم نے کشمیر میں کمانڈو اپریشن شروع کر رکھی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کامیاب ہو۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے فوجی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کسی قوم نے اتنے دلیر فوجی پیدا نہیں کیے جتنے دلیر پاکستان اور آزاد کشمیر نے پیدا کیے ہیں لیکن وطن کی آن پر قربان ہونے والے یہ فوجی نہیں جانتے کہ وہ ایک تلوار کی مانند ہیں جس کا دستہ حکمرانوں کی مٹھی میں ہے اور حکمران اُن کی مٹھی میں ہیں جن کا وہ دیا کھاتے ہیں۔ حکمران جب چاہیں گے اس تلوار کو نیام میں ڈال لیں گے۔"

"لیکن پاکستانی قوم ایسی تلوار نہیں جو کسی اور کی مرضی سے نیام میں چلی جائے" — رجب علی نے کہا۔

"بہت جذبہ ہے تمہاری قوم میں" — آسیہ نے کہا — "یہ میں دیکھ رہی ہوں۔ ہندوستان کے حکمران اسی خطرے سے ڈرتے ہیں۔ خود پاکستان کے حکمران اپنی قوم کے جذبے سے پریشان ہیں مگر قوم بے بس ہے۔ قوم کو گرا دیا جاتا ہے۔"

"تم اتنی عقلمند کس طرح ہو گئی ہو آسیہ؟"

iqbalmt@onedrive.com scanned by iqbalmt

"مردوں نے عقل دی ہے ملک!" — آسیہ نے کہا — "در اصل میں عقل مند نہیں، تم مرد بے عقل ہو۔ خوبصورت عورت مردوں کی عقل پر چھا جایا کرتی ہے.... ایک اور بات بتا دوں ملک! وعظ اور لیکچر نہ شروع کر دینا کہ تم مسلمان کی اولاد ہو۔ اسلام کی بیٹی ہو اور تم ہندوؤں کے حق میں ایک اسلامی ملک کی جڑیں کاٹ رہی ہو.... مجھ پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ مجھے تم پر ہنسی بھی آئے گی اور غصہ بھی۔ جس شوخ، چنچل اور نوجوان لڑکی کو تم پچاس سال کی عمر کے شرابی کبابی کے ہاتھ بیچ ڈالو تو اُس کے جذبات کے ساتھ اس کا دین اور ایمان بھی مر جاتا ہے۔ اُس پر کسی عالم کا وعظ اور کسی عامل کا تعویذ کوئی اثر نہیں کرتا۔ ناگن کی طرح اُس کے اندر زہر بھر جاتا ہے۔ تم جانتے ہو ملک! ماں تقدس اور عقل و دانش کی دیوی ہوتی ہے۔ ہر بیٹی اپنی ماں کی پوجا کرتی ہے۔ بیٹی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرتی ہے لیکن ماں کی ہر بات کو وحی کا درجہ دیتی اور اس کی تعمیل کرتی ہے۔ میرے باپ نے میری نقد قیمت وصول کی اور ماں نے مجھے کہا کہ تمہارا خاوند بوڑھا ہے۔ کچھ سالوں بعد مر جائے گا پھر اُس کی ساری جائیداد تمہاری ہوگی اور تم اپنی پسند کے کسی آدمی کے ساتھ شادی کر لینا....

"اور ملک رجب علی! تمہاری کوئی بیٹی ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا کہ خدا اور رسولؐ کے بعد بیٹی کے دل میں ماں کا درجہ دیا گیا ہے۔ میں اپنی بیٹیوں میں سے تھی جو اپنے باپ کو اپنا محافظ اور دنیا کا سب سے بہادر اور عقلمند آدمی سمجھا کرتی ہیں مگر میرے باپ نے اپنے ہاتھوں مجھے اُس آدمی کے بستر میں پھینک دیا جسے تم نے دیکھا تھا۔ پھر ہوا کیا؟ مجھے سبق کیا ملا؟ صرف یہ کہ دھوکہ کھاؤ، دھوکہ دو۔ ماں نے مجھے فریب کاری کے راستے پر ڈالا۔ باپ نے کچھ کہے بغیر مجھے سبق دیا کہ باپ، خاوند سب فریب اور عرص ہے۔ میں نے یہ گناہ کیا کہ اپنے خاوند کی پہلی بیوی کو زہر دے دیا۔ میں تمہیں بتا دیا تو تم نے کہا کہ آؤ آسیہ! تم نے بڑا بھیانک جرم کیا ہے۔ آؤ ایک بڑا خوبصورت گناہ کریں۔ ہم اپنا گھناؤنا جرم اس کے سائے میں گم ہو جائے گا....

"تم سے مجھے یہ سبق ملا کہ میں اتنی خوبصورت بنوں اور مجھ میں اتنی دلکشی ہے کہ میں قتل بھی ہو سکتی ہوں اور میں تھانیداروں کو شیشے میں اتارنے لگی۔ تم فیر مرد تھے نا ملک! میری ازدواجی زندگی میں فیر مرد تم ہی تھے۔ عورت قتل کر سکتی ہے، قتل ہو سکتی ہے لیکن عصمت کا موتی کسی غیر مرد کے قدموں میں نہیں پھینک سکتی۔ خاوند چاہے کیسا ہی ہو.... تم نے میری یہ جھجک دُور کر دی اور مجھے صاف بچا لیا میں نے اپنی سوکن سے اور اپنے خاوند سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ سوچ لیا تھا لیکن ایسی سوچ کو دل میں نہیں آنے دیا تھا کہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے کسی اپنے جیسے خوبرو جوان کے ساتھ چوری چھپے یارانہ گانٹھ لوں۔ مجھے چاہنے والے ملے تھے۔ میرے خاوند کے دو بھتیجوں اور ایک بھانجے نے مجھے آنکھوں سے، اشاروں سے، مسکراہٹوں سے اور ادھوری ادھوری، ٹوٹی ٹوٹی باتوں سے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس بڈھے کھوسٹ کے ساتھ کب تک جلتی رہو گی۔ ان میں سے ایک نے تو مجھے صاف لفظوں میں محبت کی دعوت دی تھی....

"یہ تینوں خوبصورت جوان تھے مگر ان سے مجھے نفرت سی ہو گئی تھی۔ میں اب مزید فریب نہیں کھانا چاہتی تھی۔ اب میری باری تھی کہ میں فریب دوں۔ میں بہت شوخ، شریر اور چنچل لڑکی ہوا کرتی تھی لیکن

میں جب کسی کے قتل کی خبر سنتی تھی تو میں کانپ جایا کرتی اور کئی کئی دن میری طبیعت ٹھکانے نہیں آیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی میں خواب میں ڈر جایا کرتی تھی مگر میں نے دو انسانوں کو قتل کر دیا اور مجرم فریب بن کر اتنی زیادہ جائیداد کی مالک بن گئی۔ کبھی میں نے کبھی جاسوس ڈاکو، ٹھگ یا پیشہ ور دھوکے باز کو جنم نہیں دیا۔

مجھ پر جو بیتی ہے، اس پر غور کرو تو سمجھ جاؤ گے کہ اسلام کی بیٹی ایک اسلامی ملک کی جڑیں کیوں کاٹ رہی ہے۔"

"میرا کوئی مذہب نہیں ملک! یہ بھی نہ سمجھنا کہ میں ہندوؤں کی وفادار اور مسلمانوں کی دشمن ہوں۔ تم چاہو تو میں مسلمانوں کی وفادار اور ہندوؤں کی دشمن بن جاؤں گی۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ میں ہندوستان کی سوکے رہ گئی۔ میں اِدھر آ جاتی تو میری ذہنیت بگڑی ہی رہتی۔ جاسوس نہ بنتی کچھ اور بن جاتی۔ مجھ سے خیر اور برکت کی توقع نہ رکھو ملک! مجھ میں جذبات نہیں رہے۔ میں انسان نہیں رہی۔ تمہیں اپنے ملک سے محبت ہو گی۔ میرے دل میں کسی ملک کی محبت نہیں۔ اپنی بیٹی کے سوا مجھے کسی سے پیار نہیں۔"

ملک رجب علی ہنس پڑا اور بولا — "اگر تمہیں اپنی بیٹی سے پیار ہے تو اس پیار میں میرا حصہ بھی ہے۔ شازی میری بیٹی ہے۔"

"نہ ملک!" — آسیہ نے کہا — "بیٹی کو تم سے پیار ہو گا۔ خون نے خون کو پہچان لیا تھا۔"

"کیا تم اسے بتاؤ گی کہ یہ میری بیٹی ہے؟"

"میں نے ابھی سوچا نہیں" — آسیہ نے کہا — "میں نے ابھی کچھ بھی نہیں سوچا ملک! میں نے اسے اس لائن پر ڈالا ہے لیکن لڑکی جذباتی ہے۔ میں اسے واپس بھیج دوں گی۔ اسے تو میری طرح پتھر ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے تمہیں دیکھے بغیر اپنا آپ ظاہر کر دیا ہے۔" — آسیہ نے آہ بھری اور چپ ہو گئی۔ ملک رجب علی سمجھ گیا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور اُس نے پوچھا — "تم اپنی بیٹی کو گرفتار کروا دو گی؟"

ملک رجب علی اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر ٹہل کر رُک گیا اور نظریں آسیہ پر گاڑ دیں۔ "میں کسی کو بھی گرفتار نہیں کروں گا" — ملک رجب علی نے کہا — "لیکن میں اپنی بیٹی کو ہندوستان نہیں جانے دوں گا۔"

"اگر تم واقعی ہندوستان کے جاسوس ہو تو خود ہندوستان نہیں جاؤ گے؟"

"ہمیشہ کے لیے تو نہیں جاؤں گا" — رجب علی نے جواب دیا — "میرا مستقل ٹھکانہ لاہور ہی ہے۔ وہی میرا اڈہ ہے۔ میں ہندوستان گیا تو چند دنوں کے لیے جاؤں گا۔ اپنی بیٹی کو نہیں جانے دوں گا۔"

"پاگل نہ بنو ملک!" — آسیہ نے کہا — "شازی سے دُور رہنا تم اپنا کام کرو۔ ہمیں پکڑوا دو اپنی بیٹی کی عزت کا خیال ہے تو چلے جاؤ اور ہمیں بھول جاؤ۔"

○

ملک رجب علی کے لیے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ اُسے اس گروہ کو پکڑوانا تھا لیکن شازی اُس کے لیے ایسی دیوار بن گئی تھی جسے گرانا اُس کے بس میں نہیں تھا۔

"کیا ملک ناصر نے تمہیں میرے متعلق کچھ نہیں بتایا؟"

"میں چار پانچ دنوں سے اُسے ملی نہیں" — آسیہ نے جواب دیا — "میں پرسوں واپس آئی ہوں۔"

iqbalmt@onedurdu.com scanned by

"اُس سے پوچھتی رہنا میں کون ہوں اور کیا ہُوں" — ملک رجب علی نے کہا — "میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں تمہارے گروہ میں کس طرح شامل ہُوا ہُوں۔ میں نے شازی کو غلط بتایا ہے کہ میری فیلڈ دوسری ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکی جذباتی ہے۔ میں اسے کہہ بھی چکا ہُوں کہ اپنے جذبات کا کلاؤ گھونٹ دے ورنہ بہت بڑا نقصان اٹھائے گی"

رجب علی نے عبدالجلیل خان سے بات شروع کی کہ کس طرح اُس نے عبدالجلیل کو ایذا رسانی سے مارڈالا تھا۔ اُس نے رادھا اور کرن کے قتل کی واردات سنائی۔ عبدالجلیل کی بیوی سلمٰی سے ملاقات اور شادی کا قصہ سنایا۔ سلمٰی کے بیٹے کیپٹن اصغر کا ذکر کیا اور آخر میں ملک ناصر سے اپنی ملاقات کی تفصیل سُنا کر کہا کہ وہ اس کے رنگ میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ رہ گیا تھا اُس نے کچھ جھوٹی باتیں شامل کر کے اور ایسے انداز سے سنائی جیسے وہ پاکستان سے نالاں ہے اور وہ اس ملک کے خلاف جاسوسی کر کے مسرت اور سکون محسوس کرے گا۔ وہ ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکا تھا۔ رنگ آمیزی اور فریب کاری میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے آسیہ کو متاثر کر لیا۔

"اب تم مل گئی ہو" — اُس نے کہا — "اور اپنی بیٹی مل گئی ہے۔ اب تو مجھے اس کام سے ریٹائرمنٹ مل جائے گی۔ کچھ پرشک کر کے میرا دل نہ توڑو آسیہ! مجھے اس راستے پر ڈال دو۔ ملک ناصر نے ہندوستانی سفیر کو بھیج دیا ہے"

"اگر تم ہماری ایجنسی جنس کے آدمی ہو اور اگر تم اس کام کی کچھ سوجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ اس کام میں ہر کسی پر شک کرنا لازمی ہے" — آسیہ نے کہا — "تم کہو تو میں نے اتنی زیادہ باتیں بیکار کی ہیں جنہیں ملک! میں نے ایک بھی بات بیکار نہیں کی۔ ایک تو یہ کام ایسا ہے کہ ہر کسی پر شک کرنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میری فطرت ایسی بن گئی ہے کہ میں ہر نئے مرد کو شک کی نگاہوں سے دیکھتی ہُوں اور جب کوئی مرد میرے جال میں آجاتا ہے تو یوں سمجھو کہ ایک سکھی مکڑی کے جال میں آ گئی ہے.... تم ابھی مجھے وہی آسیہ سمجھ رہے ہو جو ایک بوڑھے شرابی جاگیردار کی بیوی تھی"

"ہاں آسیہ!" — رجب علی نے مسکرا کر کہا — "تم مجھے وہی آسیہ لگتی ہو.... نوجوان خوبصورت....

تمہارے جسم کی نُو میرے وجود میں ابھی تک سمو جُود ہے۔ تمہاری عمر آگے بڑھ گئی ہے اور تم بہت حسین ہو گئی ہو آسیہ!"

آسیہ کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس مسکراہٹ میں مسرت جیسا کوئی تاثر نہیں تھا باقی ہر تاثر اس میں موجُود تھا۔ تلخی کا بھی، تمسخر کا بھی، شاید اس میں غصہ بھی تھا۔

"اب نہیں ملک!" — اُس نے رجب علی سے کہا — "اب کاروبار ہی کاروبار ہے.... جس عورت کے ساتھ تم نے شادی کی ہے، کیا نام بتایا تھا؟.... سلمٰی.... اس کے ساتھ تمہیں واقعی محبت ہے؟"

"ہاں آسیہ!" — رجب علی نے جواب دیا — "اُس سے مجھے دلی محبت ہے"

"کیا تم اُسے بتا رہے ہو کہ تم ہندوستان کی ایجنسی جنس کے لیے کام کر رہے ہو؟"

"اُسے بتانے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" — رجب علی نے جھوٹ بولا — "وہ سیدھی سادی عورت ہے۔ میری ذاتی سرگرمیوں کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ میری

بے شمار زمین ہے اور ساری آمدنی اسی سے آتی ہے۔ اُس کا جوان بیٹا ہے کیپٹن اصغر، وہ اسی کے تصور میں کھو لی رہتی ہے۔ میرے آگے کوئی رکاوٹ نہیں" — اُس نے مزید جھوٹ بولا — "میں اگر اپنی کوٹھی میں اڈہ بنالوں گا تو بھی میری بیوی کو پتہ نہیں چلے گا۔ اُسے اللہ میاں کی گائے سمجھو آسیہ!"

آسیہ ملک رجب علی کے انداز سے کہیں زیادہ چالاک، ہوشیار اور مکار تھی مگر رجب علی نے اپنی زبان کا جادو چلایا اور جہاں ضرورت محسوس ہُوئی وہاں جھوٹ بولے تو آسیہ کی گردن سانپ کی طرح پیسرے کے ہاتھ میں آ گئی۔

○

"تم نے ٹریننگ کہاں سے لی تھی؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

"ٹریننگ بہت بعد کی بات ہے" — آسیہ نے کہا — "صرف ٹریننگ سے اس کام میں کوئی آدمی مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کام کے لیے خاص قسم کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا ذہن ایسا نہیں تھا، وہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا ذہن کس طرح بنا تھا۔ مختصر یہ کہ مجھے فریب دیا گیا اور میں فریب کار بن گئی"

"خاوند کے مرنے کے بعد تم پر کیا گزری تھی" — رجب علی نے پوچھا — "تم نے اکیلے زندگی کس طرح گزاری تھی؟"

آسیہ نے آہ بھری اور بولی — "انسان بیکی کرنے پر اُتر آئے تو وہ لوگوں کو حیران کر سکتا ہے، اور اگر انسان بدی پر اُتر آئے تو بدی کی بھی کوئی حد نہیں۔ میں نے جب اپنے خاوند کو بھی زہر دے دیا تو میری حالت یہ ہو گئی کہ رات کو میں خوف سے کانپنے لگتی تھی۔ کئی راتیں ایسی آئیں کہ آنکھوں میں کٹ گئیں، بیماری جیسی بھی کبھی کبھی مجھے اپنے سینے سے چپکا لیا کرتی تھی لیکن اسے میں نے کبھی محسوس تک نہ ہونے دیا کہ میں خوف سے مری جا رہی ہوں۔ میری ماں آئی ہوئی تھی۔ باپ بھی آ گیا تھا۔ دونوں آٹھ دس دن میرے پاس رہے۔ ان دنوں میں نہ ڈری....

میں نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو میرے دل میں نفرت کا طوفان اُمڈ آیا۔ تنہائی میں میرے پاس آیا تو میں بے قابو ہو گئی۔ میں نے اُسے کہا — میں مگرمچھ کے آنسو سُنا کرتی تھی۔ آج دیکھ لیے ہیں۔ کیا لینے آئے ہو یہاں" — اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ بولا — کیا کہہ رہی ہو آسیہ بیٹی! میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اپنے سینے سے لگا کے رکھوں گا — میں نے کہا — "اب مجھے کسی اور کے پاس بھیجنے کا ارادہ ہے؟ میں ایک بار بک چکی ہُوں آپ میری قیمت وصول کر چکے ہیں۔ میں نے اپنی قیمت وصول کر لی ہے۔ اس میں آپ کا کوئی حصّہ نہیں۔ آپ یہاں کچھ دن رہ کر چلے جائیں۔ میں سب کے سامنے آپ کی بے عزتی نہیں کروں گی"....

"میری ماں نے خوب مکاری دکھائی۔ عورتوں کے سامنے میرے گلے لگ کر ایسی روئی اور ایسے بین کیے جیسے وہ خود بیوہ ہو گئی ہو لیکن رات کو اُس نے میرے پاس تنہا بیٹھ کر کہا — "بیٹی! اللہ کا شکر ادا کر، بڑی جلد ہی تیری جان چھٹی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ یہ بڈھا مر جائے گا اور تُو جوان رہے گی۔ جائیداد اپنے قبضے میں کر لینا اور پھر اپنی پسند کا کوئی اپنے جیسا خاوند دیکھ لینا۔ دیکھ میری بات کتنی جلدی پوری ہُوئی ہے....

iqbalmt@gmail.com scanned by

"اس کے بعد میری ماں نے اس قسم کی باتیں شروع کر دیں جیسے اپنے خاوند کی جائیداد کی مالک میں نہیں بلکہ میری ماں ہے اور میں اس جائیداد کی آمدنی ماں کو دیا کروں گی۔ باتوں باتوں میں وہ جاگیردارنی بن گئی۔ جب اُس نے کہا کہ اپنی سوکن کے زیورات مجھے دے دے، میں چھپا کر گھر سے جاؤں گی تو میرا دماغ پھر گیا۔ مجھے تو احساس ہی نہ رہا کہ یہ میری ماں ہے۔ میں نے کہا — تم ماں نہیں ڈائن ہو۔ کیا تم نے میری قیمت وصول نہیں کر لی تھی؟ جس روز تم نے مجھے اس بڈھے کے حوالے کر دیا تھا اس روز تم سب میرے لیے مر گئے تھے۔ اب تم میری ہمدردی کے لیے نہیں اس جائیداد کے لیے آتے ہو جو میں نے خاوند سے حاصل کی ہے۔ میں نے ابا سے بھی یہی کہا ہے تمہیں بھی یہی کہتی ہوں کہ اب آئی ہو، پھر یہاں نہ آنا۔۔۔۔

"ماں نے بہت چیتر سے بدلے، زبان کے کرتب دکھائے لیکن میں نے اُسے کہہ دیا کہ تم میرے ساتھ نہیں میری قبر کے ساتھ باتیں کر رہی ہو۔ مُردے کسی کی نہیں سُنا کرتے۔۔۔۔ وہ غصے سے بھری ہُوئی میرے گھر سے گئی۔ میرا باپ یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ آسیہ! تم عورت ذات ہو۔ دھوکہ کھا گئی ہو۔ تمہارے خاوند کے رشتہ دار تمہیں اس جائیداد اور دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھنے دیں گے۔ [illegible] تمہارے گھر کا دروازہ کھلا رہے گا۔ میرے سوا تمہارے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں۔۔۔۔

"وہ ٹھیک کہہ گیا تھا۔ میرے خاوند کے قریبی رشتہ داروں نے مجھے وراثت کے معاملے میں پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کبھی مجھے قانونی چارہ جوئی کی دھمکیاں ملتیں کبھی دو بزرگ آتے اور مجھے نصیحت کرتے کہ میں جائیداد کا کچھ حصہ اپنے خاوند کی پہلی بیوی کے بیٹے کو دے دوں جو ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ یہاں سے میں راتوں کو ڈرنے لگی۔ میں جان گئی کہ جائیداد اور گھر میں جو زیورات ہیں یہ مجھے مروا دیں گے۔ مجھے ڈر یہ بھی تھا کہ یہ لوگ میری بچی کو اٹھا لے جائیں گے۔۔۔۔

"میرے لیے ایک پریشانی اور پیدا ہو گئی۔ میرے خاوند کے [illegible] ایک بھانجا تھا جس کا میں پہلے ذکر کر چکی ہوں۔ تینوں خوبصورت جوان تھے اور میری دوستی کے خواہاں تھے۔ انہوں نے ہمدردی کے بہروپ میں میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ ان میں سے جو بھی آتا مجھے کہتا کہ وہ میری زمینوں کی دیکھ بھال کرے گا کیونکہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں ان کی نیت سمجھتی تھی، وہ چاہتے تھے میں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے پھسل جاؤں۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت تھی لیکن میرے اندر سے ایک آواز آتی تھی کہ آسیہ! تم ایک مرد کے آگے جھک گئیں تو تمہیں ہر مرد کے آگے جھکنا پڑے گا۔ ان سے دامن بچا کے رکھنا۔

"تم جانتے ہو ملک! عورت ایک بار پھسل جائے تو اُس کے پاؤں کوئی نہیں جمنے دیتا۔ میرے خاوند کے دونوں بھتیجوں اور بھانجے کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ میرا ان کے ساتھ خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں بوڑھے خاوند کی جوان بیوی اور اب بیوہ ہوں اس لیے میں اپنے جیسے کسی جوان آدمی کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ میں نے انہیں ٹھکرایا نہیں۔ ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔ گاؤں میں ایک عورت تھی جو تھی تو ایک غریب سے کسان کی بیوی لیکن اونچی ذاتوں کے امیر کبیر آدمیوں کو انگلیوں پر نچایا کرتی تھی۔ خدا نے اُسے چہرے اور جسم میں کشش اور زبان میں جادو کا اثر دیا تھا۔"

"وہ پنجابی فلم تو نہیں تھی؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"وہی تھی" — آسیہ نے کہا — "وہ پنجابی مستانی ہی تھی۔ تم اُسے جانتے ہو؟"

"میں جب مختار سے علاقے کے حق لینے میں تھا تو وہ میری لنجر تھی" — رجب علی نے کہا — "وہ تو آسمان سے تارے توڑ لاتی اور زمین کی ساتویں تہہ سے بھید نکال لاتی تھی۔"

"میرے خاوند کے ساتھ اُس کا تعلق اُس وقت سے تھا جب وہ نوجوان تھی" — آسیہ نے کہا — "میں جب اس گھر میں آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے خاوند اور اُس کی پہلی بیوی پر رعب جھاڑ دیا کرتی تھی حالانکہ اُس کی حیثیت نوکرانیوں جیسی تھی۔ میرے خاوند کے ساتھ اُس کا تعلق خفیہ سا تھا۔ میرے ساتھ وہ پیار کی باتیں کیا کرتی تھی۔ میں جب بیوہ ہو گئی تو پنجابی مستانی میرے گھر میں اُسی طرح آتی رہی جس طرح پہلے آیا کرتی تھی۔ اب وہ میری سُلجھی چاپی کرنے لگی۔"

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنے لگی ہو" — رجب علی نے مُسکرا کر کہا — "یہ تو ایسی عورتوں کا پیشہ ہوتا ہے۔ وہ۔۔۔۔"

"نہیں ملک!" — آسیہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "تم نے غلط سمجھا ہے۔ وہ تم جیسے کسی عاشق کے پیغام نہیں لاتی تھی۔۔۔۔ ایک روز اُس نے مجھے کہا — 'تین آدمی جو تمہارے گھر میں آتے جاتے ہیں بدنام کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی لیکن ان کا تمہارے گھر آنا جانا لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ تمہارا چلن ٹھیک نہیں رہا' — میں نے اُسے بتایا کہ میں انہیں گھر میں آنے سے روک نہیں سکتی۔ ڈرتی ہوں کہ وہ مجھے پریشان کریں گے۔ اُس نے کہا کہ وہ ان کا بندوبست کر دے گی۔۔۔۔

"تھوڑے عرصے بعد چلاؤ کو میرے خاوند کے ایک بھتیجے اور اُس کے بھانجے کی نگرانی ہو گئی ہے۔ دوسرا بھتیجا اپنے بھائی کی موت کو نہ پہنچا، پھر دونوں خاندانوں کے آدمی نکل آئے۔ اس لڑائی میں تین چار آدمی زخمی ہو گئے اور دونوں خاندانوں میں عداوت شروع ہو گئی۔ لڑائی بظاہر معمولی سی بات پر ہوئی تھی لیکن اصل محرک پنجابی مستانی کو معلوم تھی جو اُس نے بعد میں مجھے بتائی۔ اُس نے ایک کو دوسرے کے متعلق کہا کہ وہ کہتا پھرتا ہے کہ آسیہ کی دوستی اُس کے ساتھ ہے اور آسیہ نے دوسرے کی بڑی بے عزتی کی ہے۔ دوسرے کو بھی اُس نے یہی بتایا۔ اس پر وہ معمولی سی بات پر آپس میں ٹکرا گئے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے تینوں کی بیویوں کے کانوں تک اپنی اُستادی سے یہ بات پہنچائی — 'مختار کے خاوند نے آسیہ کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اور آسیہ نے اس کی بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا ہے' — اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں کے گھروں میں بھی لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔۔۔۔

"ان کا میرے گھر میں آنا ختم ہو گیا۔۔۔۔ میں نے تینوں تفصیل سے نہیں بتایا کہ پنجابی مستانی نے یہ کام کس طرح کیا تھا۔ اُس کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے مردوں سے بچنے کے لیے داؤ پیچ اور چیتر سے بتا دیئے۔ اُس نے کہا — 'مرد اپنے آپ کو عورت کا حاکم سمجھتا ہے لیکن عورت ایک مُسکراہٹ اور آنچل کے ایک اشارے سے مرد کو اپنے قدموں میں گرا سکتی ہے۔۔۔۔ تم جیسی خوبصورت لڑکی تو بڑے بڑے حاکموں کو اپنے پیچھے پیچھے پھرا سکتی ہے' — اُس نے مجھے یہ مُسکراہٹیں اور اشارے بتا دیئے۔ میں اُسے پیسے بھی دیا کرتی اور کپڑے بھی دیا کرتی تھی۔ اتنا اُسے کبھی کسی گھر سے

iqbalmt@one.com.pk Scanned by

نہیں ملا تھا۔ وہ میری ملازمہ بھی بن گئی، مشیر بھی اور محافظ بھی۔۔۔۔

"میرے خاوند نے تین چار غنڈے بدمعاش بھی اپنے اثر میں رکھے ہوئے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس شخص کی زندگی کس طرح گزرتی تھی اور اُس کے بازو کتنے لمبے اور ہاتھ کہاں تک پہنچتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ تھانے میں جو بھی تھانیدار اور چھوٹا تھانیدار آتا تھا ان کا وہ وظیفہ لگا دیتا تھا۔"

"مجھے یاد ہے۔" ملک رجب علی نے کہا۔ "اُس نے میرا بھی ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو مجھے اور میرے تھانے کے اسے ایس۔ آئی کو باقاعدگی سے پہنچ جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کاہنا ڈاکو اپنا مال کبھی کبھی تمہارے خاوند کی حویلی میں رکھ کر جاتا اور جب کاہنا دیکھتا کہ خطرہ ٹل گیا ہے اپنا مال اُٹھا لے جاتا تھا۔"

"میں کاہنے ڈاکو کی ہی بات کرنے لگی تھی۔" آسیہ نے کہا۔ "تمہیں یاد ہوگا کہ وہ کس پائے کا آدمی تھا۔ لوگ اُس سے ڈرتے بھی تھے اور اُس کی عزت بھی کرتے تھے۔"

"کاہنا میرا بھی یار تھا۔" رجب علی نے کہا۔ "اُسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص ڈاکو ہے۔"

"میری حفاظت اِس کاہنے نے کی جسے لوگ ڈاکو کہتے تھے۔" آسیہ نے کہا۔ "وہ تھا ڈاکو۔ میرے خاوند کے مرنے کے تین مہینے بعد آیا اور بہت روئی۔ وہ رات کے وقت آیا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر ڈر گئی لیکن اُس نے میرا ڈر دُور کر دیا۔ کہنے لگا۔ 'تمہیں میں نے دو تین بار ہی دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے ڈاکو ہی سمجھتی ہوگی لیکن اس وقت مجھے سگے بھائی کا درجہ دے دو۔ میرے لیے خوبصورت ڈاکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ تمہارا خاوند میرا دوست نہیں بھائی تھا۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا سکتی ہو۔ خدا نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے۔ میں اپنا حق ادا کرنے آیا ہوں۔ کوئی خدمت، کوئی کام مجھے بتاؤ۔'۔۔۔۔

"میں نے اُسے کچھ بھی نہ بتایا۔ میں اُس سے کیا خدمت کرا سکتی تھی؟ یہی کہ اُس نے مجھے بہن کہا تھا۔ اُس کے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ اُس نے مجھے دل سے بہن کہا ہے۔ اُس نے جب دیکھا کہ میں سوائے شکریہ ادا کرنے کے کوئی بات نہیں کہہ رہی تو اُس نے کہا۔ 'تم میری بات نہیں سمجھ سکی آسیہ۔ میں بات صاف کہہ دیتا ہوں۔ تم جیسی خوبصورت بیوہ جس کا کوئی والی وارث نہ ہو اسے کوئی سکون اور عزت سے جینے نہیں دیا کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ جاگیردار کی ملک اب تم ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ دوسری شادی کب کر رہی ہو؟' میں نے کہا کہ ابھی کوئی ارادہ نہیں۔ اُس نے کہا۔ 'اگر تمہیں گاؤں کے کسی آدمی سے خطرہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ وہ تمہارے سامنے سے بھی دُور بھاگے گا۔۔۔۔

"میں اُس کا مطلب سمجھ گئی۔ یہی میرا مطلب تھا۔ میں نے اُسے خاوند کے بھتیجوں اور بھانجے کے اور دو اور آدمیوں کے نام بتا دیئے۔ میں نے اُسے کہا۔ 'کاہنے! میں کسی مرد کے ساتھ دوستی کی خواہش نہیں کروں گی۔ تم نے مجھے بہن کہا ہے تو بہن اپنے بھائی کو دکھ دے گی کہ وہ اپنی عزت بچا کر رکھتی ہے۔' کاہنے نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ 'تمہاری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔۔۔۔

"اور میں نے دیکھا کہ میں نے کاہنے کو جن آدمیوں کے نام بتائے تھے وہ مجھ سے دُور ہٹ گئے بہت

بعد میں پتہ چلا کہ کاہنا نمبردار کو اور گاؤں کے دو سکھ زمینداروں کو اور کچھ سرکردہ آدمیوں کو دھمکی دے گیا تھا کہ چوہدری شاکر علی کے گھر کی طرف کسی نے میلی نظر سے دیکھا تو اُس کا گھر برباد ہو جائے گا۔"

(۲)

آسیہ نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "وہ وقت تمہیں یاد ہے ملک! ڈاکوؤں اور بدمعاشوں میں بھی کچھ اخلاق تھا۔ آج زمانے کو کیا ہو گیا ہے۔ جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی طریقے سے ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ شکل سے مومن لیکن اعمال مجرموں والے ہیں۔۔۔۔ کاہنا شاید اب بھی ڈاکو ہی ہوگا۔ میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی ہوں۔ کاہنے کو یاد رکھتی ہوں۔"

"وہ زندہ نہیں۔" رجب علی نے کہا۔ "پاکستان بننے سے دو تین مہینے پہلے پکڑا گیا تھا۔ ڈکیتی کی وارداتیں تو اُس کے نام تھیں ہی، اُس کے خلاف تو آدمیوں کے قتل کے کیس پولیس کے رجسٹر میں لکھے ہوئے تھے۔ صرف چار مہینے کیس چلا اور اُسے پھانسی دے دی گئی۔"

"وہ۔۔۔" آسیہ کو صدمہ ہوا جس کے تاثرات اُس کے چہرے پر بھی آ گئے۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ ہاتھوں سے آنکھیں پونچھ کر بولی۔ "اس شخص نے میری تمام تنہا زندگی سے خوف اور خدشے نکال دیئے۔ وہ کبھی کبھی آ جاتا تھا۔ میری اور شازی کی خیریت پوچھ کر اور تسلی کر کے اور تسلی دلا کے دے کر چلا جاتا تھا۔ پھر اِس کے ساتھ کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟"

"میں اُس کے مرنے پر بھی نہیں گئی۔" آسیہ نے جواب دیا۔ "ایک آدمی اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ ماں کے لیے دو ہزار روپیہ بھیج دیا اور ساتھ کہہ دیا کہ میں نہیں آؤں گی۔ اگر ماں میں نور ہوا تو وہ رقم واپس بھیج دے گی۔ کسی نے بھی نہیں بھیجی۔ ماں نے وہ رقم رکھ لی۔ تم جانتے ہو ملک! اُس وقت سونے کا بھاؤ ایک ہزار روپے آج کے آٹھ ہزار کے برابر تھے۔۔۔۔ میں نے اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ آج تمہیں دیکھا ہے تو وہ سارا زمانہ میرے سامنے آ گیا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے میرے سینے میں ایک بند دروازہ تھا۔ وہ ٹوٹ گیا ہے۔"

ملک رجب علی کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ وہ اپنی ہمسایہ پر خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے تیروں کا بنا ہوا بڑا مضبوط بند توڑ دیا تھا۔ اُس کی زبان کا جادو ہی کچھ ایسا تھا کہ آسیہ جو اپنے آپ کو بڑا مضبوط پتھر سمجھتی تھی، نرم ہو گئی تھی۔ شازی کمرے میں آ گئی۔

"امی! آپ نے کیا کہانیاں شروع کر دی ہیں اور مجھے الگ بٹھا دیا ہے۔" شازی نے کہا۔ "مجھے بھی یہیں بیٹھنا ہے۔"

"نہ میری اچھی بیٹی!" آسیہ نے بڑے پیار سے کہا۔ "بہت ضروری باتیں کر رہی ہوں۔ سمجھا کرو۔"

شازی بڑا سا منہ بنا کر سمجھ گئی۔ وہ ماں کے پاس بیٹھی رجب علی کے پاس بیٹھنے کو بے تاب ہو رہی تھی لیکن ماں نے اُسے پھر دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

"کبھی خیال آتا ہے کہ شازی میں اس لائن میں کامیاب ہے گی۔" آسیہ نے کہا۔ "اور کبھی اس پر جذبات ایسے طاری ہو جاتے ہیں کہ اسے اپنی زبان اور اپنی حرکتوں پر قابو نہیں رہتا۔ کیا تم اسے اس کام کے قابل سمجھتے ہو؟"

iqbalmt@yahoo.com scanned by

"نہیں"۔ رجب علی نے کہا۔ "تم اپنی بات سُناؤ آسیہ! شادی کیا کرے گی اور کیا نہیں کر سکے گی، یہ بعد میں سوچ لیں گے۔"

"میری بات بڑی لمبی ہے ملک!"۔ آسیہ دُکھی ہوئی سی ہنسی ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ "اب میں اعتراف کر ہی لوں تو بہتر ہے کہ تم میرے دل کو بہت اچھے لگے تھے۔ میری ازدواجی زندگی میں تم پہلے غیر مرد آئے تھے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ میں نے تمہیں محبت کا سرچشمہ سمجھ لیا تھا۔ میرے جذبات پیاسے مرد ہے تھے۔ آج تمہیں دیکھا ہے تو اپنے دبے جذبات اور احساسات کو میں سنبھال بھی وہ جی اُٹھے ہیں۔ تم سنتے رہنا ملک! تم تحمل سے سُنتے رہنا۔"

"سُن رہا ہوں آسی!"۔ رجب علی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "یاد ہے تمہیں، میں نے تمہیں اس کمرے کی تنہائی میں آسی کہا تھا؟"

آسیہ نے آہ بھری، اور کہنے لگی۔ "تمہیں دیکھ کر سب کچھ یاد آگیا ہے..... میں کالج ڈاکو کی بات کر رہی تھی۔ اُس نے مجھے تحفظ دیئے رکھا۔ اس کے علاوہ میرے خاوند کے دو اور خاص آدمی تھے جو ملازم لیکن گاؤں والے جانتے تھے کہ وہ پکے جاسوس اور پیسوں کی محفل کے آدمی ہیں۔ وہ ہر وقت کھیلنا جانتے تھے۔ زمین کے نیچے سے بھی وار کیا کرتے تھے۔"

"وہ اچھے اور کرامات ہوں گے۔"

"ہاں، وہی"۔ آسیہ نے کہا۔ "اگر تم انہیں جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ کیسے تھے اور کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے میرا ساتھ غلاموں کی طرح دیا۔ مجھے وہ شہزادی سمجھتے تھے۔ میں نے دراصل اُن کی وفاداری خریدی تھی۔ انہیں میں اُس سے زیادہ دیتی تھی جو انہیں میرے خاوند سے ملا کرتا تھا۔ کرم نے اپنی بیٹی کی شادی کی تو آدھا خرچ اُسے میں نے دیا تھا۔ اُن کی شراب میرے ذمے تھی۔ وہ میرے ایسے محافظ بن گئے تھے کہ جانیں قربان کرنے پر تیار رہتے تھے۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ کسی کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن مجھے کوئی شریف عورت بھی نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے کالج کی دائی ہی کہا جاتا اور یہ بھی کہ میرے کئی خاوند ہیں۔ یہ باتیں گاؤں میں ہوتی تھیں جو پلی مستانی اور دو اور عورتوں کے ذریعے مجھ تک پہنچتی تھیں۔ میرے سامنے ایسی بات کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میرے مزارعے مجھ سے بہت خوش تھے۔ میں اُنہیں اُن کے حق سے زیادہ دیا کرتی تھی۔ میں نے انہیں بڑی سختی سے کہہ رکھا تھا کہ مجھے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یا جھک کر سلام نہ کیا کریں لیکن وہ تو میرے آگے سجدے کرنے کو بے تاب رہتے تھے....."

"مجھے پتہ چلا کہ مجھ پر ایک پیر سے تعویذ بھی کروا لے گئے ہیں اور مجھے نقصان پہنچانے کے لیے میری کھیتیوں میں بھی تعویذ دبا لے گئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ دیہات میں لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا کیا درپردہ حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ سب حرکتیں میرے خلاف ہوئیں اور میں روز بروز شریر اور دلیر ہوتی گئی۔ عورت بدکار ہو تو وہ لوگوں کے سامنے جانے اور بات کرنے سے ڈرتی ہے کہ کوئی آدمی کھری بات کہہ کر شرمسار کر دے گا۔ مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں گاؤں میں سر اُونچا کر کے چلا کرتی تھی۔ کوئی آدمی میری دوستی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ مجھے عجیب عورت کہنے لگے۔ بعض کہتے تھے کہ آسیہ

کو کسی کالی چیز کی دُعا ملی ہوئی ہے کہ مردوں کی طرح سینہ تان کر چلتی ہے اور بعض کہتے تھے کہ کسی پیر کی بددُعا ہوئی ہے ورنہ اتنی خوبصورت اور جوان عورت کی اب تک دو تین شادی ہو چکی ہوتی لیکن اس کے قریب سے بھی کوئی نہیں گزرتا....."

"قریب سے گزرنے والے بہت تھے ملک! اچھے آدمیوں نے بھی شادی کے پیغام بھیجے تھے۔ میں نے ایک بھی قبول نہ کیا۔ میرے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ میرے اُمیدوار میرے ساتھ نہیں میری جائیداد کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل میرے دماغ میں کوئی سیدھی سوچ آتی ہی نہیں تھی۔ میرے محافظ حرام پیشہ لوگ تھے۔ میری اپنی سوچیں بھرمار ہو گئی تھیں۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے جو کوئی بھی دیکھتا ہے اُس کے ذہن میں جُرم آتا ہے۔ جوان، خوبصورت اور دولت مند بیوہ کو جو چند سال کسی بُڑھے خاوند کی بیوی رہ چکی ہو، دیکھ کر کسی بھی مرد کے دماغ میں خلوص کی سوچ نہیں آسکتی۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ یہ عورت پیاسی ہے مری جا رہی ہے اس لیے یہ کسی بھی خوشحال آدمی کے جال میں آجائے گی۔ مجھے اپنے آپ کو اور اس بیٹی کو ان بھیڑیوں سے بچانا تھا اس لیے مجھے پکے مجرموں کا سہارا اور تحفظ خریدنا پڑا۔ بی مستانی اور اس جیسی دو اور عورتیں میری خاص ہمدرد تھیں۔ وہ مجھے چالاکی اور ہوشیاری کی باتیں سکھاتی رہتی تھیں....."

"مجھے ایک اور شہزادے کا پیغام ملا۔ وہ ناٹک گڑھ کا رہنے والا تھا۔ شاید تم اُسے بھی جانتے ہو گے۔ تم اس علاقے میں رہ چکے ہو۔ خواجہ کبیر کے نام سے مشہور تھا۔ غالباً پائے کا زمیندار تھا۔"

"ہاں، اس وقت اچھا خوبصورت جوان تھا۔" ملک رجب علی نے کہا۔ "جس وقت کی تم بات کر رہی ہو اس وقت اُس کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان ہو گی۔ میں اُسے جانتا تھا۔ اُس کا باپ انگریزوں کی مخبری کرنے والا اور ہندوؤں کا دوست تھا۔ وہ مر گیا تو خواجہ کبیر اپ کے راستے پر چل پڑا۔ آزادی سے پہلے وہ پنجاب اسمبلی کا ممبر بھی رہ چکا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ یونینسٹ پارٹی کی ٹکٹ سے الیکشن میں کھڑا ہوا اور ہار گیا تھا کیونکہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے۔"

"وہی خواجہ کبیر۔" آسیہ نے کہا۔ "میں ایک روز اپنی زمینیں دیکھنے گئی۔ وہ گھوڑے پر سوار میرے قریب سے گزرا اور رُک گیا۔ ہم دونوں نے اس سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یہ آدمی اچھا لگا۔ عمر کے لحاظ سے بھی اچھا تھا۔ ایک دو باتیں ہوئیں تو اس نے کہا۔ 'اچھا..... تو وہ تم ہو۔ چوہدری شاکر علی کی بیوہ..... میں نے تمہاری بہت سی باتیں سُنی ہیں۔' میں نے کہا۔ 'یہی سنا ہو گا کہ آسیہ نے بہت سے خاوند رکھے ہوئے ہیں اور وہ کاہنے ٹکوں کی داشتہ ہے۔' وہ ہنس کر بولا۔ 'نہیں۔ اس کے اُلٹ سُنا ہے۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے بتانے والوں نے بتایا ہے کہ تم شیر کی بچی ہو اور کوئی مرد تمہاری آنکھ میں آنکھ نہیں ڈال سکتا۔ میرے دل میں بدی نہیں آسیہ! میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ تم چاہے کتنی ہی دلیر ہو لیکن عورت ہو اور اکیلی ہو۔ مجھے اپنا خادم اور ہمدرد سمجھو۔ کسی ایک کا نام لو جو تمہیں بدنام کرتا ہو۔ خدا کی قسم اُس کی لاش نہیں ملے گی۔' — میں نے کہا۔ 'یہ کام میں خود بھی کر سکتی ہوں۔' — اُس نے کہا — 'میں اس کے عوض کچھ نہیں مانگوں گا آسیہ! آزما لو۔ اگر مجھے تمہاری وہ ضرورت ہوئی تو پہلے نکاح پڑھاؤں گا۔' — میں نے کہا۔ 'میں چاہوں یا نہ چاہوں؟' — اُس نے کہا۔ 'دل سے چاہو گی تو....."

iqbalmt@onenet.com.pk scanned by

"ایسی اور بھی باتیں ہوئیں اور وہ چلا گیا۔ دوسرے ہی روز اُس کا پیغام آ گیا۔ میں نے عزت سے انکار کر دیا۔ اُس کا ایک اور پیغام آیا کہ ایک ملاقات ہونی چاہیئے، میری نیت بُری نہیں۔۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہ شخص مجھے اچھا لگتا تھا۔ میری کچھ زمین گاؤں سے سات آٹھ میل دُور تھی۔ میں نے خواجہ کبیر کو وہیں بلا لیا۔ ہماری بڑی لمبی ملاقات ہوئی۔ اُس کی پہلے ہی ایک بیوی تھی اور چھوٹے چھوٹے دو بچے۔ وہ کہتا تھا کہ اُس کی بیوی شکل کی بھی بہت اچھی اور عقل کی بھی بہت اچھی ہے۔ مجھے وہ دوسری بیوی بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس عورت کو نہیں اُجاڑوں گی جو اپنے خاوند کو چاہتی ہے اور خاوند اُسے چاہتا ہے۔۔۔۔ وہ تمہاری طرح بہت اچھی اور پیاری باتیں کیا کرتا تھا۔"

"پکا استاد تھا۔" رجب علی نے کہا ــــ "اچھی حرکتیں کرنے والا آدمی نہیں تھا لیکن بڑا گہرا اور گھاگ تھا۔"

"ہاں، وہ ایسا ہی تھا۔" آسیہ نے کہا۔ "اُس نے کہا کہ شادی نہ کرو صرف ملتی رہا کرو۔ میں نے اُسے کہا کہ ملا کروں گی لیکن اس طرح جس طرح دو سہیلیاں یا دو دوست ملا کرتے ہیں۔ تم مجھے عورت نہ سمجھنا اور میں تمہیں مرد نہیں سمجھوں گی۔۔۔۔ اگر میں تمہیں اِن ملاقاتوں کی کہانی سُنانے لگوں تو آج کی رات اسی میں گزر جائے گی۔ بس اتنا سُن لو کہ خواجہ کبیر کے ساتھ میں ایک اور ہی دُنیا میں داخل ہو گئی۔ ہماری دوستی گہری ہوتی گئی۔ ملک! تم یقین نہیں کرو گے کہ اُس نے اپنی نیت میں کبھی فتور نہ آنے دیا۔ مدت اُس نے مجھے یہ کہتے ہوئے دیا کہ وہ مرد ہے اور میں عورت ہوں۔۔۔۔

"ایک بار ہم دِلّی چلے گئے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ کنوئیں کا مینڈک تھی۔ ریل گاڑی کے فسٹ کلاس ڈبے کے اتنے لمبے سفر اور اتنے عالیشان ہوٹل نے میرے ذہن اور دِل کے دریچے اور زیادہ کھول دیئے جو اس عمر تک بند پڑے تھے۔ ایسی شراب پہلے کبھی موجود رہتی تھی مگر اس کی بدبُو سے مجھے متلی آنے لگتی تھی۔ بدبُو کے علاوہ شراب کا تعلق میرے بُرے وقت کے ساتھ بھی تھا اس لیے مجھے یہ اور زیادہ بُری لگتی تھی۔ میں کالج میں اچھا اور کرنے کے لیے دِن کا بیشتر وقت گھر میں رکھتی تھی لیکن ان بند توتلوں سے بھی مجھے نفرت تھی۔۔۔۔

"دِلّی کے ہوٹل کے ایک کمرے میں جو دو جڑے ہوئے پلنگ پڑے تھے مجھے بڑے ہی اچھے لگ رہے تھے۔ خواجہ کبیر نے کہیں کی تولیں منگوا کر مجھے دیں۔ میں نہانے کیا چلا گیا کہیں بادلوں میں اُڑنے لگی۔ یہ دنیا مجھے بہت خوبصورت لگنے لگی اور خواجہ کبیر کو میں دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت آدمی سمجھنے لگی۔۔۔۔ صبح جب آنکھ کھلی تو لگا جیسے بڑا ہی حسین خواب دیکھا ہے۔ خواجہ کبیر ساتھ والے پلنگ پر سویا ہُوا تھا۔ میرا ذہن بیدار ہُوا تو خیال آیا کہ یہ خواب نہیں بڑی حسین حقیقت تھی ــــ خواجہ کبیر نے مجھے وہسکی پلا دی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شراب ہر گناہ کی ترغیب دیتی ہے وہ رات سچ ثابت ہو گیا تھا۔ میری اور خواجہ کبیر کی دوستی سہیلیوں والی نہیں رہی تھی۔ وہ مرد تھا، میں عورت تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہُوا۔۔۔۔

"ہم آٹھ دِن دِلّی رہے۔ خوب سیر کی۔ وہیں خواجہ کبیر نے میری ملاقات دو ہندوؤں سے کرائی۔ وہ کانگرس کے لیڈر یا مستقل تھے۔ پھر تین ہندو لڑکیوں سے ملاقات ہوئی جو تعلیم یافتہ تھیں اور بہت ہی خوبصورت۔۔۔۔ ہم واپس آئے تو خواجہ کبیر کے ساتھ میری ملاقاتیں زیادہ ہونے لگیں کبھی ہم ٹالا جاتے، کبھی امرتسر،

کبھی جالندھر اور ہم شہر شہر گھومتے پھرتے لیکن اب یہ سیر سپاٹا نہیں تھا۔ خواجہ کبیر، اُس کے ہندو دوستوں اور ہندو لڑکیوں نے مجھے سیاسی تخریب کاری میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن آ رہے تھے اور مسلمان پاکستان کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہر مسلمان کی زبان پر تین نام رہتے تھے ــــ پاکستان، قائدِاعظم اور مسلم لیگ۔ کانگرسی ہندو مسلمانوں کو کانگرس کی طرف گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دولت لُٹا رہے تھے۔ دھمکیاں بھی روا تھا کہ پوری کی پوری برادری اپنے بزرگوں کے کہنے پر ووٹ دیتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بااثر مسلمانوں کو اپنے اثر میں لیا جائے۔ میں نے ہندو لڑکیوں کے ساتھ ایسے تین بااثر آدمیوں کو اپنے حُسن، اداؤں اور دلکش حرکتوں سے شیشے میں اُتار لیا تھا۔ نیشنلسٹ پارٹی کے وفادار مسلم لیگ کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں کو اپنے طلسم میں گرفتار کیا اور مسلم لیگ میں جانے سے روکا۔۔۔۔

"میں اب بڑے کام کر رہی تھی۔ میں تو مسلمانوں کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔ میں نے ہندو لڑکیوں کے ساتھ مل کر پاکستان کے بہت سے مخالف پیدا کیے۔ وہ پاکستان بن جانے تک پاکستان کے مخالف رہے۔ ان میں سے دو کو میں نے پاکستان میں وزارتوں کی کرسیوں پر بیٹھے دیکھا۔۔۔۔

"پاکستان بن گیا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہُوا وہ تمہیں یاد ہو گا۔ ایک کانگرسی لیڈر نے مجھے دِلّی بھیج دیا تھا۔ وہاں میں شانتی کے ساتھ ہندوؤں کی حفاظت میں رہی۔ انہیں میری ضمانت پر رہا کروا لائی تھیں۔ چند مہینوں بعد مجھے اور دو اور ہندو لڑکیوں کو ہندوستان کی انٹیلی جنس کے سپرد کر دیا گیا۔ وہاں ہمیں ایسی ٹریننگ دی گئی جو مجھے بڑی اچھی لگی۔ جب ٹریننگ پوری ہو گئی تو مجھے آزمائش کے لیے پاکستان میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں ہندوستان کا سفارت خانہ تھا اور جاسوس بہت تھے۔ مجھے تحفظ حاصل تھا۔ آزمائش میں پوری اُتری۔۔۔۔

"میں واپس ہندوستان گئی۔ ایک سال بعد مجھے پھر پاکستان میں داخل کیا گیا۔۔۔۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شانتی کو شانتی بھی جوان ہو گئی۔ میں نے اسے بھی اسی راستے پر ڈال دیا۔ اب پاکستان کے سرکاری حلقے میرے سائے تلے پڑے ہیں۔ ہمیں جس جس سے خطرہ ہو سکتا ہے اُس پر میرا طلسم طاری ہے۔"

"اب سوال یہ ہے کہ شانتی کو بتا دیا جائے کہ میں اُس کا باپ ہوں؟" ــــ ملک رجب علی نے پوچھا۔

"نہیں۔" ــــ آسیہ نے جواب دیا۔ "نہ بتانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر بُرا اثر پڑے۔"

رجب علی جب آسیہ کے گھر سے ملک نامر کے گھر کو جا رہا تھا، اُسے یہی ایک خیال پریشان کر رہا تھا کہ شانتی اُس کی بیٹی تھی اور وہ جس مشن پر پاکستان آئی تھی اس کے لیے شانتی کو ایسی قربانی بھی دینی تھی جو کسی بیٹی کا غیرت مند باپ سوچ بھی نہیں سکتا۔ رجب علی نے اس رنگ کو گرفتار کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا مگر شانتی کا کیا بنے گا؟

"شانتی کو اس رنگ سے کس طرح نکالا جائے؟" ــــ رجب علی سوچتا جا رہا تھا۔ اُسے کوئی طریقہ، کوئی راستہ سُوجھتا نہیں تھا۔

iqbalmt@gmail.com Scanned by

ملک رجب علی جب ملک ناصر کی کوٹھی میں داخل ہوا تو بھی اُس کے ذہن پر شازی سوار تھی اور جب وہ اپنے کمرے میں صوفے پر گر پڑنے کے انداز سے بیٹھ گیا تو اُس کے ذہن اور اعصاب کے لیے شازی آسیب بن گئی۔

"بتا دوں اُسے؟" — وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا اور اُس کے ذہن میں بھنور اُٹھنے لگے۔ آئی میٹر شخصیت کا آدھی جذبات کے بھنور میں ایسا بے بس ہو گیا کہ وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ وہ صرف سوچ نہیں رہا بلکہ بول رہا ہے۔

"کسے کچھ بتانا چاہتے ہو ملک جی؟" — ملک ناصر کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

رجب علی ہنس پڑا۔ اس غیر ارادی ہنسی نے اُسے سنبھال لیا۔ وہ پولیس کے دھندے جانتا تھا۔ زبان کے کرتب دکھا سکتا تھا۔

"اپنی بیوی کی سوچ رہا ہوں یار!" — رجب علی نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "بھلی عورت ہے۔ سوچا کہ اُسے بتا دوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اُسے فون پر اصغر کے متعلق بتا رہا ہوں کہ وہ اپنی رجمنٹ میں ہے اور خیریت سے ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اصغر کی خاطر اسلام آباد میں رُکا ہوا ہوں۔ مجھے یہاں نہ جانے کتنے دن رکنا پڑے۔"

"اُسے نہ بتاؤ۔" — ملک ناصر نے کہا۔ "اگر چاہو تو میں تمہیں لاہور کا کال سے دیتا ہوں، لیکن میرے ساتھ رہو تو زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کی کمانڈو اپریشن پاکستان کی ائی کمانڈ اور حکومت کی توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ہے اور یہ اپریشن وقت سے پہلے کامیاب ہو گیا ہے۔ اب اگر پاکستان نے وہ کارروائی جو کمانڈو اپریشن کے بعد کی جاتی ہے صحیح جنگی طریقے سے کی تو سمجھو کشمیر گیا پاکستان کی جھولی میں.... سچ پوچھو تو کشمیر بھارت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ پاکستان نے تو ہمیں بھارت کی دفاعی قلعہ بندیوں پر گولا باری شروع کر دی ہے۔"

"کیا انڈیا جوابی کارروائی نہیں کرے گا؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

"ضرور کرے گا۔" — ملک ناصر نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ بھارتی اس انتظار میں ہیں کہ پاک لور آزاد کشمیر فوج چھمب سیکٹر یا کسی بھی سیکٹر میں داخل ہوں تو جوابی حملہ کیا جائے۔ میری اطلاع کے مطابق پاکستان اور آزاد کشمیر کی مشترکہ فوج چند دنوں میں مقبوضہ کشمیر پر حملہ کرے گی۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کھلی جنگ شروع ہونے والی ہے۔ اس صورت میں میرے سپرد دو بڑے اہم مشن ہیں۔ ان کے لیے تو مجھے تمہاری ضرورت شاید پڑے کیونکہ تم اس لائن میں انا ڑی ہو۔ راولپنڈی میں تمہارے کرنے کے کام سوچو، میں تمہیں راہنمائی کی بھی ضرورت ہو گی جو تمہیں میں دیتا رہوں گا۔"

"تم بہتر سمجھتے ہو۔" — رجب علی نے کہا۔ "مجھے جیسے کہو گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

"جو مال میرے یہاں رکھا ہوا ہے وہ لاہور میں نہیں۔" — ملک ناصر نے شیطانی مسکراہٹ سے اور آنکھ

مار کر کہا۔ "شازی نام کی ایک لڑکی سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے۔ کہو، کیا چیز ہے۔ ابھی کچی ہے۔ اپنے کام کی سمجھتی ہے لیکن اس میں ابھی غلط قسم کے جذبات موجود ہے۔ ہمارے ساتھ ہندو لڑکیاں بھی ہیں لیکن جو بات شازی میں ہے وہ کسی اور لڑکی میں نہیں۔"

ملک رجب علی کے دل میں خنجر سا اُتر گیا۔ اُسے ملک ناصر پر غصہ نہ آیا۔ ملک ناصر کو تو معلوم نہیں تھا کہ شازی رجب علی کی بیٹی ہے۔ رجب علی کو اتنا دکھ ہوا کہ اُس نے چاہا کہ ملک ناصر کرسی سے اُٹھ جائے اور وہ دروازہ بند کر کے روتے اور چیخ چیخ کر روتے۔ ملک ناصر نے شازی کے متعلق جو بات شروع کی تھی وہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔

"کہاں گم ہو گئے ہو ملک؟" — ملک ناصر نے اُسے ہلا کر پوچھا۔

ملک رجب علی نے مسکرا کر کہا کہ وہ لاہور اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ملک ناصر کچھ نہ کچھ بول رہا تھا اور رجب علی اس سوچ میں گم ہو گیا کہ شازی کو ہدی کے اس جال سے کیسے نکالے۔ اُسے یہ سوچ بھی آئی کہ ملک ناصر نے اگر شازی کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت کی تو وہ ملک ناصر کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

◇

کیپٹن اصغر ابھی سی۔ ایم۔ ایچ میں تھا۔ اُس کا زخم بڑی اچھی رفتار سے ٹھیک ہو رہا تھا۔ ابھی اُسے کچھ دن اور ہسپتال میں رہنا تھا۔ ملک رجب علی اُس کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ اُس نے ابھی تک سلمٰی کو نہیں بتایا کہ اصغر زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہے۔

"ہسپتال سے فارغ ہوں تو میں خود ہی اُن کے ساتھ ٹیلیفون پر بات کروں گا۔" — اصغر نے کہا۔ "میں ڈاکٹروں کے پیچھے پڑا ہوا ہوں کہ مجھے جلدی فارغ کریں۔"

"ہسپتال کے پاس جلدی پہنچنا چاہیے۔"

"نہیں ابا جان!" — کیپٹن اصغر نے کہا۔ "مجھے اپنی بٹالین میں جلدی پہنچنا چاہیے۔ میرے ساتھی تین افسر چار کمانڈو ٹریننگ کر چکے ہیں لیکن میں پہلے ہی سخت زخمی ہو کر یہاں آن گرا۔ وہ اور کمانڈو آفیسر زخمی ہو کر آئے ہیں۔ وہ اپنے مشن کی باتیں سناتے ہیں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"یہی وجہ ہے کہ تمہارا زخم جلدی ٹھیک نہیں ہو رہا۔" — ملک رجب علی نے کہا۔ "خون کو ٹھنڈا رکھو، تمہیں جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔ دونوں ملکوں میں کھلی جنگ ہو گی۔"

"ہم اس امتحان میں پورے اتریں گے۔" — اصغر نے کہا۔ "میں اپنے ساتھی افسروں اور جوانوں کو دیکھ چکا ہوں۔ کھلی جنگ میں ہمیں ساری دنیا دیکھے گی۔"

"میں جو خطرہ محسوس کر رہا ہوں وہ بھارتی انٹیلی جنس اور سیکرٹ سروس کا ہے۔" — رجب علی نے کہا۔ "میں نے دیکھا ہے کہ بھارتی جاسوس ہمارے حکومتی اور فوجی حلقوں میں دور دور تک پہنچ گئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ آدھی جنگ انٹیلی جنس جیتا کرتی ہے۔"

"اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ کا دوست ملک ناصر انڈیا کا ایجنٹ ہے تو فوراً یا بذریعہ انٹیلی جنس کو بتا دیں۔" — کیپٹن اصغر نے کہا۔ "آپ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کسی مصلحت کے پیشِ نظر اپنی انٹیلی جنس کو نہیں بتانا چاہتے تو میں بتا دیتا ہوں۔"

"ابھی چپ رہو۔" — رجب علی نے کہا۔ "میں پورا گرد و پیش دیکھ لوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ملک ناصر مجھ سے

iqbalmt@onenaqab.com Scanned with CamScanner

ابھی بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ اُسے چھپا نا چاہیئے ورنہ وہ اَندھی ہے۔ میں پردوں کے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔ میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن جلد بازی کر جائے"۔۔۔ اصغر نے کہا۔

"میں دشمن کو اس محاذ پر کامیاب نہیں ہونے دوں گا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "اگر مجھے رپورٹ کرنی ہوتی تو سرکاری حلقوں میں کئی بڑے افسروں تک میں پہنچ سکتا ہوں لیکن اصغر بیٹا! کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انڈیا کے ایجنٹ کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ انہیں یہاں کتنا تعاون حاصل ہے۔ کم از کم اس ملک بدر کے گروہ کو میں خود پکڑوں گا اور ایسے وقت پکڑوں گا جب ان کے بچ نکلنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہوں گے۔"

"میں جانتا ہوں آپ پولیس کے ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکے ہیں"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "لیکن جاسوس کو پکڑنا ایک مختلف کام ہے۔ یہ کام اپنی انٹیلی جنس کے حوالے کریں۔"

"مجھے بھی کچھ کرنا ہے اصغر!"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "مجھے ایک گناہ کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ملک اور اپنے مذہب کے لیے کچھ کروں۔"

"ابا جان!"۔۔۔ اصغر نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "اب آپ آگے کو کیوں نہیں چلتے؟ پیچھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ بھول جائیں اس ماضی کو جو آپ کے آج کے لیے آسیب بنا ہوا ہے۔ بعض اوقات ماضی آسیب بن کر حال پر حاوی ہو جاتے ہیں۔"

ملک رجب علی ایسی ہنسی ہنس پڑا جیسے وہ ہنسا نہ ہو بلکہ اُس نے کچھ کہا ہو۔ اس نے اصغر کے جوال چہرے کو نظر بھر کے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں داد و تحسین کا رنگ تھا۔

"میں اس دن کے انتظار میں تھا جب تم اس طرح عقل کی باتیں کرنے لگو گے۔ کیسی اب کی ہیں؟" رجب علی نے کہا۔۔۔ "اب میں تمہیں اپنا بیٹا نہیں دوست کہوں گا۔ تم اب مردوں کی طرح بات کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو گئے ہو لیکن تم ابھی کسی گنہگار کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اُس گنہگار کے جذبات کو تو تم بالکل ہی نہیں سمجھ سکتے جس نے توبہ کر لی ہو لیکن کوئی ایک گناہ اُس کے اعصاب کا آسیب بن گیا ہو۔"

"میرے ابا جان آپ کے ہاتھوں مرے تھے"۔۔۔ کیپٹن اصغر نے کہا۔۔۔ "یہ آپ کی غلطی نہیں کی بات نہیں تھی۔ آپ نے سرحدوں سے اشتعلی دے کر اپنا استقبال تباہ کر دیا ہے۔ آپ آئی جی نہ بنتے تو ڈی آئی جی کے عہدے تک ضرور پہنچتے۔۔۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ آپ سے گلہ کروں۔ میری امی نے آپ کو دل سے چاہا ہے۔ پھر آپ۔۔۔؟"

"تم دونوں مجھے طعنے دیتے، میرے سر پر تھوکتے۔ مجھ سے نفرت کرتے تو میری جذباتی کیفیت یہ نہ ہوتی جو آج ہے"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "تم نے خون معاف کر کے اور مجھے محبت دے کے مجھ پر یہ فرض عائد کر دیا ہے کہ میں گناہ کا کفارہ ادا کر کے محبت کی قیمت ادا کروں۔ میری ساری جائیداد کی مالک تمہاری ماں ہے۔ وارث تم ہو لیکن یہ اقدام مجھے تسکین نہیں دے سکا۔"

"میں نے اتنی جائیداد کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "میرے اور اپنے درمیان اس طرح کی لکیر نہ کھینچیں کہ ہمیں آپ کو دیا ہوا قرض واپس لینا ہے۔ اب پاکستان اور بھارت کے درمیان جو لکیر ہے اس کی بات کریں۔ یہ لکیر خطرے میں آ گئی ہے۔ اگر آپ کا بس چلتا ہے تو میرے ڈاکٹر سے کہیں

کہ مجھے ہسپتال سے چھٹی دے دے۔ میں چل پھر سکتا ہوں۔ بھاگ دوڑ سکتا ہوں۔ ہر لحاظ سے فٹ ہوں۔"

"ڈاکٹر بہتر سمجھتے ہیں بیٹا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "ڈاکٹروں کو فیصلہ کرنے دو۔۔۔ شمیم آئی ہے؟"

"وہ کالج میں حاضری لگوا کر میرے پاس آ جاتی ہے"۔۔۔ اصغر نے کہا۔۔۔ "وہ تو بہت ہی جذباتی ہے۔"

"اپنے باپ کے متعلق کیا کہتی ہے؟"

"وہ تو یوں سمجھیں کہ باپ کی جانی دشمن ہو گئی ہے"۔۔۔ اصغر نے جواب دیا۔۔۔ "کہتی ہے میرے ابو کو گرفتار کراؤ۔"

"پھر بھی محتاط رہنا"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔۔۔ "یہ تمہاری محبت کا اثر ہے۔ باپ آخر باپ ہے۔"

○

اِدھر انسانوں کے جذبات نقطۂ عروج پر پہنچ رہے تھے۔ اُدھر دونوں ملکوں کی عداوت بھی عروج پر پہنچ رہی تھی۔ یہ عداوت دراصل دو ملکوں کی نہیں دو مذہبوں کی اور دو نظریات کی ایسی عداوت تھی جسے دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ ملک ناصر نے ٹھیک کہا تھا کہ متبادلہ کشمیر بھارت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور حقیقت بھی ہماری تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھی جاتے گی کہ پاکستانی توپ خانے نے بھارت کے چھ بگیڈ کی فلک بوس ہوائی تباہ کر دی تھیں۔ بھارت کے اُس وقت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے یہ جو کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اقوام متحدہ کے میدان میں شکست کرائے گا اُس کے لیے ایک ایسا مذاق بن گیا تھا جس سے وہ چھپتا پھرتا تھا۔ پاکستان کی فوج کی کمانڈ نے بھارت کی فوجی کمانڈ کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

بھارتی فوجی کمانڈ میں کھلبلی مچ گئی تھی اور واویلا بپا تھا لیکن اناڑی وہ بھی نہیں تھے۔ وہ پہلے ہی کچھ پتے کھیل چکے تھے۔ بھارت پر حملہ کیا جائے گا۔ ان کے پاس پلان مرجود تھا۔ پاکستان نے اگر بھارت کی گردن اتنی میں لی تھی تو بھارت نے پاکستان کے پیٹ میں گھونسہ مار کر اپنی گردن چھڑانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔

بھارت نے جوان کے محاذ پر اپنی فوجوں کی نقل و حرکت شروع کر دی اور پاکستان پر حملے کے مقامات پر فوجوں کو پہنچا دیا۔ بھارت کا مشہور آرمرڈ ڈویژن جو ہمیشہ چھامب میں رہتا تھا سیالکوٹ کے قریب پہنچ گیا۔

پاکستان تاریخ کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اب پاکستانیوں کے پاس یہی ایک راستہ رہنا چاہیئے تھا۔ "فتح یا موت"۔۔۔ بھارت بہت بڑا ملک ہے۔ بھارتی بہت دور پیچھے تک ہٹ سکتے ہیں۔ پاکستانیوں کے لیے پیچھے ہٹنے کو ایک انچ بھی جگہ نہیں۔ اب پاکستان کو اپنے پلان پر قائم رہنا ہی تھا، ورنہ دوسری صورت یہ قبول کرنی تھی کہ پاکستان نقشے سے ہٹ گیا ہے۔

حالات جتنی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے ملک ناصر گھر سے اتنا ہی غائب رہنے لگا تھا۔ ملک رجب صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ملک ناصر اپنی سرگرمیاں اُس سے چھپا رہا ہے اور وہ کچھ پریشان بھی ہو رہا تھا کہ وہ ملک ناصر کی سرگرمیوں سے باخبر کس طرح ہو گا۔ وہ اس شش و پنج میں گھرا بیٹھا تھا کہ شازی آ گئی۔ وہ کچھ پریشان سی تھی۔ ملک رجب علی جذبات سے ایسا مغلوب ہوا کہ اُس نے شازی کو گلے لگا لیا۔ یہ ایک باپ کے جذبات کا اظہار تھا لیکن شازی رجب علی کو ایک مرد سمجھتی تھی۔۔۔ ایک بڑا ہی پیارا مرد۔ جسے دل کے دکھ دکھائے جا سکتے تھے اور جو محبت کے قابل تھا۔۔۔ محبت عمر کا فرق مٹا دیا کرتی ہے۔ وہ تو خون کی کشش تھی جسے شازی کوئی اور ہی محبت سمجھ بیٹھی۔ وہ تڑپ کر رجب علی کے بازوؤں سے نکل آئی۔

iqbalmt@onemum.com scanned by

"کیا آپ کو مجھ سے دلی محبت ہے؟" — شازی نے جذباتیت سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا — "یا کیا آپ میرے ساتھ کھیل رہے ہیں؟ میری زندگی یہی ہے نا کہ اپنے جذبات کو اس لیے قربان کر دوں کہ میری ماں پرورش کر سکے اور جن کے ہاتھ میں ایک ملک کے راز ہیں وہ پرورش کر سکیں۔"

"مجھے تم سے وہ محبت ہے شازی! جو شاید ہی کبھی کسی نے کسی کے ساتھ کی ہوگی۔" — ملک رجب علی نے کہا — "اور یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیسے ہیں؟"

"یہ آنسو اس لیے ہیں کہ میں آپ کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھی ہوں اور آپ معلوم نہیں کیا ہیں۔" — شازی نے کہا — "کبھی تو میں بھی ایک دھوکہ سی محسوس کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے دھوکہ دیا تو وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہوگا۔"

"کیا تم مجھے ایک فریب سمجھتی ہو؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

"آپ بال بال فریب ہیں۔" — شازی نے کہا — "جو شخص اپنا ایمان بیچ کر اپنی قوم کو دھوکہ دے سکتا ہے وہ فریب نہیں تو اور کیا ہے۔ میں خود بھی تو ایک فریب ہوں ملک صاحب! مگر آپ میں اور مجھ میں ایک فرق یہ ہے کہ آپ اُس عمر کو پہنچ گئے ہیں جہاں انسان اپنے جذبات کو مار سکتا ہے اور میں اس عمر میں ہوں جہاں [illegible] انسان کو مار دیا کرتے ہیں۔ میں مر گئی تھی لیکن معلوم نہیں مجھے کیا ہوا کہ آپ کو دیکھ کر میرے جذبات [illegible]"

ملک رجب علی پریشان ہو گیا۔ شازی جیسی حسین لڑکی کو سنبھالنا اُس کے لیے کوئی مشکل نہ تھا، مشکل یہ پیش آ گئی تھی کہ بار بار اُس کے ہونٹوں پر یہ آ جاتی تھی۔ — "شازی تم میری بیٹی ہو۔ تم میری بیٹی ہو۔" — وہ اپنی بیٹی کو اپنے سینے میں چھپا لینے کو بیتاب ہونے لگا۔ اُس کے دو بچے پیدا ہوتے ہی [illegible] مر گئے تھے۔ یہ ایک خلش تھی جو اُسے کبھی کبھی بے چین کر دیا کرتی تھی لیکن وہ جاسوسوں کی اس دنیا میں [illegible] جہاں جذبات کا کوئی محل نہیں ہوتا۔ اُس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ابھی شازی کو نہیں بتائے گا کہ وہ کیا شے ہے جو اُسے گھسیٹ کر لے آئی ہے۔

"شازی!" — رجب علی نے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا — "تم دل کی بات صاف الفاظ میں کیوں نہیں کہہ دیتیں تمہیں دھوکہ دے کر مجھے عبارت سے کوئی انعام نہیں ملے گا۔ مجھے ہر لحاظ سے اپنا سمجھ کر دل کی بات کہو۔"

"میں سمجھ نہیں سکتی کہ آپ کی غیرت کو کس طرح بیدار کروں۔" — شازی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — "میں اگر آپ سے کہوں کہ مجھے پناہ میں لے لیں، اس غلاظت سے مجھے نکال لیں تو مجھے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ میں ایک مسلمان کی بیٹی ہوں۔ اب کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں جس قوم کی بیٹی ہوں میں اُسی کو ڈس رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں آپ مجھ پر ہنسیں گے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب پورے گروہ میں سے ایک جاسوس غداری کرتا ہے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ مجھے آپ گولی ماریں گے یا میں اپنے آپ کو خود ہی ختم کر لوں۔"

ملک رجب علی پولیس کے اس اصول سے واقف تھا کہ ہر کسی کو شک کی نگاہوں سے دیکھو۔ جاسوسی تو ایسا کام ہے کہ کسی پر یقین اور اعتبار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اُسے خیال آیا کہ شازی سے یہ ایگزیمنگ کروا کر ملک ناصر اُس کا امتحان ہی تو نہیں لے رہا؟ لڑکی تو حسین تھی لیکن وہ لڑکی کی ماں کو جانتا تھا۔ اس ماں نے لڑکی کو غیبتاً بتایا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آیا کہ اس عمر کی لڑکی کیا اتنی خوبی سے ایگزیمنگ کر سکتی ہے کہ وہ دیوار

آنسو بہانے شروع کر دے؟ اس شک کی بنا پر ملک رجب علی نے پولیس کا طریقہ کار استعمال کیا اور لڑکی کو تپہ چلے بغیر اُس کے دل کی باتیں اگلوانے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ لڑکی پگھلتی جا رہی ہے اور اُس کے سلب کی باتیں اُگلنے لگی ہے۔

"ماں نے مجھے کہا ہے کہ تیار ہو جاؤ۔" — شازی نے کہا — "کہتی تھی کہ پاکستان کے دو بہت بڑے افسروں کو ہاتھ میں لینا ہے۔ میرے ساتھ دو ہندو لڑکیاں بھی ہوں گی جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ ماں سے کیا کام لینا ہے۔۔۔ میں نے یہ کام پہلے بھی کیا ہے لیکن اب میرا دل ساتھ نہیں دیتا۔ میں نے پہلے کبھی ادھر دھیان نہیں دیا تھا۔ چند دنوں سے میری کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ صبح بہت سویرے میری آنکھ کھل جاتی ہے اذان کی آواز سنتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں خدا کو دھوکہ دے رہی ہوں۔ یہ آواز مجھے بڑی متنفس اور بڑی پیاری لگتی ہے۔ چند دنوں کی بات ہے، میں باہر اکیلی گھوم پھر رہی تھی۔ میں نے ایک نوجوان لڑکی دیکھی جس نے شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اُس کے ہاتھوں پر مہندی بھی تک تر و تازہ تھی۔ اُس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے جا رہے تھے۔ میرے دل میں کانٹا سا چبھا کہ میں کبھی نہیں بن سکوں گی۔ کوئی ایسا مرد نہیں ہوگا جسے میں اپنا بنا سکوں گی۔ جب سے آپ سے ملی ہوں میں محسوس کرنے لگی ہوں کہ آپ میرا ہاتھ تھام سکیں گے۔"

"کیا تم مجھے بھی اس کام سے ہٹانا چاہتی ہو؟" — ملک رجب علی نے پوچھا۔

"نہیں۔" — شازی نے کہا — "میں آپ کو کیسے روک سکتی ہوں۔ مجھے کیا حق ہے کہ میں کسی کو روکوں۔ میں صرف یہ کہنے لگی ہوں کہ آپ مجھے اس کام سے ہٹا کر مجھے پناہ میں لے سکتے ہیں۔"

"کیا تم نے کبھی ملک ناصر سے ایسی بات کی ہے؟"

"نہیں۔" — شازی نے کہا — "وہ ایک پتھر ہے۔ وہ جسموں کا سوداگر ہے۔ اُسے اپنی بیٹی کا پتہ نہیں کہ وہ کہاں [illegible] ہے۔ کیا کرتی ہے۔ مجھے وہ جن نظروں سے دیکھتا ہے ان نظروں میں پیار نہیں ایک حیوان نظر آتا ہے۔ اگر میں اس سے بات کروں گی تو وہ مجھے وہی سزا دلائے گا جو ایک غدار جاسوس کو دی جاتی ہے۔"

"تو نہیں یہ کس طرح پتہ چلا ہے کہ میں فرشتہ ہوں؟" — رجب علی نے کہا — "میں بھی تو اسی جیسا ایک مرد ہوں۔"

"نہیں۔" — شازی نے کہا — "میں آپ کو اُس جیسا نہیں سمجھتی۔ میں خکر پڑیاں کی تنہائی میں آپ کے بہت قریب بیٹھی رہی لیکن آپ نے اُس قسم کی کوئی حرکت یا بات نہیں کی جس سے پتہ چلتا کہ آپ بھی ملک ناصر جیسے ہیں۔ میں سمجھ نہیں سکتی کہ میں نے ایسا کیوں محسوس کیا ہے۔" — شازی نے بیتاب ہو کر رجب علی کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا — "ملک صاحب! مجھے کہیں کہ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے یا دروازہ بند کر دیں اور مجھے اُن عورتوں جیسی ایک عورت سمجھیں جو معلوم نہیں کتنی آپ کی زندگی میں آئیں گی اور چلی جائیں گی۔"

ملک رجب علی نے سوچا کہ یہ ایگزیمنگ نہیں ہو سکتی۔ اس عمر میں لڑکی اتنی چالاک نہیں ہو سکتی۔

"دیکھو شازی!" — رجب علی نے اُسے بڑی سنجیدگی سے کہا — "میں اس گروہ سے نکل نہیں سکتا۔ کوئی ایسا ارادہ ہے لیکن تمہیں اس سے بچا سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیا کام ہے جو تم سے لیا جائے گا؟ کہاں میں تمہاری جگہ کسی اور کو بھیج دوں؟"

iqbalmt@onedrive.com scanned by iqbalmt

"اگر میں جاپ کو بتا دوں تو کیا آپ اپنے وعدے پر قائم رہیں گے جی"۔۔۔ شازی نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ آپ مجھے چوری چھپے ٹوبہ اپنے گھر بھیج دیں؟"

"نہیں بچہ! یہ میرا کام ہے"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔ "تم مجھے وہ کام بتاؤ جو تم سے لیا جائے گا"۔

"میں آپ کو بتا دوں گی"۔

شازی جب چلی گئی تو روکنے کے باوجود رجب علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے بہت خوشی ہوئی کہ شازی میں غیرت موجود ہے اور وہ وہی کچھ سوچ رہی ہے جو رجب علی نے خود سوچا تھا۔

◇

"ابی جان! میں آپ کو کہہ چکی ہوں کہ میں کام میں میرا دل ساتھ نہیں دے رہا وہ میں کیسے کر سکوں گی"۔۔۔ شازی اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

"شازی بیٹی! ایسی باتیں نہ کرو"۔۔۔ آسیہ نے اُسے کہا۔ "ہم یہ کام نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے ہم ماں بیٹی اب اس جال سے نکل نہیں سکتیں۔ ہم مجبور ہیں۔۔۔ اور پھر یہ مجبوری ایسی ہے جس میں ہمارا کام کا صلہ کوئی ادا نہ کیا جائے گا۔ جو صلہ ہمیں ملے گا ذرا اُسے تصور میں لاؤ۔ دنیا کی ہر نعمت شازی بیٹی ایک کوٹھی ہماری منتظر ہے۔ آمدنی اتنی جیسے ہم شہزادیاں ہوں۔ پھر تمہاری شادی ہوگی میں تمہارے لیے تم جیسا خوبصورت دولہا لاؤں گی۔۔۔ یہ کام ہم نے ہمیشہ کے لیے تھوڑے ہی کرنا ہے۔ دو تین مشنوں کی جنگ بدر تھوڑے ہی ہو گی"۔

"لیکن وہ کام کیا ہے"۔۔۔ شازی نے پوچھا۔ "کیا یہ کوئی بہت اہم کام ہے؟"

"ہاں بہت اہم"۔۔۔ آسیہ نے کہا۔ "پاکستان نے سری اور اسلام آباد کی پہاڑیوں میں کہیں ایٹمی فضا نصب کیا ہے جو بڑی وسیع فضا کو اور بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ یہ کہیں چل رہا کوہ ریڈار ہے کہاں! اس ریڈار کو راستے سے ہٹانا ہے۔ سنا ہے کہ ایئر فورس یہ کام نہیں کر سکے گی کیونکہ ارد گرد کی پہاڑیوں پر طیارہ شکن گنیں موجود ہیں جو فضا سے نظر نہیں آ سکتیں۔ ہمیں یہ پتہ چل گیا ہے کہ یہ اطلاع ہمیں کہاں سے مل سکتی ہے۔ دو آفیسر ہیں۔ اُن تک رسائی ہو چکی ہے۔ انہیں اغوا کرنا ہے۔ تم جانتی ہو یہ کیسے کیا جاتا ہے۔ تمہارے ساتھ وہی دو ہندو لڑکیاں ہوں گی جو یہاں مسلمان ناموں سے جانی پہچانی جاتی ہیں تم انہیں جانتی ہو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں"۔

شازی کو یہی معلوم کرنا تھا کہ مشن کیا ہے۔ وہ اُسے پتہ چل گیا۔ اُس نے اپنا ردِ عمل فوراً بدل لیا اور ماں سے کہا کہ میں جاؤں گی اور یہ کام کروں گی۔

◇

دوسرے دن رجب علی آسیہ کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ آسیہ نے شازی کو کہیں بھیج دیا تھا۔ رجب علی نے آسیہ سے پوچھا کہ اُس نے اُسے کیوں بلایا ہے۔

"بہت ہی ضروری بات کرنے کے لیے میں نے تمہیں بلایا ہے"۔۔۔ آسیہ نے کہا۔۔۔ "میں تم سے توقع رکھوں گی کہ یہ بات اپنے آپ تک رکھنا۔ اس میں میرا نہیں تمہاری اپنی بیٹی کا منفعہ نقصان ہے۔۔۔ کیا تم نے شازی کو بتا دیا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے؟"

"نہیں"۔۔۔ رجب علی نے کہا۔ "میری اُس سے ملاقات ہوئی ہی نہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکی کا ذہن بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے"۔۔۔ آسیہ نے کہا۔ "اس نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ اب اُس نے ایک نئے مشن سے بالکل ہی انکار کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔ شادی پر تمہارا اثر معلوم ہوتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ آئندہ شازی سیکرٹ سروس کا کوئی کام نہیں کرے گی۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ تم نے اُسے ایک باپ کی حیثیت سے منع کر دیا ہے۔ میرے ساتھ وہ تمہاری باتیں یوں کرتی ہے جیسے اپنی کسی عزیز سہیلی کی بات کر رہی ہو"۔

"یہ تمہارا شک ہے کہ میں نے اُسے روکا ہے۔ میں چاہتا ضرور ہوں کہ وہ اس کام میں استعمال نہ ہو"۔

"اور تم جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا"۔۔۔ آسیہ نے کہا۔ "ملک ناصر نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ ہمارا گروہ کتنا اہم ہے۔ ہم اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ اسی سے اس گروہ کی اہمیت کا اندازہ کر لو۔ اس گروہ کے کسی فرد کی غداری اُسے سیدھا عدالت کے کٹہرے میں لے جائے گی۔ تم مرد ہو ملک! میں ہر جال جا لا کی کروں لیکن میں عورت ہوں۔ شازی نے مُنہ پھیر لیا تو یہ لوگ اُسے انڈیا لے جا کر جیل میں بٹھا دیں گے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا تو اسے جان سے مار کر لاش انڈیا کے کسی دریا میں بہا دیں گے"۔

ملک رجب علی نے یقین کر لیا کہ یہ لوگ اُس کا امتحان نہیں لے رہے۔ شازی واقعی اپنے اس مشن کے متعلق سنجیدہ اور پختہ ہے۔ وہ یہی سُننا چاہتا تھا۔ اُس نے آسیہ کو تسلی دی کہ وہ شازی کو اس لائن سے نکلنے نہیں دے گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اُسے اپنا رشتہ بھی نہیں بتائے گا۔

"ملک! میں نے جذبات سے دل دہلا دینے والی آواز میں کہا۔ "میری زندگی یوں سمجھو کہ ختم ہو چکی ہے۔ مجھے اس بیٹی کا غم کھائے جا رہا ہے۔ میں نے جو زندگی گزاری ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ یہی لائن مجھے اچھی لگی۔ اسی پر بیٹی کو ڈال دیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کا یہی مستقبل بہتر رہے گا۔ تم خود اسی لائن کے آدمی ہو۔ اگر بیٹی تمہارے حوالے کر دوں تو بھی خطرہ ہے۔ نہ جانے تم کب بگڑے جاؤ پھر میری بیٹی کا کیا بنے گا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی جہاں یہ کم از کم مجرم تو نہیں ہو گی"۔

ملک رجب علی اُس کی ہاں میں ہاں ملا کر وہاں سے نکل آیا۔

◇

ملک رجب علی ملک ناصر کی کوٹھی میں پہنچا تو نوکر نے اُسے ایک ٹیلی فون نمبر دیا کہ یہاں سے کسی خاتون کا فون آیا تھا۔ رجب علی نے اسی وقت وہ نمبر ملایا۔ پتہ چلا کہ شازی نے کہیں سے فون کیا تھا۔ شازی نے اُسے اتنا ہی کہا کہ ساڑھے سات بجے وہیں آ جانا۔

ساڑھے سات بجے رجب علی اور شازی ایک بار پھر لشکر پہاڑیوں کی سرسبز بلندی پر بیٹھے تھے اور شازی اُسے بتا چکی تھی کہ وہ مشن کیا ہے جس کے لیے اُسے استعمال کیا جا رہا ہے۔

"اب بتائیں میں کیا کروں"۔۔۔ شازی نے پوچھا۔۔۔ "میں نے ماں سے بھی کہہ دیا تھا کہ میں نہیں جاؤں گی لیکن اس نے مجھے اتنا ڈرایا ہے کہ میں اکیلی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں"۔

ملک رجب علی گہری سوچ میں کھو گیا۔

"ملک صاحب!"۔۔۔ شازی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ چُپ کیوں ہو گئے ہیں؟ آپ کی مردانگی کہاں چلی گئی ہے؟"

iqbalmt@yahoo.com Scanned by CamScanner

ملک رجب علی اُسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اُسے اب یقین ہو چکا تھا کہ اُس کا امتحان نہیں لیا جا رہا اور شازی کوئی دھوکا یا فریب نہیں دے رہی۔ اب اُسے شاید شادی کے بارے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا لیکن شازی فوراً جواب مانگ رہی تھی۔

"ملک صاحب! آپ کہاں کھو گئے ہیں" — شازی نے غصیلی اور روتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "اگر میری جگہ آپ کی بیٹی ہوتی تو آپ کیا کرتے؟ کیا اُس وقت بھی آپ کی غیرت اسی طرح سو جاتی؟"

رجب علی اِس طرح چونکا جیسے گھاس کے کسی کیڑے نے اُسے کاٹ لیا ہو۔ اُس نے شازی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"مجھے اپنی بیٹی تو نہیں بنا سکتے آپ" — شازیہ نے کہا۔ "میں اِس حق سے محروم ہو چکی ہوں۔ مجھے آپ اپنی بیوی تو بنا سکتے ہیں۔ میں آپ کی بیوی بن جاتی ہوں۔ شرط یہ ہے کہ مجھے یہاں سے نکال لے جائیں۔"

رجب علی ہم کی طرح چیخا — "شازیہ! کیا کہو اُس کرتی ہو۔ بیٹی بیوی نہیں بن سکتی۔ میں بیٹی کو کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

"کیا آپ مجھے اپنی بیٹی بنا لیں گے؟" — شازی نے پوچھا۔ "کیا میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھوں؟"

رجب علی آخر انسان تھا پتھر تو نہیں تھا۔ جذبات نے اُس کے ضمیر کو اور اُس کی روح کو کچل کر رکھ دیا۔ وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بات جو وہ خود نہیں کہنا چاہتا تھا کسی قوت نے کہلوا دی۔

"شازی! تم ہو ہی میری بیٹی" — رجب علی نے کہا۔ اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

شازی نے دونوں ہاتھ اُس کے کندھے پر پھیرے تو اُس کے ہاتھوں سے رجب علی کے چہرے پر نمی محسوس کی۔

"آپ رو رہے ہیں؟" — شازی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا — "مجھے بھی سمجھائیں۔"

ملک رجب علی نے اُسے پوری تفصیل سے سمجھا دیا۔ اس دوران شازی کا سر آہستہ آہستہ اُس کی گردن کے گرد لپٹتے گئے اور اُس کے گال رجب علی کے گال کے ساتھ جا لگے۔

"تمہاری ماں بے قصور ہے شازی" — رجب علی نے کہا۔ "وہ ایک فریب کا شکار ہوئی تھی اور وہ بڑا ظالم فریب بنی تم یہ نہ سوچنا کہ تم ایک گناہ کی پیداوار ہو۔ ماں سے نفرت مت کرنا۔ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو کر سکتی ہو۔ میں پالی ہوں۔"

"مجھے کسی سے نفرت نہیں" — شازی نے سسکیوں کے درمیان کہا — "مجھے اس کام سے نفرت ہے جس میں میری ماں نے مجھے ڈال دیا ہے۔ مجھے اس سے بچائیں۔ آپ میرے باپ ہیں۔ اپنی بیٹی کو پناہ میں لے لیں۔"

ملک رجب علی اُسے پناہ میں لینے کا فیصلہ تو کر ہی چکا تھا لیکن اُس نے اپنے لیے یہ دشواری پیدا کر لی تھی کہ وہ بھائی جنسل جنس کے اس پورے گروہ کو پکڑوانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ وہ شازی کو وہاں سے فوراً نہیں نکال سکتا تھا۔ اُس نے شازی کو یقین دلایا کہ وہ کچھ دن اور برداشت کرے۔ اُسے اس غلیظ کام سے نکال لیا جائے گا۔

"سُنا ہے آپ کا بیٹا کیپٹن ہے اور وہ ہسپتال میں پڑا ہے" — شازی نے کہا۔ "کیا میں اپنے بھائی کو دیکھ سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں!" — رجب علی نے کہا — "میں تمہیں کل وہاں لے چلوں گا لیکن اُسے یہ نہ بتانا کہ تم میری بیٹی ہو۔ میں کہوں گا کہ تم میرے ایک دوست کی بیٹی ہو اور تمہیں زخمی نوجوانوں کو دیکھنے کا شوق ہے۔۔۔۔ اور یاد رکھو بیٹی! اپنی ماں کو نہ بتانا کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ تم میری بیٹی ہو۔"

◇

دوسرے دن اصغر نے ملک رجب علی کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو دیکھا تو حیران ہوا کہ یہ کون ہے۔ رجب علی نے اُسے بتایا کہ یہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔

"کیا آپ کا بھائی آپریشن میں زخمی ہوئے تھے؟" — شازی نے اصغر سے پوچھا۔

"ہاں" — اصغر نے کہا — "اگر کمانڈو آپریشن کے زخمی دیکھنے کا شوق ہے تو ساتھ والے کمروں میں اور اِدھر ایک وارڈ میں جا کر دیکھو۔ ہم تو وہ خوش نصیب ہیں جنہیں ہمارے ساتھی اُٹھا لائے ہیں۔ اُنہیں تصور میں لاؤ جو زخمی ہو کر تڑپتے وہیں رہ گئے ہیں۔ تم سب جب گھری نیند سو رہے ہوتے تھے وہ تمہاری آبرو کی خاطر جانیں قربان کر رہے تھے۔"

اصغر اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا۔ باقی بات ملک رجب علی نے سُنائی کہ ان نوجوانوں نے کمانڈو آپریشن کس طرح کامیاب کیا ہے۔ شازی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ رو پڑے گی اور اصغر سے لپٹ جائے گی۔ اتنے میں نرس کمرے میں آئی۔

"سسٹر!" — اصغر نے شازی کی طرف اشارہ کر کے نرس سے کہا۔ "انہیں ذرا ساتھ والے کمروں اور وارڈ میں لے جاؤ۔ یہ زخمیوں کو دیکھنے آئی ہیں۔"

نرس اسے لے گئی اور کم و بیش نصف گھنٹے بعد واپس لائی۔ شازی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اُس کے سر سے بات نہیں ہو سکی۔ اُس نے آتے ہی کہا۔ "چلئے۔ مجھے گھر لے چلیں" — اُس نے اصغر کو دیکھا۔ اصغر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شازی اس مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکی۔ ملک رجب علی اصغر سے رخصت ہوا اور شازی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

"کیا دیکھا ہے کمروں میں اور وارڈ میں؟" — ملک رجب علی نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے شازی سے پوچھا

"کچھ کچھ گھبراہٹ سی لگتی ہے۔"

شازی کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کہا۔ "گھر نہ چلیں۔ کہیں اور لے چلیں۔ جنسل پارک۔۔۔۔ میں شہر کے شور و شر سے دُور نکل جانا چاہتی ہوں۔"

رجب علی اُسے شہر سے دُور جنسل پارک کے اُس حصے میں لے گیا جہاں درخت زیادہ اور لوگ کم ہوتے ہیں۔

◇

"اپنے بیٹے کو زخمی دیکھ کر بھی آپ اپنے اُس دشمن کے جاسوس بنے ہوئے ہیں جس نے آپ کے اتنے خوبصورت بیٹے کو زخمی کیا اور اس کے کئی ساتھیوں کو مار ڈالا ہے" — شازی نے کہا۔ "میں تو پہلے ہی اس ذلیل پیشے سے بھاگنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم نے دیکھا کیا ہے؟"

"میں نے اصغر جیسے نوجوان اور خوبصورت لفٹیننٹ اور کیپٹن دیکھے ہیں" — شازی نے کہا — "وارڈ میں

iqbalmt@gmail.com scanned by

ایک سے ایک جوان دیکھا ہے۔ ان میں دو دونوں آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے ہیں۔ ایک کرنل لفٹیننٹ کی ایک ٹانگ کولہے سے کٹ چکی ہے۔ ایک سپاہی کا دایاں ہاتھ کلائی سے غائب ہے۔ ماں کو حوالدار کو دیکھا جس کا چہرہ بھی پٹیوں میں لپٹا ہُوا ہے۔ کہتے ہیں جُھلس گیا ہے۔ بعض زخمیوں کے جسموں پر کئی کئی زخم ہیں۔ میں نے ان سب کو ہنستے اور مسکراتے دیکھا۔ ایک نے کہا۔ "یہی دیکھنا ہے تو دشمن کے سامنے دیکھنا۔ یہاں آپ کیا دیکھنے آئی ہیں! دعا کریں ہم جلدی ٹھیک ہو جائیں۔ ہم دیں جائیں گے جہاں سے زخمی ہو کر آئے ہیں۔"

"تم ڈر کیوں گئی ہو؟" — رجب علی نے پوچھا۔

"ڈری نہیں ابا جان!"

"نہ نہ نہ — ملک رجب علی نے کہا — "مجھے ابا جان کہنے کی عادت نہ ڈالو۔ ملک صاحب ہی کہتی رہو۔ یہ تو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم میری بیٹی ہو۔"

"میں ڈری نہیں" — شازی نے کہا — "ان زخمیوں کو دیکھ کر میرے اندر ایک بڑے ہی گھناؤنے جرم کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے انہیں میں نے زخمی کیا ہے اور جو وہیں رہ گئے ہیں ان کو میں نے قتل کیا ہے۔ میں ان کے دشمن کی جاسوس ہوں۔ جاسوس کا کام یہی ہوتا ہے کہ اپنی فوج کو ادھر کی ایسی معلومات دے کہ اپنی فوج اس ملک کی فوج کو تباہ کر دے۔۔۔۔ یہ تو ایسے لگتا ہے جیسے سب میرے بھائی ہوں۔۔۔۔ میں جاسوسی نہیں کر سکتی۔ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو ابھی جیسا ہوتا۔ میرا اگر کوئی خاوند ہوگا تو وہ بھی ابھی جیسا ہوگا۔ اگر میرے بیٹا ہوتا تو وہ بھی جوان ہو کر ابھی جیسا ہوگا۔"

"میں تم میں یہی احساس پیدا کرنا چاہتا تھا" — ملک رجب علی نے کہا۔

"آپ کا احساس کیوں مر گیا ہے ملک صاحب؟" — شازی نے کہا — "آپ اپنے بیٹے کے دشمن کیوں ہیں؟ کیا آپ اس کاروبار پیشے سے نکل نہیں سکتے؟"

ملک رجب علی سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکا۔ شازی نے اسے کندھے سے پکڑ کر بڑی زور سے جھنجھوڑا۔

"آپ چُپ کیوں ہیں ملک صاحب؟" — شازی نے ایسے لہجے میں کہا جو نارمل نہیں لگتا تھا۔ "بولیں — کیا آپ واقعی میرے باپ ہیں؟"

دل سے نکلی ہوئی بات اثر رکھتی ہے۔ کبھی راہ گھنٹوں کے حساب سے بولتا ہے تو سننے والوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا، کبھی کوئی آدمی راہ چلتے کوئی بات کہہ جاتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک کتاب کھول کر رکھ گیا ہو۔ شازی نے اُسے لیکچر نہ دیا، بڑی مختصر سی بات کہی لیکن اُس کے الفاظ سلگتے ہوئے انگاروں کی طرح رجب علی کے ضمیر پر جا پڑے۔

"میں واقعی تمہارا باپ ہوں شازی" — ملک رجب علی نے یوں کہا جیسے وہ کہنا نہ چاہتا ہو — "اور میں جاسوس نہیں ہوں۔"

"پھر ملک ناصر اور میری ماں کے ساتھ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"جاسوسی" — ملک رجب علی نے جواب دیا — "میں اُن کی جاسوسی کر رہا ہوں۔ میں انہیں پکڑواؤں گا اور تم میری مدد کر سکتی ہو۔ تمہارے بچ نکلنے کی یہی ایک صورت ہے کہ یہ پورے کا پورا گروہ پکڑا جائے، ورنہ یہ تمہیں

نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں میں پکڑوا سکتا ہوں لیکن تمہاری مدد کے بغیر یہ لیکن نہیں۔"

"مجھے بتائیں میں کیا مدد کر سکتی ہوں" — شازی نے کہا — "میں مدد کروں گی۔"

تم اپنی ماں کے کہنے کے مطابق اُن افسروں سے ملو جن سے ریڈیلر کے متعلق معلوم کرنا ہے" — رجب علی نے کہا — "اُن کے نام، عہدے اور عہدے معلوم کرو۔ اپنی ماں سے پوچھ کر اس کام میں اور کون کون شامل ہے۔ یہ بھی معلوم کرو کہ ریڈیلر کہاں ہے اور اسے کس طرح تباہ کیا جائے گا۔۔۔۔ یہ تمہارا آخری مشن ہوگا۔ احتیاط یہ کرنا کہ تمہاری ماں کو ذرا سا بھی شک نہ ہو کہ تمہاری نیت بدل گئی ہے۔"

"آپ شاید جانتے نہیں کہ یہ کام جو آپ نے مجھے بتایا ہے یہ کوئی مشکل کام نہیں" — شازی نے کہا اور لرزیدہ سے لہجے میں کہنے لگی — "مرد بڑی ہی گھٹیا چیز ہے۔ کوئی جیسی عورت کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اُس نے ملک رجب علی کو ترستی ہوئی اور پیاسی نگاہوں سے دیکھا اور التجا کی — "کیا میں کسی ایک آدمی کی بیوی بن سکوں گی؟ مجھے عمر قید کی سزا دے لیں۔ میں اپنی مدد آپ کریں گی۔ احترام کے لائق سمجھتی ہوں۔۔۔۔ باپ اور خاوند۔۔۔۔ باپ تو مل گیا ہے۔"

"خاوند بھی مل جائے گا" — رجب علی نے کہا — "بھائی بھی مل جائے گا۔۔۔۔ جو چاہو گی مل جائے گا۔"

◇

رجب علی اپنے آپ میں نہ رہا۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ وہ جُوا کھیل رہا ہے اور یہ کھیل ایسا ہے جو اُس نے پہلے کبھی نہیں کھیلا۔ وہ ہار جانے کے تصور سے پریشان ہو جاتا۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ شازی اُس کی اصلیت سے پردہ اُٹھا دے گی اور وہ اُسے قتل کرا کے لاش غائب کر دے گا۔

دونوں صورتوں میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی شخصیت کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ شازی کے عزم کی جو سختی اور پاکیزگی تھی وہ اُسے سہما دے رہی تھی۔ اسی کیفیت میں وہ کرنل سے ملنے گیا۔ کرنل اصغر اپنا نام بتاتے ہیں۔ رجب علی دوڑتا ہُوا باہر گیا۔ اصغر نے اُسے بتایا کہ ہسپتال سے اُسے چھٹی مل گئی ہے لیکن وہ ابھی نہیں جائے گا کیونکہ اُسے ہر روز مرہم پٹی کے لیے ہسپتال جانا پڑے گا۔ رجب علی نے اُسے کہا کہ تم اپنی ماں کو یہیں سے ٹیلیفون کرو اور اُسے بتاؤ کہ میں ذرا سا زخمی ہو گیا تھا اور اب ٹھیک ہوں۔

لاہور سلمٰی کی کوٹھی میں طاہرہ، ارشد، طاہر پرویز اور جمال بیگ آئے بیٹھے تھے۔ سلمٰی تنہائی اور اصغر کے لیے پریشان رہتی تھی، اس لیے طاہرہ اکثر اُس کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ اُس روز یہ سب ہی اُس کے پاس جا بیٹھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ سلمٰی نے دوڑ کر ریسیور اُٹھایا۔ اصغر کی آواز سُن کر وہ اُچھل پڑی۔ سب ہی ٹیلیفون کے گرد جمع ہو گئے۔

"اصغر کا فون تھا" — سلمٰی نے ریسیور رکھ کر خوشی اور رنج کے ملے جلے لہجے میں کہا — "وہ کچھ زخمی بھی ہے۔ کہتا ہے اب ٹھیک ہوں۔ مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہیے" — وہ چپ سی ہو گئی اور بولی — "لیکن میں تو کبھی گھر سے بھی نہیں نکلی۔ میں اکیلی کیسے جاؤں گی۔ راولپنڈی اسلام آباد تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے۔"

"میں آپ کے ساتھ چلا چلتا ہوں" — ارشد نے کہا — "لیکن چھٹی ملنی بڑی مشکل ہے۔"

"میں چلا جاؤں ابو!" — طاہر پرویز نے کہا۔

"نہ بیٹا!" — ارشد نے کہا — "یہ تمہارا کام نہیں۔"

scanned by iqbalmt@gmail.com

سب نے جمال بیگ کی طرف دیکھا۔

"ہاں! ہاں!" — جمال بیگ نے کہا — "مجھے ہی جانا چاہیے۔ چلو سلمٰی بیٹی! تیاری کرو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ کیا تمہیں اس گھر کا کوئی اتا پتا معلوم ہے؟"

"ہاں پتہ تو معلوم ہے مجھے" — سلمٰی نے کہا — "شاید اب گاڑی کا تو کوئی وقت نہیں ہوگا۔ بس پر جانا پڑے گا۔ ورنہ ملک صاحب سٹیشن پر اکیلے تھے۔"

◇

ماں بیٹے کی ملاقات بڑی ہی جذباتی تھی۔ ماں بیٹے کے زخم پُیاں کھول کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے بڑی مشکل سے قائل کیا گیا کہ زخم معمولی ہیں لیکن سلمٰی پر جذبات کا غلبہ بڑا ہی شدید تھا۔ اتنے میں شمیم آگئی۔ وہ بڑے تپاک سے سلمٰی سے ملی۔ جب شمیم کمرے سے نکل گئی تو رجب علی نے سلمٰی کو اپنے قریب کر لیا۔

"کیوں مری جا رہی ہو سلمٰی!" — رجب علی نے شگفتہ سے لہجے میں کہا — "دیکھو میں نے تمہارے لیے کتنی پیاری بہو تلاش کر لی ہے۔"

"کون سی بہو؟"

"یہ جو تم نے ابھی دیکھی ہے" — رجب علی نے کہا — "میں شمیم کی بات کر رہا ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد یہ بچی ہی تھی۔"

اسطرح کچھ دیر ٹھہر کر چلا گیا۔ سلمٰی کے چہرے پر رونق عود کر آئی۔ شمیم نے بڑے تپاک اور پیار سے سلمٰی اور جمال بیگ کے لیے الگ الگ کمرے صاف کروا دیئے اور انہیں دکھا دیئے اور ساتھ ہی انہیں کہا کہ آنی جلدی اب واپس جانے کی نہ سوچنا۔

اگلی صبح رجب علی کی آنکھ ابھی کھلی ہی تھی کہ جمال بیگ اُس کے پاس آ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب اور اضطراب کے آثار تھے۔

"کہئے رات کیسے گذری؟" — رجب علی نے اس سے پوچھا۔

"ہاں گذر ہی گئی ہے" — جمال بیگ نے کہا — "معلوم نہیں آپ مجھے اچھی جانتے ہیں یا نہیں۔ میں بھلی سا آدمی ہوں۔ زندگی کچھ ایسے ہی گذر گئی ہے۔ مجھ میں ایک بہت بڑی خامی ہے کہ آپ ذرا سا ناراض ہوتے دیکھیں گے تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ آپنے اُدھر کیوں دیکھا ہے۔ آپ پولیس والے بال کی کھال اتارا کرتے ہیں۔ یہی خرابی مجھ میں ہے۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" — رجب علی نے پوچھا — "کیا دیکھ لیا ہے آپ نے؟"

"بیلائی سا آدمی ہوں" — جمال بیگ نے کہا — "آدھی رات کے بعد آنکھ کھل گئی اور عادت کے مطابق میں باہر نکل گیا۔ اسلام آباد کی فضا بڑی پیاری لگی۔ چاندنی بڑی شفاف تھی۔ کوٹھی کا لان بہت خوبصورت لگا۔ لاہور بھی ایسے ہی کیا کرتا ہوں۔ آدھی رات کو ریڈیو کے کمرے جا ٹہلتا ہوں۔ طاہرہ بیٹی روکتی ہے۔ میں ہنس کے ٹال دیتا ہوں۔"

"آپ یہاں کی بات کریں نا" — رجب علی نے قدرے جھنجھلا کر پوچھا۔

"یہ کوٹھی کھل جیسی بڑی ہے" — جمال بیگ نے کہا — "میں اس آخری کونے والے کمرے کے قریب سے گذرا تو ایسے لگا جیسے ریڈیو پر کوئی ڈرامہ چل رہا ہو لیکن خیال آیا کہ رات کے ایک بجے کون سا ریڈیو چلتا ہے۔ کھڑکی

ذرا سی کھلی تھی۔ میرے کانوں میں آواز پڑی — "پاکستان کو آدھی شکست تو ہم دیں گے۔ باقی کا منڈلی ہی توقع ہے" — میں چونک کر رک گیا۔ پھر کسی کی آواز آئی۔ ریڈیو کے متعلق قوبات ہو چکی ہے۔ اسے کمانڈو ایکشن سے ہی تباہ کیا جائے گا۔ کوئی اور بولا — کل تک ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ریڈیو مری سے کتنا دور ہے اور کس جگہ ہے" —

"پھر ایک عورت کی آواز آئی کہ رات ہو چکی ہے اب چھٹی کرو۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔ میں دوڑ کر باڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ کمرے میں سے چار آدمی اور دو عورتیں نکلیں۔ باہر ایک لمبوتری کار کھڑی تھی۔ وہ سب اُس میں بیٹھے۔ ملک ناصر نے انہیں رخصت کیا۔ کار چلی گئی۔"

ملک رجب علی کو دھچکا سا لگا لیکن اُسے یہ خیال بھی آگیا کہ وہ جمال بیگ کو اعتماد میں لے رہا ہے۔ جمال بیگ نے اُسے کوئی انوکھی خبر نہیں سنائی تھی۔ وہ جانتا تھا یہ کیا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ جمال بیگ کو اعتماد میں لینا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اُس نے جمال بیگ کو ٹالنے کے لیے کچھ گول مول سی باتیں کیں۔

"ملک صاحب!" — جمال بیگ نے اُس کی کلائی کو اپنی مٹھی میں لے لیا اور کہا — "آپ جانتے ہیں یہ سب کیا ہے لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ جسے آپ ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اتنی جلدی ٹلنے والا انسان نہیں۔ میں نے اور بھی کئی باتیں سنی ہیں۔ مجھے کوئی یقین نہیں دلا سکتا کہ یہ لوگ پاکستان کے حق میں گپ شپ لگا رہے تھے۔"

"میاں جی" — رجب علی نے کہا — "کیا ہم اپنے میزبان سے یہ کہیں کہ تم انڈیا کے جاسوس ہو؟ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا۔"

"آپ میزبان کی بات کر رہے ہیں" — جمال بیگ نے کہا — "طاہرہ میری عزیز بیٹی ہے۔ میں کہتا ہوں طاہرہ کی زندگی ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ طاہرہ انڈیا کی جاسوس ہے تو میں اُس کی گردن کاٹ دوں گا اور پھر سیشن جا کر گولی مار کے ایک عورت کو قتل کر دیا ہے۔"

رجب علی پریشان ہو گیا کہ اس بوڑھے کو کیسے ٹالا جائے۔ اُس نے جمال بیگ سے تھوڑی سی گفتگو اور بھی کی۔

"ملک رجب علی!" — جمال بیگ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا — "میں تمہارے ماضی کے ایک ایک لمحے سے واقف ہوں۔ تم نے ایک آدمی کو قتل کر کے اُس کی بیوی سے شادی کر لی۔ تمہیں پتہ نہیں کہ میں بھی قاتل ہوں۔ میں پکڑا نہیں گیا۔ تب مجھے پاگل سمجھ سکتے ہو لیکن میری حقیقت یہ ہے کہ مجھے پکڑنے والا پولیس میں میری ذات میں موجود ہے۔ میں اُس لاہور خدا سے ڈرتا ہوں۔ اس سے ڈرتا بھی ہوں لیکن ملک! میری عقل میرے ہاتھ میں ہے۔ میں سمجھوں گا کہ اس شخص کو قتل ہونا چاہئے تو میں اُسے قتل کر کے رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھی ہو۔ اتنے دنوں سے یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ جواب دو ملک! مجھے جواب دو! ورنہ میں پولیس سٹیشن چلا جاؤں گا۔ میں یہاں سے ٹیلی فون کر کے پولیس کو بلا سکتا ہوں۔"

رجب علی کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ اُسے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ بوڑھا پتھر ہے جسے موم نہیں کیا جا سکتا۔ جمال بیگ نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اس راز سے پردہ اُٹھا دے۔ اس کی تجربہ کار نگاہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ بوڑھا گفتگو نہیں۔ آخر اُس نے جمال بیگ کو بتا دیا کہ وہ جاسوسوں کے ایک بڑے ہی خطرناک اور مضبوط گروہ کے درمیان بیٹھا ہے اور اس نے گروہ کو چھانسہ دے رہا ہے کہ وہ بھی ان کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ رجب علی نے جمال بیگ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

"آپ سلمٰی کو ساتھ لے کر لاہور چلے جائیں" — رجب علی نے کہا — "میں اس گروہ کو نپٹا کر آؤں گا۔ شاید خود پکڑوں۔ کیسے پکڑوں گا یہ ابھی بتا نہیں سکتا۔ معلوم نہیں ہلاکت کیا ہٹا کھا جائیں۔"

iqbalmt@onedu.com scanned by

"میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا" — جمال بیگ نے کہا — "مجھے بوڑھا نہ سمجھیں۔ مجھے کمزور نہ سمجھیں۔ میں نے ساری عمر عورت کے بغیر گزار دی ہے۔ میرے جسم کی طاقت محفوظ ہے۔ کبھی آپ کو بتاؤں گا میں کیا تھا اور کیا بنا اور اب کیا ہوں! میرے دامن پر ایک بے گناہ اور معصوم عورت کے خون کے داغ ہیں۔ ان داغوں کو میرا اپنا خون مٹا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو میرے خون کی ضرورت ہو۔ آپ کی ضرورت دراصل پاکستان کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی قربان گاہ پر خون کا نذرانہ دوں گا تو بڑے سکون سے جان دے دوں گا اور خدا کے حضور سرخرو ہو کر جاؤں گا۔"

"پھر آپ میرے ساتھ ہی رہیں" — رجب علی نے کہا — "مجھے کسی کے ساتھ کی ضرورت تو ہے لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ شاید میں آپ ہی کا اچھا ساتھی ثابت ہوں۔"

ایک گھنٹہ دس منٹ بعد رجب علی اور شازی پجیرو پر پہاڑیوں کی سرسبز بلندی پر بیٹھے تھے اور شازی اُسے بتا رہی تھی کہ یہ ریڈار مری سے کتنی دُور کس سمت اور کس مقام پر ہے۔ اُس کی اطلاع کے مطابق یہ ریڈار مری کے درختوں اور سبزہ زار میں اتنا ڈھکا چھپا تھا کہ نشاندہی کے باوجود انڈین ایئر فورس اسے تباہ نہیں کر سکتی۔ ریڈار کی حفاظت کے لیے قریبی پہاڑی کی چوٹی پر پاکستان ایئر فورس کے آبزرور ونگ کی ایک پوسٹ بنائی گئی تھی جس میں چھوٹی اور بڑی طیارہ شکن توپیں موجود تھیں۔

اِسی چوکی کو ریڈار پہلے ہی خبردار کر دیتا تھا کہ فلاں سمت سے دشمن کے طیارے آ رہے ہیں۔ ان طیارہ شکن گنوں کے علاوہ انتظام ایسا کیا گیا تھا کہ دشمن کے طیارے قریب آنے سے پہلے پشاور سے طیارے بُلائے جا سکتے تھے۔

شازی نے رجب علی کو بتایا کہ پاکستان میں اور جہاں کہیں بھی ریڈار تھے سب کی وہ تمام انڈین ایئر فورس کو معلوم ہیں۔ یہ واحد ریڈار ہے جو جموں اور سری نگر کے ہوائی اڈوں سے آنے والے طیاروں کا خطرہ کار کر سکتا ہے لیکن اسے طیاروں سے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔

شازی نے بتایا کہ انہیں کمانڈو قسم کی کارروائی سے تباہ کیا جائے گا۔ شازی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے تباہ کرنے والے بھارت سے آئیں گے یا یہاں موجود ہیں۔ پلان بنانے والوں نے کہا تھا کہ صرف دو گرنیڈ ٹھکانے پر پڑ گئے تو ریڈار بے کار ہو جائے گا۔

شازی نے بتایا کہ طے یہ ہوا ہے کہ جونہی پاکستان حملہ کرے یہ ریڈار تباہ کر دیا جائے۔ اب شازی نے ایک کاغذ رجب علی کو دیا جس پر اُس نے ریڈار کا مقام اور راستہ بنا رکھا تھا۔

"میں آپ کو ریڈار پر حملے کا وقت نہیں بتا سکوں گی" — شازی نے کہا — "دن بھی نہیں بتا سکوں گی۔ یہ یقین سے بتا سکتی ہوں کہ یہ پرلی ملک ناصر کی گاڑی میں جائے گی۔ وقت رات کا ہو گا۔ ملک ناصر خود ساتھ ہو گا لیکن ملک ناصر پیچھے سڑک پر رہے گا۔ ملک ناصر کی گاڑی اس لیے لے جائی جا رہی ہے کہ اس شخص کا پہنچنا دُور تک اثر رسوخ ہے۔ اس کی گاڑی کو کوئی بھی چیک کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ ملک ناصر پر نظر رکھیں اور پلان بنائیں کہ آپ انہیں کس طرح پکڑوا سکتے ہیں۔"

"شازی!" — ملک رجب علی نے اُس کے سر کو چوم کر کہا — "تم نے میری بیٹی کا نہیں، پاکستان کی بیٹی کا کردار ادا کیا ہے۔ اِس کا صلہ تمہیں میں نہیں دے سکتا۔ خدا دے گا۔"

"بچڑے جانے کی صورت میں تو میری ماں بھی پکڑی جائے گی" — شازی نے کہا — "کیا آپ اُسے بچا لیں گے؟"

"خود ہی سوچو شازی" — رجب علی نے کہا — "اگر یہ ماں تمہارے ساتھ رہی تو کیا تم اپنے آپ کو گناہوں سے بچا سکو گی؟ تمہاری ماں سراپا گناہ اور فریب ہے۔ اگر تم پاکیزہ زندگی چاہتی ہو تو تمہیں کچھ قربانی دینی ہو گی۔ اپنی ذات سے ماں کی ذات کو نوچ پھینکو۔ تم میری پناہ میں ہو۔"

"ہاں میں قربانی دینے کے لیے تیار ہوں" — شازی نے کہا۔

دوسرے دن ملک رجب علی کی کار مری کی طرف جا رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر اُس نے وہ کاغذ رکھا ہوا تھا جس پر شازی نے کچھ لکیریں ڈال دی تھیں۔ خاصی بلندی پر جا کر اُس نے کار روک لی اور اُس کی نظریں پہاڑیوں کے دامن سے چوٹی تک گھومنے لگیں۔ جیسے اُسے جو ہدایتیں نظر آ رہی تھیں وہ ویسی ہی تھیں جیسی شازی نے بتائی تھی۔ دُور ایک چوٹی پر اُسے ہلکی سی چمک نظر آئی۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہاں کچھ تھا۔ وہ ریڈار ہی ہو سکتا تھا۔

اُس سمت کی پہاڑی کی چوٹی پر اُس نے دیکھا۔ وہاں بھی اُسے کچھ آثار نظر آئے جیسے وہ پاکستان ایئر فورس کی آبزرور ونگ کی چوٹی ہو۔ اُسے یقین ہو گیا کہ شازی نے غلط نہیں بتایا۔ وہ اس سوچ میں کھو گیا کہ وقتِ ضرورت فوج کی مدد حاصل کرے یا وہ خود کچھ کر سکے گا۔

by iqbalmt@onenet.com.pk Scanned by

ملک رجب علی کو یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ شاذی نے اُسے جو علاقہ بتایا تھا وہاں کی دو چوٹیوں پر کچھ ہے لیکن اُسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہاں ریڈار اور آبزرویشن کی پوسٹ ہے۔ وہ آگے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سڑک پر ایسی جگہ کھڑا تھا جو خاصی بلندی تھی۔ نیچے وادی تھی۔ وہ سڑک سے نیچے نہیں اُتر سکتا تھا۔

وہ کار میں بیٹھا اور کار سٹارٹ کر کے اسلام آباد کی طرف موڑ دی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس ریڈار کو تباہ کار جاسوسوں سے بچانے کے لیے اُس نے کوئی سکیم نہیں بنائی۔ کوئی پلاننگ نہیں کی اور اُس کے ساتھ طاہرہ کے باپ جمال بیگ کے سوا کوئی بھی نہیں۔ جمال بیگ بوڑھا اور ناتجربہ کار تھا۔ وہ جذبات کی زبان میں بات کرتا تھا۔ وہ وہ کر دا نما اسی پر آ کر رُک جاتا تھا کہ وہ ملٹری انٹیلی جنس کو بتا دے۔

تھک ہار کر اُسے یہی ترکیب سوجھی تھی نفرت انگیز فرجن سرکاری لوگوں کا یہ کام ہے اُنہی کو بتا دے لیکن اُسے لاہور والی دو ہندو لڑکیاں رادھا اور کرن یاد آ گئیں جو بھال نسیر اور عقیلہ کے ناموں سے جاسوسی کرتی تھیں۔ انہیں وہ ذاتی طور پر جانتا تھا اور وہ اُن لوگوں کو بھی جانتا تھا جو دشمن کی ان دو بیٹیوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ وہ کوئی عام اور گمنام شہری نہیں بلکہ ایسے لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں ملک و ملت کی قسمت تھی اور جن کے سینوں میں ملک کے قیمتی راز تھے۔

اُس وقت ملک رجب علی ڈی۔ ایس۔ پی تھا اور اُسی سنسنی کا ایک کل پرزہ تھا اور رادھا اور کرن جیسی لڑکیاں اپنے ڈھب پر چلاتی تھیں، اس لیے اُس نے محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ اور اُس کے ماتحت اور افسر کیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اب جب کہ اُس کی ذات میں انقلاب آ گیا تھا اور اُس نے اپنے آپ کو اپنے ضمیر کے حوالے کر دیا تھا اور اُس کی روح کو خدا نے اپنے نور سے منور کر دیا تھا اُسے بڑی شدت سے محسوس ہونے لگا تھا کہ اُس نے عبدالجلیل کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ وہ پوری قوم کو قتل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ یہ احساس بڑا ہی تلخ اور اذیت ناک تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ انتہائی اہم افسر اور وزیر دولت، عورت اور شراب کی بدولت دشمن کے ہاتھ میں کھیلتے ہیں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ملک ناصر کے گروہ اور اس کے عزائم کی نشاندہی کرے تو وہ پیٹھ بٹورا کوئی ایک افسر یا وزیر اس گروہ پر پردہ ڈال دے اور گروہ اپنے کام میں لگا رہے۔

یہ اُس کا وہم تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس پر کسی دشمن کا طلسم طاری نہیں تھا۔ وہ اپنے اُن فوجی بھائیوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے تھے جو سیز فائر لائن کشمیر میں جانیں اور خون قربان کر رہے تھے۔ ملک رجب علی کا مسئلہ نفسیاتی تھا جاسوسی کا مسئلہ تھا لیکن اس سے واقف نہیں تھا۔ یہ ایک احساس تھا جو کانٹے کی طرح اُس کے دل میں اُتر گیا تھا۔ یہ ضمیر کا ردِعمل تھا۔ اُس نے ایک ایسے آدمی کو قتل کیا تھا جو محبِ وطن پاکستانی تھا۔ وہ پاکستان کے دشمن کے پاکستانی دوستوں کا دوست رہا اور پولیس میں اپنے عہدے کو اُن کی نشاندہی کے مطابق استعمال کرتا رہا تھا۔ وہ اب اپنے ہاتھوں اُس دشمن کے دل میں خنجر اُتارا ہوا پاتا تھا۔ وہ بے چین اور بے قرار رہتا تھا۔ اُسے نجات کی یہی صورت نظر آئی تھی کہ دشمن کو اپنے ہاتھوں ختم کرے یا خود ختم ہو جائے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جس میں انسان لاشعوری طور پر اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا ہے یا کوئی کارنامہ کر کے اپنے آپ کو معاف کرنے

کا جواز پیدا کرنے کی یا ہیرو بننے کی کوشش کرتا ہے۔

انسان کتنا ہی دانشمند، کتنا ہی عالم کیوں نہ ہو وہ اپنی نفسیات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ ملک رجب علی کا دماغ اوسط درجہ انسان کے دماغ سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔ اُس نے پولیس کی نوکری کی تھی۔ وہ اوسط درجہ آدمی کی نسبت زیادہ بہتر سوچ سکتا تھا لیکن ہر انسان کی طرح وہ بھی ذہن لاشعور کا قیدی تھا۔ اس حد تک مجبور اور بے بس کہ اُسے یہ خیال آتا ہی نہیں تھا کہ وہ اکیلا جاسوسوں اور تخریب کاروں کے گروہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔

●

وہ جب ملک ناصر کی کوٹھی میں داخل ہوا ملک ناصر برآمدے میں کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔ رجب علی کار سے نکلا تو ملک ناصر نے اس کی طرف دیکھا لیکن ملک ناصر کی مسکراہٹ غائب تھی جو رجب علی کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر آ جایا کرتی تھی۔

"پاکستان نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے"۔۔۔ ملک ناصر نے آگے بڑھ کر رجب علی سے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجوں نے کشمیر کے مقبوضہ سیکٹر پر حملہ کر دیا ہے"۔۔۔ ملک ناصر نے کہا۔۔۔ "ابھی ابھی ریڈیو سے خبر سُنی ہے"۔

ملک ناصر رجب علی کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اُدھر سے سلمٰی دوڑی آئی۔ اُس نے بھی رجب علی کو وہی خبر سنائی جو ملک ناصر سے سن چکا تھا۔ سلمٰی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"چائے"۔۔۔ ملک ناصر نے سلمٰی کو وہاں سے اُٹھانے کے لیے کہا۔۔۔ "آپ جائیں کھانا تو لگوا دیں۔ نوکر بڑے پریشان ہیں"۔

"بھارت کا مسئلہ حل ہو گیا ہے"۔۔۔ ملک ناصر نے رجب علی سے کہا۔۔۔ "پاکستان اب دو دن کا مہمان ہے۔ جنگی سازوسامان کے لحاظ سے بھارت پاکستان کے لیے دیو ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا کہ پاک فوج اور ایئر فورس نے سرحد پر کہیں بھی چھیڑ خانی کی بھارت پاکستان پر حملہ کر دے گا اور اپنی پوری جنگی طاقت سے حملہ کرے گا"۔

"تقریباً کتنے ڈویژن ہوں گے؟"

"بیس سے کم نہیں ہوں گے"۔۔۔ ملک ناصر نے جواب دیا۔۔۔ "پاکستان کو دو دنوں میں مکمل کر رکھ دینے کے لیے بھارت کا آرمرڈ ڈویژن ہی کافی ہے۔ پاکستان کے پاس ہے کیا؟ پانچ ڈویژن بھی پورے نہیں۔ پاکستان کی ایئر فورس میں کیا ہے؟۔۔۔ پرانے زمانے کے سپیئر طیارے۔ کیا یہ طیارے سے اٹین ایئر فورس کے جدید اور تیز رفتار طیاروں کا مقابلہ کر سکیں گے؟"

"پھر ہمارا کام تو آسان ہو جائے گا"۔۔۔ ملک رجب علی نے کہا۔۔۔ "بھارت پاکستان پر کب حملہ کرے گا؟"

"بہت جلد"۔۔۔ ملک ناصر نے جواب دیا۔۔۔ "اب کسی بھی صبح تم خبر سنو گے کہ لاہور پر بھارت کی فوج قابض ہو گئی ہے۔۔۔ ہمارا کام آسان نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا کام کرنا ہے"۔

ملک رجب علی اُس کی زبان سے سننا چاہتا تھا کہ ایک ریڈار کو تباہ کرنا ہے لیکن ملک ناصر کی زبان سے ایسی کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔

iqbalmt@onelibrary.com scanned by

"اگر سوتا آزما کا کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔" رجب علی نے کہا۔

ملک ناصر نے اُسے چونک کر دیکھا لیکن مُسکرایا۔ بولا کچھ بھی نہیں۔ وہ جاسوسی کے میدان کا شاہسوار تھا کچا نہیں تھا کہ ایک نئے آدمی کو اتنا نازک رازدے دیتا۔

"سوتا آزما کام نہیں؟" — ملک ناصر نے کہا۔

"ناصر! مجھے کچھ بتاؤ۔" رجب علی نے ایسے جوشیلے لہجے میں کہا جیسے وہ انتقام لینا چاہتا ہو — "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ پراعتبار نہیں کرتے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میرے دل میں پاکستان کی محبت ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان نے مجھے کیا دیا ہے؟ میں آج آئی جی نہیں تو ڈی آئی جی ضرور ہوتا لیکن مجھے استعفیٰ دینا پڑا۔ جو بھی سیاسی پارٹی اقتدار میں آئی اُس نے میرے ہاتھوں اپنے مخالفین کو کسی جرم کے بغیر گرفتار کرایا۔ میں نے انہیں جواز نہیں دیں ان سے بعض مرتبہ گئے۔ میرا ضمیر برداشت نہ کر سکا — چاپلوسی، خوشامد، جھوٹ..... اس کے باوجود اوپر والوں نے مجھے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ مجھے مجبور ہو کر استعفیٰ دینا پڑا۔ میرے انتقام کا وقت آگیا ہے ناصر! مجھے کچھ بتاؤ۔ پاکستان کی کوئی نازک رگ مجھے دکھا دو، پھر دیکھنا میں اس ملک کا کیا حشر کرتا ہوں۔ مجھے کوئی معاوضہ نہیں چاہیئے۔ میں انعام نہیں مانگتا۔"

ملک رجب علی کا یہ داؤ بھی نہ چل سکا۔ اُسے توقع تھی کہ اس قسم کی جوشیلی اور جذباتی باتوں سے ملک ناصر کے ہونٹوں کی مہر ٹوٹے گی لیکن ملک ناصر رجب علی کی توقع سے کہیں زیادہ محتاط اور محفوظ ثابت ہوا۔ وہ بول مسکراتا رہا جیسے رجب علی کی ہنسی اڑا رہا ہو۔

"دیکھو ملک!" — ملک ناصر نے کہا — "تم اس لان میں ابھی بچے ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ بھیم پر عہد ہے۔ میں نہیں ایک آدمی کے ساتھ لگا دوں گا۔ جنگ کی صورت میں راولپنڈی سے ایبٹ آباد تک ریل پٹڑی اور روڈ جنگی سامان کی ریل گاڑیاں چلیں گی۔ ان گاڑیوں کو راستے میں تباہ کرانا ہوگا۔ وہ آدمی ٹیلی فونک رپورٹنگ دے گا یا ریل روڈ سے شیشن سے مال گاڑیوں کی روانگی کا وقت معلوم کر کے بھارت کی ایئر فورس کو ٹیلی فونک ایئر لیس اطلاعیں دیتی ہوں گی۔ وہاں سے طیارے آئیں گے اور گاڑی کو راستے میں تباہ کر دیں گے۔"

"میں یہ کام کر سکوں گا" — رجب علی نے کہا۔

"تمہارے کرنے کا ایک کام اور ہے" — ملک ناصر نے کہا — "یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے پاس فوج بھارت کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ پاکستان کے لوگ قومی وطنی اور حریت کے جذبے سے پھٹے جا رہے ہیں۔"

"یہ تو زن کچھ کی لڑائی میں پتہ چل گیا تھا" — ملک رجب علی نے کہا — "ہم اس قوم کو مرا ہوا سمجھتے تھے مگر زن کچھ میں دونوں ملکوں کی فوجوں کا تصادم ہوا تو پتہ چلا کہ پاکستانی قوم مری نہیں ہوئی بلکہ ضرورت سے زیادہ زندہ و بیدار ہے۔"

"یہ ایک خطرہ ہے" — ملک ناصر نے کہا — "اگر ایئر فورس لاہور میں داخل ہو گئی تو لاہور کا ہر ایک مکان قلعہ بن جائے گا۔ بچہ بچہ لڑے گا اور ایئر فورس کو لاہور میں پیر نہیں ٹیکنے دے گا۔ ایئر فورس کے پاس اسلحہ ایکسپلوژن تو بہت ہے لیکن سولز ایل نہیں۔ ایئر فورس صرف وہاں کامیاب ہو سکتی ہے جہاں اُسے راستہ بڑا صاف مل جائے اور کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اگر پاک فوج تیزی سے ہٹ آئی تو شہری آگے

پیلے جائیں گے لیکن ہمارا مشاہدہ کچھ اور ہے۔ زن کچھ میں صرف ایک بریگیڈ نے بھارت کے ایک ڈویژن کو وہ مار دی تھی کہ شاستری کو ہاتھ کھڑے کرنے پڑے....

"مقبوضہ کشمیر میں پاکستان اور آزاد کشمیر کا کمانڈو اپریشن دیکھو۔ ان چند ایک انسانوں نے وہ تباہی مچائی ہے جیسے وہاں جن بھوت پھر گئے ہوں۔ ساری دنیا دنگ رہ گئی ہے۔ وہاں انڈین آرمی کی تعداد کم و بیش دو لاکھ ہے لیکن یہ تعداد بیکار ہو کے رہ گئی ہے.... کرنے والا کام یہ ہے کہ پاکستان کے لوگوں کا جذبہ ٹوٹنا ہے۔ یہ کام ہو رہا ہے۔ تم یہ کام کامیابی سے کر سکتے ہو۔ تمہیں جاننے والے لوگ تم سے خوفزدہ ہوں گے اور تمہاری ہر بات کو سچ مانیں گے کیونکہ تم ڈی۔ ایس۔ پی رہ چکے ہو اور سوسائٹی میں تمہارا مقام خاصا اونچا ہے۔ تم زبان کا جادو چلانا جانتے ہی ہو۔"

"تم مجھے فضہ کالم میں شامل کرنا چاہتے ہو" — رجب علی نے کہا — "یہ کوئی مشکل کام نہیں۔"

"کسی ہوٹل میں جا بیٹھو" — ملک ناصر نے کہا — "کسی محفل میں چلے جاؤ۔ کسی ایسے آدمی سے بات کرو جو بات آگے چلانے کا عادی ہو۔ ہر جگہ ایسی افواہیں پھیلاؤ جو قابلِ یقین ہوں۔ مثلاً اس پر دینا ہے کہ انڈین آرمی لاہور میں داخل ہو گئی ہے اور پاک فوج پسپا ہو رہی ہے۔"

"یعنی مجھے یہ مشہور کرنا ہے کہ ہماری فوج بھارتی فوج کے مقابلے میں ٹھہرنے کے قابل نہیں" — رجب علی نے کہا — "اور بھارت ایک دیو کی طرح چلا آ رہا ہے۔"

"تم اتنے ہوشیار ہو کہ بھارت اور پاکستان کے لوگ افواہ ساز اور افواہ پسند ہیں" — ملک ناصر نے کہا — "تم ایسی دلچسپی بات بتاؤ تو یہ چند ایک آدمیوں میں گھوم پھر کر ہنگڈون جاتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی گمراہی ہے جس سے تم فائدہ اٹھائیں گے۔ تم ایک چنگاری رکھ دو پھر دیکھنا کہ جنگل کو آگ کس طرح لگتی ہے.... میں تمہیں راستہ سمجھا دیتا ہوں۔"

ملک ناصر نے اُسے فضہ کالم کے کام اور طریقہ کار پر لیکچر دیا اور اُسے کہا کہ وہ اس کام کی ابتدا کرے۔ ملک رجب علی ریڈار کے متعلق کچھ سننے کو بیتاب تھا مگر ملک ناصر نے ایسی کوئی بات نہ کی۔

•

دو دسمبر ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن تھا۔

چھمب سیکٹر میں بھارتیوں نے جو دفاعی انتظامات کر رکھے تھے، اُن سے کوئی ٹینک ڈویژن ہی توڑ سکتا تھا۔ ایک تو قلعہ بند پہاڑیاں جن میں ملوکیاں، چک پنڈت، منساوز، جھنڈو، پھورا اور برسالہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اچھے خاصے مضبوط قلعے تھے۔ ان کے علاوہ کنکریٹ کے بنکر تھے جن میں بعض دو منزلہ تھے۔ انہیں توپوں اور ٹینکوں کے گولے بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ زمین کے نیچے بھی دفاعی انتظامات تھے۔ یہ گلیاں سی تھیں جو زیرِ زمین اِدھر اُدھر چلی جاتی تھیں۔ ضرورت کے مطابق جوان ایک بنکر سے دوسرے بنکر تک اور ایک مورچے سے زمین کے اندر ہی اندر دوسرے مورچے تک جا سکتے تھے۔

ایسے مضبوط اور بھارتیوں کے دعوے کے مطابق ناقابلِ تسخیر دفاع میں بھارت نے بے شمار فوج بھر رکھی تھی۔ توپ خانہ تھا اور ٹینک بھی تھے اس دفاع کو فضائی تحفظ دینے کے لیے جمّوں اور پٹھانکوٹ کے ہوائی اڈوں پر انڈین ایئر فورس کے لڑاکا بمبار طیارے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

iqbalmt@onemail.com
scanned by iqbalmt
خوبصورت لوگوں کی محفل

مقبوضہ کشمیر میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو جانبازوں نے وقت سے بہت پہلے کامیابی حاصل کر لی تھی جو معمولی نہیں تھی۔ تمام یونٹیں بارکوں اور کیمپوں میں قید ہو کے رہ گئی تھیں۔ چھاپہ ماروں نے جنگی اہمیت کے تمام پل تباہ کر دیئے تھے۔ سڑکیں فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے محفوظ نہیں رہی تھیں۔ بلندی کی کوئی پوسٹ سلامت نہیں رہی تھی۔

اگست اور ستمبر ۱۹۶۵ء کے دو مہینے پاکستان اور کشمیر کی تاریخ کا ایک درخشاں اور یادگار باب ہے۔ پاکستانیوں کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ کشمیر پاکستان کا مسئلہ ہے اور پاکستانیوں کو پہلی بار اپنے جذبے کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا تھا۔ بھارت نے جوابی وار یوں کیا کہ اگست کے وسط میں آزاد کشمیر کے علاقے بھارت گئی اور درّہ حاجی پیر ڈیٹونال سیکٹر) پر شدید گولا بندی شروع کر دی۔ ۲۵ اگست کے آخری بارہ گھنٹوں میں یہ گولا باری اتنی شدید تھی کہ بارہ گھنٹوں میں بھارتی توپ خانے نے ۱۰ ہزار گولے فائر کیے۔

۲۶ اگست ۱۹۶۵ء کو انڈین آرمی کے پورے بریگیڈ نے آزاد کشمیر کی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ ایک چوکی پر آزاد کشمیر فوج کی صرف ایک کمپنی تھی جس کی نفری صرف ایک سو تھی مورچہ بند تھی۔ ان ایک سو جوانوں نے ایک بھی گولی فائر نہ کی جب دشمن اتنے قریب آگیا کہ اس کی آنکھوں کی سفیدی صاف نظر آنے لگی تو مجاہدوں نے اس پر گرنیڈوں کا میزبر سا دیا۔ دشمن کئی لاشیں اور ہتھیار وغیرہ پھینک کر بھاگ گیا۔

۲۷ اگست کو بھارتیوں نے سکیم بدل کر رات ایک بجے حملہ کیا۔ اب کے وہ دائیں اور بائیں سے اوپر آئے۔ معرکہ خونریز تھا۔ اُدھر پورا بریگیڈ جسے ڈویژن کے توپ خانے کی گولہ باری حاصل تھی، اِدھر صرف ایک سو جوان جن میں دو کل کے حملے میں شہید اور پانچ شدید زخمی ہو چکے تھے۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ ۲۶ جوان شہید ہو گئے۔

درّہ حاجی پیر اور بے ڈوری کی چوکیوں پر انڈین آرمی نے ہر بریگیڈ کی نفری سے حملے کیے۔ اس کے ساتھ اس قدر گولا باری کی کہ آزاد کشمیر کے بیالیس بہادر جوان شہید ہوئے، زخمی ہوئے اور جو دو پسپا ہو گئے تھے وہ دو چار دن مقابلہ کر کے آخر پیچھے ہٹ آئے۔

بھارتیوں نے یہ تو زور سو چا کہ انہوں نے کتنی زیادہ قوت سے کتنی تھوڑی سی نفری کو شکست دی ہے اور یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ انہوں نے اس کو انتہا سمجھا اور نشے سے سرشار پاکستان کی سرحد کے اندر گولا باری شروع کر دی جس کا نشانہ ایک معصوم سے سرحدی گاؤں اعوان شریف ضلع گجرات کے بے ضرر دیہاتی بنے۔ ہندو نے مسلمان کی غیرت کو چیلنج کر دیا تھا۔

پاک فوج میدان میں آگئی چونکہ بھارتیوں کے حملے سیدھے پاکستان پر آتے نظر آ رہے تھے اس لیے پاک فوج کی فوج اور پنجاب رجمنٹیں چھمب کی طرف بھیج دی گئیں۔

یہ تھا وہ محاذ جسے بھارت کے اُس وقت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے اپنی مرضی کا محاذ کہا تھا اور جسے اُس نے اپنے فوجی لیڈروں کے کہنے کے مطابق پہاڑی ڈویژنوں کے لیے بہترین محاذ سمجھا تھا۔ بھارت کے فوجی لیڈر جانتے تھے کہ پاکستان کے پاس ایک بھی پہاڑی ڈویژن نہیں۔

۳۰ اگست ۱۹۶۵ء کو بھارتیوں نے پونچھ کی شمالی پہاڑیوں میں گولا باری شروع کر دی۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج کی رات اُن پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے اور پاکستانی ایئر اُن کی مرضی کے محاذ پر نہیں

بلکہ اپنی مرضی کے میدان میں لڑائیں گے۔ بھارتی یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ پونچھ کے شمالی علاقے پر قابض ہو کر باغ کی وادی پر قبضہ کر لیں گے جہاں سے وہ آزاد کشمیر کو آسانی سے قبضے میں لے لیں گے۔ پاک فوج کے دو بریگیڈ جن کے ساتھ ایک بریگیڈ آزاد کشمیر کا تھا، ۳۱/۳۰ اگست کی رات گجرات سے آگے نکل گئے تھے۔ پاکستانی توپ خانے نے گولا باری شروع کر دی تھی جس نے چھمب کے سیکٹر اور اردگرد کے مضبوط بنکروں اور ظلہ بندیوں کو ہلا ڈالا تھا۔ سحر کی تاریکی میں ہمارے تینوں بریگیڈ برق رفتار پیش قدمی کر گئے۔

●

یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو تاریخ پاکستان کے ایک درخشندہ باب کی سرخی لکھ دی گئی۔ چھمب کا سورج اُبھر رہا تھا۔ انڈین آرمی کے غرور اور بھارتی حکمرانوں کی نخوت اور رعونت کا سورج پاکستانی توپ خانے کی گولا بدی کے گرد و غبار، ٹینکوں اور پیادہ جوانوں کی یلغار کی گرد میں غروب ہو رہا تھا۔ دن کے ساڑھے دس بجے تک چھمب کی ظلہ بندیاں ـــــ ملوکیاں، چک پنڈت، منادر، جھنڈا، پھورا اور برسالہ ـــــ فائروں کے قدموں تلے روندی جا چکی تھیں۔ بور سے جال جو بھارتیوں کا مضبوط مورچہ بلکہ قلعہ تھا، خالی ہو رہا تھا کیونکہ بھارت کے دفاعی دستوں کے صحرا سے میں آجانے کا خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ بھارت کے فرانسیسی ٹینک ہمارے دستوں کو گھیرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے لیکن پاکستانیوں نے رُخ بدل کر دیا پر حملہ کر دیا اور تھوڑی سی دیر میں اس اہم اور مضبوط مقام پر بھی قبضہ کر لیا۔

ذرا بھارتی فوج کا حساب لگائیں جو تین بریگیڈوں کے آگے اپنے ٹینک، توپیں، مارٹر اور مشین گنیں، پٹرول اور ہر طرح کے ایمونیشن کے بکسوں اور لاشوں کے ڈھیر چھوڑتی بھاگی چلی جا رہی تھی ـــــ انڈین آرمی کا نمبر دس ڈویژن (ہیڈ کوارٹر ڈوڑیاں) ـــــ نمبر ایک سو اکانوے انڈین بریگیڈ گروپ (انڈین انفنٹری بریگیڈ ـــــ) جو جوڑیاں کی فضا میں مارسیس سیٹوں پر ایک واویلا سا مچا دیا۔ یہ انڈین آرمی کے ایک شکست خوردہ کمانڈر کی آواز تھی جو وہ اپنی ٹوٹی کمان کو دے رہا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ـــــ "وسکی بیچو..... وسکی بیچو....."

شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے ـــــ وسکی آگئی لیکن یہ بوتلوں کی شکل میں نہیں بلکہ جدید سپاٹر لڑاکا بمبار طیاروں کی شکل میں تھی۔ وسکی بھیجو کا مطلب یہ تھا کہ فضائی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ خفیہ الفاظ تھے جو بھارتی ہائی کمان نے سُنے اور چار جدید لڑاکا بمبار طیارے چھمب کی فضا میں بھیج دیئے۔ انہوں نے نہایت اطمینان سے پاک اور آزاد کشمیر ٹروپس پر آگ اگلنی شروع کر دی۔ ہمارے طیارہ شکن توپچیوں نے ان کا مقابلہ کیا مگر طیارے کا مقابلہ طیارہ ہی کر سکتا ہے۔

پاک فضائیہ کے دو شہباز گجرات پر اُڑ رہے تھے۔ انہیں ایک آواز سنائی دی ـــــ دشمن کے طیارے ہمارے مورچوں پر فائرنگ کر رہے ہیں ـــــ دونوں شہباز تاریخ پاکستان کا پہلا فضائی معرکہ لڑنے کے لیے چھمب کے آسمان میں پہنچ گئے۔ اب وہاں چار دیسپر ہی نہیں دو کھیزر طیارے بھی اُڑ رہے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دو سپیر طیارے چار دیسپاروں اور دو کھیزر جیسے برتر اور تیز تر طیاروں کا مقابلہ کر سکیں گے مگر شہبازوں نے جان کی بازی لگا دی۔ پاک فوج دیکھ رہی تھی۔ بھارت کی فوج دیکھ رہی تھی ـــــ خدا دیکھ رہا تھا ـــــ آسمان میں مشین گنوں کے دھماکے سنائی دینے لگے اور دیسپاروں یکے بعد دیگرے بم گرانے کی ڈرل چھٹنے لگے

iqbalmt@yahoo.com scanned by

چاروں دیباڑوں کے پرخچے چھمب کی فضا میں بکھر کر زمین پر اور دُور جا گرے۔ کمبنیز الطیار سے اپنے چند ساتھیوں کا حشر دیکھ کر کھسک گئے — وہ بھی کی بوٹل پھٹکا چور ہو گئی۔

بھارت کا فضائی قوت کا غرور بھی چکنا چور ہو گیا۔

●

رجب علی کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ پاک فوج کو چھمب کے محاذ پر کتنی کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اُس نے ریڈیو آن کیا اور آل انڈیا ریڈیو کی کاسٹیشن لگایا۔ چند منٹ بعد وہاں کوئی تبصرہ نشر ہونا شروع ہوا جو پاکستانی محلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس تبصرے نے اُسے مایوس کر دیا کیونکہ تبصرہ کر رہا تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجوں نے چھمب پر جو حملہ کیا تھا وہ پسپا کر دیا گیا ہے اور پاکستانی بہت سے ٹینک اور توپیں پیچھے چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔

وہ ملک ناصر کے کمرے میں گیا اور اُسے بتایا کہ پاک آرمی کی توڑی گمت بنی ہے۔ ملک ناصر نے قہقہہ لگایا۔

"دیکھو ملک جی" — ملک ناصر نے کہا — "آئندہ خیال رکھو کہ آل انڈیا ریڈیو شکست کو فتح کہا کرتا ہے۔ تم نے زن کچھ کے متعلق آل انڈیا ریڈیو کی خبریں شاید نہیں سنی تھیں۔ اُدھر انڈین آرمی کا پورا ڈویژن پاکستان کے ایک بریگیڈ کے گھیرے سے نکلنے کے لیے پسپا ہو رہا تھا لیکن آل انڈیا ریڈیو کہہ رہا تھا کہ پاکستان آرمی کا بریگیڈ بُری طرح بھاگ رہا ہے۔ تم سبھی خبریں مجھ سے سنا کرو۔ میرے پاس ایک ایسی سیکرٹ کی رپورٹ آتی ہے اسے کہتے ہیں کامیاب پروپیگنڈا۔ تم یہ فن آل انڈیا ریڈیو سے سیکھو۔ جسے پاکستانی جھوٹ کہتے ہیں وہ بھارت کا ایک ہتھیار ہے ....

"چھمب کی کیفیت یہ ہے کہ حملے سے پہلے پاک آرمی کا توپخانہ ہر رات چھمب کے قریب پہنچ جاتا تھا اور بے تحاشہ گولہ باری کر کے صبح طلوع ہونے سے پہلے وہاں سے غائب ہو جاتا تھا۔ اس طرح دشمن کا دفاع پہلے ہی کمزور ہو چکا تھا۔ وہاں جو کچھ رہ گیا ہے وہ پاکستانیوں کے قبضے میں ہے۔ بھارت کے ٹینک تیزی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں اور پاکستانی آگے بڑھ رہے ہیں۔ اسی کیفیت میں ہم پر بڑی زبردست فضائی حملے عائد ہوتی ہے .... تم جاؤ آرام کرو۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

ملک رجب علی جب اپنے کمرے میں آیا تو جمال بیگ اُس کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"کچھ پتہ چلا کہ یہ لوگ کیا کریں گے؟" — جمال بیگ نے رجب علی سے پوچھا اور کہنے لگا — "خدا نخواستہ کہیں پاکستان نے ایک دیو کو چھیڑ دیا ہے۔"

"اب اللہ مالک ہے جو ہو گا سو ہو گا" — رجب علی نے کہا۔

وہ دونوں بہت دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ رجب علی پر واضح ہو گیا کہ جمال بیگ عقل بھی رکھتا ہے اور جذبہ بھی اور شاید وہ اُس کا بڑا مفید سا ساتھی بن سکے گا۔ رجب علی نے جمال بیگ کو بتا دیا کہ وہ کہری کی پہاڑیوں میں گیا تھا اور یہ دیکھ آیا ہے کہ وہ ریڈار کہاں ہے جسے یہ لوگ تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

جمال بیگ نے اُسے کہا کہ وہ اُسے پوری تفصیل سے سمجھائے کہ یہ کیا سلسلہ ہے اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔ رجب علی نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا سوائے اس عزم کے کہ وہ اس گروہ کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ جمال بیگ کی نفسیاتی کیفیت بھی رجب علی سے ملتی جلتی تھی۔ اس لیے اُس نے ویسا ہی مشورہ دیا جو پہلے ہی رجب علی کے ذہن میں تھا۔

اُسی شام جب ملک ناصر کہیں باہر نکل گیا تھا تسلیم رجب علی کے کمرے میں آ گئی۔

"اب آپ کے امتحان کا وقت آ گیا ہے" — تسلیم نے بڑی سنجیدگی سے کہا — "میں دیکھ رہی ہوں کہ میرا باپ صبح سے بے چین اور پریشان ہے۔ اس وقت تک وہ دو جنوں کے حساب سے ٹیلیفون کر چکا ہے۔ اُس کے چند ایک ٹیلیفون تو میں نے سنے ہیں۔ پہلا جملہ یہ کہتا ہے — 'لگتا ہے کھل گئی ہے'۔۔۔ اپنی اپنی جگہ ہشیار رہنا' — اس کے بعد وہ ایسی باتیں کرتا ہے جیسے یہ شخص گانے بھینسوں کا کاروبار کرتا ہے۔۔۔۔ اصغر ٹھیک ہو گیا ہے۔ اُسے کہیں آگے نہ بھیج دیں۔"

"آگے بھیج دیا تو کیا ہو گا؟" — رجب علی نے ذرا سخت سی آواز میں کہا۔

تسلیم کا سر جھک گیا۔ رجب علی نے اُس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا سر اُوپر کیا۔ تسلیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تسلیم!" — رجب علی نے کہا — "اصغر کے پاؤں کی زنجیر بن جاؤ۔ زندہ قوموں کے بیٹے عشق و محبت کے لیے زندہ نہیں رہا کرتے۔ انہیں وطن کی قربان گاہ پر اپنی جان کا اور اپنے خون کا نذرانہ دینا ہوتا ہے۔"

"میں اپنے وطن کے لیے کیا قربانی دے سکتی ہوں؟" — تسلیم نے پوچھا۔

"تم اصغر کو قربان کر دو" — رجب علی نے کہا — "اگر تم اصغر کے راستے میں نہ آئیں تو یہ بھی تمہاری بہت بڑی قربانی ہو گی۔"

تسلیم کی نظریں جب علی کے چہرے پر جم گئیں اور اُس کی آنکھوں نے آنسو پی لیے۔

"آپ کو یہ قربانی نہیں دینی پڑے گی" — رجب علی نے کہا۔

تسلیم نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم یہاں سے یہاں کیوں رکا ہوا ہوں" — رجب علی نے کہا — "میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ جیت کس کی ہو گی اور کس کی ہار۔ اگر ہمارے ڈیڈی ہار گئے تو۔۔۔"

"تو میرا کیا ہو گا پھر کیا ہو گا" — تسلیم نے رجب علی کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "میں اب ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔۔۔ کیا آپ نے سلمیٰ باجی کو بتا دیا ہے کہ آپ یہاں کیوں رکے ہوئے ہیں؟"

"نہیں" — رجب علی نے کہا — "اُسے نہیں بتاؤں گا۔"

●

دو دن گزر گیا۔ ملک ناصر شام سے پہلے گھر سے نکل گیا۔ رجب علی اور جمال بیگ نے اُسے دیکھا اور جب اُس کی کار بڑی ہی تیزی سے کوٹھی سے نکل گئی تو رجب علی اور جمال بیگ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ملک ناصر کے جانے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے گیا ہے۔

"اس شخص سے آپ کوئی راز نہ سیکھ سکے؟" — جمال بیگ نے رجب علی سے پوچھا۔

"بیگ صاحب!" — رجب علی نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا — "کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ میری بعض حرکتیں ایسے لگتی ہیں جیسے میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہوں۔"

"اگر آپ اپنا دماغی توازن درست کرنے بیٹھ گئے تو آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے" — جمال بیگ نے کہا — "عزم اور جذبے والے پاگل ہی تاریخ بنوا کرتے ہیں۔"

سلمیٰ آ گئی اور دونوں خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد اصغر آ گیا۔ وہ جوش سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت میں باتیں کرتا تھا۔ سلمیٰ اُس کی باتیں لینے لگی۔ رجب علی کو موقع مل گیا۔ اُس نے سلمیٰ سے کہا — "اصغر سے کہا

iqbalmt@onenet.net.pk Scanned by iqbalmt

کر اُسے ایک دوست کے ہاں جانا ہے۔ اُس نے شمیم کی کار لی اور نکل گیا۔

جب وہ آسیہ کی کوٹھی میں داخل ہُوا تو کار کی آواز پر شازی دوڑتی باہر نکلی۔ رجب علی نے کار سے نکل کر اُس سے پوچھا کہ اُس کی ماں گھر ہے؟

"ملک ناصر آیا تھا" — شازی نے اُسے بتایا — "امّی کو ساتھ لے گیا ہے۔ آج سے ان لوگوں کی سرگرمیاں بڑی تیز ہو گئی ہیں۔ آپ اندر چلیں۔ آج خدا سے کچھ اور مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔ امّی مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہیں۔ میں کہتی تھی کہ آپ آجائیں یا آپ کا فون ہی آجائے۔"

"میں کہا ہی تھا، سے پاس ہوں" — رجب علی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے کہا — "آج مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی۔ ملک ناصر مجھے اندھیرے میں رکھ رہا ہے۔ مجھے ٹال رہا ہے۔"

"آپ پر ابھی کوئی بھی بھروسہ نہیں کرے گا" — شازی نے کہا — "انٹیلی جنس والے تو اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہیں کیا کرتے۔ آپ کو کچھ پتہ چلے گا تو مجھ سے، صرف مجھ سے۔"

"میں یہی بات کرنے آیا ہوں" — رجب علی نے کہا — "مجھے ریڈار کے متعلق ان لوگوں کے پروگرام کی تفصیل کب مل سکے گی؟"

"پرسوں صبح" — شازی نے کہا — "کل رات ہماری کوٹھی میں پارٹی ہو رہی ہے۔ ملک ناصر بھی ہوگا اور پاکستان کے وہ دو افسر بھی ہوں گے جو ریڈار کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ ریڈار تباہ کرنے میں مدد دیں گے۔ میں آپ کو ان کے نام بتا دوں گی۔"

•

اگلے چار دن تک شازی اُسے کچھ نہ بتا سکی سوائے اس کے کہ ریڈار کو اب کسی بھی روز تباہ کر دیا جائے گا اور اس پارٹی میں صرف چار آدمی ہوں گے۔

ان چار دنوں میں پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج کے تین بریگیڈ بھارت کی دفاعی لائن جیدیوں اور شکروں کو روندتے ہوئے آگے چلے گئے تھے۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ان کے راستے میں دریائے توی آ گیا۔ بھاگتے ہُوئے دشمن کے چند ایک ٹینک اور ٹرک دریا میں پڑے تھے۔ انہیں چلانے والے اسلحہ پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ بھاگتے ہُوئے دشمن نے دریا کے پار اپنا توپ خانہ پوزیشن میں کر کے دریا کے اِدھر والے کنارے پر شدید گولا باری شروع کر دی جیسے اُس نے پاکستان اور آزاد کشمیر کے مجاہدوں کے سامنے آگ کی دیوار کھڑی کر دی ہو۔

اس قدر شدید گولا باری میں زمین کا ایک انچ بھی محفوظ نہیں تھا اور اس سے آگے دریا دو ایسی رکاوٹیں تھیں جو کسی بھی جری اور کثیر تعداد فوج کو روک لیا کرتی ہیں اور حملے کے پلان دھرے رہ جاتے ہیں۔ ان دو رکاوٹوں کے ساتھ ایک رکاوٹ پاکستان کے اُس وقت کے حکمران نے کھڑی کر دی۔ وہ اس طرح کہ جو ڈویژن کا کمانڈر اتنے مضبوط دفاع کو اتنے کم عرصے میں توڑ کر خلاف توقع اتنی تیز پیش قدمی کر رہا تھا اُسے حکم ملا کہ وہ ڈویژن کی کمان چھوڑ دے، دوسرا جرنیل کمان لینے آ رہا ہے۔

ایسے وقت جب دشمن پسپا ہو رہا ہو اور اپنی پیشقدمی پلان کے مطابق ہو رہی ہو، کمان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی لیکن پاکستان کا بدقسمت آدم نرالا تھا۔ ایک خود ساختہ فیلڈ مارشل پاکستان کا بدقسمت آدم بنا بیٹھا تھا جو ملک کا حکمران

بھی تھا اور افواج کی ہائی کمانڈ کو اُس نے اپنے پاؤں تلے رکھی ہُوئی تھا۔ اُس نے دیکھا کہ چھمب کے محاذ پر مطلوبہ کامیابی تقریباً حاصل کر لی گئی ہے تو اُس نے اس کا سہرا اپنے ایک خوشامدی جرنیل کے سر باندھنے کے لیے اُسے اس ڈویژن کی کمان لینے کے لیے بھیج دیا۔

پہلے جرنیل نے بہت واویلا مچایا کہ اس صورت حال میں جب دشمن پسپا ہو رہا ہے کمان میں تبدیلی نہ کی جائے کیونکہ تمام تر صورت حال کو وہی بہتر سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ کمان دینے اور لینے میں بڑا قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا مگر اس بادشاہ نے ویسے ہی احکام دیئے جیسے دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے اپنے جرنیلوں کو روس کے محاذ پر دیئے اور حکمت کھا کر اپنے ملک کو تباہ کرایا تھا۔

چھمب سیکٹر میں ڈویژن کمانڈ کی تاریخ لے اپنے آپ کو ہرایا۔ ڈویژن کی کمان لینے دینے میں تیرہ گھنٹے ضائع ہو گئے۔ ان تیرہ گھنٹوں میں دشمن نے پیچھے جا کر دفاعی مورچے مضبوط کر لیے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے افسر اور جوان مایوس ہو گئے۔ وہ دشمن کی گولہ باری میں ہی دریا پار کرنے کو بے تاب تھے۔ ان کی جیتابیوں میں انتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔ انتقام لینے کے لیے انہیں اٹھارہ سال انتظار کرنا پڑا تھا۔

ان ڈوگروں میں آزاد کشمیر کے وہ جوان بھی تھے جو ۱۹۴۷ء میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور مقبوضہ کشمیر سے اس حال میں بھاگ کر آئے تھے کہ ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ ان کے خاندانوں کے کئی کئی افراد کو ان کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔ ان کی بہنوں اور ماؤں کو ڈوگرے اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ ان میں کئی بچے تن تنہا، پاپیادہ، روتے بلبلاتے، پاؤں سوجے ہُوئے، بیم غشی کی حالت میں آزاد کشمیر اور پاکستان میں آئے تھے۔

پاک فوج میں بہت سے جوان ایسے تھے جنہوں نے بچپن میں مشرقی پنجاب میں اپنوں کو سکھوں کی کرپانوں سے کٹتے دیکھا تھا۔ جوان لڑکیوں کو بے آبرو اور اغوا ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ان بھیانک اور اعصابی یادوں کے ساتھ جوان ہوئے تھے۔ ان کے اندر انتقام کا لاوا ابل رہا تھا۔

آزاد کشمیر اور پاکستان کے ان جوانوں کو اپنے حکمرانوں کی پالیسیوں اور احکام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی وہ جانتے تھے کہ فوج سیاسی حکمرانوں کا ہتھیار ہوتی ہے۔ جب چاہا نیام سے نکال لیا، جب چاہا نیام میں ڈال لیا۔ فوج سے توقع رکھی جاتی ہے کہ اپنا مورال بلند رکھے۔ افسروں اور جوانوں کے جذبات کا خواہ کیسا ہی حال ہو۔

یہ ڈوگرے جو دریائے توی کے کنارے ٹوٹ کے کھڑے تھے، وہ جنگی مبصروں اور فنِ حرب و ضرب کو سمجھنے والوں کی نگاہ میں نفری اور ہتھیاروں کے لحاظ سے اس قابل نہیں تھے کہ بھارت کے اتنے مضبوط مورچوں میں جدید اسلحہ سے لیس پوزیشن لیے ہُوئے ڈویژنوں کو یوں پسپا کر سکتے جس طرح بھارتی پسپا ہُوئے تھے۔ یہ اسلام کے ان متوالوں کا جذبہ تھا جس نے گوشت پوست کے ان انسانوں کو ٹینک بنا دیا تھا۔ مردانِ حُر مردانِ آہن بن گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو دھن کا اور اُن کے مذہب کا اور اُن کے ملک کا ایسا دشمن ہے جو ہمیشہ دشمن رہے گا اور وہ اسلام دشمنی کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔

یہ افسر اور جوان دریائے توی کے قریب اوپر والوں کو کوس رہے تھے جو دریا میں کود جانے کا حکم نہیں دے رہے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ اُن کی ہائی کمانڈ پر ایک آمر کا آسیب طاری ہے جس نے

iqbalmt@oneurdu.com scanned by

جنگی صورت حال کی۔ ڈویژن کمانڈر اور اُس کے ٹروپس کے جذبے اور بھڑکے ہوئے جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے کمان تبدیل کر دی ہے اور یہ ایسا احمقانہ فیصلہ ہے جو فتح کو شکست میں بدل سکتا ہے۔

●

پاک فوج کے توپ خانے نے اپنے فضائی دیدہ بانوں کے ذریعے دشمن کے توپ خانے کی پوزیشن معلوم کر لیں اور گولا باری شروع کر دی۔ شام ساڑھے پانچ بجے پاکستان کے ایک بریگیڈ کو دریا پار کرنے کا حکم ملا۔ ٹروپس اسی حکم کے منتظر تھے۔ حکم ملتے ہی وہ آگ کے دریا میں کود گئے اور شام ساڑھے سات بجے اپنے تینوں بریگیڈ دریا پار کر گئے۔

دشمن اور زیادہ بوکھلا گیا۔ ایک جگہ بھارتی توپ خانے کی اکتیس فیلڈ توپیں گولا باری کر رہی تھیں۔ پاکستانی توپ خانے کا ایک لیفٹیننٹ کرنل اتنا آگے آ گیا کہ اُسے دشمن کی ان توپوں کے قریب جا پہنچا۔ اُس نے وائرلیس پر اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دیا۔ اس پر گوروں کی بوچھاڑ سیدھی دشمن کی توپوں کے اوپر گری۔ بھارتی توپچی اکتیس اچھی بھلی توپیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پاکستانی لیفٹیننٹ کرنل نے اچھل کر نعرہ لگایا۔ وہ اپنی ہی بیٹری کے قریب تھا۔ اُدھر سے مشین گن فائر ہوئی جس کی گولیاں ہمارے لیفٹیننٹ کرنل کے ایک بازو کی ہڈی کو توڑتی ہوئی ایک ٹانگ کو چیرتی گزر گئیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا لیکن اپنے ٹروپس اتنی تیز پیش قدمی کر رہے تھے کہ بلڈ کی پہنچی گئے اور اپنے لیفٹیننٹ کرنل کو چھاتیوں میں سے اٹھا کر پیچھے بھیج دیا۔ وہ آج بھی زندہ ہے۔

۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھی پیشقدمی کی رفتار میں فرق نہ آنے دیگیا۔ بھارتی [illegible] کے کھوم پھر کر اور توپ خانے نے بے تحاشہ گولا باری کر کے پاکستان اور کشمیر کے جنوں کو روکنے کی کوشش کی مگر دشمن الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا گیا۔ اُس نے اپنے فضائی بیڑے کی بھی مدد حاصل کی مگر آسمان سے [illegible] ہوئے ایک اور [illegible] کی چھاتیاں اللہ کے سپاہیوں کو نہ روک سکیں۔

ایک بار انڈین ایئر فورس کے چوپنٹ طیارے اپنی پسپا ہوتی فوج کے دفاع بچانے کے لیے آئے۔ ادھر سے پاک فضائیہ کے دو سٹار فائٹر (ایف ۱۰۴) پہنچ گئے۔ چھ کے چھ نیٹ طیارے [illegible] ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ان میں سے ایک کا پائلٹ البابو کھلایا کہ وہ اپنے اڈے کا راستہ ہی بھول گیا۔ پاک فضائیہ کے شاہینوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا اور اُسے پسرور (سیالکوٹ سیکٹر) میں لا اتارا۔ اس کے پائلٹ کا نام سکوارڈن لیڈر برج پال سنگھ تھا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز بھارتیوں کا ایک اور مضبوط مورچہ ہاتھ میں آ گیا۔ یہ ڈوگئی کا مقام تھا اور یہ چوڑیاں کا دفاع تھا۔ یہ علاقہ بلند تھا۔ دشمن نے اس بلندی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہاں سے ٹینک اور توپیں قیامت کی گولا باری کر رہی تھیں۔ ہمارے ٹروپس کے سامنے چھوٹی چھوٹی نہروں کی رکاوٹیں تھیں۔ اوپر سے دشمن آگ برسا رہا تھا۔ اللہ کے نام لیواؤں کے لیے یہ بڑا ہی کڑا امتحان تھا۔ پاکستانی ٹینک پوزیشنیں بدل بدل کر ڈوگئی کے دفاع کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شام کے پانچ بج گئے۔ پاک فضائیہ کی مدد لی گئی۔

اُوپر سے شاہباز بم اور راکٹ برسا رہے تھے۔ نیچے اپنی دو بٹالینیں دشمن کے اس بے حد مضبوط اور خطرناک مورچے کے ایک پہلو میں پہنچ گئیں۔ معرکہ شدت اختیار کر گیا۔ شاہبازوں نے

اس مورچے کے عقب میں بہت بڑا شکار مارا۔ یہ ٹینک تھے، توپیں اور گاڑیاں تھیں۔ یہ کمک تھی جو ڈوگئی کے مورچے کو جا رہی تھی۔

دشمن پر پاکستان کے جانبازوں نے بڑھ چڑھ کر حملے کیے۔ دشمن پریشان ہو گیا۔ اپنے اگلے دستوں کو سنبھالنے کے لیے اُس نے مورچوں سے نکل کر دو جوابی حملے کیے جو اُسے بہت مہنگے پڑے۔ دو بے لشکر قیدی، لاشیں اور اسلحہ ایمونیشن پھینک کر پسپا ہو گیا۔

یہ چوڑیاں کا دفاع تھا جو ریزہ ریزہ ہوا تو پاکستانی توپخانے کے گولے اکھنور میں گرنے لگے۔ اکھنور کشمیر کا وہ دروازہ تھا جو بھارت کے لیے بند کرنا تھا۔ اس صورت میں کشمیر میں بھارت کی جو فوج تھی وہ بھارت سے کٹ کر رہ جاتی اور یہ تمام نفری پاکستان کی قیدی ہوتی۔

پاکستان اور آزاد کشمیر افواج کی اس کامیابی نے نئی دلی کے درودیواروں ہلا دیئے جیسے پاکستانی توپوں کے گولے اکھنور میں نہیں نئی دلی میں پھٹ رہے ہوں۔ کمانڈر انچیف کی کامیابی نے بھارتی ہائی کمانڈ کے چھکے چھڑا رکھا تھا۔ اب پاکستان اور آزاد کشمیر کے ٹروپس اکھنور کے قریب جا پہنچے تو حکومتی اور فوجی حلقوں میں بھونچال آ گیا۔

بھارتی ہائی کمانڈ میں بڑے اچھے دماغ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے اس صورت حال کے لیے جو پاکستان نے بھارت کے لیے پیدا کر دی تھی پلان تیار کر رکھا تھا۔ پلان تھا — پاکستان پر اتنی زیادہ طاقت سے حملہ کر کشمیر پر پاکستان کی گرفت ڈھیلی ہو جائے۔

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کی شام ساڑھے چار بجے آل انڈیا ریڈیو کا پروگرام روک کر اعلان کیا گیا "یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ علاقہ [illegible] میں ایک دو دنوں میں دو جگہوں پر سخت بارشیں ہوں گی"۔ اس اعلان کو دہرایا گیا۔ کچھ دیر بعد پروگرام کو روکا گیا اور اعلان کیا گیا "علاقہ نمبر ایک کے لیے آج کوئی وارننگ نہیں ہے"۔ اس اعلان کو بھی دہرایا گیا۔

اعلان ملک رجب علی نے بھی سُنے۔ اُسے شک ہوا کہ یہ کسی خاص اعلان کے خفیہ الفاظ ہیں۔ "دو جگہوں پر سخت بارشیں" کا مطلب کچھ اور ہے۔ وہ اسی سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ جمال بیگ اس کے کمرے میں آیا۔

"ملک صاحب!" — جمال بیگ نے فاتحانہ لہجے میں کہا — "کل تک اکھنور پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا اور کشمیر بھارت سے کٹ جائے گا"۔

"ایک دو دنوں میں بھارت پاکستان پر بڑا ہی فیتور حملہ کرے گا" — رجب علی نے کہا — "آل انڈیا ریڈیو سے ابھی ابھی ایک پُراسرار اعلان ہوا ہے جو عوام کے لیے سوکم کا حال نہیں بلکہ یہ ایک کوڈ خفیہ پیغام ہے جو انڈین آرمی کو دیا گیا ہے"۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہ واقعی خفیہ پیغام تھا جو فوج کو دیا گیا تھا۔ علاقہ نمبر ایک خانیوال لاہور تھا۔ "دو جگہوں" سے مراد واہگہ اور قصور تھا۔ اس سے ایک ہی روز پہلے بھارت کے وزیر دفاع چاون نے کہا تھا "ہماری فوجیں دلیری سے لڑ رہی ہیں۔ ہم نے (پاکستان کے خلاف) مناسب کارروائی کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

www.iqbalmt@gmail.com scanned by iqbalmt@gmail.com

"ملک ناصر کہاں ہے؟" — جمال بیگ نے پوچھا۔

"کل شام سے غائب ہے" — ملک رجب علی نے جواب دیا — "وہ اب غائب ہی رہے گا۔"

"ریڈار کو تباہ کرنے والی پارٹی کے پروگرام کا کچھ پتہ چلا؟" — جمال بیگ نے پوچھا۔

"نہیں" — رجب علی نے جواب دیا — "اس لڑکی (شازی) نے بہت کوشش کی ہے لیکن یہ پروگرام اتنا خفیہ رکھا جا رہا ہے کہ اس رینگ کے افراد کو بھی کچھ پتہ نہیں چلنے دیا جا رہا۔ یہ یقین ہے کہ اس ریڈار کو چند آدمیوں کی پارٹی تباہ کرے گی اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ملک ناصر اس پارٹی کے ساتھ نہیں جا رہے گا۔"

"آپ گھوڑے پھرنے کے کوڑے نہیں لائے؟" — جمال بیگ نے پوچھا — "چلئے، اوپر کوئی نکل چلتے ہیں۔ کچھ بھی وہ جگہ یا وہ علاقہ دکھائیں جہاں آپ کہتے ہیں کہ ریڈار ہے۔"

●

شمیم کی کار موجود تھی۔ ملک رجب علی اپنا ریوالور ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اس شام بھی اس نے قمیض کے نیچے ہولسٹر باندھ کر اس میں ریوالور ڈال لیا۔ اس نے شمیم سے کار کی چابی لی اور سلمٰی کو بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

وہ کار کو پہاڑیوں کی طرف لے گیا۔ اس کا ارادہ اس طرف سے مری، وڈیر جانے کا تھا۔ اسلام آباد سے کچھ دور گئے تو رجب علی نے ایک کار دیکھی جو پہاڑیوں کے اندر جا رہی تھی۔ نیلے رنگ کی وہ کار ملک ناصر کی لگتی تھی۔ اس نے کار اس رُخ پر کر لی۔ نیلی کار پہاڑیوں کے اندر جا چکی تھی۔ ملک رجب علی کو شک سا ہوا۔ اُسے بشارت کے الفاظ یاد آنے لگے — "گاڑی ملک ناصر کی استعمال ہو گی۔"

رجب علی نے اپنی کار روک لی اور جمال بیگ سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ دونوں پیدل چل پڑے۔ ملک رجب علی نے جمال بیگ کو بتایا کہ یہ کار جو پہاڑیوں میں غائب ہو گئی ہے ملک ناصر کی ہے۔ ان پہاڑیوں میں اس کار کو کیا کام؟

ملک رجب علی اور جمال بیگ تیز چلتے پہاڑیوں میں چلے گئے۔ انہیں کار کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن کار نظر نہیں آتی تھی۔ وہ جگہ کار کے چلنے کے قابل نہیں تھی۔ پتھریلی جگہ تھی اور درخت بھی خاصے تھے۔ ملک رجب علی سامنے والی ٹیکری پر چڑھ گیا۔ ہریالی بہت تھی۔ گھاس اور جھاڑیاں اونچی تھیں۔ چھوٹے بڑے درخت بھی تھے۔ ملک رجب علی ٹیکری پر جا کر بیٹھ گیا۔ جمال بیگ کو بھی اس نے بٹھا لیا۔ آگے اس ٹیکری سے بلند ٹیکریاں تھیں اور ان سے آگے پہاڑی تھی۔

ملک رجب علی کی نظروں نے سارا علاقہ دیکھ لیا۔ کار نظر آئی۔ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ رجب علی اس ٹیکری سے اترا گیا اور سامنے والی ٹیکری پر چڑھ گیا۔ وہ اب ہانپ رہا تھا۔ جمال بیگ بوڑھا تھا لیکن وہ جوانوں کی طرح ٹیکریوں سے اترتا اور چڑھتا تھا اور پتھروں پر اس کے قدم پھسلتے ڈگمگاتے نہیں تھے۔

اس ٹیکری پر بھی رجب علی بیٹھ گیا اور ہر سو دیکھا۔ کار کی آواز بند ہو گئی تھی۔ دور اُسے درختوں کی اوٹ میں کار نظر آ گئی۔ اس میں سے پانچ آدمی نکلے۔ ایک آدمی پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں کو کچھ بتا رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد اس آدمی کے ساتھ سب نے ہاتھ ملائے۔ وہ وہیں کھڑا رہا، چار پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ پانچوں آدمی کار میں بیٹھنے کے لیے مڑے۔

"وہ رہا ملک ناصر!" — رجب علی نے کہا۔

"وہی ہے" — جمال بیگ نے کہا۔

ملک ناصر کار میں بیٹھا اور کار چل پڑی۔ یہ جگہ پہاڑیوں، ٹیکریوں، درختوں اور جھاڑی نما پیڑوں میں ڈھکی چھپی تھی۔ اس جگہ کوئی سیر کے لیے بھی نہیں آتا ہوگا۔ رجب علی کے لیے اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"یہ وہی پارٹی ہے" — جمال بیگ نے کہا — "واپس چل کر پولیس کو اطلاع دیتے ہیں۔"

"اتنے میں یہ اپنا کام کر جائیں گے" — رجب علی نے کہا — "انہیں صرف ہم دونوں روک سکتے ہیں۔"

"میں آپ کا ساتھ دوں گا" — جمال بیگ نے کہا — "لیکن خالی ہاتھ ہوں۔"

"میرے پاس ریوالور ہے" — رجب علی نے کہا — "اگر میں خالی ہاتھ ہوتا تو بھی ان لوگوں کے پیچھے چلا جاتا..... بیگ صاحب! یہ ہمارا فرض ہے۔"

"فرض ادا کریں گے ملک صاحب!" — جمال بیگ نے کہا — "چلئے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

کار ان کے پیچھے سے گزری۔ رجب علی نے ملک ناصر کو اچھی طرح پہچان لیا۔

●

رجب علی اور جمال بیگ جب اس ٹیکری سے اترے تو دونوں نے پہلی بار روحانی سکون محسوس کیا جیسے منزل کسی نے بوجھ اتار پھینکا ہو۔ دونوں پر خموشی طاری ہو گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نہ کوئی مشورہ دیا نہ ہدایت۔ دونوں نے سوت کو قبول کر لیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ رجب علی کہہ گیا کہ یہ پارٹی رات کے اندھیرے میں ریڈار والی پہاڑی تک پہنچے گی۔ وہ دونوں اس پارٹی سے پہلے پہاڑی تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ وہ ایسے علاقے میں چلے گئے جہاں پہاڑیاں، درخت اور گھاس تھی۔ انہیں دو آدمی نظر آئے۔ وہ ادھر اُدھر ہو گئے تھے وہ پہاڑیوں کے اندر جا رہے تھے۔ کچھ فاصلہ رکھ کر رجب علی اور جمال بیگ چلتے گئے۔

جب سورج غروب ہوا تو وہ پہاڑیوں اور ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے۔ انہیں دوسرے دو آدمیوں کی بھی جھلک نظر آئی اور غائب ہو گئی۔ خاصا آگے گئے تو رجب علی کو وہ چوٹی نظر آئی جس پر اس نے چار پانچ روز پہلے چمک دیکھی تھی۔ اس چوٹی تک پہنچنے کے لیے کم از کم دو گھنٹے درکار تھے۔

رجب علی اور جمال بیگ ایک ڈھلان پر جا رہے تھے۔ ہلکا سا زناٹا سنائی دیا اور کوئی چیز پیچھے کی طرف رجب علی کے کندھے میں اتر گئی۔ رجب علی رُک گیا۔

"خنجر ہے ملک صاحب!" — جمال بیگ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے کندھے

iqbalmt@onenurd.com Scanned by

سے خنجر نکال لیا۔

دونوں بیٹھ کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے۔ رجب علی نے ریوالور نکال لیا۔ جمال بیگ نے اُسے کہا کہ اُس کے کندھے سے بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔

"بہہ جانے دو" رجب علی نے بے پرواہی سے کہا۔ "اب یہ زندگی بھر زخمی ہی پائے رہ۔ آپ کو خنجر مل گیا ہے۔ اُن کے پاس ریوالور یا مشین گنیں ضرور ہوں گی لیکن وہ اس طرف سے گولی نہیں چلائیں گے کہ کوئی آ جائے گا اور وہ پکڑے جائیں گے۔"

سامنے والی ٹیکری کی ڈھلان پر دو سے زیادہ آدمی چھپ چھپ کر آ رہے تھے۔ رجب علی نے ریوالور سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ ایک آدمی رُکا۔ ایک طرف کو جھکا اور گر پڑا۔ رجب علی دوسرے آدمی پر گولی چلانے لگا تھا کہ اُسے پیچھے سے پتھر لڑھکنے کا شور سنائی دیا۔ فوراً اس کے کہ وہ پیچھے دیکھتا، دو بازوؤں نے اُسے جکڑ لیا۔ وہ اُٹھا اور اُس نے جھٹکے سے آگے کو جھک کر پھر بیٹھ کر اُوپر کو جھٹکا دیا۔ اُس کے گھٹنے پیٹ سے لگ گئے لیکن جس آدمی نے اُسے پکڑ لیا تھا وہ اُس کے سر کے اُوپر سے قلابازی لگا کر آگے جا پڑا۔ وہ ڈھلان تھی۔ وہ آدمی لڑھکتا نیچے گیا۔

رجب علی نے اُس پر ریوالور تان لیا۔ وہ آدمی پیٹھ کے بل آہستہ آہستہ اُٹھا۔ رجب علی نے ایک اور گولی فائر کی۔ وہ آدمی گرا پھر اُٹھ نہ سکا۔ سامنے سے سٹین گن کی باڑھ آئی۔ رجب علی کو یوں لگا جیسے اُس کی ٹانگ کٹ کر جسم سے الگ ہو گئی ہو۔ سٹین گن کی نہ جانے کتنی گولیاں اُس کی ران سے گزر گئی تھیں۔ رجب علی گر پڑا۔ اُس کی ٹانگ بری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ اُسے چکر آنے لگے۔

اِدھر ایک آدمی جمال بیگ کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے وار بچا رہے تھے۔ وہ جگہ لڑنے کے قابل نہیں تھی۔ ڈھلان تھی۔ رجب علی نے اس تخریب کار پر دو گولیاں چلائیں لیکن اتنی قریب ہونے کے باوجود گولیاں ضائع گئیں کیونکہ وہ شخص پینترے سے بدل رہا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا اور جمال بیگ بوڑھا لیکن وہ اس جوان سے زیادہ پھرتیلا تھا۔

جمال بیگ کا پاؤں ایک پتھر پر آیا اور وہ سنبھل نہ سکا۔ وہ گر رہا تھا کہ تخریب کار کا خنجر جمال بیگ کے پہلو میں اُتر گیا۔ رجب علی نے سنبھل کر ریوالور سیدھا کیا اور گولی چلائی۔ وہ آدمی پیچھے ہٹ کر گرا لیکن گرتے گرتے اُس نے خنجر جمال بیگ پر اتنی زور سے پھینکا کہ جمال بیگ کے سینے میں اُتر گیا۔

رجب علی نے ریوالور میں مزید گولیاں ڈالیں اور اس توقع پر سب کی سب ہوا میں فائر کر دیں کہ ریڈار اور آبزرویشن کی پوسٹ تک آواز پہنچ جائے گی اور وہاں سے کوئی آ جائے گا۔

وادیاں تاریک ہونے لگی تھیں لیکن ابھی نظر کام کرتی تھی۔ رجب علی کا خون بہت زیادہ بہہ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے سے دھندلے بادل گزرنے لگے تھے۔ وہ اِرد گرد کی آوازوں سے بے خبر ہوتا جا رہا تھا۔ جمال بیگ کو اُس نے پکارا لیکن اُسے جواب نہ ملا۔

کیا جمال بیگ شہید ہو گیا ہے؟

رجب علی کو شب و روز نظر آنے لگی۔ اُس نے اطمینان اور سکون کی آہ لی۔

iqbalmt@yahoo.com Scanned by